

گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
فروری 2015
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے قسط وار ناول
اختر شجاعت کے قلم سے پُرعقیدت مضمون
رضوانہ پرنس کا دلکش افسانہ آپ کی نذر
Monthly PAKEEZA REGD. NO. SS-12 FEB - 2015 PRICE RS. 60/=
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار

معاون: آمنہ حماد

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

منی ناول

افسانے

خصوصی مضامین

مستقل عنوانات

پبلشر و پروپرائٹر: ثمینہ رسول ۔ مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

نمائندہ لاہور سید افراز علی ناز 0332-4214400 رانا لے حمید 0323-2895528

ماڈل: نینا بتول .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹوگرافر: موسیٰ رضا

جلد42• شمارہ 11• فروری 2015• زر سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35595313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com





ایک بہت پرانا مقولہ ہے ''قدرت نے انسان کو ایک زبان اور دو کان اس لیے دیے ہیں کہ وہ جتنا بولتا ہے اس سے دگنا سنے......'' لیکن یہ باتیں اس وقت سر سے گزر جاتی ہیں جب لوگ محفل پر چھا جانے کی غرض سے اتنا بولتے ہیں جیسے کسی کی بولتی بند کرنا چاہتے ہوں۔ ایسے لوگ بولتے ہوئے یہ تک بھول جاتے ہیں کہ گفتگو کا مقصد تبادلہ خیالات ہوا کرتا ہے...... اکثر خواتین اپنی تعریفیں از خود کرتے ہوئے یہاں تک بھول جاتی ہیں کہ سننے والے دوسرے کی تعریفوں میں اتنی زیادہ دلچسپی نہیں لیا کرتے...... ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ اپنے آپ کو نہایت باذوق اور بذلہ سنج ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے پاس دلچسپ باتوں کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے...... اور وہ بلا تکان بولے چلے جاتے ہیں اور یہ دیکھے بغیر...... کہ مسکراتے ہوئے لب...... اب اکتائے ہوئے انداز میں وہاں سے اٹھنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ایسا بھی اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اکثر لوگ اپنی علمیت کا رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ہمیشہ غیر ملکی کہاوتوں کی تعریف کریں گے اور ایسے حوالے دیں گے تاکہ ان کی علمی قابلیت کا آپ پر رعب پڑ جائے...... مگر ایسے لوگ نہ صرف باتونی کہلاتے ہیں بلکہ غیر دلچسپ شخصیت بھی بن جاتے ہیں۔

اگر آپ پہلی ہی ملاقات میں دوسروں کو متاثر کرنا چاہتے ہیں تو گفتگو کرنے میں سادہ اور دلکش رہیے اور وہ بات کیجیے جس سے دوسروں کو بھی دلچسپی ہو اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ محفلوں میں بیٹھ کر اپنی نیکیوں اور دوسروں کی برائیوں کو قطعاً نہ اچھالیں...... اور نہ ہی کسی کو کم تر سمجھیں...... ہمیشہ پُر اعتماد رہیں کہ دوسرے آپ سے مل کر خوش ہوں۔ آپ کا دوستانہ اور پُر محبت رویہ...... آپ کے بارے میں ایک اچھی رائے قائم کرے گا۔

اور سب سے اہم بات...... آپ تعریف کرنے کے معاملے میں کبھی بخل سے کام نہ لیں...... جس طرح اپنی تعریف سن کر خود آپ کو خوشی ہوتی ہے تو ویسی ہی خوشی کسی دوسرے کو دینے میں کیا حرج ہے اور یہ بات تو یقیناً آپ کو معلوم ہی ہوگی کہ محبت کا دوسرا نام خوشی ہی تو ہے۔

مدیرہ
انجم انصار

پس اللہ نے ان کے بدلے میں جو انہوں نے (صدقِ دل سے) کہا انہیں باغ
دیے جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں بہہ رہی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے
اور یہ (ہی) بدلہ ہے نیکی کرنے والوں کا (۸۵) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور
ہماری آیتوں کی تکذیب کی وہی لوگ دوزخ والے ہیں (۸۶) اے
ایمان والو وہ پاکیزہ چیزیں جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں حرام نہ
کرو اور (کسی بات میں) حد سے آگے نہ بڑھو بے شک اللہ حد سے بڑھنے
والوں کو دوست نہیں رکھتا (۸۷) اور جو حلال (اور) پاکیزہ چیز تمہیں اللہ
نے دی ہے اسے کھاؤ اور اس اللہ (کی نافرمانی) سے بچو جس پر تم ایمان
رکھتے ہو (۸۸) (اور اللہ کی قسم کھانے سے بچو) اللہ تمہاری قسموں میں
لغو (قسموں) کا تم سے مواخذہ نہ کرے گا لیکن جو تم نے بالقصد (جھوٹی)
قسمیں کھائی ہوں ان کا تم سے مواخذہ کرے گا پس اس (قسم) کا کفارہ دس
محتاجوں کو [illegible] قسم کا متوسط کھانا کھلانا جو تم اپنے عزیزوں کو کھلاتے ہو یا دس
محتاجوں کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا پھر جو کوئی (یہ چیزیں) نہ پائے تو
(اس پر) تین روزے رکھنا (ضروری ہے) یہ تمہاری قسموں کا کفارہ
ہے جب تم قسم کھا لو (اور وہ پوری نہ ہو) اور اپنی قسموں کی حفاظت
کرو (تم کو لازم ہے کہ ان کو پورا کرو) اسی طرح اللہ اپنے احکام تمہارے
لیے ظاہر فرماتا ہے تاکہ تم شکر کرو (۸۹) اے ایمان والو شراب اور جوا
اور بت اور پانسے ناپاک ہیں (اور) شیطان کے کام ہیں
پس تم ان سے بچو تاکہ بامراد ہو (۹۰) شیطان
تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے میں (تمہیں
مبتلا کرکے) تمہارے درمیان عداوت
اور رنجش ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز
سے روک دے۔ پس کیا (اب) تم (شراب اور
جوئے سے) باز آنے والے ہو (یا اب بھی باز نہ
آؤ گے) (۹۱)

(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۸۵ تا ۹۱)





سیدنا محمود ﷺ

۴۔ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی (۴) الضحیٰ

ترجمہ: اور آخرت تمہارے لیے پہلی حالت یعنی دنیا سے کہیں بہتر ہے۔

۳۔ اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱) الکوثر

ترجمہ: ہم نے آپ ﷺ کو کوثر عطا کی۔

عربی لغت میں کوثر کثرۃ سے ماخوذ ہے اور اسی مناسبت سے اس کے معنی خیر کثیر لیے جاتے ہیں۔

۱۔ صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے پاس تابعی حضرت سعید بن جبیرؒ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ لوگ ایسا کہتے ہیں کہ کوثر جنت میں ایک نہر کا نام ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ خیر کثیر کی ایک قسم ہے اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کو دونوں جہانوں میں اتنی بھلائیاں عطا فرمائی ہیں کہ ان کی کثرت کی کوئی حد نہیں۔

۲۔ حضرت عکرمہؓ کے نزدیک 'کوثر' سے مراد نبوت ہے۔

۳۔ حضرت حسن بصریؒ کا خیال ہے کہ اس سے مراد 'قرآن' ہے۔

۴۔ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ کہتے ہیں صحیح یہ ہے کہ 'کوثر' کسی ایک چیز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام صفاتِ کمال کو اس میں شامل کیا گیا ہے اور خیر کثیر تمام معانی میں شامل ہے۔

۵۔ مولانا احمد رضا خان بریلویؒ نے 'کوثر' کا ترجمہ بے شمار خوبیاں لیا ہے۔

قیصر بخیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس

اعتبارِ وفا

قسط ۔ 6

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا . . . گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے . . . کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑکھڑاتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے . . . لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے . . . اور مان لیا جائے . . . کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے . . . اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں . . . جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب پھولوں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں



''ڈیڈی۔'' وہ ان کے بیڈ پر ان کے پاس ہی بیٹھی تھی اور آنسو بڑی خاموشی سے اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

''ایمی۔'' ممی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''ممی۔'' اس نے روتی آنکھوں سے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''ڈیڈی کی یہ حالت ہوگئی اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں..... خبر تک نہیں دی۔''

اس نے ڈیڈی کی طرف دیکھا جنہوں نے عین اسی لمحے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا اور ان کے لب کانپے تھے شاید وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

''ڈیڈی۔'' وہ ان پر جھک گئی لیکن ان کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

''ڈیڈی۔'' اس نے بے قراری سے آواز دی۔ ''ڈیڈی پلیز آنکھیں کھولیں، یہ میں ہوں ایمل، آپ کی گڑیا، آپ کی ایمی.....''

تب ہی دستک دے کر ایک نرس اندر آگئی گو اس پرائیویٹ اسپتال کا یہ ایک وی آئی پی روم تھا پھر بھی اس نے پورے کمرے میں نظر گھمائی۔

''فالتو لوگ چلے جائیں پلیز ڈاکٹر علی حسن راؤنڈ پر آرہے ہیں۔'' ایمل نے سسٹر کی طرف مڑ کر دیکھا اور بیڈ سے اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''پلیز آپ۔'' سسٹر نے ایک طرف کھڑے افنان اور ارتقاع کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں خاموشی سے باہر چلے گئے۔ جاتے جاتے افنان نے ایمل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا تسلی دی تھی۔

''ماما ہم باہر لاؤنج میں ہیں۔''

وہ سر ہلا کر ہونٹ کچلتے ہوئے ڈیڈی کی طرف دیکھنے لگی جن کی رنگت خطرناک حد تک زرد ہو رہی تھی، ہونٹ خشک ہو رہے تھے ایک بازو میں ڈرپ کی سوئی لگی ہوئی تھی۔ سسٹر نے پہلے ڈرپ چیک کی پھر بی پی چیک کر کے سرہانے پڑی ٹیبل سے فائل اٹھا کر اس میں نوٹ کیا۔ تب ہی ڈاکٹر علی حسن دو جونیئر ڈاکٹرز کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ڈاکٹر علی حسن ادھیڑ عمر تھے۔ ہارٹ اسپیشلسٹ تھے اور کرنل حامد رضا کے دوست تھے اس لیے سی ایم ایچ میں علاج کی سہولیات ہوتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ اس پرائیویٹ اسپتال میں آتے تھے کیونکہ یہاں ڈاکٹر علی تھے۔

''السلام علیکم..... انکل!'' ایمل نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام بیٹا! آپ کب آئے ہو؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئے ہیں۔'' ڈاکٹر علی، سسٹر کے ہاتھ سے فائل لے کر چیک کرنے لگے تھے۔

''انکل خطرے کی تو کوئی بات نہیں ہے؟ ڈیڈی ٹھیک ہو جائیں گے ناں؟'' سسٹر کو فائل پکڑاتے ہوئے ڈاکٹر علی حسن نے ایمل کی طرف دیکھا۔

''آپ کے ڈیڈی کو بہت شدید اٹیک ہوا ہے فی الحال خطرے سے باہر ہیں۔ پہلے اٹیک پر ہی میں نے تاکید کی تھی کہ انہیں احتیاط کرنی چاہیے، ہر طرح کی ٹینشن اور اسٹریس سے دور رہیں لیکن کرنل صاحب نے توجہ ہی نہیں دی اور دیکھیں ابھی دو ماہ بھی نہیں ہوئے اور دوسرا اٹیک ہو گیا۔''

''پہلا اٹیک..... دو ماہ پہلے؟'' ایمل نے ممی کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں ممی۔'' اس کی

آواز بھرا گئی تھی۔
''بابر سے بات ہوئی تھی، میں نے اسے بتایا تھا بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے وہ تمہیں بھیج دے لیکن اس نے کہا تمہاری اپنی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم خواہ مخواہ پریشان ہو جاؤ گی اور پھر تمہارے ڈیڈی نے بھی منع کر دیا تھا کہہ رہے تھے ذرا طبیعت سنبھلتی ہے تو خود ہی جائیں گے ایمل کی طرف۔'' ممی بتا رہی تھیں اور ڈاکٹر علی حسن، کرنل حامد کو چیک کر رہے تھے۔
''ابھی کچھ دیر پہلے ڈیڈی نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تھا لیکن پھر...... ڈیڈی بے ہوش تو نہیں ہیں؟''
''نہیں، دوائیوں کے زیرِ اثر غنودگی میں چلے جاتے ہیں۔ بس آپ کو یہ احتیاط کرنی ہے کہ جب یہ گھر جائیں تو کوئی ٹینشن نہ ہو۔''
''ڈیڈی کو بھلا کیا ٹینشن ہو سکتی ہے؟'' ایمل نے سوچا۔ ''یہ ڈاکٹر بھی ہر مرض کے پیچھے ٹینشن اور اسٹریس بتا دیتے ہیں۔'' ڈاکٹر علی حسن اسٹاف کو دوائیوں کے متعلق سمجھا رہے تھے۔ ایمل کی نظریں ڈیڈی پر تھیں جن کے چہرے سے اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ انہوں نے منہ کھولا تھا اور پھر گہری گہری سانسیں لینے لگے تھے۔ غالباً انہیں سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔
''ڈاکٹر، ڈیڈی کو دیکھیں کیا ہو رہا ہے انہیں۔'' ایمل یک دم چیخی۔
کرنل حامد نے لمحے بھر کے لیے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ مار کر ڈرپ کی سوئی نکال دی۔ اب وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو مسل رہے تھے۔ ڈاکٹر علی حسن فوراً ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
''کرنل صاحب...... کرنل صاحب!'' انہوں نے ان کے ہاتھ تھامے اور اسٹاف سے کہا۔ ''سسٹر آکسیجن لگاؤ فوراً۔''
سسٹر مستعدی سے ان کے حکم کی تعمیل کرنے لگی جبکہ ایمل، ڈیڈی کی ایسی حالت دیکھ کر ممی کے گلے لگ کر رونے لگی۔ وہ اسے ہولے، ہولے تھپکنے لگیں۔
ممی نے اسے فون پر بتایا تھا کہ اس کے ڈیڈی اسپتال میں ہیں شدید اٹیک ہوا ہے دل کا اور وہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں، بیٹا ابھی آ جاؤ فوراً۔'' فون پر مسلسل وہ رو رہی تھیں۔
''مجھے ڈر لگ رہا ہے تمہارے ڈیڈی بالکل ٹھیک نہیں ہیں۔'' اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی تھی۔ افنان اور ارتفاع نے اسے سنبھالا تھا۔
''حوصلہ کریں ماما، انشاء اللہ نانا جان ٹھیک ہو جائیں گے۔'' افنان نے اسے گلے سے لگایا تھا۔
''پلیز انی مجھے لاہور لے چلو، ابھی لے چلو۔'' وہ تڑپ، تڑپ کر رو رہی تھی پتا نہیں کیوں دل ڈوب رہا تھا اور پھر افنان نے فلائٹ کا پتا کیا تھا اور شام چھ بجے کی فلائٹ سے انہیں لاہور کی سیٹ مل گئی تھی۔ آنے سے پہلے ارتفاع اور افنان نے باپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان کا فون آف تھا۔ افنان نے اپنے چچا عامر کو بھی فون کیا تھا جو لاہور میں ہی رہائش پزیر تھے لیکن عامر نے بتایا کہ بابر ان کی طرف نہیں ہیں بلکہ چچا نے طنز بھی کیا تھا۔
''بھئی تمہارے پاپا ٹھہرے بڑے آدمی، وہ بھلا غریب بھائی کے گھر کیوں آئیں گے اگر وہ خالو کے محل میں نہیں ہیں تو کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہوں گے۔'' عامر چاچو ہمیشہ یوں ہی جلی کٹی باتیں کرتے تھے۔ افنان نے ان کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔
کچھ دیر بعد ہی کرنل حامد کی سانس بحال ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر علی حسن نے ایمل کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے ہم انہیں آئی سی یو میں منتقل کر دیتے ہیں۔''
ایمل نے ڈیڈی کی طرف دیکھا۔ان کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا تھا لیکن اب چہرے پر اذیت کے آثار نہیں تھے۔
''آپ بہتر سمجھتے ہیں انکل۔''
''بابر کہاں ہے؟'' ڈاکٹر علی حسن نے پوچھا۔
''بابر تو نہیں ہے لیکن افنان ہے میرا بیٹا، میں اسے بلاتی ہوں۔'' ایمل فوراً ہی باہر چلی گئی۔ڈاکٹر علی حسن، سسٹر کو ہدایات دینے لگے اور کچھ دیر بعد ہی کرنل حامد کو آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا۔وہ ممی اور ارتفاع تینوں آئی سی یو کے باہر ایک طرف چھوٹی سی راہ داری میں موجود کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔افنان اسٹریچر کے ساتھ لفٹ میں گیا تھا۔ایمل مسلسل رو رہی تھی۔پاس بیٹھی ارتفاع نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
''ماما پلیز حوصلہ کریں۔'' جب ہی افنان انہیں آئی سی یو سے باہر آتا نظر آیا تو ایمل فوراً کھڑی ہو گئی۔
''افی، ڈیڈی؟'' افنان اسے ساتھ لگائے حوصلہ دینے لگا۔
''میرا دل ڈوب رہا ہے افی، مجھے لگتا ہے جیسے ڈیڈی کو کچھ ہو جائے گا۔ میں کیسی بیٹی ہوں افی...... میرا باپ یہاں بیمار تھا اور میں وہاں کیسے مطمئن بیٹھی تھی، مجھے خبر تک نہ تھی۔''
''ماما پلیز حوصلہ کریں، نانا جان کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ سب پلیز چلیں، ان کے کمرے میں چل کر بیٹھیں، میں ہوں ناں ادھر یہاں وقفے، وقفے سے یکھتا رہوں گا اور اگر ڈاکٹر صاحب نے اجازت دی تو یہاں ہی نانا جان کے پاس رہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب ابھی راؤنڈ لے کر ادھر ہی آ رہے ہیں۔انہوں نے مجھے کہا تھا کہ وہ آتے ہیں۔'' اس نے روتی آنکھوں سے افنان کی طرف دیکھا۔
وہ کتنا بھی سمجھدار سہی آخر تھا تو ابھی نوجوان لڑکا ہی صرف بیس سال کا پھر اسے ایسے معاملوں کا کیا پتا تھا۔ کبھی اسپتالوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا اس کا...... اگر بابر ہوتا تو ڈاکٹروں سے صحیح صورت حال معلوم کرتا۔ اگر ضرورت پڑتی تو وہ کسی مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ سے رابطہ کر لیتا۔
''ارفی پلیز اپنے پاپا کو فون کرو۔'' اس نے ارتفاع سے التجا کی۔ ارتفاع نے اپنا موبائل ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ ''انہیں کہو وہ یہاں آ جائیں اسپتال میں۔''
ارتفاع جو پہلے بھی کتنی بار کوشش کر چکی تھی ایک بار پھر باپ کا نمبر ملانے لگی۔ وہ خود چاہتی تھی وہ آ جائیں تو وہ ان کے ساتھ چاچو عامر کی طرف چلی جائے۔ وہ بھلا یہاں کیوں بیٹھی ہے، اس کا کیا رشتہ ہے کرنل حامد کے ساتھ۔ خواہ مخواہ بیزار ہو رہی ہوتی۔ٹھیک ہے وہ افی اور ایمل کی خاطر لاہور آ گئی تھی اور یوں بھی افنان نے کہہ دیا تھا کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے اور پھر خدانخواستہ نانا کو کچھ ہو گیا تو وہ اکیلی کیسے آئے گی۔ وہ دل ہی دل میں ہنسی تھی کہ بھلا اسے آنے کی ضرورت بھی کیا تھی لیکن کچھ دیر پہلے اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ افنان کو ناراض نہیں کرے گی اور نہ ہی ایمل کو۔ سو وہ چلی آئی تھی لیکن اب پاپا فون ہی نہیں اٹھا رہے تھے اور یہاں...... اس نے نانو کی طرف دیکھا اور سوچا۔
''نانو نے کبھی اسے زیادہ پیار نہیں کیا۔ آج سے پہلے وہ جب، جب لاہور آئی تھی اس نے کبھی نانو کے رویے پر غور نہیں کیا تھا لیکن اس بار اس نے محسوس کیا تھا کہ نانو جس طرح والہانہ انداز میں افنان سے ملی تھیں اس گرم جوشی سے اس سے نہیں ملی تھیں اور وہ ہمیشہ ہی اس سے سرسری انداز میں ملتی تھیں، ہاں نانا......'' اس نے کرنل حامد کے رویے کے متعلق سوچا تو اسے لگا کہ وہ افنان کی نسبت اس سے زیادہ پیار کرتے تھے۔

''خیر......'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس نے ایمل کی طرف دیکھا۔
''پاپا کا فون اب آف تو نہیں ہے لیکن وہ پک نہیں کر رہے۔ شاید کسی میٹنگ میں ہوں گے۔ ماما آپ پریشان نہ ہوں۔'' افنان نے ایمل کا ہاتھ دبایا۔
''ڈاکٹر شہریار ایکسپرٹ کارڈیالوجسٹ ہیں۔ کافی نام ہیں ان کا ہارٹ سرجری کے ماہر ہیں، وہ میرے ایک دوست کے ماموں ہیں، میں اسے فون کرتا ہوں اگر آپ کہتی ہیں تو انہیں بھی دکھا لیتے ہیں۔''
''نہیں ابھی نہیں بیٹا، پہلے علی بھائی سے پوچھ لو۔'' خاموش بیٹھی ممی نے افنان سے کہا تو افنان نے سر ہلایا اور انہیں یہ بتاتا ہوا کہ وہ ڈاکٹر علی حسن کی طرف جا رہا ہے جو کچھ دیر پہلے ہی آئی سی یو وارڈ میں گئے تھے۔ وہاں سے چلا گیا۔
''ممی آپ ارفی کے ساتھ کمرے میں چلی جائیں، میں یہاں ہی بیٹھوں گی۔''
ایمل نے افنان کے جانے کے بعد ممی کی طرف دیکھا جو بے حد نڈھال اور تھکی، تھکی سے بیٹھی تھیں۔ وہ بہت دنوں بعد انہیں دیکھ رہی تھی وہ اسے بے حد کمزور لگیں۔ یہ اس کی ہر وقت ٹک سک سے درست رہنے والی ممی تھیں۔ شکن آلود کپڑوں کے ساتھ نڈھال اور اکیلی۔
''ممی۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس بینچ پر بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ''ڈیڈی ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ اور پریشان نہ ہوں ممی، ہم اب یہاں ہی رہیں گے آپ کے پاس۔ میں، آپ اور ڈیڈی کو اب اکیلا چھوڑ کر کراچی نہیں جاؤں گی۔ اس عمر میں اب آپ کو ہماری ضرورت ہے ممی اور ہم کیسی خود غرض اولاد ہیں، میں بابر کو منا لوں گی ممی...... یوں بھی کراچی کے حالات کہاں اچھے ہیں اور بابر تو ہر مہینے یہاں چکر لگاتے ہی ہیں۔ ہم یہاں آ گئے تو وہاں چکر لگا لیا کریں گے بلکہ میں ان سے کہوں گی کہ وہاں کا سارا بزنس ہی ختم کر کے یہاں منتقل ہو جائیں۔'' ممی نے دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھ بھینچ لیے اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگیں۔
''اللہ تمہیں اپنے گھر میں خوش اور آباد رکھے۔ تمہارے ڈیڈی کہتے ہیں بیٹیاں سدا ساتھ نہیں رہتیں۔ ایک دن انہوں نے اپنا الگ آشیانہ بنانا ہی ہوتا ہے یہ تو ہماری بھول تھی جو ہم نے چاہا کہ تم اور بابر سدا ہمارے ساتھ رہو۔ اپنے سگے بیٹے بھی آج کل کہاں ساتھ رہتے ہیں ہمیشہ اور پھر تو...... ہم نے اپنی سی ایک کوشش کی تھی جب میں بابر کو بیٹا بنا کر گھر لائی تھی تو سوچا تھا ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے، بابر کے ساتھ تمہاری شادی کر دوں گی تو ہماری اکلوتی بیٹی ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ خیر اللہ تمہیں اپنے گھر میں سکھی رکھے۔ بابر سے خواہ مخواہ کی صدمت کرنا، غصے میں کہیں الٹی سیدھی بات نہ کر دے۔ اب وہ داماد ہے بیٹا نہیں رہا۔ ہم تو بس تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔ جہاں رہو خوش رہو۔''
''پتا نہیں خوشی کیا ہوتی ہے اصلی اور سچی خوشی؟'' وہ بابر کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزار رہی تھی، اسے بابر سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی لیکن کیا وہ خوش بھی تھی اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔
''تم خوش تو ہو ناں ایما؟'' ممی جب بھی ملتیں ہر بار یہی پوچھتیں۔ اور وہ ہنس دیتی تھی۔
''ناخوش کی کیا بات ہے ممی۔'' آج پھر ممی پوچھ رہی تھیں ''تم خوش تو ہو ناں بابر کے ساتھ؟'' اب جبکہ افنان بھی بیس سال کا ہو چکا تھا ممی کو پتا نہیں کیوں اس کی خوشیوں پر شک تھا لیکن آج اسے ممی کی بات پر ہنسی نہیں آئی تھی اور وہ آئی سی یو سے آتے افنان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔
''نانا جان پہلے سے بہتر ہیں۔'' افنان نے قریب آ کر بتایا۔ ''انہوں نے مجھ سے بات بھی کی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ آپ دو، دو منٹ کے لیے باری، باری اندر جا کر نانا جان کو دیکھ سکتے ہیں۔'' ایمل

ایک دم کھڑی ہوگئی۔

''ٹھیک ہے ایمل'' پہلے تم جاکر اپنے ڈیڈی سے مل لو، ہوسکتا ہے وہ تم سے بات کرنا چاہیں۔ وہ تمہارے لیے بہت اداس اور پریشان رہنے لگے تھے۔''

''کیوں ممی؟'' اس نے ان کی طرف دیکھا۔

''وہ پریشان کیوں رہتے تھے؟ آپ نے پہلے بھی نہیں بتایا۔''

''پتا نہیں انہوں نے مجھے بھی نہیں بتایا۔ پچھلے دو تین ماہ سے وہ تمہارا بہت ذکر کرنے لگے تھے۔ کرید، کرید کر مجھ سے پوچھتے تھے کہ بابر کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے، تمہاری بھی مجھ سے ایسی بات تو نہیں ہوئی کہ مجھے لگا ہو کہ تم پریشان ہو۔ میں نے کئی بار پوچھا بھی کہ کیا بات ہے لیکن انہوں نے کچھ بتایا نہیں شاید ان کا خیال تھا کہ بابر سخت مزاج ہے اور تم بہت حساس ہو۔''

''بابر کا رویہ تو ہمیشہ بہت اچھا رہا ممی۔ ڈیڈی مجھ سے بات کرتے تو میں انہیں مطمئن کر دیتی۔''

ارتقاع اس ساری گفتگو سے بے نیاز اپنے موبائل کے ساتھ مصروف تھی۔

''آئیں ماما!'' افنان نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اس کے ساتھ تھا آئی سی یو تک آئی جوتے تبدیل کیے۔ افنان نے اشارے سے بتایا کہ وہ سامنے ہی نانا کا بیڈ ہے۔

''ڈیڈی۔'' وہ تیر کی طرح ان کی طرف بڑھی۔ کرنل حامد نے دایاں ہاتھ تھوڑا سا اونچا کیا۔ وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ ''ڈیڈی۔'' اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگایا ''یہ کیا ہوگا ہے آپ کو؟'' آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

''کچھ نہیں میری جان بس بلاوے کے بہانے ہیں۔'' وہ ذرا سا مسکرائے اور اس کے ہاتھ کو جس میں اس نے ان کا ہاتھ تھاما ہوا تھا ہونٹوں سے لگایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کے کونوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''ڈیڈی پلیز!'' اس نے تڑپ کر ہاتھ چھڑا کر ان کے آنسو پونچھے۔ ''آپ ٹھیک ہو جائیں گے، بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''کاش۔'' ان کے لبوں سے نکلا۔ ''تھوڑی سی مہلت مل جائے ایمل مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ بہت کچھ سمجھانا ہے لیکن......'' وہ کچھ دیر یونہی اس کا ہاتھ تھامے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''انشاء اللہ ڈیڈی ہم بہت ساری باتیں کریں گے۔ بہت گھومیں پھریں گے، شطرنج کھیلیں گے اور مجھے پتا ہے، اب بھی آپ مجھے ہرا دیں گے ہمیشہ کی طرح۔''

ان کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومنا چاہتے تھے لیکن ایک ہاتھ میں ڈرپ کی سوئی لگی تھی۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جب ایمل نے یک دم اپنا سر ان کے سینے پر رکھ دیا اور روتے ہوئے گلہ کیا۔

''آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا جب پہلی بار آپ کو اٹیک ہوا تھا۔ میں اسی وقت آ جاتی آپ کے پاس رہتی، آپ کا خیال رکھتی۔ آپ نے اپنا خیال نہیں رکھا ناں، احتیاط نہیں کی بالکل بھی۔ انکل علی حسن کہہ رہے تھے لیکن اب میں آپ کے پاس ہی رہوں گی اور آپ کا خیال رکھوں گی۔'' اس نے سر اٹھایا۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے وقت ختم ہو گیا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھنا میری گڑیا اور مجھے معاف کر دینا۔''

''ایسا مت کہیں ڈیڈی، کیوں کہہ رہے ہیں آپ ایسا۔ معافی تو مجھے مانگنی چاہیے ڈیڈی۔ ایک بار میں نے آپ کا دل دُکھایا تھا آپ کو تکلیف دی تھی۔ میں ہمیشہ آپ سے شرمندہ رہی لیکن کبھی کہہ نہ سکی۔ معافی نہ مانگ سکی، آپ مجھے معاف کردیں ڈیڈی اس تکلیف کے لیے جو ایک بار میں نے آپ کو دی تھی۔'' اس کی آواز ذرا سی بلند ہوئی تھی۔

''نہیں۔'' انہوں نے پھر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ''تم میری بہت پیاری بیٹی ہو۔ تم نے مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ میں کبھی تم سے ناراض نہیں رہا۔ میں نے انجانے میں تمہارے ساتھ.....''

''پلیز!'' ایک سسٹر نے جو آئی سی یو وارڈ میں مختلف مریضوں کے بیڈ کے پاس جارہی تھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''آپ پیشنٹ کو ڈسٹرب نہ کریں۔''

''سوری سسٹر۔'' وہ سیدھی ہوکر بیڈ کے پاس پڑے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ سسٹر نے ڈرپ چیک کی، اسے تھوڑا اسلو کیا اور بی پی چیک کر کے دوسرے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ کرنل حامد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو اس نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

''باقی باتیں پھر کریں گے، آپ ریلیکس ہوجائیں بس۔'' جواباً وہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ ''میں ممی کو بھیجتی ہوں وہ بہت اپ سیٹ ہورہی تھیں۔'' انہوں نے سر ہلایا۔

''ہاں ٹھیک ہے، اپنی ممی کو بھیج دو میں نے ان سے بھی معافی مانگنی ہے اور کچھ کہنا ہے پھر پتا نہیں وقت ملے یا نہیں۔'' اپنے آنسوؤں کو بہ مشکل روکتی ہوئی وہ باہر آئی۔ افنان باہر ہی کھڑا تھا۔

''انی ممی کو لے جاؤ ڈیڈی کے پاس پھر ڈیڈی سے مل کر تم ارفی اور ممی کو گھر لے جانا۔ ممی بہت تھکی ہوئی اور نڈھال لگ رہی ہیں۔ جانے کتنی راتوں سے جاگ رہی ہیں کچھ دیر آرام کرلیں گی۔ میں اِدھر ڈیڈی کے پاس رہوں گی تم بھی تھوڑا فریش ہوکر آجانا۔''

''ٹھیک ہے، میں نانو اور ارفی کو چھوڑ کر فوراً واپس آجاؤں گا۔''

وہ ممی کو لے کر چلا گیا تو وہ کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر ڈیڈی کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگی جبکہ ارتقاع اب بھی اپنے موبائل کے ساتھ مصروف تھی اور ظفری کے آئے مسیجز کا جواب لکھ رہی تھی، تب ہی آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور افنان بوکھلایا ہوا سا باہر آیا۔

''ماما..... ماما۔''

''کیا ہوا؟'' ایمل بوکھلا کر کھڑی ہوگئی۔ ارتقاع بھی موبائل چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایمل نے آئی سی یو کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر علی حسن تقریباً بھاگتے ہوئے آئی سی یو میں گئے تھے۔ افنان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے، اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

عنبرین ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لیتے ہوئے ہولے ہولے گنگنا رہی تھی جبکہ بابر بیڈ پر ترچھا لیٹا اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں تو محترمہ کو یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی پھر آجاؤں گا لیکن جناب ہم تو وعدہ نبھانے والے بندے ہیں جیسے ہی شادی سے فارغ ہوا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگا کسی کو نہیں بتایا اور بزنس جائے بھاڑ میں ہم اپنی جاناں کو ناراض نہیں کرسکتے۔''

عنبرین نے آخری بار آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور پھر اپنی تیاری سے مطمئن سی ہوکر صوفے پر بیٹھ گئی جو بیڈ

کے سامنے والی دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔
''لیکن تم نے کچھ اور وعدے بھی کیے تھے بابر۔''
''جو، جو وعدے کیے ہیں سب پورے کروں گا جانم!''
''لیکن کچھ وعدے وقت کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں بابر..... وقت گزر جانے کے بعد وہ اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں پھر اگر وہ پورے کر بھی دیے جائیں تو بے معنی ہو جاتے ہیں۔'' وہ سنجیدہ تھی۔
''مثلاً کون سے وعدے؟'' بابر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اب دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔
''اب جانے دو، یہ بتاؤ تم نے مجھے تیار ہونے کے لیے کیوں کہا تھا، میں تیار ہوں کہاں جانا ہے؟'' عنبرین خواہ مخواہ اس وقت اس کا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔
''کہیں جانا ضروری ہے کیا؟ اپنے لیے تمہیں تیار ہونے کا نہیں کہہ سکتا۔ یہاں بیٹھ جاؤ میرے سامنے تاکہ تمہیں دیکھتا رہوں۔''
''لیکن تم کہیں باہر جانے کا کہہ رہے تھے۔''
''ہاں، ڈنر باہر کرنے کا خیال تھا لیکن تم نے لنچ میں اتنا کچھ کھلا دیا کہ فی الحال بھوک نہیں ہے۔ ذرا ٹھہر کر دس بجے تک نکلتے ہیں۔'' عنبرین نے سر ہلایا۔
''تم کچھ چپ چپ اور اداس لگ رہی ہو۔ سچ بتاؤ کیا میرے سرپرائز نے خوش نہیں کیا؟ تم تو یقیناً میرے آنے کی توقع نہیں کر رہی تھیں ناں؟''
''ہاں یہ تو ہے، میں تمہیں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔'' وہ مختصر بات کر کے پھر اپنے ہاتھوں کے ناخن دیکھنے لگی تھی۔ بابر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مسکرایا۔
''اِدھر آؤ ناں یار..... اتنی دور بیٹھ گئی ہو۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جس کا ہمیں انتظار تھا۔''
''اور چاہے وہ وقت آنے تک ہم گزر جائیں۔'' عنبرین کے لہجے میں تلخی تھی۔
''مرچیں کیوں چبا رہی ہو؟'' اس کی پیشانی پر بل پڑا۔
''میں اکیلے رہتے اور تمہارا انتظار کرتے، کرتے تھک گئی ہوں۔ اتنا عرصہ گزر گیا تم نے ایمل سے بات نہیں کی۔ کیوں بات نہیں کرتے تم اس سے..... مجھے اس کے ساتھ رہنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پہلے بھی میں نے تمہیں کہا ہے۔''
''لیکن ایمل کو اعتراض ہو سکتا ہے اور فی الحال میں اس کا اعتراض افورڈ نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کے لیے تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔''
''کیا میں ہمیشہ انتظار کرتی رہوں گی، کیا تم مجھے میرا مقام کبھی نہیں دو گے؟'' عنبرین کی آواز بھرا گئی تھی۔
''تمہارا مقام یہاں ہے ڈیئر میرے دل میں۔'' اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔
''لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم اب مجھے اپنے گھر میں بھی وہی مقام دو جو ایمل کا ہے۔ مجھے اپنی فیملی سے ملواؤ، اپنے والدین سے، اپنے بہن بھائیوں سے انہیں بتاؤ کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔''
''احمق عورت!'' بابر نے اندر ہی اندر دانت پیسے لیکن بظاہر لہجے میں نرمی بھر کر بولا۔ ''بس تھوڑا سا اور انتظار میری جان، کچھ وقت دو۔''
''اور کتنا وقت بابر؟'' عنبرین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''بس تھوڑا سا شاید چند ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال۔''
''پتا نہیں کیوں، میں ہر بار تمہارا اعتبار کر لیتی ہوں۔'' عنبرین نے بے بسی سے کہا۔
''اس لیے جانو کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور محبت اعتبار کا ہی دوسرا نام ہے۔ جہاں محب اور محبوب کے درمیان اعتبار کا رشتہ نہ ہو وہاں محبت نہیں ہو سکتی۔ محبت تو نام ہی ایک دوسرے کی وفا پر اعتبار کرنے کا ہے۔ اس لیے کبھی بے اعتبار مت ہونا عنبرین۔'' وہ کھڑا ہو گیا تھا اور اب کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے رک کر اس نے عنبرین کی طرف دیکھا۔
''مجھے اپنا ٹارگٹ اچیو کرنے میں کچھ وقت لگ گیا ہے لیکن اب تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بہت جلد میں تمہارا ہاتھ تھام کر سب کے سامنے لے جاؤں گا اور اعلان کروں گا کہ یہ عنبرین بابر، بابر نوید کے دل کی ملکہ اس کی سوئٹ ہارٹ۔''
''پتا نہیں وہ وقت کب آئے گا بابر میں تو اس وقت کا انتظار کرتے، کرتے تھک گئی ہوں۔'' عنبرین آنکھوں میں آنسو لے آئی تھی۔
''تمہیں پتا ہے، تمہارے آنسو میرے دل پر گرتے ہیں۔ تم اس طرح آنسو بہا کر میرا امتحان مت لیا کرو۔ ایسا نہ ہو میں سب کچھ بھول کر اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر یہاں تمہارے قدموں میں آ بیٹھوں۔'' اس نے انگلی سے اس کا گال سہلایا۔
''تمہارا مشن کیا ہے بابر؟'' عنبرین نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لیے۔ ''میں آج تک جان نہیں سکی تم اعتبار کی بات کرتے ہو لیکن آج تک تم نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ چلو ڈیمل کو تم نے میرے متعلق نہیں بتایا لیکن اپنے والدین کو تو بتا سکتے تھے۔'' عنبرین جو سوچ رہی تھی کہ آج بابر سے کچھ نہیں کہے گی زیادہ دیر تک دل کی بات دل میں نہ رکھ سکی۔
''تم نے مجھے کیا دیا بابر، اولاد کی نعمت تک سے تو محروم رکھا۔ کاش میری بیٹی میرے پاس ہوتی تو میں تم سے کچھ نہ مانگتی لیکن......''
''میں نے تمہیں کیا نہیں دیا عنبرین۔'' بابر کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ ''کیا نہیں تمہارے پاس اور اب کیا نہیں ہے۔ دنیا کی ہر نعمت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دی ہے۔ شادی کی ہے تم سے، تمہیں اپنا نام دیا ہے۔''
''ہاں سب کچھ دیا ہے لیکن مجھے ایک بچہ چاہیے تھا۔ وہ ہوتا میرے پاس تو میں اپنی دنیا میں خوش رہتی، بھلے تم مہینوں نہ آتے مجھے پروا نہیں ہوتی تمہاری۔''
''ارے، یہی تو ہم نہیں چاہتے تھے کہ بچے میں کھو کر ہمیں بھول جاؤ۔'' بابر نے لہجے کی ٹون بدلی تھی۔
''لیکن تم نے وعدہ کیا تھا تم مجھے ماں بننے سے محروم نہیں رکھو گے اور......''
''یار اللہ کی دین اور مرضی تھی میرا اس میں کیا قصور ہے کہ اللہ نے تمہیں اس نعمت سے محروم رکھا۔'' اب کے عنبرین بھی خاموش رہی...... جانتی تھی بابر سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔
''کتنے گھاٹے کا سودا کیا تھا اس نے، یہ دو بیڈ روم کا فلیٹ جو بابر نے اس کے نام کیا تھا۔ اس کے لیے اس نے اپنی زندگی گروی رکھ دی تھی۔'' اس نے دل گرفتگی سے سوچا۔ پتا نہیں کیوں پچھلے چند ماہ سے اسے احساسِ زیاں شدت سے ستانے لگا تھا لیکن قصور تو اس کا اپنا تھا بابر کو اس نے خود اپنے لیے چنا تھا۔ جس آفس میں اس نے جاب کی تھی وہاں بابر پہلے ہی جاب کر رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بابر اس سے شادی کر لے۔ وہ گریجویٹ تھی

اس نے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کے کچھ کورسز بھی کر رکھے تھے۔ اس فرم میں جاب اسے جن صاحب نے دلوائی تھی ان کے گھر اس کی ماں کام کرتی تھی اس کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا لیکن اس کے طور طریقے اور پہناوا ایسا تھا کہ اس کے طبقے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ شکل صورت کی تو وہ اچھی تھی ہی لیکن اسے مرد کو لبھانے کے بھی سارے گر آتے تھے۔ سو اسے بابر کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ شروع، شروع میں بابر نے بھی یہی سمجھا تھا کہ وہ شوقیہ جاب کر رہی ہے لیکن جب اسے لگا کہ بابر اس کا اسیر ہو چکا ہے تو وہ اسے اپنے گھر لے گئی اور اسے سب کچھ بتا دیا۔ باپ مر چکا تھا، بھائی کوئی تھا نہیں، ایک بڑی اور ایک چھوٹی بہن شادی شدہ زندگی گزار رہی تھیں اور وہ...... بابر نے اس کی صاف گوئی کو سراہا تھا۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم کہاں رہتی ہو، تمہارے معاشی حالات کیا ہیں اور تمہارا ماضی کیا تھا۔ ہمارے درمیان دوستی کا جو رشتہ تھا وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔“

لیکن عنبرین کو صرف دوستی کی خواہش نہ تھی اور نہ ہی وہ محبت کی قائل تھی۔ اس نے جس طبقے میں جنم لیا تھا وہاں محبت کی فرصت کسی کو نہ تھی وہاں ہر وقت ضروریات کا ایک انبار منہ پھاڑے کھڑا رہتا تھا صبح جاگنے سے لے کر رات سونے تک زندگی صرف انہی سوچوں کے گرد گھومتی تھی کہ پیٹ کا دوزخ کیسے بھرا جائے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں جیسی زندگی نہیں گزارے گی۔ اس لیے اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ اپنے میک اپ اور کپڑوں پر خرچ کرتی تھی۔ اسے اس کی پروا نہیں تھی کہ گھر میں کوئی بھوکا سویا ہے یا کھا کر اگر درمیان میں اماں اس کا رشتہ نہ طے کر دیتیں تو اس نے سوچ رکھا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہوا وہ یونیورسٹی میں داخلہ لے گی اور وہاں کسی نہ کسی لڑکے کو اپنی طرف متوجہ کرے گی جو ایسا لڑکا ہو جو دولت مند ہو لیکن پھر اس کی پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ اماں نے بی اے کے بعد اسے گھر بٹھا لیا۔ اپنی تینوں بہنوں میں صرف وہی تھی جس نے اتنی تعلیم حاصل کی تھی اور اب جب قسمت نے پھر اسے موقع دیا تھا کہ وہ اپنا معیار زندگی بدل سکے تو وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی بابر فلرٹ ہے، وہاں آفس میں کئی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی سو وہ بابر کی محبت میں مبتلا ہو کر اس کی طرف نہیں بڑھی تھی بلکہ اس کے پیش نظر مستقبل کی پلاننگ تھی۔ وہ بابر جیسے امیر شخص کے ساتھ شادی کر کے اپنی زندگی سہل بنانا چاہتی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ بابر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں...... سود و زیاں کا حساب کر رہی تھی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”اتنی جلدی! وقت آنے دو پھر سارے حساب کتاب کر لینا۔“ بابر کا لہجہ معنی خیز تھا وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ ”لگتا ہے آج موڈ کچھ خراب ہے۔“ بابر نے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے نثار ہوتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”نہیں تو۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔ بابر کی خفگی یا ناراضی وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اگر بابر اسے چھوڑ دیتا تو وہ جن آسائشوں کی عادی ہو چکی تھی ان کے بغیر اب وہ زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔

”سوری بابر اگر میری کوئی بات بری لگی ہو تو...... بس یونہی کبھی، کبھی یہ اکیلا پن اور تنہائی مجھے بیزار کر دیتی ہے بس یہی بات ہے۔“ اس نے ایک لگاوٹ بھری نظر بابر پر ڈالی۔ وہ بابر کو ناراض کر ہی نہیں سکتی تھی، کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ بابر کے ساتھ شادی کرنے کے لیے اس نے اس کی ہر غلط صحیح بات مانی تھی۔

”کتنے دنوں کے لیے آئے ہو؟“

”جب تک تم کہو نہیں جاؤں گا کہیں بھی۔“ بابر مسکرایا۔ ”بلکہ ایسا کیوں نہ کریں کہ ہفتے بھر کے لیے کہیں

چلتے ہیں۔ مری، بھوربن، مظفر آباد وغیرہ۔''

''کیا ایسا ممکن ہے بابر؟ تم مذاق تو نہیں کر رہے؟'' وہ یک دم خوش ہوگئی تھی۔

''ہرگز نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا۔'' اس نے یقین دلایا۔

''تو پھر کب جائیں گے؟''

''کل ہی چلتے ہیں۔'' بابر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''کل؟'' عنبرین نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تیاری بھی تو کرنی ہوگی ناں۔''

''ارے، کیا تیاری کرنی ہے، چار جوڑے کپڑے رکھ لینا بیگ میں تو نکل چلیں گے۔''

''پھر بھی وہاں تو ٹھنڈ ہوگی ناں کچھ گرم کپڑے وغیرہ نکالنے ہوں گے۔''

''اوکے، تو پھر کل تم تیاری کر لینا پرسوں چلے جائیں گے۔'' عنبرین کا چہرہ کھل اٹھا تھا یہ دوسری بار تھی جب بابر اسے باہر لے کر جا رہا تھا اور وہ نثار ہونے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے دس بجنے والے ہیں۔'' بابر کھڑا ہوگیا۔

''کہاں چلیں گے؟'' عنبرین نے پوچھا۔

''جہاں تم کہو، تمہاری پسندیدہ جگہ پر چلتے ہیں۔'' بابر نے جھک کر تکیے کے پاس پڑا اپنا موبائل اٹھایا جسے آن کرنے کے بعد اس نے سائلنٹ کر دیا تھا۔ ارتقاع کی بے شمار مس کالز تھیں۔ ارتقاع کی تو عادت تھی وہ جب بھی کہیں جاتا تین چار بار ضرور کال کرتی لیکن افنان کی بھی کئی کالز تھیں۔

''اتنی کالز؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''آخر کیا مصیبت پڑ گئی۔'' وہ جھلایا اور افنان کا آیا میسج کھولا جو

چند منٹ پہلے ہی آیا تھا۔
''پاپا آپ سے بات نہیں ہو پا رہی ہے۔ نانا ابو کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ آپ جب بھی میسج پڑھیں گھر آجائیں ہم کچھ دیر بعد ان کی ڈیڈ باڈی لے کر گھر جا رہے ہیں۔''
''اوہ۔'' اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا اور بیٹھ گیا۔ عنبرین پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھی جبکہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

انہیں آج دیر ہوگئی تھی ورنہ عام طور پر وہ رواحہ کے آنے سے پہلے ہی گھر آ چکے ہوتے تھے لیکن آج جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو رواحہ بے چینی سے لاؤنج میں ٹہل رہا تھا۔
''پاپا آپ نے اتنی دیر کر دی۔''
''بس یار کبھی کبھی ہو جاتی ہے دیر۔'' اس کے رخسار کو دو انگلیوں سے چھو کر وہ تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے۔
''اور آپ فون بھی نہیں اٹھا رہے تھے، اتنا پریشان ہو رہا تھا میں۔''
''سوری میری جان، آج جلدی میں صبح گھر پر ہی رہ گیا تھا چارجنگ کے لیے لگایا تھا۔''
''تو آپ کسی سے لے کر بھی فون کر سکتے تھے ناں!'' رواحہ کی عادت تھی ایسے چھوٹے، چھوٹے گلے شکوے کرنے کی اور وہ کر سکتا تھا۔
''میرا خیال تھا تمہارے آنے تک میں بھی گھر پہنچ جاؤں گا لیکن راستے میں ٹریفک میں پھنس گیا۔ مجھے کیا پتا تھا میرا بیٹا پریشان ہو جائے گا۔'' انہوں نے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔
''کیا کالج میں کوئی فنکشن تھا؟'' رواحہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں یار، وہ ہمارے ایک کولیگ ہیں بیگ صاحب ان کے والد اسپتال میں ایڈمٹ ہیں تو کالج آف ہونے کے بعد ہم کچھ کولیگز اسپتال چلے گئے تھے ان کی مزاج پرسی کے لیے۔'' انہوں نے بتایا تو رواحہ نے مطمئن ہوتے ہوئے پوچھا۔
''کھانا لگواؤں؟''
''تم نے کھا لیا؟'' وہ جھک کر جوتے اتارنے لگے۔
''نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے، آج کینٹین میں ایک دوست نے سموسے کھلا دیے تھے۔''
''یار یہ بازاری چیزیں مت کھایا کرو۔ خواہ مخواہ کہیں بیمار پڑ جاؤ تو۔'' ان کے لہجے میں تشویش تھی۔ وہ یونہی اس کے متعلق حساس تھے۔
''کچھ نہیں ہوتا بابا سب دوست کھا رہے تھے تو....'' وہ ہولے سے ہنسا اور ساتھ ہی خدا بخش کو آواز دی۔ ''چاچا۔''
''نہیں یار، مجھے بھی بھوک نہیں ہے اس وقت بس صرف چائے پیوں گا۔ دونوں باپ بیٹا رات کو اکٹھا کھائیں گے۔ عظام واپس آ گیا کیا؟'' انہوں نے سیدھے ہوتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں، آج آ جائے گا شاید۔''
''اس کی پڑھائی کا تو حرج ہو رہا ہوگا؟''
''نہیں بابا، کور کر لے گا وہ لیکن اپنے پاپا کے ساتھ اس طرح اتنے دنوں کے لیے وہ پہلی بار باہر گیا ہے۔''

سر ہلا کر وہ خدا بخش کی طرف دیکھنے لگے جو رواحہ کے بلاوے پر آیا تھا اور اب سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"چائے بنا دو خدا بخش اور کھانا ہم دونوں رات کو ہی کھائیں گے اب۔" خدا بخش نے سر ہلایا۔ "اور ہاں...... " انہیں پتا تھا کہ جب تک وہ نہ آجاتے اور کھانا نہ کھا لیتے وہ کھانا نہیں کھاتا تھا۔ "تم بھی کھانا کھا لینا کتنی دفعہ کہا ہے کہ ہمارا انتظار نہ کیا کرو، ہمیں دیر سویر ہو جاتی ہے اور تم خوامخواہ بھوکے بیٹھے رہتے ہو انتظار میں۔"

"صاحب گھر میں کوئی انتظار کرنے والا نہ ہو تو گھر لوٹنے کو جی نہیں چاہتا، ایک بار میں نے اپنے دادا سے سنا تھا، ہزار بار کہا شادی کر لیں صاحب کوئی انتظار کرنے والی ہوتی تو خدا بخش کا ہے کو بھوکا رہتا۔" اس نے ایک ناراض سی نظر ان پر ڈالی۔

"خدا بخش کے انتظار کی فکر نہ ہو تو آدھی، آدھی رات تک گھر نہ آئیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تو رواحہ کی نظر ان سے ملی تو وہ مسکرا دیے رواحہ بھی مسکرا اٹھا۔

"صحیح تو کہتا ہے خدا بخش...... اس کا خیال نہ ہو کہ وہ بھوکا بیٹھا ہوگا تو کبھی، کبھی تو جی ہی نہیں چاہتا گھر لوٹنے کو۔"

"ویسے آپ خدا بخش کی بات مان لیتے تو زیادہ بہتر نہیں تھا؟" رواحہ کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"اور اگر اس وقت میں خدا بخش کی بات مان لیتا تو سب سے زیادہ گلے تمہیں ہی ہوتے مجھ سے کہ میرے سر پر سوتیلی ماں مسلط کر دی۔"

"بھلے، وہ مجھ پر کتنے ہی ظلم کرتی مگر آپ تو اتنے تنہا نہ ہوتے۔" اس نے دلگرفتگی سے سوچا لیکن ہاتھ اٹھا کر شوخی سے بولا۔ "اب آپ مجھے خوامخواہ یتیم نہ کریں بابا۔ اصل میں تو اپنی بیوی کی محبت میں آپ نے شادی نہیں کی کہ اعتبارِ وفا قائم رہے اور قصوروار میں نہیں بابا مجھے یہ الزام منظور نہیں، میری طرف سے کھلی اجازت ہے ذرا بھی گلہ کر جاؤں تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

"رواحہ تم بھی ناں۔" وہ ہنس پڑے۔

"سچ بتائیں یہی بات ہے ناں؟ آپ ماما کی جگہ کسی کو نہیں دے سکے؟"

"ہاں یار۔" انہوں نے اعتراف کیا۔ "اس کی محبت کے نقش اتنے گہرے تھے کہ ان پر کوئی اور نقش نہیں بن سکے...... خیر۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم جا کر آرام کر لو تھکے ہوئے یونیورسٹی سے آئے ہو۔"

"او کے بابا پھر رات میں ملاقات ہوتی ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"رات بالکل نیند نہیں آئی تھی کچھ دیر سو جاؤں گا لیکن اگر جواد آئے تو مجھے جگا دیجیے گا، اسے کچھ کتابیں لینی تھیں مجھ سے۔"

"نیند کیوں نہیں آئی تھی؟" وہ پریشان سے ہو گئے۔

"بس ایسے ہی۔" اس نے نظریں چرائیں۔ اب وہ انہیں کیا بتاتا کہ رات بھر ارنی کے تصور نے اسے سونے ہی نہیں دیا۔ "بس نوٹس بناتے، بناتے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور پھر نیند ہی نہیں آئی۔"

"شام کو عظام کی طرف تو نہیں جانا؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں، کل یونیورسٹی میں ہی ملاقات ہو جائے گی اور شاید کل وہ میرے ساتھ ہی آجائے۔"

"اچھا ہے رونق ہو جائے گی۔" وہ خوش ہو گئے۔ انہیں ہمیشہ سے ہی بھرے پرے گھر اچھے لگتے تھے۔ کم از کم چار پانچ بہن بھائی تو ہوتے ناں، انہیں اپنے اکلوتے پن سے بہت گلے تھے۔ وہ اکثر بابا جان سے

کہتے تو وہ مسکرا دیتے۔

''ہمارا وقت تو گزر گیا یار، اب جب تم اپنی فیملی بناؤ گے، تو جھ سے کم پر کمپرومائز مت کرنا۔''

''ہاں، مجھ سے کہیں اور خود ذرا خیال نہ آیا کہ چلو مما کو تو اللہ نے بلا لیا دوسری مما ہی لے آئیں، چار بہن بھائی تو ہوتے ناں کبھی رونا پڑ جاتا تو دو چار ہاتھ آنسو پونچھنے والے تو ہوتے ایک دو کندھے سر رکھنے کو مل جاتے۔'' اور ان کی ایسی باتوں پر بابا جان مسکرا کر رہ جاتے۔

''یار مجھے پتا ہوتا کہ تمہیں اتنی زیادہ کمی محسوس ہوگی تو لے آتا تمہاری نئی مما لیکن اس دل کا کیا کرتا جس میں تمہاری مما کے بعد کسی اور کے لیے گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' تب وہ حیران ہوتے تھے وہ تو سمجھتے تھے کہ محبت کے لیے مرد کا دل بڑا فراخ ہوتا ہے۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری محبت کی گنجائش نکل ہی آتی ہے لیکن بابا جان کے دل پر چند سالہ رفاقت کے نقش اتنے گہرے تھے کہ پھر کوئی نقش بن ہی نہ سکا لیکن اب خود چندا کے بعد وہ کسی کے لیے اپنے دل کا دروازہ نہیں کھول سکے تھے، اب وہ سمجھ سکتے تھے، من پسند شریکِ حیات کی جگہ کسی اور کو دینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ بابا جان کی لو میرج نہ تھی لیکن مما کے ساتھ ان کی محبت مثالی تھی۔ تو دان کے لیے کتنا مشکل تھا چندا کی جگہ کسی اور کو دینا۔ جب وہ تین سالہ رواحہ کے ساتھ کراچی آئے تھے تو کتنے ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا انہیں۔ رواحہ نے چند ماہ تنگ بھی تو بہت کیا تھا۔ ماما، ماما کر کے اتنا چلاّتا کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ سب نے ہی دوسری شادی کے مشورے دیے تھے۔ کئی ایک نے تو رشتے بھی بتائے تھے۔ بیگ صاحب نے تو اپنی بیوہ بہن کے لیے کہلوایا بھی تھا لیکن دل میں تو کہیں گنجائش نہ تھی گھر میں بھی نہ بن سکی۔ خدا بخش نے رواحہ کو سنبھال لیا تھا۔

رواحہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا انہوں نے ریلیکس ہونے کے لیے ٹانگیں پھیلائیں۔ بیگ صاحب کے والد کی طبیعت کافی خراب تھی اور بیگ صاحب از حد فکر مند اور پریشان تھے۔ یہ والدین بھی کیا چیز ہوتے ہیں۔ عمر کے ہر حصے میں ان کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ بھلے خود بوڑھے ہو جاؤ تب بھی جی چاہتا ہے کہ ان کی گود میں سر رکھ کر اپنے غم رو کر ہلکے ہو جائیں۔ بابا جان ہوتے تو وہ بھی کبھار ان کی گود میں سر رکھ کر تھوڑا سا رو کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔ اتنا وقت گزار آئے تھے صرف رواحہ کے سہارے لیکن پھر بھی، کبھی کبھی دل بے چین ہو جاتا، مچلنے لگتا۔ کوئی چھم سے تصور میں آ جاتا۔ ان کے تصور نے اسے کئی شکلیں اور کتنے روپ دیے تھے۔ وہ شکلیں بدل بدل کر آنکھوں کے سامنے آتے رہتے، ہر روپ دلفریب اور دل موہ لینے والا ہوتا۔ وہ بے چین ہو جاتا، دل پر بوجھ سا آ پڑتا۔ ایسا بوجھ کہ لگتا دل پھٹ جائے گا۔ وقت کی دھول میں سب کچھ چھپ گیا تھا، گم ہو گیا تھا پھر بھی دل ان چہروں کو کھوجنے سے باز نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی تو انہیں لگتا جیسے وہ کسی لق و دق صحرا میں تنہا کھڑے ہوں، دور، دور تک ریت اڑتی ہو اور حلق میں کانٹے اگتے ہوں۔ آس پاس دور و نزدیک کوئی اپنا نہ ہو۔ ایسے میں رواحہ کا خیال بھی ذہن سے نکل جاتا کاش بابا جان ہی ساتھ نہ چھوڑتے۔ ان کے تسلی بھرے لفظ، ان کا شفیق لمس اس بوجھ کو کم کر دیتا۔

ان دنوں وہ کیسے ہواؤں میں اڑتے تھے۔ چندا کی محبت کیا ملی تھی زندگی گنگنانے لگی۔ ان کے اندر جیسے ہر وقت خوشی کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتیں لیکن بابا جان کبھی، کبھی انہیں بے حد پریشان لگتے کسی گہری سوچ میں ڈوبے۔

''بابا جان آج کل آپ کیا سوچتے رہتے ہیں؟'' ایک روز انہیں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ پوچھ بیٹھے تھے۔

''کچھ نہیں تمہاری خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کرتا ہوں اور اس خوشی کو نظر لگ جانے سے ڈرتا ہوں۔ پتا

نہیں کیوں خوف سا آتا ہے کہ کہیں ..... ''اس روز وہ بہت سنجیدہ تھے۔

''اوں ہوں۔'' انہوں نے بابا جان کے گرد اپنا بازو حمائل کیا تھا ''میں جانتا ہوں آپ کو کیا خوف ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ چندا کے ڈیڈی اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے آج تک اس کی کوئی بات نہیں ٹالی اور خود چندا کو اسٹیٹس وغیرہ کی کوئی پروا نہیں ہے، وہ میرے ساتھ کسی جھونپڑے میں بھی رہ سکتی ہے۔'' وہ بات کر کے جھینپ سے گئے اور بابا جان مسکرا دیے تھے۔

''وہ کہتی ہے کہ اس کے ڈیڈی اس کی زندگی کا فیصلہ اس کی مرضی سے کریں گے اور اس کی مرضی .....'' بابا جان کو تو انہوں نے مطمئن کر دیا تھا لیکن جب ایک روز چندا نے کہا کہ وہ اپنے بابا جان کو ان کے گھر بھیجیں تو وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ کیا چندا کے والدین کو وہ قبول ہوں گے وہ جدی پشتی امیر لوگ تھے اور وہ .....

''نہیں ابھی نہیں۔'' ابھی انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔ ان کے پاس تو اپنا گھر بھی نہیں۔ کچھ عرصہ قبل بابا جان نے ڈیفنس میں ایک کنال کا پلاٹ لیا تھا۔ ان کا ارادہ ریٹائرمنٹ کے بعد گھر تعمیر کرنے کا تھا۔ چندا کے والدین کو پہلا اعتراض کرایے کے گھر پر ہی ہونا تھا اور اگر وہ پلاٹ فروخت کر کے کسی اور علاقے میں بنا بنایا گھر لے لیتے تب بھی فی الحال خالی ہاتھ وہ کیسے چندا کا ہاتھ مانگنے چلے جاتے۔

''چاچا..... چاچا خدا بخش۔'' رواحہ نے اپنے کمرے سے نکل کر خدا بخش کو آواز دی تو وہ چونک کر لاؤنج میں آتے رواحہ کو دیکھنے لگے۔

''میرے لیے بھی چائے بنا دیجیے گا۔''

''تم سوئے نہیں؟''

''نیند نہیں آرہی تھی بابا۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور ریموٹ اٹھا کر چینل سرچ کرنے لگا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' وہ ایسے ہی حساس تھے اس کے لیے۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا تب سے اسے زکام بھی ہوتا تو وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتے تھے۔

''ٹھیک ہوں بابا، بس نیند نہیں آرہی تھی سوچا اب رات کو ہی ایک بار سوؤں گا۔'' وہ ٹی وی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب خدا بخش ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آیا۔ ٹرالی پر شامی کباب، چکن پکوڑا اور چاکلیٹ کیک تھا۔ خدا بخش جانتا تھا کہ دونوں نے کھانا نہیں کھایا اس لیے وہ خود ہی چائے کے ساتھ یہ لوازمات لے آیا تھا۔

''آپ کا بھی جواب نہیں چاچا۔'' رواحہ نے ان کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر شامی کباب اس میں رکھا۔

''سوچتا ہوں اگر آپ نہ ہوتے ہمارا اس طرح خیال کون رکھتا۔''

''اور کبھی یہ بھی سوچا کہ میں نہیں ہوں گا تو کون خیال رکھے گا؟'' خدا بخش نے دوسری پلیٹ انہیں پکڑائی۔

''آپ نے کہاں جانا ہے، آپ ہمیشہ ہوں گے ہمارے ساتھ۔'' رواحہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''ہمیشہ کون ساتھ دیتا ہے، ہم کب تک جیتے رہیں گے ایک دن تو جانا ہی ہے۔ میں تو کہتا ہوں صاحب .....'' وہ ان کی طرف مڑا ''رواحہ صاحب کی شادی کر دیں جو ہمارے بعد ان کا خیال رکھے گی۔''

''خیال تو اچھا ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''بس کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر رشتہ طے کر دیں۔ پڑھائی ختم کرتے ہی جیسے ہی نوکری ملے تو بس شادی کر دیں۔'' خدا بخش کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ویسے یہ ساتھ والے اٹھارہ نمبر والے شیخ صاحب ہیں ناں ان کی بیٹیاں بہت پیاری ہیں۔''

"یہ کیا چاچا آپ آس پڑوس کی لڑکیوں کو تاڑتے رہتے ہیں؟" رواحہ کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"لو آتے جاتے خود ہی دکھ جاتی ہیں۔ بڑی شریف لڑکیاں ہیں نظر جھکا کر چلتی ہیں۔ اچھی طرح چادریں لپیٹ کر۔ آج کل کی لڑکیوں کی طرح نہیں کہ دیدہ ہوائی سی۔"

"اچھا مجھے تو آج تک یہ بھی علم نہیں ہوسکا کہ شیخ صاحب کی بچیاں بھی ہیں۔" بابا نے حیرت سے کہا۔

"آپ کو کیسے پتا چلتا صاحب، صبح منہ اندھیرے اٹھ کر کالج چلے جاتے ہیں آتے ہیں تو پھر یا تو کمرے میں گھس کر بیٹھ جاتے ہیں یا پھر ٹی وی کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔" خدا بخش نے ترخ کر کہا۔ "تین بیٹیاں ہیں ان کی ایک تو چھوٹی ہے دو بڑی ہیں۔ کسی کالج، یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔"

"اچھا۔" وہ دلچسپی سے خدا بخش کو دیکھنے لگے۔

"بس آپ اُن کسی طرح بات چلائیں۔" وہ تو جیسے تیار بیٹھا تھا۔ رواحہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آپ کے وہ دوست نہیں ہیں راجا صاحب وہی بیس نمبر والے۔" خدا بخش سب کو ان کے گھروں کے نمبر سے یاد رکھتا تھا۔ "ان کی جو بیگم ہیں وہ کافی آتی جاتی ہیں اٹھارہ نمبر میں، ان سے بات کریں۔"

"کیوں رواحہ؟" ان کا دل بھی کسی ہنگامے کے لیے مچل اٹھا کچھ تو تبدیلی ہو زندگی میں۔

"ارے نہیں بابا، ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں۔"

"تو پڑھتے رہیے، پڑھنے سے کس نے منع کیا ہے۔" خدا بخش ان کے توجہ دینے پر خوش ہو گیا تھا۔ "ابھی تو صرف رشتہ طے کریں گے۔"

"نہیں چاچا، مجھے کسی شیخ صاحب کی لڑکیوں وڑکیوں سے شادی نہیں کرنی!" وہ جھنجلایا۔

"لڑکیوں سے نہیں صاحب، شادی تو کسی ایک ہی لڑکی سے ہوگی۔" خدا بخش کو بھی شوخی سوجھی تھی۔

"شیخ صاحب کی نہ سہی کوئی اور دیکھ لیں گے۔ راجا صاحب کی بیگم بہت سوشل ہیں۔"

"اُفوہ خدا بخش چاچا، یہ آج آپ میری شادی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔"

"شادی کہاں، صاحب ابھی تو صرف لڑکی دیکھیں گے۔" خدا بخش کو بھی اس گفتگو میں مزہ آرہا تھا۔

"ہاں تو لڑکی دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، میں نے خود دیکھ لی ہے بابا۔" وہ تمبورا اٹھاتے ہوئے روانی میں بولا۔

"ہیں..... خود ڈھونڈ لی لڑکی؟" خدا بخش کا منہ تھوڑا سا کھلا اور پھر بند ہو گیا۔

"تو اور کیا، شادی میں نے کرنی ہے تو لڑکی بھی خود ہی ڈھونڈنی ہے۔"

"لو بھئی بیٹا باپ پر نہیں جائے گا تو اور کس پر جائے گا۔" خدا بخش نے ہلکی سی تالی بجائی۔ "آپ نے تو ہمارا کام آسان کر دیا۔"

"تو اسی خوشی میں اب چائے لے آئیں۔"

"او ہاں۔" خدا بخش نے سر پر ہاتھ مارا۔ "چائے دم دے کر آیا تھا۔ دودھ گرم کرنے کے لیے مائیکرو میں رکھا تھا، ابھی لایا۔" اس نے دونوں کی طرف دیکھا۔ "اور صاحب آپ نے تو کچھ بھی نہیں لیا۔" اس نے جاتے، جاتے ان کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں شامی کباب اور تمبورے کا ایک پیس رکھا۔ رواحہ شوخ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ خدا بخش کے طفیل اتنا تو وہ جانتا تھا کہ بابا کی لو میرج تھی لیکن اس کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ہر موضوع پر بات کرنے والے بابا نے اس موضوع پر کبھی بات ہی نہیں کی تھی۔

''بابا'' اسی انداز میں انہیں تکتے ہوئے اس نے شوخی سے پوچھا۔ ''آپ نے ماما کو کیسے ڈھونڈا تھا؟''

''یار وہ میری کلاس فیلو تھی لیکن تم ذرا کچھ تفصیل بتاؤ گے ہماری بہو کے متعلق۔ بہت اشتیاق ہو رہا ہے جاننے کا۔ ویسے اچھے دوست ہو اپنے بابا کے، لڑکی ڈھونڈ بھی لی، فائنل بھی کر لی اور ہم سے ذکر تک نہیں کیا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے بابا۔'' اب بھلا وہ انہیں کیا بتاتا۔ ابھی تو بات صرف اس کے دل میں ہی تھی اس نے ارتقاع کو دیکھا اور دل اس کی دائمی رفاقت کی چاہ کرنے لگا۔

''کچھ تو بتاؤ یار۔'' وہ بضد ہوئے، انہیں گمان تو تھا کہ کوئی ہے جسے ان کے رواحہ نے پسند کر لیا ہے۔

''نہیں، پہلے آپ بتائیں کیونکہ پہلے میں نے پوچھا ہے۔''

''اور کیا بتاؤں، بتایا تو ہے ہم کلاس فیلو تھے۔''

''کیا آسانی سے شادی ہو گئی تھی یا پھر ظالم سماج نے کوئی ٹانگ شانگ اڑائی تھی۔'' وہ مارے اشتیاق کے سارے کا سارا اُن کی طرف مڑ گیا۔

''آسانی سے تو نہیں لیکن کچھ خاص مشکل بھی نہیں ہوئی تھی۔''

''آپ بہت لکی ہیں بابا۔'' رواحہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو ایک تکلیف دہ احساس ان کے اندر دور تک پھیلتا چلا گیا اور ایک افسردہ سی مسکراہٹ ہونٹوں تک آ کر دم توڑ گئی۔ اگر وہ لکی ہوتے تو چندا کبھی نہ بچھڑتی عمر بھر ان کے ساتھ رہتی لیکن......

''میرا مطلب ہے محبت کے معاملے میں...... جسے چاہا اسے پالیا۔'' رواحہ نے خود ہی وضاحت کی۔ اس کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی کہ اگر بابا لکی ہوتے تو ماما آج زندہ ہوتیں۔

''تم لکی کسے کہتے ہو بیٹا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''یہی کہ آپ کسی سے محبت کرو تو وہ بھی آپ سے اتنی ہی شدت سے محبت کرے جتنی شدت سے آپ کرتے ہو اور پھر وہ محبت آپ کی رفیق بھی بن جائے تو آپ لکی ہوئے ناں۔''

''صرف اتنا ہی کافی نہیں ہوتا میری جان بلکہ دو محبت کرنے والوں کے درمیان اعتبار بھی ہو، ایک دوسرے پر اندھا اعتماد، اسے آپ کی اور آپ کو اس کی وفا پر اعتبار ہو۔ دنیا چاہے کچھ بھی کہے آپ کو لگے کہ آپ کا محبوب غلط نہیں، صحیح ہے۔ آپ کبھی اس پر شک نہ کریں تو پھر واقعی آپ لکی ہیں۔''

''تو کیا آپ کو اپنے لکی ہونے پر شک ہے بابا؟'' یہ رواحہ تھا جس کے دل میں جو آتا کہہ دیتا۔ ''ویسے آپ پر شک کرنا بنتا بھی تھا۔ اتنی زبردست پرسنالٹی ہے آپ کی اور اس وقت تو غضب ڈھاتے ہوں گے۔ لڑکیاں تو آپ کے آگے پیچھے پھرتی ہوں گی اور آپ...... کیا آپ کو ان پر اعتبار تھا؟'' انہیں لگا جیسے کسی نے تیز دھار نشتر ان کے دل میں اتار دیا ہو۔

''مجھے اس کی محبت پر خود سے زیادہ اعتبار تھا۔'' بے حد آہستگی سے کہہ کر وہ خدا بخش کی طرف دیکھنے لگے جو چائے لے کر آیا تھا۔ چائے کا کپ لے کر انہوں نے ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ زخموں کے ٹانکے ادھڑنے لگے تھے اور وہ رواحہ سے مزید اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے تھے سو وہ خدا بخش سے پوچھنے لگے۔

''تم نے کھانا کھا لیا خدا بخش؟'' وہ جانتے تھے رواحہ کا اگلا سوال کیا ہوگا اور وہ اس کے اگلے سوال سے بچنا چاہتے تھے۔

''بس کھانے ہی لگا ہوں صاحب۔''

''ہمارے انتظار میں مت بھوکے رہا کرو خدا بخش، مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔''

''اور مجھے بھی شرمندگی ہوتی ہے صاحب، گھر کے، مالک تو باہر بھوکے پھر رہے ہوں اور ملازم دستر خوان سجا کر بیٹھے ہوں۔''

''خدا بخش کتنی بار کہوں تم ملازم نہیں ہو۔'' وہ جان بوجھ کر بات کو طول دے رہے تھے کہ رواحہ کا ذہن کہیں اور لگ جائے اور ایسا ہی ہوا۔ انہیں خدا بخش کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھ کر رواحہ پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''اچھا، یار آج پکایا کیا تھا؟'' انہوں نے کن انکھیوں سے رواحہ کی طرف دیکھا۔

''اچار گوشت تھا صاحب۔''

''اچھا رات کو تھوڑے سے چاول بھی ابال لینا۔'' وہ چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے، پکڑے کھڑے ہو گئے۔ ''مجھے، کچھ تھکن ہو رہی ہے آرام کروں گا۔'' بغیر رواحہ کو مخاطب کیے انہوں نے کہا اور تیزی سے لاؤنج سے نکل گئے۔ رواحہ نے ٹی وی کی اسکرین سے نظریں ہٹا کر انہیں جاتے دیکھا۔

''یہ بابا بھی نا، جہاں ماما کا ذکر آیا اور منظر سے غائب۔ پتا نہیں کیوں وہ ماما کے متعلق بات کرتے ہوئے ہمیشہ ہی کتراتے ہیں۔'' اس نے ایک بار خدا بخش سے پوچھا تھا۔

''بابا اپنے بابا جان، اپنے دوستوں سب کے متعلق اتنی باتیں کرتے ہیں لیکن ماما کے متعلق کوئی بات ہی نہیں کرتے۔''

''کیا بات کریں بیٹا؟'' خدا بخش بھی اداس ہو گیا تھا۔ ''صرف ڈیڑھ سال کی رفاقت اور پھر دائمی جدائی وقت ہی کتنا گزارا تھا دونوں نے ساتھ۔''

''پھر بھی، شادی سے پہلے کی، جب وہ ماما سے ملے تھے تب کی باتیں.....''

''زخموں سے کھرنڈ چھیلنے سے فائدہ، نئے سرے سے تکلیف نئے سرے سے غم تازہ۔ تمہاری ماما کے بعد جو حال ہوا تمہارے بابا کا اسے صرف بابا جان اور میں ہی جانتے ہیں۔''

اور صرف اس خیال سے کہ بابا، ماما کے ذکر پر دکھی نہ ہوں وہ بہت کم ماما کے متعلق بات کرتا تھا لیکن اس کا دل تو چاہتا تھا کہ کبھی اپنے ننھیال جائے۔ نانا، نانی اگر ہیں تو ان سے ملے خیر...... چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر وہ پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن ذہن بار، بار ارتفاع کی طرف چلا جاتا تھا۔ پتا نہیں کیا تھا اس لڑکی میں کہ وہ اس کا خیال ذہن سے نکال ہی نہیں پاتا تھا حالانکہ کئی بار اسے گمان گزرا تھا کہ وہ ظفری میں انٹرسٹڈ ہے۔ اکثر فائنل ائیر کا ظفری ان کے گروپ کے گرد منڈلاتا نظر آتا تھا۔

''یہ ون سائڈڈ محبت بھی نا، نہ جانے کتنا خوار کرے گی۔'' سہیلیوں کے ہجوم میں کھڑی ہنستی ہوئی ارتفاع پہلی ہی نظر میں اسے بھا گئی تھی اس روز یونیورسٹی میں اس کا پہلا دن تھا۔

''یہ ارتفاع ہے..... ارتفاع بابر۔'' جواد نے اس کا تعارف کروایا تھا حالانکہ اس سے پہلے کلاس میں رسمی تعارف ہو چکا تھا وہ اسے اچھی لگی تھی۔ ''اور یہ رواحہ ہے میرا دوست اور یہ بھی ہماری طرح نیو ایڈمیشن ہے۔'' جواد کو یونیورسٹی آتے چار دن ہو گئے تھے جبکہ وہ اس کا پہلا دن تھا کیونکہ اسے ٹمپریچر تھا۔ ارتفاع اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' رسمی سا جملہ بول کر وہ نائلہ کی طرف متوجہ ہو گئی جو اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی تھی اور سامنے سے آنے والی کسی لڑکی کی طرف اشارہ کر رہی تھی پھر سب لڑکیاں ہی دوسری طرف چلی گئیں اور پھر جیسے اس کی نظریں ہر روز ہی اسے کھوجنے لگی تھیں۔ کلاس میں، لائبریری میں، سہیلیوں کے ساتھ وہ ہمیشہ

اسے ہنستی، کھلکھلاتی نظر آتی تھی۔ وہ ایک خوش باش لڑکی تھی جسے دیکھ کر زندگی اور تازگی کا احساس ہوتا۔ رسمی بات چیت سے علاوہ دونوں کے درمیان کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ چھ سات مہینے تک تو وہ زیادہ تر عالیہ کے ساتھ ہی نظر آتی رہی یا کبھی کبھی اپنے گروپ کی چند لڑکیوں کے ساتھ لیکن پچھلے دو تین ماہ سے فائنل ایئر کا ظفری اس کے آس پاس نظر آتا رہتا کبھی کبھار وہ بات چیت کرتے بھی نظر آجاتے لیکن عالیہ ہمیشہ ساتھ ہوتی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے اس سے اپنا حالِ دل کہے، کیسے بتائے کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے کہیں وہ اس کی بے عزتی نہ کردے۔ جواد اور عظام اس کے دل کی کیفیات سے آگاہ تھے۔ وہ تو بچپن سے ہی ایسا تھا بہت کم دل کی بات دل میں رکھتا تھا اور اب تو وہ ایک ہفتے سے یونیورسٹی ہی نہیں آرہی تھی جبھی اسے عالیہ سے پتا چلا کہ وہ لاہور گئی ہوئی ہے اور اس کے نانا ابو کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔

”پتا نہیں کبھی میں اس سے اپنے دل کی بات کہہ بھی سکوں گا یا نہیں۔“ ایک گہری سانس لے کر اس نے ٹی وی آف کیا اور وہاں ہی صوفے کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں موندلیں۔



وہ بازو سر کے نیچے رکھے بیڈ پر لیٹا سامنے کارنس پر رکھی ہوئی فرح کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ عظام کے ساتھ پورا ایک ہفتہ مری میں بہت خوب صورت وقت گزار کر وہ آج ہی واپس آیا تھا۔ ان آٹھ دنوں میں اسے احساس ہوا تھا کہ عظام اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ گزرے سالوں میں ایسے بہت سارے دن وہ عظام کے ساتھ گزار سکتا تھا لیکن اس نے یہ دن کھو دیے تھے۔ اس نے فرحی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس زندگی کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دے گا۔ کبھی مڑ کر نہیں دیکھے گا ان چودہ سالوں کو وہ ایسے بھلا دیں گے جیسے وہ چودہ سال کبھی ان کی زندگی میں آئے ہی نہیں تھے لیکن پھر وہ کیوں فرحی کے بعد اس زندگی میں واپس پلٹ آیا تھا، کیوں وہ اتنا دل برداشتہ ہوگیا تھا، کیوں اس نے اس زندگی کو پھر سے قبول کرلیا تھا جسے اس نے بھی دل سے پسند نہیں کیا تھا اور کبھی عظام کی خاطر بھی واپس پلٹنے کا نہیں سوچا۔ عظام کے ساتھ مال پر، نتھیا گلی اور ڈونگا گلی میں گھومتے، پہاڑوں پر اترتے چڑھتے، لفٹ چیئر میں بیٹھتے اسے پچھتاوے کے اس گہرے احساس نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ عظام کے چہرے پر دمکتی خوشی، ہونٹوں پر کھلتی مسکراہٹ دیکھ کر یہ پچھتاوا جیسے اور بڑھ جاتا تھا وہ اسے یہ خوشی دے سکتا تھا، وہ اس کے ساتھ ایک نارمل زندگی گزار سکتا تھا۔ فرحی کی روح یقیناً اس کے اس عمل سے خوش ہوتی کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ وہ ایسی زندگی نہ گزارے۔ چودہ سال وہ خاموش رہی تھی اس نے اس زندگی کو اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کرلیا تھا لیکن جب اسے ماں بننے کی نوید ملی تھی تو وہ بے چین ہوگئی تھی، تڑپ اٹھی تھی۔

”ثمر ہمارے بچے جب بڑے ہوں گے اور انہیں پتا چلے گا کہ ان کا باپ کس کام میں ملوث ہے تو ہمارا وجود اُن کے لیے گالی بن جائے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اس احساس کے ساتھ بڑے ہوں کہ ان کا باپ ایک غنڈا ہے۔ ایک اسمگلر کا کارندہ ہے۔ نہیں ثمر میں اپنی غلطی کی سزا اپنے بچوں کو نہیں دوں گی۔“ یہ اس دن کی بات تھی جب ڈاکٹر نے اسے جڑواں بچوں کی خوش خبری دی تھی۔

”سارا قصور تو میرا ہے ناں ثمر، میں تمہاری بھی قصور وار ہوں۔ اگر میں تمہاری زندگی میں نہ آتی تو تم صوفی نصیر احمد بزاز کے بیٹے سے حیاتی دادا نہ بنتے۔ کاش وقت پلٹ سکتا۔ کاش ممی جب مجھے سمجھا رہی تھیں تو میں ان کی بات سمجھ لیتی...... رک جاتی۔ اس رات میں گھر سے باہر قدم نہ رکھتی۔“

”خود کو الزام مت دو فرحی، قصور وار تو ہم دونوں ہی ہیں۔ میں ہی تمہیں روک دیتا، حوصلہ افزائی نہ کرتا۔

جمعے کے دن کی اہمیت

حضرت سیدتنا عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے مرنے سے ایک سال پہلے ایک فرشتہ اس کے لیے مقرر فرما دیتا ہے جو اس کو راہِ راست پر لگاتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ خیر پر مرجاتا ہے اور لوگ پھر کہتے کہ فلاں شخص اچھے حال میں مرا ہے۔ ایسا شخص بغیر کسی تکلیف کے اپنے رب سے جاملتا ہے اور اللہ اپنے ایسے بندے سے ملنا چاہتا ہے جبکہ اللہ اگر کسی کو برائی میں مبتلا کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو مرنے سے ایک سال قبل اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے جو اسے مسلسل بہکاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے بدترین وقت میں مرجاتا ہے۔ اس کے پاس جب موت آتی ہے تو اس کی جان اٹکنے لگتی ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ جو جمعہ کے دن ناخن ترشوائے اللہ تعالیٰ اس کو دوسرے جمعے تک بلاؤں سے محفوظ رکھے گا اور تین دن زائد یعنی دس دن تک بلاؤں سے امن میں رہے گا۔ اسی طرح ایک اور حدیث ہے کہ جو لوگ ہفتے کے دن ناخن تراشتے ہیں ان سے بیماری نکل جاتی ہے اور شفا داخل ہوتی

یہ جاننے کے باوجود کہ میرا اور تمہارا ساتھ ناممکن ہے۔ ہم دو مختلف حدوں پر کھڑے ہیں۔ میں نے کیوں تمہاری محبت کی پزیرائی کی۔" وہ بھی جیسے پچھتاوے میں گھر گیا تھا۔

"نہیں ثمر، تم نے تو مجھے سمجھایا تھا۔ تم تو سیدھے راستے سے ممی، ڈیڈی کی مرضی سے مجھے اپنانا چاہتے تھے لیکن میں......" فرحی نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے تھے۔

"جذبات، آدمی کو اندھا کر دیتے ہیں ثمر۔ میں بھی تب بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ مجھے لگتا تھا میرے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ تم نہ ملے تو میں تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گی۔"

"جو گزر گیا اسے بھول جاؤ فرحی، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اپنے بچوں کو اس دنیا کی ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے اور ہمیں دور چلے جائیں گے۔" گگ با کو اس نے ان چودہ سالوں میں بہت فائدے پہنچائے تھے اور جب چودہ سالوں بعد اس نے گگ با سے آزادی مانگی تو گگ با خاموش ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے تم اپنی مرضی سے زندگی گزارو۔ جو کاروبار کرنا چاہو کرو، میں تمہاری مدد کروں گا۔" لیکن پھر کیا ہوا تھا وہ اپنا وعدہ نہیں نبھا سکا تھا۔ فرحی کے بعد وہ پھر گگ با کے پاس لوٹ آیا تھا۔ پہلے تو تقدیر اسے گگ با کے پاس لائی تھی اور اب وہ خود پلٹ کر آیا تھا اور اس کے قدموں میں بیٹھا رو رہا تھا۔

"گگ با میں لوٹ آیا ہوں۔ ایک بار میں نے پوری نیک نیتی کے ساتھ فرحی کو اس کے گھر پہنچانا چاہا تھا لیکن راستے کھوٹے ہو گئے اور اب ایک بار میں نے پھر اپنی الگ دنیا بسانی چاہی تو تقدیر نے پھر مجھے آپ کے قدموں میں لا ڈالا ہے۔ پہلے میں نے جبراً یہ زندگی قبول کی تھی اب اپنی خوشی سے قبول کر رہا ہوں۔ میرے لیے زندگی بے معنی ہو گئی ہے گگ با، میرے پاس اب جینے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ یہ زندگی ایک بار آپ نے بچائی تھی، یہ آپ کی ہے، اسے پھر آپ کو لوٹا رہا ہوں جیسا چاہیں اس زندگی کے ساتھ سلوک کریں۔ اس رات آپ نے ہمیں پناہ دی تھی اور ہمارا سہارا بن گئے تھے۔" وہ اسی رات کی کیفیات میں جا پہنچا تھا۔

"اور وہ رات...... اور اس رات کی وہ صبح......!" اس نے جھرجھری سی لی اور تصویر سے نظریں ہٹا لیں۔

اس صبح فرحی جوس کا گلاس ہاتھوں میں لیے نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی پھر یکا یک وہ گلاس ٹیبل پر رکھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ پہلے آہستہ، آہستہ پھر بلند آواز میں۔

"فرحی...... فرحی پلیز مت روؤ۔ چلو ہم چلتے ہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی بہت دیر نہیں

ہے اتوار کے دن یہی عمل کرنے سے فاقے نکل جاتے ہیں اور پیر کے دن تراشنے سے صحت ملتی ہے۔ یہی عمل اگر منگل کے دن کیا جائے تو شفا نصیب ہوگی جبکہ بدھ کے دن ناخن تراشنے والوں کو خوف اور وسوسے سے دور رکھا جائے گا۔ جمعرات کے دن جزام جیسا مرض چلا جائے گا اور نگاہ تیز ہوگی اور جمعے کے دن گناہ ختم ہوں گے اور رحمت آئے گی۔

الغرض سنتوں پر عمل کرنے میں برکتیں ہی برکتیں ہیں۔ جمعتہ المبارک جو شخص خاص جمعے کے لیے اہتمام کرتا ہے ناخن، بال، مونچھیں تراشنے اور غسل کرنے کے بعد نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد کا رخ کرتا ہے تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ایک ہزار فرشتے مقرر فرما دیتا ہے جو اس کے حق میں دعائے مغفرت فرماتے ہیں جبکہ اس عمل کے برخلاف چلنے والوں کے لیے نقصان ہی نقصان ہے۔ ایک اور جگہ سرکار مدینہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جمعہ کی باقاعدہ تیاری نیت کے ساتھ کرنے والے شخص کے ایک ہفتے کے گناہ نماز جمعہ پڑھنے کے ساتھ ہی معاف کر دیے جاتے ہیں۔

از: ریحانہ حسن، کراچی

ہوئی کیا خبر ابھی کوئی تمہارے گھر میں جاگا بھی نہ ہو۔'' وہ جیسے بے چین سا ہو کر خود کو تسلیاں دے رہا تھا پھر اس کی نگاہ کلاک پر پڑی تھی ایک لمحے کو دل دھک سے رہ گیا تھا پھر بھی وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور اس نے فرحی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''چلو اٹھو۔'' لیکن فرحی تو بلک بلک کر رو رہی تھی۔ تب ہی کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اور پھر وہ فرحی سے مخاطب ہوا تھا۔ ''بیٹا، اٹھو چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ جلیل خان نے کبھی غلط بات نہیں کی۔ میں نے ابھی تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں لے کر جاؤں گا۔'' فرحی فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بھی ساتھ جانا چاہا تھا لیکن فرحی نے روک دیا۔

''نہیں پلیز ثمر، تم ساتھ مت چلو تمہیں ساتھ دیکھ کر شاید ڈیڈی کو غصہ آجائے شاید وہ......'' فرحی ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن وہ متذبذب سا اسے دیکھ رہا تھا۔

''مجھ پر بھروسا کرو جوان، میں اس وقت پوری نیک نیتی کے ساتھ اس بچی کو گھر پہنچانے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے پہلے میرے دل میں ایسی کوئی نیکی کرنے کا خیال نہ ہو لیکن کچھ دیر پہلے جب اس بچی سے میں نے وعدہ کیا تو پوری نیک نیتی کے ساتھ کیا۔'' وہ بیٹھ گیا۔ اسے لوگوں کی پہچان نہیں تھی لیکن اسے لگا تھا یہ شخص صحیح کہہ رہا ہے۔

''میرے آنے تک تم یہاں ہی رہو ناشتا کرو۔ اسے چھوڑ کر میں واپس آتا ہوں تو میرا ڈرائیور تمہیں بھی تمہارے گھر چھوڑ آئے گا بلکہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اپنے گھر اپنی خیریت کی اطلاع بھجوا کر دو تین روز یہیں چھپے رہو۔ تمہاری بائیک سے یقیناً پولیس تمہارے گھر پہنچ گئی ہوگی۔'' وہ اس کے کندھے پر تھپکی دے کر فرحی کو ساتھ لے کر چلا گیا تھا اور اس کے لیے وقت گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسے لگنے لگا تھا جیسے فرحی اور اس شخص کو گئے صدیاں گزر گئی ہوں۔ بہت زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تھی لیکن اسے لگا تھا بہت دیر ہو گئی ہے۔ دل میں طرح طرح کے وہم آنے لگے۔ پتا نہیں یہ شخص کون ہے، اس کا رہن سہن بھی کچھ مشکوک سا لگ رہا ہے۔ شیر خان نامی شخص کے پاس اسلحہ تھا۔ گھر میں کوئی عورت بھی نہیں نظر آئی کہیں وہ شخص فرحی کو لے کر چلا ہی نہ جائے۔ بیچ دے......

''یا اللہ میں نے اسے اکیلا کیوں جانے دیا۔ ساتھ ہی جاتا، گاڑی میں بیٹھا رہتا۔ فرحی کے گھر نہ جاتا لیکن مجھے اسے ایک اجنبی کے ساتھ اکیلا نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔'' اس نے ارد گرد دیکھا وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ سامنے پڑا ناشتا ٹھنڈا ہو گیا تھا وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور لکڑی کا بھاری دروازہ کھول کر باہر نکل آیا، شیر خان گیٹ پر نہیں

تھا شاید اپنے کیبن میں تھا پھر...... وہ تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا اور چھوٹا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ باہر گلی میں کوئی نہیں تھا۔ وہ تیز، تیز چلتا ہوا اسٹاپ کی طرف جا رہا تھا۔ ایک پولیس والا پان سگریٹ کے ایک کھوکھے پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی نظریں اس پر پڑیں تو غیر ارادی طور پر اس کے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ عین اسی لمحے جب اس نے پولیس والے کی طرف دیکھا تھا پولیس والے نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا اور چونک کر سگریٹ پھینک کر اس کی طرف لپکا تھا اور اسٹاپ سے پہلے ہی اس کے پیچھے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا وہ یک دم رک گیا۔

''بچو کہاں بھاگے جا رہے ہو؟'' پولیس والے کے ہونٹوں پر تمسخر بھری مسکراہٹ تھی۔

''جی...... جی۔'' وہ گھبرا کر مڑا تھا۔

''تم نے کیا سمجھا تھا، میری نظروں سے بچ کر نکل جاؤ گے۔ افضل خان کی نظروں میں کیمرے فٹ ہیں کیمرے۔'' اس نے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر اس کے بازو پر ہاتھ ڈالا تھا۔

''میں سمجھا نہیں سر۔''

''اوئے رات کو تم ہی تھے ناں ڈاکوؤں کے ساتھ؟''

''نہیں سر آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں تو......''

''غلط فہمی کے پتر۔'' اس نے اس کے بازو پر گرفت مضبوط کی۔ ''افضل خان کسی کو دیکھ لے تو سو سال بعد بھی پہچان لے۔ رات تو ہی تھا ناں موٹر سائیکل پر کسی کڑی کے ساتھ، بھگا کر لایا تھا؟''

''نہیں...... نہیں سر وہ تو میری کزن تھی میں اسے گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''یعنی تو ہی تھا۔'' پولیس والا مسکرایا اور بائیں ہاتھ سے اپنی مونچھ کو بل دیا۔ ''چل آگے لگ۔''

''سر پلیز میری بات سنیں، یقین کریں میں ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں ہوں، میں تو......''

''چل زیادہ بک، بک نہ کر۔'' پولیس والے نے اس کی ٹانگ پر اپنے بوٹ سے ٹھوکر لگائی۔

''سر خدا کے لیے میری بات سنیں، میں......'' اب پولیس والے کی نظریں اس کی خون آلود آستین پر تھیں۔ رات فرحی کو اٹھاتے ہوئے اس کے خون سے اس کی شرٹ کی آستین آلودہ ہو گئی تھی۔

''لگتا ہے کڑی کو بھی کھڑکا دیا تو نے۔ کسی پولیس والے پر گولی چلائی اور پھر......''

''نہیں نہیں مجھ سے قسم لے لیں، میں نے تو زندگی بھر کبھی پستول کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔''

''چل بس اب یہ ساری کہانیاں تھانے چل کر سنانا۔'' افضل خان کی آنکھوں میں ڈھول جھونک کر بھاگ رہا تھا۔''

''نہیں پلیز، مجھے جانے دیں۔'' وہ منتیں کر رہا تھا۔ اس کا بھلا کب پہلے ایسے حالات سے واسطہ پڑا تھا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا تھا۔ پولیس والا اسے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔ تقدیر کی کتاب میں اس کے لیے کیا لکھا تھا وہ نہیں جانتا تھا لیکن اندر ہی اندر اس کا دل ڈوب رہا تھا...... پتا نہیں اماں، ابا کو میرا پتا بھی چل سکے گا یا نہیں اور یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔'' وہ شخص کہہ تو رہا تھا اپنے ساتھی کا قتل وہ اس پر ڈال دیں گے۔ اماں، ابا، فرحی کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا اور وہ جیل میں ہی مر جائے گا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا اور اس میں طرح، طرح کے خیالات آ رہے تھے اور مایوسی لمحہ بہ لمحہ اس کے دل میں بڑھتی جا رہی تھی۔ ہاں کسی کو پتا نہیں چلے گا اسے یقین تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ ایک شخص سڑک کراس کرتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اور یہ شیر خان تھا جو سڑک پار اس وقت دودھ لینے جاتا تھا اور اب دودھ لے کر واپس آ رہا تھا۔

اگلے دس دن اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھے۔ تھانے میں مار، مار کر انہوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اعتراف کرلے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی ہے اور اس نے ہی ایک پولیس والے پر گولی چلائی تھی لیکن جو کام اس نے کیا ہی نہیں تھا اس کا اعتراف کیسے کرلیتا۔ اگر عادی مجرم ہوتا تو مار سے بچنے کے لیے اعتراف کربھی لیتا لیکن وہ عادی مجرم نہیں تھا اس لیے مار کھاتا رہا اور منتیں کرتا رہا۔

''خدا کے لیے میرے گھر میں کسی طرح اطلاع بھجوادو میری ماں مرجائے گی۔''

''تجھ جیسوں کی ماں کو تو غیرت سے مرہی جانا چاہیے۔'' وہ گڑگڑاتا پولیس والوں کے پاؤں پکڑ لیتا لیکن ان کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔ وہ دسواں دن تھا جب ایک پولیس والے نے اسے لاک اپ سے باہر نکالا۔

''چل تھانیدار صاحب تجھے بلارہے ہیں۔'' وہ بہ مشکل اٹھا تھا اس کا جوڑ، جوڑ دکھ رہا تھا۔ ایس ایچ او کے کمرے میں کرسی پر وہی شخص بیٹھا تھا جس کے گھر اس نے پناہ لی تھی۔

''سر۔'' وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ ''سر آپ تو جانتے ہیں ناں میں نے کوئی قتل نہیں کیا، میں بے گناہ ہوں۔'' اس نے تاسف سے پہلے اسے اور پھر ایس ایچ او کی طرف دیکھا۔

''ہماری پولیس کا مزاج کبھی نہیں بدلے گا۔ گناہ گار اور بے گناہ کا ایک ہی حشر کرتے ہیں۔''

''سر ہمیں کیا پتا تھا یہ آپ کا بندہ ہے۔''

''ارے میرا بندہ نہ بھی ہوتا پر تم جانتے تھے قتل اس نے نہیں کیا پھر بھی...... خیر......'' انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''چلو اٹھو۔''

''ہاں، ہاں چل جا۔'' ایس ایچ او نے بھی ہانکا۔ وہ بے یقینی سے ایس ایچ او کی طرف دیکھتا ہوا اس شخص کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

''سر وہ...... فرحی......'' گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے فرحی کے متعلق پوچھا۔

''گھر چل کر تم سے بات کرتے ہیں۔'' اس شخص نے آہستگی سے کہا۔ شیر خان گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔ شیر خان چوکیدار تھا، گارڈ تھا یا ڈرائیور اس نے یونہی سوچا۔ وہ بے حد تکلیف میں تھا۔ اس کے ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے نیل پڑے تھے بلکہ پورے جسم کا یہی حال تھا۔ گاڑی اس شخص کے گھر کی طرف رواں تھی جب ایک بار پھر اس نے بات کرنے کی کوشش کی۔

''سر پلیز صرف مجھے یہ بتادیں کہ فرحی کے ڈیڈی نے کچھ کہا تو نہیں تھا؟ آپ نے اسے گھر چھوڑ دیا تھا ناں...... بس یہ بتادیں سر اور مجھے یہاں ہی کہیں اتار دیں۔ میں اپنے گھر جاؤں گا میرے ماں باپ بہت پریشان ہوں گے اور میری اماں تو......'' آنسوؤں کا گولا سا حلق میں اٹک گیا تھا۔

''اس حلیے میں گھر جاؤ گے؟'' پہلے سوال کا جواب نظر انداز کرکے اس شخص نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی شرٹ کی آستینوں کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ ایک آستین پھٹی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر خود پر ڈالی۔ ''پہلے میرے گھر چلو وہاں آرام سے نہا دھو کر کپڑے بدلنا پھر تمہارے گھر چلتے ہیں۔'' اس بار اس شخص کا لہجہ اسے بہت نرم لگا تھا اور وہ شخص بے حد ہی شفیق...... پھر گھر پہنچنے تک اس نے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی اسے دھچکا سا لگا۔ سامنے صوفے پر فرحی بیٹھی تھی اس کی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہی آنسو بہنے لگے تھے۔

''فرحی۔'' وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا تھا۔ ''فرحی تم تو گھر گئی تھیں پھر کیوں آگئیں واپس۔ وہاں ہی رہ جاتیں جیسے بھی تھا ممی کے پاؤں پکڑ لیتیں۔'' فرحی کے آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے تھے۔ وہ شخص انہیں تنہا

چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

''فرحی مجھے بتاؤ...... تفصیل سے بتاؤ کیا ہوا؟'' وہ اس وقت اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔

''بھابی نے مجھے گھر سے نکال دیا ثمر۔ ڈیڈی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا سب اسپتال میں تھے، گھر میں صرف بھابی تھیں انہوں نے کہا جس طرح آئی ہو اسی طرح واپس چلی جاؤ، میں نے بہت منتیں کیں، انکل نے بتانے کی کوشش کی لیکن بھابی کوئی بات نہیں سن رہی تھیں۔ انہوں نے کہا اب بات سننے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بات سارے خاندان میں پھیل چکی ہے حتیٰ کہ روحی کی سسرال میں بھی بات پہنچ گئی۔''

''کیسے بھابی، کیسے بات پھیل گئی اتنی جلدی اور پھر آپا کی سسرال میں کس نے خبر دی؟'' میں جانتی تھی یقیناً بھابی نے ہی سب کو خبر کی ہوگی پھر بھی پوچھ رہی تھی۔

''بس صبح صبح روحی کی ساس آگئی تھیں اور انہوں نے تو تمہارا خط بھی پڑھ لیا تھا جو تم چھوڑ گئی تھیں اور پھر وہ اونچا اونچا بولنے لگیں کہ میری جرأت بھی کیسے ہوئی، رات گزار کر آگئی واپس ثمر......'' وہ رو رہی تھی۔

''انہوں نے کہا بھائی مجھے گولی مار دیں گے اور خود پھانسی چڑھ جائیں گے۔ تم نے جو کرنا تھا کرلیا اب بھائی کی زندگی سے مت کھیلو اور نکل جاؤ اس گھر سے پھر کبھی یہاں قدم نہ رکھنا جس کے لیے بھاگی تھیں اسی کے پاس چلی جاؤ۔'' اور وہ ساکت بیٹھا سوچ رہا تھا یہ ایسا کیوں ہو گیا تھا ان کے ساتھ، حالات کیوں ان کے خلاف ہو گئے تھے۔

''مجھے پتا تھا ڈیڈی ہمیشہ کس اسپتال میں جاتے ہیں۔ مجھے یقین تھا بھابی تو غیر ہیں، ممی ضرور میری بات سنیں گی۔ میں ان انکل کے ساتھ اسپتال گئی لیکن بھائی گیٹ پر مل گئے۔ انہوں نے ہمیں اندر نہیں جانے دیا۔ ممی، ڈیڈی سے بات نہیں کرنے دی۔ انہوں نے کہا تم ہمارے لیے اسی وقت مر گئی تھیں جب تم نے رات کے اندھیرے میں گھر سے باہر قدم رکھا تھا، ہماری عزت سے کھیل کر کیا اب ہمارا تماشا دیکھنے آئی ہو۔ چلی جاؤ اس سے پہلے کہ میں تمہیں اور خود کو بھی گولی مار دوں۔ انہوں نے انکل کی بات بھی نہیں سنی اور نفرت سے منہ موڑ کر چلے گئے۔ تمہاری اماں نے کتنا صحیح کہا تھا کہ چھپ کر گھر سے باہر رکھنے والا پہلا قدم ہی عورت کو پاتال میں گرا دیتا ہے۔ میں پاتال میں گر گئی ہوں ثمر۔ میں نے ان دس دنوں میں ہر روز انہیں فون کیا، کسی نے مجھ سے بات تک نہیں کی، میری بات نہیں سنی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''تم نے واپس نہیں آنا تھا فرحی جیسے بھی ہوتا جس طرح بھی ہوتا وہاں ہی بیٹھ جاتیں، ماں باپ تھے دل پگھل جاتا آخر'' وہ تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ فرحی کہاں جائے گی؟

''نہیں، وہ فرحی کو اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ فرحی نے اس کے لیے گھر چھوڑا تھا اور اب فرحی اس کی ذمے داری ہے لیکن ایک بار میں خود جاؤں گا فرحی کی ممی سے ملنے، وہ ماں ہیں ضرور میری بات سنیں گی۔ وہ ضرور فرحی کے لیے گھر کے دروازے کھول دیں گی۔''

''جوان۔'' وہ شخص اچانک لاؤنج میں آیا تھا شاید وہ کہیں آس پاس ہی تھا۔ ''کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا، ثمر...... ہاں ثمر حیات! گلّے نے تمہارے لیے واش روم میں کپڑے لٹکا دیے ہیں۔ تم پہلے غسل کر لو پھر دلدار تمہارے زخموں اور چوٹوں کا جائزہ لیتا ہے۔''

''لیکن میں وہ گھر......''

''باقی باتیں پھر آرام سے سکون سے بیٹھ کر کرتے ہیں۔ میں تم دونوں کے لیے تم سے زیادہ فکر مند ہوں حالانکہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔ باتھ لینے سے تمہاری طبیعت کچھ ہلکی ہو جائے گی۔'' اس نے اس کی بات کاٹی

تھی۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ جسم کا ہر عضو جیسے دار کے شکنجے میں کسا تھا اور دل پر جیسے کوئی بھاری بوجھ پڑا ہوا تھا۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو شاید دیواروں سے ٹکریں مارتا لیکن ضبط کرتا ہوا وہ اٹھا یقیناً ہاتھ لینے اور یہ دس دنوں کے میلے اور پھٹے ہوئے کپڑے بدلنے سے طبیعت کا بھاری پن کم ہو جائے۔ جاتے جاتے اس نے مڑ کر فرحی کی طرف دیکھا جو بیٹے ہوئے چہرے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور بار بار آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو پونچھتی رہی تھی۔ جب وہ ہاتھ لے کر باہر آیا تو تب بھی فرحی اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی اور وقفے وقفے سے آنسو پونچھتی جاتی۔ ایک طرف صوفے پر ان کا میزبان بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ ڈاکٹر نما شخص ولدار تھا اسے آتے دیکھ کر وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کے سوجے ہوئے ہونٹوں اور چہرے پر پڑے نیلوں کا جائزہ لیا تھا۔

''یہ پولیس والے......'' اس نے گالی دی۔ ''اس طرح مارتے ہیں کہ بظاہر چوٹیں نظر نہیں آتیں لیکن اندر سب کچھ ٹوٹ، پھوٹ جاتا ہے لیکن یہاں تو کچھ نظر بھی آ رہا ہے کہیں زخم وغیرہ بھی ہیں۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''لیکن پورا جسم نیلوں نیل ہوا پڑا ہے۔''

''ہوں۔'' ولدار نے اپنے باکس سے دو گولیاں نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھیں اور ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر اسے پکڑایا۔ اس نے خاموشی سے پانی کے گھونٹ کے ساتھ گولیاں نگل لیں۔

''فرحی۔'' وہ ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے قریب جا کر گھٹنوں کے بل کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ ''فرحی۔'' اس نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا تھا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو ولدار اپنا باکس اٹھائے لاؤنج سے جا رہا تھا۔

''میں نہیں جانتا ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے۔ ہماری نیت میں تو کہیں کوئی کھوٹ نہیں تھا لیکن شاید ایسا ہی ہونا لکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اب کیا کروں ایسا کہ تم......'' اک ذرا رک کر اس نے پھر بات شروع کی۔ ''میں ایک بار تمہیں تمہارے گھر پہنچانے کی کوشش ضرور کروں گا لیکن اگر کامیاب نہ ہو سکا تو پھر تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا بس یہی ایک راستہ رہ گیا ہے ہمارے پاس۔ اماں تو سب کچھ جانتی ہیں اور اب تو انہوں نے ابا کو بھی سب کچھ بتا دیا ہوگا میرے ابا بہت شفیق باپ ہیں اور اماں کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔''

''تمہارے، ابا ثمر......'' وہ جو ہونٹ بھینچے بیٹھی تھی یک دم چیخیں مار، مار کر رونے لگی۔

''کیا...... کیا ہوا ابا کو؟'' اس نے چیخ کر پوچھا۔ ''بولو...... بولتی کیوں نہیں فرحی؟'' اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ ''کیا ہوا ہے، ابا کو؟'' اس نے مڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا جو صوفے پر خاموش بیٹھا تھا اس کے دیکھنے پر نرمی سے بولا۔

''ہماری زندگیوں میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے ثمر حیات جس کے متعلق ہم نے سوچا بھی نہیں ہوتا کہ ایسا ہو جائے گا۔'' وہ متوحش نظروں سے مڑ کر پھر فرحی کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہم واپس آئے تو شیر خان نے بتایا کہ تمہیں پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ میں نے انکل سے کہا مجھے تمہارے گھر پہنچا دیں۔ تمہاری اماں ضرور میری بات کا یقین کریں گی۔ وہ مجھے اپنے پاس رکھ لیں گی لیکن ثمر جب ہم وہاں پہنچے تو تمہارے گھر کے باہر لوگ جمع تھے اور اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہاں لوگوں نے بتایا کہ صبح صبح پولیس آئی تھی تمہارے گھر......''

''کیسے پولیس کیسے وہاں آ گئی؟''

''شاید تمہاری بائیک کے کاغذات سے سراغ ملا ہوگا انہیں۔'' فرحی نے نظریں جھکا لی تھیں۔

''جب تمہارے ابا کو بتایا گیا کہ تم کسی ڈاکے میں ملوث ہو، جس میں ایک بندہ بھی مارا گیا اور وہ تمہارے ابا کو تھانے لے جانے آئے تھے تمہارے متعلق پوچھ گچھ کرنے کے لیے۔''

''تو کیا ابا تھانے میں ہیں؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''نہیں۔'' فرحی اس شخص کی طرف دیکھنے لگی۔ ''جب انہیں پولیس وین میں بٹھایا جانے لگا تو وہ وہاں ہی گر گئے اور اسپتال لے جانے سے پہلے ہی......''

''نہیں......'' وہ اتنے زور سے چیخا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔ وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے فرحی کو دیکھ رہا تھا جس کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے تھے اور اس کے ہونٹوں سے دبی، دبی چیخیں نکل رہی تھیں۔

''نہیں...... ابا ایسے کیسے جاسکتے ہیں؟'' اس نے پھر کہا اور دہاڑیں مار، مار کر رونے لگا۔ ابا کا چہرہ بار، بار اس کی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ وہ محبت جتاتے نہیں تھے لیکن اس سے شدید محبت کرتے تھے۔ وہ رو رہا تھا کسی نے اسے چپ نہیں کروایا تھا کچھ دیر بعد وہ خود ہی سنبھلا تھا۔

''چلو فرحی اٹھو، ابھی ہم چلتے ہیں۔ ابا کے بعد اماں کتنی اکیلی ہوں گی انہیں میری کتنی ضرورت ہوگی دیر مت کرو پلیز...... ہائے میری اماں۔'' لیکن فرحی یوں ہی بیٹھی رہی تھی۔

''فرحی۔'' اس نے بے قراری سے اس کا بازو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

''ثمر...... ثمر اماں وہاں نہیں ہیں۔'' وہ پھر بلک پڑی تھی۔ اب کے جیسے اسے سکتہ ہو گیا تھا۔ فرحی کا بازو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا وہ خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اماں کہاں گئیں؟'' بڑی دیر بعد اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

''پتا نہیں ثمر آس پڑوس سے پتا کیا تو انہوں نے بتایا کہ اس اچانک حادثے نے ان کے ذہن پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس حادثے کے چوتھے دن وہ ایسے ہی گھر سے نکل گئیں پھر پلٹ کر نہیں آئیں۔ تمہارے ماموں نے گھر میں تالا لگا دیا ہے۔ انکل نے سب پتا کیا ہے ثمر، ہر روز بندہ بھیجتے ہیں تمہارے محلے میں۔''

دروازہ آہستہ سے کھلا اور عظام کا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ اس نے چونک کر عظام کی طرف دیکھا لیکن بہت دیر تک خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ماضی میں اس طرح کھویا تھا...... جیسے اس نے ابھی ابھی ابا کی موت کی خبر سنی ہو۔ دکھ کا یہ خنجر جیسے ابھی ابھی اس کے دل میں اترا ہو۔ اس کیفیت سے واپس آنے میں اسے کچھ وقت لگا تھا۔ عظام نے اندر قدم رکھا۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں پاپا؟''

''اوں ہوں کچھ نہیں بیٹا۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''سوچ رہا تھا کتنی جلدی ایک ہفتہ گزر گیا۔ اب مجھے جانا ہوگا۔''

''لیکن پاپا جانے کے بعد واپس بھی تو آنا ہے ہمیشہ کے لیے...... آپ نے پرامس کیا ہے ناں۔''

''ہاں۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی اور سوچا۔ ''پتا نہیں وہ اس دلدل سے خود کو نکال بھی سکے گا یا نہیں۔'' لیکن بہر حال اسے خود کو اس دلدل سے نکالنا ہی تھا کیسے اور کس طرح یہ ابھی اس نے سوچا ہی نہ تھا۔

''کیا پروگرام ہے بابا، آج ڈنر باہر ہی نہ کریں؟'' ثمر حیات نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد سر ہلا دیا۔

''ایز یو وش جانم ہم نے تو تمہارے حوالے کر دیا ہے خود کو ایک ہفتے کے لیے۔''

''اور یہ ہفتہ ختم ہونے والا ہے بلکہ ہو گیا ہے۔'' عظام کے لہجے سے اداسی جھلکی تھی۔

''رواحہ کو فون کیا تھا کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے پاپا، اب صبح ہی ملاقات ہوگی۔''
''اور پھر کل تم اس کے ہاں شفٹ ہو جاؤ گے؟''
''جی پاپا، میرا سامان تو ہاسٹل میں ہے۔ آپ کے جانے کے بعد لے کر چلا جاؤں گا۔''
''میں تو صبح جلدی نکل جاؤں گا نو بجے تک تم یونیورسٹی سے ہی ہاسٹل چلے جانا اور پھر وہاں سے......''
''آپ نے جانا ہے ناں تو میں پھر کل یونیورسٹی نہیں جاؤں گا آپ کو ائر پورٹ چھوڑنے جاؤں گا۔'' آج سے پہلے تو عظام نے کبھی اسے سی آف کرنے کی بات نہیں کی تھی لیکن آج سے پہلے کبھی اس طرح وہ اتنے دن اکٹھے رہے بھی تو نہیں تھے۔
''نہیں یار، تمہاری پڑھائی کا پہلے ہی بہت حرج ہو چکا ہے۔ ممتاز مجھے چھوڑ آئے گا۔''
''لیکن پاپا......''
''کہہ دیا ناں، عظمی ضد مت کرو تمہاری پڑھائی بہت اہم ہے۔'' اور ان کے حتمی لہجے پر عظام چپ کر گیا۔
''ٹھیک ہے پاپا اب پھر آپ کا چکر کب لگے گا؟''
''شاید دو تین ماہ تک۔ میں تمہیں فون کر دوں گا۔''
''آپ اگلی بار آئیں گے تو میں آپ کو رواحہ کے پاپا سے ملواؤں گا۔''
''ہاں ضرور۔'' ثمر حیات کھڑا ہو گیا تھا۔ ''میں ذرا فریش ہو جاؤں پھر چلتے ہیں۔''
عظام نے سر ہلا دیا تو ثمر حیات واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ شام ہی کو وہ واپس گھر پہنچے تھے اور تب سے ہی وہ یونہی ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا تھا جبکہ عظام آرام کرنے کے بعد فریش ہو کر نیچے آ گیا تھا۔ اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اس کا کہیں جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ عظام کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ عظام نے اگر باہر ڈنر کا پروگرام بنایا تھا تو یقیناً وہ اس کے ساتھ کچھ اور انجوائے کرنا چاہتا تھا اور اگر وہ نہ جاتا تو وہ مایوس ہو جاتا۔ اس نے ہمیشہ ہی اسے مایوس کیا تھا لیکن اب نہیں۔ وہ واش روم سے نکلا تو عظام کارنس پر کھیان ٹیکے فرحی کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔
''پاپا اس بار جب آپ آئیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ خانیوال چلوں گا ماما اور بھائی کی قبر پر۔'' وہ سر ہلا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بالوں میں برش کر کے اس نے مڑ کر عظام کی طرف دیکھا۔
''چلو کہاں چلنا ہے؟''
''چائنیز پسند ہے آپ کو؟''
''جو تمہاری پسند۔'' ثمر نے مسکرا کر ڈریسنگ ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔
''تو ٹھیک ہے پھر۔''
کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہے تھے لیکن اندر قدم رکھتے ہی عظام ٹھٹک کر رک گیا...... یہ وہی تھی۔ وہ سفید ڈریس والی...... بک شاپ پر ملنے والی لڑکی وہ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہاں سے باہر کی جانب آ رہی تھی۔ عظام کی نظریں اس پر تھیں جبکہ ثمر حیات اس کے پیچھے آنے والی ہستی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔
''یہ...... یہاں کہاں......؟''

جاری ہے

ناتا

رفعت شبانہ

''ٹرن ٹرن'' ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی لیکن سب اپنے، اپنے کمروں میں تھے۔ آج اتوار یعنی چھٹی کا دن اور صبح کے چھ بجے کون فون اٹھاتا سو گھنٹی بج، بج کر خاموش ہوگئی مگر تھوڑی دیر سے، بعد دوبارہ بجنے لگی۔ اس مرتبہ فون کی گھنٹی کی آواز سن کر صفیہ بیگم باہر نکلیں۔ آنکھیں سہلاتے ہوئے انہوں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف صفیہ بیگم کی نند فریحہ تھی۔ آواز رونے والی تھی اور روتے ہوئے





ہی انہوں نے کہا۔
''بھابی! بڑے بھیا کا انتقال ہوگیا ہے جلدی گھر پہنچ جائیں۔''
ایک لمحے کو صفیہ بیگم پریشان ہوگئیں کیونکہ بڑے بھیا کے انتقال کی خبر سن کر وہ خود بھی صدمے میں آگئیں کہ اچانک کیا ہوگیا ابھی پچھلے اتوار کو تو سب ساس کے گھر جمع تھے ہنسی مذاق ہو رہا تھا، سارے بہن بھائیوں کے قہقہے گونج رہے تھے، کھانا پینا ہو رہا تھا۔ بڑے بھیا بھی سب سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ اچانک کیا ہوگیا وہ تو کوئی بیمار بھی نہیں تھے۔ ابھی صفیہ بیگم خاموش سوچ ہی رہی تھیں کہ دوسری طرف نند نے کہا۔
''بھابی جلدی آجائیں۔''
''ہاں، ہاں بس میں پہنچ رہی ہوں۔'' صفیہ بیگم نے کہا۔ صفیہ بیگم اس گھر کی دوسری بہو تھیں ان سے چھوٹی تین بہوئیں اور تھیں اور تین نندیں تھیں، سب شادی شدہ تھیں اور اس طرح یہ کل پانچ بھائی اور تین بہنیں تھیں۔
ٹیلی فون سننے کے بعد صفیہ بیگم سب سے پہلے اپنے کمرے میں آگئیں اور یہ سوچ کر کہ اگر شوہر کو اٹھادیا تو وہ فوراً چلنے کو کہیں گے اور گھر کے کام نہیں کرنے دیں گے۔ اس لیے پہلے میں اپنے گھر کا ضروری کام نمٹالوں پھر انہیں اور بچوں کو جگاؤں گی انہوں نے شوہر کا موبائل اٹھا کر آف کر دیا تاکہ مزید کوئی کال نہ آسکے اور اپنا موبائل جو پہلے ہی سے آف تھا اسے اپنے پرس میں ڈال لیا۔ وارڈ روب سے انہوں نے شوہر، اپنے اور بچوں کے کپڑے نکالے اور باہر لے جا کر استری کرکے رکھتی گئیں۔ استری ختم کر کے کچن کی جانب جانے لگیں تو ان کی بڑی بیٹی آمنہ اٹھ گئی۔
''امی کیا بات ہے، آج تو چھٹی ہے آپ اتنی جلدی کیوں اٹھ گئیں۔'' وہ حیرت میں تھی۔ صفیہ بیگم آمنہ سے چھپانا چاہ رہی تھیں کیونکہ آمنہ اپنے تایا ابو کی بڑی لاڈلی تھی اور بڑی بیٹی اور بڑی پوتی ہونے کے ناتے سب اسے بہت چاہتے تھے اور ددھیال کی طرف اس کا بہت جھکاؤ بھی تھا کیونکہ بڑے بھیا یعنی تایا کے تین بیٹے تھے پر بیٹی کوئی نہیں تھی۔ وہ آمنہ کو اگر یہ بات بتادیتیں تو اس کو چپ کرانا بڑا مشکل ہوجاتا اور وہ ان کو کوئی کام نہیں کرنے دیتی اور وہ یہ چاہتی تھیں کہ سب کام نمٹا کر چلیں۔ لیکن کب تک... صفیہ بیگم کو اپنے جلدی اٹھنے کا سبب بتانا ہی پڑا۔ ''بیٹا وہ پھپو کا فون آیا تھا کہ تایا ابو کی حالت بہت خراب تھی انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں اور...''
''امی اور کیا؟'' آمنہ ایک دم پریشان ہوگئی۔
''اور... اور یہ کہ تایا ابو کا وہاں پر انتقال ہوگیا، ہم چلنے کو تیار ہو رہے ہیں۔'' آمنہ سن کر رونے لگی۔
''بیٹا! اپنے تمام کپڑے دیکھ لو اور اپنا بیگ بھی تیار کرلو۔ پھر چلتے ہیں۔'' وہ اسے گلے لگا کر بولیں۔
''تم تیار ہو کر کچن میں آجاؤ، میں انڈے پراٹھے بناتی ہوں اور تمہارے ابو کو بھی اٹھاتی ہوں۔ اگر ناشتا ٹھیک طریقے سے کر کے جائیں گے تو وہاں پریشانی نہیں ہوگی کیونکہ کھانا تو دیر سے ملے گا نا...'' صفیہ بیگم کی بات سن کر آمنہ چیخ پڑی۔
''امی آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ وہاں انتقال ہوگیا اور آپ کو انڈے پراٹھوں کی پڑی ہے۔''
''ارے بیٹا وہاں ابھی کوئی نہیں آیا ہوگا'' صفیہ بیگم نے آمنہ کو سمجھایا۔

"لیکن امی ہم کوئی اور نہیں ان کے گھر کے فرد ہیں آپ کو کیا ہو گیا ہے۔" اس نے غصے میں ماں سے کہا۔

آمنہ اس پورے وقت اپنی ماں کو جلدی، جلدی چلنے کا کہتی رہی لیکن صفیہ بیگم اپنے تمام کام نمٹاتی رہیں۔ صفیہ بیگم نے بچوں اور شوہر کو کچھ دیر میں اٹھا دیا تھا اور ان کو بھائی کے انتقال کا بھی بتایا، وہ بھی بہت پریشان اور غمگین دکھائی دیے لیکن کیا...... مجبوری تھی...... صفیہ بیگم نے میاں اور سب بچوں کو انڈے پراٹھوں کا ناشتا کرایا۔ حالانکہ میاں اور بچوں نے ناشتے میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں لی لیکن جلدی، جلدی ناشتا کرتے رہے تاکہ دادی کے گھر جا سکیں۔

سب کاموں سے فارغ ہو کر میاں نے گاڑی نکالی اور سب لوگ دادی کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ سب زور [illegible] سارے بہن بھائی آ چکے تھے سب سے آخر میں صفیہ بیگم اپنی فیملی کے ساتھ پہنچی تھیں۔ پھر وہاں پہنچ کر صفیہ بیگم پورا وقت ڈرامے بازی کرتی رہیں۔ نندوں سے ساس امی سے اور دیورانیوں سے گلے مل، مل کر خوب روتی رہیں پھر اندر جا کر اپنی جیٹھانی سے گلے مل کر خوب دہائی دیتی رہیں اور جیٹھانی کو چپ کراتی رہیں۔ ان کو صبر کا حوصلہ بھی دیتی رہیں۔ آمنہ اپنی امی کی حرکات کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ سب منافقت لگ رہی تھی اس کو یہ سب دکھاوا محسوس ہو رہا تھا۔

"ہائے میں تو سن کر ہی پریشان ہو گئی تھی ہاتھ میں چائے کا کپ تھا یوں ہی رکھ کر آ گئی۔ چائے تک نہیں پی گئی۔ ابھی پچھلے اتوار کو تو ہم سب بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ بڑے بھیا کتنا خوش نظر آ رہے تھے۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ میں تو سن کر ہی گھبرا گئی اور سب کو جلدی،

جلدی لے کر آگئی۔" صفیہ بیگم نے درد بھری آواز بنا کر اپنی داستان مکمل کی۔ آمنہ ہر مرتبہ حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتی کہ وہ کتنی غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں۔

"ارے، فریحہ ڈرائنگ روم میں سپارے رکھوا دو تا کہ جو لوگ آچکے ہیں وہ سپارے تو پڑھ لیں۔" صفیہ بیگم نے اپنی نند فریحہ کو کہا تو وہ بولی۔

"ہاں بھابی، میں نے رکھوا دیے ہیں سب لوگ پڑھ رہے ہیں آپ بھی پڑھ لیں..... میں لاؤں سپارہ آپ کے لیے؟" فریحہ نے صفیہ بیگم سے کہا تو وہ بیٹی کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"ارے آمنہ میرا چشمہ تو لانا۔"

"امی وہ تو آپ کے پرس میں ہوگا، میں پرس لاتی ہوں۔" جب آمنہ نے ماں کو پرس لا کر دیا تو صفیہ بیگم پرس میں چشمہ ڈھونڈنے لگیں اور بولیں۔

"ارے ہے، میں تو چشمہ لانا ہی بھول گئی۔" حالانکہ آمنہ کو یہ سب معلوم تھا کہ آنے سے پہلے انہوں نے چشمہ جان بوجھ کر پرس سے نکال کر ٹی وی ریک میں رکھ دیا تھا۔" اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بیگ بھاری ہو رہا ہے۔"

تھوڑی دیر وہ پرس میں ہاتھ مارتی رہیں۔ "چشمہ تو نہیں ہے چلو دانے پڑھ لیتی ہوں۔" اور وہ دانوں پر کلمہ پڑھتی رہیں۔ لوگ آتے جاتے رہے کچھ پڑھتے رہے، کچھ تسبیحات پڑھتے رہے اور کچھ لوگ باتوں میں مصروف تھے کچھ خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو تکتے رہے غرض کہ موت کا گھر تھا ہر شخص بے چین اور بے قرار تھا۔

"آمنہ ارے آمنہ بات سنو۔" صفیہ بیگم نے بیٹی کے کان میں کہا "بیٹا اتنا زیادہ نہ پڑھو تھک جاؤ گی۔ سر میں درد ہونے لگے گا۔ اور لوگ بھی تو پڑھ رہے ہیں۔ تم تھوڑا آرام کر لو۔" آمنہ نے ماں کی بات سن کر نظر انداز کر دی اور پھر اپنی پھپھو کے برابر بیٹھ کر دوبارہ سپارہ پڑھنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد انہیں یاد آیا کہ سب لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان کے میکے والے نظر نہیں آرہے۔ انہوں نے دوبارہ پرس کھولا موبائل نکال کر اپنے میکے والوں کو اطلاع دی۔ صفیہ بیگم دانے پڑھ رہی تھیں لیکن ان کا دل پڑھنے کے علاوہ سب کاموں میں لگا ہوا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت پر ان کی نظر تھی لوگوں سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔ اور مشورے بھی دے رہی تھیں۔

"ارے جواد..... یہاں پانی کی ضرورت ہے۔ ٹھنڈے پانی کا انتظام کروادو۔ یہاں چادریں اور بچھوادو ارے راستہ چھوڑ کر ڈسپنسر رکھنا۔" دیور پاس سے گزرا تو بولیں۔

دوسرے کمرے میں تمام نندیں اور دیورانیاں غم سے نڈھال ساس کے پاس بیٹھی ان کی دلجوئی کر رہی تھیں۔ آمنہ بھی اپنے تایا ابو کی بڑی لاڈلی تھی، تائی اماں بھی آمنہ کو بہت پسند کرتی تھیں۔ آمنہ کو بار بار صفیہ بیگم اٹھا کر اپنے پاس بلاتیں لیکن وہ دوبارہ وہیں اپنے ددھیال والوں کے پاس جا کر بیٹھ جاتی۔

لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ عصر تک جاری رہا۔ اس دوران آمنہ کے ننھیال والے بھی آگئے۔ اب صفیہ بیگم دانے چھوڑ کر میکے والوں سے باتوں میں لگ گئیں۔ وہ لوگ بھی پڑھنے سے زیادہ باتوں میں لگے ہوئے تھے۔

اب گھر کے سارے مرد اندر آنے لگے اور قریبی رشتے دار گھر کی خواتین سے ملتے رہے۔ جنازہ اٹھنے لگا اور عصر کی نماز تک سب مسجد پہنچ گئے۔ گھر میں صرف خواتین رہ گئیں۔ لوگوں نے سپارے اٹھا کر رکھ دیے، دعائیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پڑوسیوں کے گھر سے چائے آگئی۔

"ہم تو رات کا کھانا کھائے ہوئے تھے۔ صبح جیسے ہی اطلاع ملی ہم کو تو ہوش ہی نہیں رہا۔ بھاگم بھاگ آ گئے۔" صفیہ بیگم سب کو چائے بانٹنے لگیں اور پھر بولیں۔ قریب کھڑی آمنہ حیرت سے اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

"ارے بیٹی آمنہ! چائے پی لو صبح سے پڑھ رہی ہو، سر میں درد ہو گیا ہو گا۔" اس نے بیزاری سے ماں کی طرف دیکھا اور کپ ہاتھ میں لے لیا۔

اب آہستہ آہستہ مرد حضرات نے آنا شروع کر دیا تھا۔ مغرب کی اذان تک سب واپس آ گئے اور پھر کھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کھانے کی بڑی اچھی خوشبو آ رہی تھی تھوڑی دیر بعد سب کے لیے کھانے کا اہتمام ہو گیا اور لوگ غمزدہ گھر کے افراد کو کھانا کھلانے لگے۔ باقی مہمانوں کو بھی بٹھا دیا گیا۔ صفیہ بیگم اپنے میکے والوں کی خاطر میں لگ گئیں کیونکہ انہوں نے اپنے میکے والوں کو بھی زبردستی کھانے پر روک لیا تھا۔

غرض کہ انہوں نے جیٹھ کے انتقال کو اپنا نہیں جانا اور دکھاوے میں لگی رہیں۔ آمنہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ماں کے ساتھ شکوہ شکایت بالکل فضول ہے۔ ابو ہمیشہ امی کے سامنے ہار جاتے تھے اور چھوٹے بہن، بھائی ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ کوئی فیصلہ کر سکیں اور اپنی ضد کو منوا سکیں۔ بس آمنہ ہی کڑھتی رہتی تھی۔

غرض کہ چالیسویں تک صفیہ بیگم کے ڈرامے چلتے رہے اور اس دوران انہوں نے کسی بھی طرح سسرال والوں کی حقیقی معنوں میں دلجوئی نہیں کی۔

ہر جمعرات کو جب دادی کے گھر قرآن پڑھنے جانا ہوتا تو وہ سب کام کر کے وہاں دیر سے جاتی تھیں اور وہاں بھی صرف باتیں اور کہانیاں ہوتی تھیں۔ وقت یوں ہی گزرتا گیا۔

☆☆☆

ٹرن ٹرن ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا فجر کی نماز پڑھ کر صفیہ بیگم ابھی لیٹی تھیں۔ گھنٹی خاموش ہو گئی۔

ٹرن، ٹرن دوبارہ گھنٹی سنائی دی۔ دوسری طرف صفیہ بیگم کی چھوٹی بہن تھی۔

"ہیلو....." صفیہ بیگم نے آنکھیں مسلتے ہوئے آواز نکالی۔

"آپا میں اتنی دیر سے تم کو موبائل پر فون کر رہی ہوں تم نے اپنا موبائل آف کیا ہوا ہے اور فون بھی نہیں اٹھا رہی ہو۔"

"ہاں بولو کیا بات ہے؟" صفیہ بیگم نے پوچھا۔

"آپا بھائی جان کا انتقال ہو گیا۔ تم جلدی آ جاؤ۔" دوسری طرف سے اس نے روتے ہوئے کہا۔ صفیہ بیگم تو حال سے بے حال ہو گئیں اور ایک منٹ کے اندر سب گھر والوں کو جگا ڈالا اور زور، زور سے رونے لگیں اور روتے، روتے سب کو جلدی تیار ہونے کا کہتی رہیں کہ ہم سب دس منٹ میں نکل جائیں گے۔

آمنہ نے یہ سب دیکھ کر ماں سے کہا۔

"امی اتنی جلدی بھی کیا ہے ابھی تو کوئی بھی نہیں آیا ہو گا، کھانا کہاں سے ملے گا، ناشتے میں انڈے پراٹھے بنا لیں؟"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، وہاں ماموں کا انتقال ہو گیا ہے اور یہاں تم کو انڈے پراٹھوں کی پڑ رہی ہے۔ آخر وہ تمہارے سگے ماموں تھے کوئی غیر نہیں۔" آمنہ دل ہی دل میں بہت کچھ سوچ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں سے اشک ضرور جاری ہوئے تھے مگر کس کے لیے یہ سمجھنے سے وہ خود بھی قاصر تھی۔

ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی

تیرھواں اور آخری حصہ

عیسٰی نے ٹریگر دبا دیا تھا مگر اس دوران چاچو کی بھیانک چیخ سنائی دی تھی۔ عیسٰی کا نشانہ چوکا اور آفاق کی کھوپڑی پاش، پاش ہونے سے بچ گئی۔ آفاق کے منہ سے نکلی تیچاں حسیب انکل برداشت نہیں کر سکے تھے۔ انہیں شدید اٹیک ہوا تھا اور وہ اسی وقت جاں بحق ہو گئے۔ انہوں نے جلد ہی دنیا کے غموں سے چھٹکارا پا لیا تھا۔ بعد کے حالات انتہائی تکلیف دہ تھے۔ آفاق، گھر چھوڑ کر اپنی کو لیے چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے لیے الگ فلیٹ کا انتظام کر لیا تھا۔ عیسٰی کی حالت بہت خراب تھی۔ پاپا کی موت نے اسے نچوڑ ڈالا تھا۔ اسے گھر، دفتر اور حتیٰ کہ مالا بھی بھول گئی تھی۔ ابھی پاپا کو مرے ہوئے چند دن گزرے تھے۔ ابھی پاپا کے زخم سے اس کا اپنا دل زخم رسیدہ ہو رہا تھا۔ پاپا کی جدائی کا غم ابھی تازہ تھا۔ جب علی عیسٰی کی زندگی سے مالا کو اچانک نکال دیا گیا۔

آخر اس رات ہوا کیا تھا؟

☆☆☆

اس رات پھر سے طوفانی بارش آئی تھی۔ تنہا مالا خوف کے عالم میں تھر، تھر کانپ رہی تھی۔ ایک چاچو کا سہارا تھا وہ بھی نہ رہا۔ اسے چاچو کی کمی بڑی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ عیسٰی بھی ان دنوں مالا کی ذات سے بے پروا ہو گیا تھا۔ بلکہ عیسٰی کو تو ان دنوں اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ نہ دفتر جاتا تھا نہ ہی گھر میں ٹکتا تھا..... زیادہ وقت قبرستان میں گزرتا۔ پاپا کی وصیت تھی کہ انہیں مما کے ساتھ ہی دفن کیا جائے۔ عیسٰی نے ان کی وصیت پوری کر دی تھی۔ مگر وہ خود تو مخبوط الحواس ہو رہا تھا... جیسے پاپا کے بعد اسے زندگی کو ترتیب دینا مشکل لگ رہا تھا۔ جیسے پاپا کا ہاتھ میلے میں کسی بچے کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو اور اب عیسٰی تنہا، اکیلا، رنجیدہ مارا، مارا پھر رہا تھا۔ اسے نہ کوئی رستہ نظر آتا تھا نہ کوئی منزل دکھائی دیتی۔ پاپا کی اچانک موت نے اسے گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔ اس کی بے یقینی ختم ہی نہیں ہوتی تھی کہ اس کے پاپا مر بھی سکتے ہیں؟ پھر اسے آفاق پہ شدید طیش چڑھتا تھا۔ جیسے پاپا کی موت کا اصل ذمے دار آفاق ہی تھا۔ وہ اس کے سامنے ہوتا تو عیسٰی اسے گولیوں سے بھون ڈالتا۔ ان دنوں عیسٰی پر پاگل پن کا بھوت سوار تھا۔ اسے ہر چہرے میں اپنے پاپا کا چہرہ دکھائی دیتا۔ اور ہر چہرے پر پاپا کے قاتل کا گمان بھی ہوتا۔ اسے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ وہ

اٹھ کر بار بار دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا تھا۔ ان حالات میں مالا اس کی کیا کیئر کرتی؟ کیا تسلی دیتی؟ کس طرح قریب آتی؟ وہ مالا کو بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ گھر میں ہوتا تو کمرا بند کیے اندھیرے میں پڑا رہتا۔ مالا پاس آتی تو اسے جھڑک کر باہر بھیج دیتا۔ اسے اندھیرے اور تنہائی سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی شکستہ حالت میں مالا کی شکستگی کو نظر انداز کر چکا تھا۔ اسے اپنے غم کے سامنے ہر کسی کا غم ہیچ لگتا تھا۔ کاروبار خسارے میں جا رہا تھا۔ کچن کا راشن ختم ہو رہا تھا مگر عیسیٰ کو کوئی پروا نہیں تھی۔ ملنی کچا پکا کھانا پکا دیتی تھی جسے مالا اکیلے ہی نگلتی۔ علی عیسیٰ تو جیسے چاچو کے ساتھ ہی مٹی میں دفن ہو گیا تھا۔ ایسے حالات میں مالا کی ذہنی کنڈیشن کیا ہو سکتی تھی؟ اس کا دل چاہتا، وہ دیواروں سے ٹکریں مار مار کر خود کو ختم کر لے۔ جس عیسیٰ کے لیے وہ یہاں ہزار میل کاٹ رہی تھی، وہی عیسیٰ پرایا ہو گیا تھا، نہ کوئی دوست موجود تھا نہ کوئی ہمدرد...... مالا شاید عیسیٰ سے پہلے ہی پاگل ہو جاتی...... بلکہ پاگل تو عیسیٰ نے اسے کر ہی دیا تھا۔

یہ چاچو کی وفات کے دس پندرہ دن کے بعد کی بات ہے۔ بلکہ دن کیا، رات ہو چکی تھی۔ اس رات بہت دن بعد موون آئی تھی۔ بس جنازے کے وقت آتے ہوئے مالا نے اسے دیکھا تھا اور اس کے بعد آج آئی تھی۔ وہ آتے ساتھ علی عیسیٰ کے کمرے میں گھس گئی تھی۔ اسی کمرے میں جس سے عیسیٰ نے کچھ دیر پہلے مالا کو جھڑک کر نکال دیا تھا۔ وہ کمرے میں اکیلا رہنا چاہتا تھا اور مالا کی موجودگی اسے ڈسٹرب کرتی تھی۔

مالا کو اس لمحے موون پر رشک آیا تھا۔ وہ جو عیسیٰ کی جھڑکیاں کھا کر لاؤنج کے ایک کونے میں ٹک کر بیٹھی رو رہی تھی۔ موون کو عیسیٰ کے کمرے میں جاتا دیکھ کر رشک کرتی رہی۔ عیسیٰ نے مالا کو کمرے میں سے نکال دیا تھا مگر موون کو ہرگز نہیں نکالا تھا۔ بھلا



موں کو کمرے میں سے نکالنے کی کس میں جرأت تھی۔ حالانکہ عیسٰی چاہتا تو موں کی بے عزتی کرتا، اسے برا بھلا کہتا...... آخر وہ کیسی بیٹی تھی جو باپ کی موت کا سن کر گھڑی بھر کے لیے آئی تھی اور پھر پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔

مگر عیسٰی نے موں کو کچھ نہیں کہا تھا بلکہ خلاف توقع موں کے بجائے عیسٰی کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد عیسٰی کا کمرے سے باہر نکلنا مالا کو حیران کر گیا تھا۔ وہ دونوں بہن بھائی نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے تھے؟ مالا کچھ پریشان ہو کر عیسٰی کی طرف آ گئی تھی۔ اس نے یہی سمجھا تھا جیسے عیسٰی کو کسی چیز کی ضرورت ہے، شاید پانی وغیرہ نہ لینا ہو۔ وہ تو اپنی نادانی میں کچھ سمجھ ہی نہیں پائی تھی جب عیسٰی کے الفاظ اسے آسمان کی وسعتوں سے اٹھا کر زمین کی گہری کھائی تک لے آئے۔ وہ جیسے سرخ آنکھیں لیے مالا کو جھنجھوڑنے آیا تھا۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر مالا خوف اور دہشت سے دنگ رہ گئی تھی۔ یہ علی عیسٰی تو نہیں تھا؟ یہ مالا کا عیسٰی تو نہیں تھا؟ یہ تو کوئی اجنبی شخص کھڑا تھا۔ اجنبی نگاہوں سے گھورتا ہوا۔ تب مالا لمحے بھر کے لیے بھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ عیسٰی اتنا غیر معمولی کیوں لگ رہا ہے؟ وہ جیسے نیند میں تھا مگر عیسٰی تو جاگ رہا تھا۔ مالا کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔ جبکہ اندر بیٹھی ساحرہ اسے مسمرائز کر کے اپنے شعور سے اسے پیغام بھیج رہی تھی۔

”تم میری زندگی کا ناسور ہو، سبز قدم عورت، جب سے میری زندگی میں داخل ہوئی ہو، میرا چین، سکون، اطمینان سب ختم ہو چکا ہے، تم یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتیں؟ تم میری زندگی سے نکل کیوں نہیں جاتیں، میرے گھر سے نکل جاؤ، میری زندگی سے نکل جاؤ۔ فحش، بدکردار......“ عیسٰی جانے کیا کیا بول رہا تھا۔ مالا کی آنکھیں ابل پڑیں، خوف، دہشت، ذلت، توہین اور جانے کون، کون سا دھواں نما احساس دل کے اندر سے اٹھ رہا تھا۔ آگ جیسے جھلسا رہی تھی۔ ذلت جیسے طمانچے مار رہی تھی۔ دہشت جیسے خوف کے عالم میں لرزا رہی تھی۔ کیا زمین پر زلزلہ آ گیا تھا؟ کیا آسمان ٹکڑے، ٹکڑے ہو کر گر پڑا تھا؟ اس کے آس پاس کیسی تباہی ہو رہی تھی۔ آخر مالا کی زندگی میں بھونچال آ ہی گیا تھا۔

عیسٰی جس طوفان کے مانند آیا تھا، اسی طرح واپس پلٹنے کے بجائے باہر نکل گیا۔

اور مالا پورے قد کے ساتھ زمیں بوس ہو گئی تھی۔ یہ عیسٰی اسے کیا کہہ کر گیا تھا۔ فحش، بدکردار، اتنی غلیظ گالی؟ کیا مالا اسی گالی کی حقدار تھی، کیا وہ اسی ذلت کی حقدار تھی؟ کیا وہ اتنے گندے الفاظ کی حقدار تھی؟ اندر کہیں بھالے سے چبھے تھے، کوئی انی سی گھپی تھی، کہیں درد سا اٹھا تھا۔ کہرام سا مچا تھا۔ شاید مالا کی موت ہو گئی تھی۔ اندر غم کے چشمے پھوٹ پڑے تھے۔ اس کے قدم کیچڑ میں پڑ رہے تھے، مالا کا پورا وجود کیچڑ سے لت پت تھا۔ وہ اس دلدل سے بھلا کیسے نکلتی؟ وہ اس اذیت سے بھلا کیسے بچتی؟ صدمے کا بوجھ سوا ہونے لگا، آنکھیں ابلنے کو بے تاب تھیں اور مالا عیسٰی زمین پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ وہ خود کو پیٹ رہی تھی۔

اپنے سر کو زمین سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں چیخ رہی تھی۔

آخر اس کا کیا قصور تھا؟ کیا اس نے چاچو کو مارا تھا؟ کیا اس نے آفاق سے کہا تھا کہ عیسٰی کو دھوکا دے؟ وہ سب کی طرف سے دی گئی اذیتوں کا اکیلی مالا سے بدلہ لے رہا تھا۔ وہ کہاں کا منصف تھا؟ وہ کہاں کا عدل کر رہا تھا؟ مالا دھاڑیں مارتی رہی، چیختی رہی، روتی رہی، تب دبے قدموں چلتی ہوئی ثنا، مالا کے قریب آ گئی تھی۔ وہ اسے چپ کروا رہی تھی۔ اسے پانی پلا رہی تھی۔ مالا کی پیشانی

سے نکلتا خون صاف کر رہی تھی پھر اس نے مالا کے دوپٹے کا پلو پکڑ کر اس میں کوئی چیز باندھ دی تھی۔

''یہ تمہارے کاغذات ویزا، پاسپورٹ، مالا! تم یہاں سے بھاگ جاؤ، عیسیٰ تو پاگل ہو چکا ہے۔ کسی شب تمہارا گلا گھونٹ دے گا۔ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ وہ مجھے بھی مار ڈالے گا۔ تم بھاگ جاؤ یہاں سے میں بھی اِدھر سے نکلنے والی ہوں۔'' نینی کی آنکھوں سے خوف اور دہشت پھوٹ رہی تھی۔ وہ مالا کو کیسی راہ دکھا رہی تھی؟ کیا وہ اس کی ہمدرد تھی؟ نہیں..... وہ مالا کی ہمدرد کیسے ہوسکتی تھی؟ کیا خبر، آفاق جھوٹ کہہ رہا ہو۔ کیا خبر، نینی اس کے لیے کوئی روشنی کی کرن لیے ہی ہو؟ مالا جس ٹوٹ پھوٹ میں مبتلا تھی، اس کا ذہن ناکارہ ہو چکا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی کوئی صلاحیت کام نہیں کر رہی تھی۔ وہ بس دم بخود سی نینی کو دیکھ رہی تھی جب فون کال نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ یہ کال کس کی تھی؟ شاید عیسیٰ کی مگر عیسیٰ اسے فون کیوں کر رہا تھا؟ مالا سے کچھ سوچا ہی نہیں گیا۔ اس نے کارڈلیس کان سے لگایا تب عیسیٰ کی بھیانک آواز سنائی دی تھی۔ اتنی بری، خوفناک اور بھیانک آواز مالا نے عمر بھر نہیں سنی تھی۔ وہ عیسیٰ تھا یا کوئی وحشی درندہ.....؟ مالا کے سر پر ہتھوڑے مار رہا تھا۔ آج روئے زمین پر عیسیٰ جیسا ظالم، سنگدل اور وحشی انسان کوئی نہیں تھا۔ اس نے مالا کے کانوں میں زہر پھونک ڈالا تھا۔

''میں علی عیسیٰ بقائمی ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں..... طلاق دیتا ہوں..... طلاق دیتا ہوں.....'' فون بند ہو چکا تھا اور مالا چکرا کر زمین بوس ہونے لگی تھی۔ نینی اسے نہ تھامتی تو مالا کا وجود جیسے پاش پاش ہو جاتا۔ قیامت کی گھڑی نہ جانے کب ہوگی۔ مالا کو تو آج کا دن ہی روزِ قیامت لگ رہا تھا۔ اس کا سب کچھ جیسے لٹ گیا۔ وہ برباد ہوگئی تھی۔ تباہ ہوگئی تھی۔ دنیا، جگ، سنسار اور اس جہان میں مالا جیسا بدبخت کوئی نہیں تھا۔ عیسیٰ نے اسے پاتال میں گرا دیا تھا۔ اسے ان گناہوں کی سزا ملی تھی جو اس سے سرزد بھی نہیں ہوئے تھے۔ یہ کیسے کالے دل والے لوگ تھے؟ یہ کیسے سنگدل لوگ تھے؟ سمندر پار سے لوگوں کے جگر پارے لے آتے اور انہیں بغیر کسی جرم کے سزائے موت سنا دیتے؟

عیسیٰ نے کیسا گھاؤ لگایا تھا؟ کیسا قلق، دھوکا اور چھل دکھایا تھا؟ اگر وہ اسے بدکردار سمجھتا تھا تو یوں بغیر تصدیق کے سزا تو نہ سناتا کم از کم کوئی وضاحت مانگتا..... مالا اپنی صفائی پیش کرتی۔ اگر عیسیٰ کا دل مطمئن نہ ہوتا تب اسے بے شک اپنے سے الگ کر دیتا۔

مالا اگر بدکردار تھی تو عیسیٰ کوئی ثبوت تو لاتا۔ یوں بغیر کسی جرم کے اتنی بڑی سزا.....؟

مگر اس وقت مالا کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند گر رہی تھی۔ نینی اسے بھاگ جانے کا مشورہ دے رہی تھی۔ مالا کے پاس اب رکنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ وہ یہاں سے اب جانے ہی والی تھی۔ یہ پیارا گھر، علی عیسیٰ کی محبت، اس کی دی گئی ذلت..... مالا یہاں سے کیا کچھ لے کر لے جا رہی تھی۔ وہ خالی ہاتھ تو نہیں تھی اس کے پاس تو علی عیسیٰ کی بے شمار یادیں تھیں۔ اس کی دی گئی ذلت تھی، نفرت اور حقارت تھی۔ اس کے علاوہ طلاق کا بدنما داغ بھی تھا۔ وہ مفلس، قلاش یا غریب کہاں تھی؟ وہ تو مغربی جرمنی سے مالا مال ہو کر جا رہی تھی۔

''م..... میں جا رہی ہوں عیسیٰ! یہ گھر آپ کو مبارک ہو۔ اچھا نہیں کیا آپ نے عیسیٰ.....! اچھا نہیں کیا آپ نے.....'' وہ بے ربط بولتی کوئی مخبوط الحواس لگ رہی تھی۔ کوئی مجنوں لگ رہی تھی۔ کوئی پاگل لگ رہی تھی۔ جیسے کوئی دیوانی ہو، کوئی فقیرنی

...... اس کے بال بکھرے تھے۔ پیشانی سے خون نکل رہا تھا۔ دوپٹا گلے میں جھول رہا تھا۔ جوتے نہ جانے کہاں تھے؟ وہ کسی بھکارن کی طرح ایک، ایک چیز کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ تب باہر بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی تھی۔ بالکل غیر مانوس سی آواز...... پھر جیسے کسی چیل کی طرح اس پر جھپٹی تھی۔ مالا کا بازو دبوچ کر وہ سٹنگ روم کے دروازے تک لے آئی۔

''بھاگ جاؤ مالا......! یہ لوگ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔ پہلے سبز باغ دکھاتے ہیں، اپنا کام لیتے ہیں، مطلب نکلواتے ہیں پھر مار ڈالتے ہیں۔'' نکی بے ربط بولتی، چیختی ہوئی لاؤنج کی طرف آ گئی تھی۔ پھر مالا کے دیکھتے ہی دیکھتے بھاری بوٹوں والوں نے پیٹرول کی بوتلیں، نکی پر خالی کر کے اسے آگ لگا دی تھی۔ آگ جو ہر طرف پھیل رہی تھی۔ آگ جو نکی کو جھلسا رہی تھی۔ آگ جو اسے راکھ کا ڈھیر کر رہی تھی۔

مالا کی بھیانک چیخیں اس کے حلق میں گھٹ گئیں۔ اس کی آواز جیسے بند ہو گئی تھی۔ وہ گونگی اور بہری ہو گئی۔ الٹے قدموں سیدھی سڑک پر بھاگتی مالا کا دوپٹا اس کے پیروں میں لوٹ رہا تھا۔ اس کے بال الجھے اور بکھرے تھے۔ خون کے جا بجا دھبے تھے اور وہ کان بند کیے سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ خون جو اس کے ماتھے پر سوکھ چکا تھا۔ دھبے جو اس کے منہ پر پڑ چکے تھے۔ آگ جو اس کی آنکھوں میں جم گئی تھی اور خوف جس کے حصار میں وہ عمر بھر کے لیے مقید ہو گئی تھی۔ آنسو جو کبھی نہ خشک ہونے کے لیے آنکھوں سے جاری ہو چکے تھے۔ کوئی اس کے کان میں دھیرے، دھیرے بول رہا تھا۔ بوار یا میں گزارے دن، بوار یا کی وہ شامیں...... کسی نے مالا کی حیران آنکھوں میں جھانک کر ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''تم...... تم اتنا حیران کیوں ہوتی ہو؟ موتیوں کی سفید مالا......!'' وہ ہنستا، ہنستا پائنتی کی طرف بیٹھ گیا تھا۔ مگر یہاں پائنتی کہاں تھی؟ علی عیسیٰ کہاں تھا؟ یہ آواز کہاں تھی؟ مالا تو سڑک پر اندھا دھند بھاگ رہی تھی مگر یہ آواز...... مالا کے کان پھٹنے لگے تھے۔ وہ عیسیٰ کی آواز کبھی نہیں سننا چاہتی تھی مگر یہ آواز......

''پتا ہے...... تم مجھے کبھی کبھی کیا لگتی ہو؟'' وہ مسکرا رہا تھا۔ اتنی میٹھی مسکراہٹ تھی۔ قاتل کی ساری ادائیں قتل کرنے والی تھیں۔ مالا کا معصوم دل سہہ نہ پاتا...... وہ مٹھاس کا دریا تھا اور مالا شیرے میں ڈوبنے والی جل ترنگ...... وہ کرم شب تاب تھا اور مالا اس کی دیوانی...... کبھی جو علی عیسیٰ کی صبیح پیشانی پر ناگواری کے بل ابھرتے تب بھلا مالا کا کیا بنتا......؟ شاید اس کا دل ہی بند ہو جاتا...... اور اس کا دل جیسے اب بند ہو رہا تھا۔

''اچھا تو...... میں تمہارے رونے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' وہ فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔ مالا کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔ کوئی اس کے آس پاس نہیں تھا۔ وہ تنہا تھی، اکیلی تھی، بے یار و مددگار تھی۔ وہ بھاگ رہی تھی۔ رو رہی تھی مگر کوئی اسے چپ کروانے والا نہیں تھا۔ کوئی اس سے رونے کی وجہ پوچھنے والا نہیں تھا۔

''کیا سما (آسمان) کے شیستران (ستارے) بھی جھوٹ بولتے ہیں۔'' کسی نے ہلکی سی خفگی کے ساتھ جتایا تھا۔ مالا کو بڑی زور کی ٹھوکر لگی تھی۔ وہ جیسے منہ کے بل گر گئی تھی۔ یہ کون سی جگہ تھی؟ یہ کون سا خطہ تھا؟ یہ کون سی سرزمین تھی؟ ہاں یہ تو علی عیسیٰ کا من ہائیم تھا۔ وہ من ہائیم جہاں محبت سانس لیتی تھی۔ جنگلوں میں دم لیتی تھی۔ جہاں خوش پوشاک بے فکرے لوگ چہلیں کرتے تھے۔ یہ خوابوں کا دیس تھا۔ یہ سنہرے ریشم جیسے لوگوں کا دیس تھا۔ جہاں دھوپ میں چشمے پھوٹتے تھے۔ جہاں رات میں بلورے کھلتے تھے۔ جہاں رات میں نگینے بکھرتے تھے۔ جہاں سہانے خوابوں میں کنول کھلتے تھے۔ یہ اور یل ایراق کی بستی تھی، یہاں سفید پریاں

اترتی تھیں۔ یہ کہکشاؤں کا نگر تھا۔ یہ اجنبیوں کا نگر تھا۔ اور وہ اپنے ڈیڈی کی المیرہ اپنے الکہ (وطن) سے لاکھوں میل دور نہ جانے کہاں، کہاں بھٹک رہی تھی۔ وہ البہار کی تمناؤں اور خوابوں کو آنکھوں میں سمیٹے ایک سنہری ساحرہ کے جال میں جکڑ گئی تھی۔ تو کیا وہ انجان سی چھوٹی لڑکی رستہ بھٹک گئی تھی۔ ہاں، وہ انجان لڑکی رستہ بھٹک گئی تھی۔ پھر کوئی شہزادہ اسے راہ بتلانے نہیں آیا تھا۔ رستہ کھوٹا ہوا تو منزل بھی کھسک گئی۔ پاؤں تھکے تو سفر بھی لمبا ہو گیا۔ آنکھ نم ہوئی تو نیند بھی روٹھ گئی۔ چلتے، چلتے اسے پھر سے ٹھوکر لگی۔ اسے ایک سنہری ناگن نے ڈس لیا تھا۔ مالا کا پورا وجود نیلا، نیل ہو گیا۔

''تم چپکے، چپکے اس لیے مسکراتی ہوتا کہ میں تمہیں نظر نہ لگا دوں۔'' عیسیٰ کی محبت لبریز آواز اس کی سماعتوں میں انگارے بھر گئی تھی۔ وہ مسکرا کہاں رہی تھی؟ وہ تو چلا رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ قسمت کے اس بھیانک موڑ پر دم بخود تھی۔ جیسے اسے اپنی بربادی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

''سفید پھولوں کی مالا کے لیے، بواریا کا حسین ترین تحفہ'' عیسیٰ نے اس کے دوپٹے کا کونا پکڑ کر کئی گلاب اس میں الٹ دیے تھے۔ وہ اس وقت جھک کر بڑی خواب آگیں نظروں سے مالا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت گزشتہ کے رومان پرور ناول کا کوئی رومانوی کردار لگ رہا تھا۔ جو اپنی شہد جیسی شار لوٹ کے عشق میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ مالا کو بھاگتے، بھاگتے پھر سے ٹھوکر لگی تھی۔ اس نے پاگلوں کی طرح اپنا دوپٹا دیکھا۔ دوپٹے میں سفید پھول نہیں تھے۔ ہاں کچھ اور ضرور تھا۔ مالا کو سوچنا نہیں پڑا تھا۔ اس کے دوپٹے میں ذلت کے ڈھیر، رسوائیوں، تنہائیوں اور طلاق کے کچھ غلیظ دھبے بھی تھے۔ اس کا دوپٹہ رسوائیوں کے بوجھ سے بڑا وزنی ہو رہا تھا.... بدکرداری کے داغوں سے آلودہ تھا۔ اس سے دوپٹے کا بوجھ اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ اس سے ذلت کا بوجھ اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ اس سے طلاق کا بار اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بواریا کا حسین ترین تحفہ وہیں الٹ کر من ہائیم کا غلیظ ترین تحفہ سمیٹے جا رہی تھی۔

''اس سے بہتر تھا.... تم یوں کہتیں.... مجھے آپ سے شدید قسم کا طوفانی عشق ہو چکا ہے۔'' وہ حسرت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کی حسرت اب مالا کی آنکھوں میں بھر گئی تھی۔ اس نے آنکھیں رگڑ، رگڑ کر آس پاس کے منظر دیکھے.... یہ کوئی بس اسٹاپ تھا۔ ایک بس اسے دیکھ کر رک گئی۔ مالا نے پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھا تھا۔ اسے کیا کرنا تھا؟ بس پر سوار ہونا تھا یا پھر پیدل چلنا تھا؟ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ وہ ہونقوں کی طرح بس کو آگے بڑھتا دیکھ رہی تھی۔

''بتاؤ ناں.... میرے بغیر دل لگ گیا؟''

بڑی آس لیے پوچھنے والا مالا کے دل کا مکین اب کہیں نہیں تھا۔ مگر اس کی آواز اس کے کان پھاڑ رہی تھی۔ وہ سڑک پر پھر سے بھاگنے لگی۔

''نہیں.... نہیں.... نہیں.... کبھی نہیں....''

مالا نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ وہ اپنی چیخیں روکنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے آنسو روکنا چاہتی تھی مگر اتنی.... بے بس کیوں تھی؟

''تم محبت کرتی ہو عیسیٰ سے تو کیا ہوا؟ سوزی بھی تو عیسیٰ سے محبت کرتی ہے۔ کیا سوزی کو عیسیٰ مل گیا؟ نہیں ناں تو پھر تمہیں کیسے مل سکتا ہے؟'' ہوا کی لہروں پر مون کی آواز لہرا رہی تھی۔ بل کھاتی ہوئی ایک حسین ناگن، جس نے مالا کے پورے وجود کو ڈس لیا تھا۔ اس کے حلق سے گھٹی، گھٹی چیخیں نکلنے لگیں۔

''میرا بھائی عنقریب تمہیں طلاق دے گا۔''

مون کا تکبر اسے کپکپا رہا تھا۔ مالا کے پورے وجود پر لرزہ طاری ہونے لگا۔

''تم عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو۔'' وہ دھیمی آواز میں زہر گھول رہی تھی۔ مالا کو لگا اس کی

سانسیں رک رہی ہیں۔

''عیسیٰ تمہیں طلاق دے گا۔''

''عیسیٰ تمہیں طلاق دے گا۔''

''تم عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو۔''

مون زہر پھونک رہی تھی۔ وہ بل کھاتی ناگن اب بھی مالا کے پیچھے تھی۔ مالا نے خوف کے عالم میں مڑ، مڑ کر دیکھا۔ کوئی اسے پکار رہا تھا۔

''تم عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو۔''

مون خونخوار بلا کی طرح اس کے سر پر سوار تھی۔ وہ اسے مارنے والی تھی۔ وہ اس کا گلا گھونٹنے والی تھی۔ وہ خون منہ کو لگائے اسے نگلنے والی تھی۔ کسی نے مالا کو پھر سے پکارا تھا۔ کوئی مالا کے پیچھے آرہا تھا۔ مالا نے سرپٹ دوڑ لگا دی تھی۔ وہ اپنی جان بچانا چاہتی تھی۔ اپنے لیے نہیں، اپنے بچے کے لیے...... بچہ...... علی عیسیٰ کا بچہ...... مالا کا بچہ...... کوئی اسے پیچھے سے پکار رہا تھا۔

''مالا رک جاؤ۔'' کوئی اس کے پیچھے آرہا تھا۔ کوئی اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ کسی نے مالا کا بازو دبوچ لیا تھا۔

''تم علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو۔''

مون کی بھیانک آواز اس کے پیچھے پھر سے آئی۔ اس نے دم بخود ہوکر مڑتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹ بے آواز پھڑپھڑائے۔

''میں علی عیسیٰ کی زندگی سے نکل چکی ہوں۔''

مالا سامنے کھڑے وجود کے گلے لگ کر دہاڑیں مارتی ہوئی رو رہی تھی۔ وہ اپنے دل پر گزری ایک، ایک قیامت کا اسے بتا رہی تھی۔ وہ اپنے زخم، زخم دل کو ہاتھ میں رکھ کر اسے دکھا رہی تھی۔ مالا کے دل پر بڑا بوجھ لدا تھا۔ اب غم گسار کو دیکھ کر وہ برداشت نہیں کرسکی تھی۔ وہ اپنے سامنے کھڑی ہیرا کو اپنے پہ گزرنے والی ہر قیامت کی خبر دے رہی تھی۔ اور ہیرا جیسے پتھر کا بت بنی سن رہی تھی۔ اس کے لیے مالا کو اُن حالوں میں دیکھنا محال تھا۔

☆☆☆

آگے کے حالات پہلے سے بھی بدتر تھے۔ ابو...... اور ہیرا تو عیسیٰ اور مون کا گریبان پکڑنا چاہتے تھے۔ وہ پولیس کو تمام واقعات بتانا چاہتے تھے مگر مالا کو یہ سب گوارا نہیں تھا۔ جب عیسیٰ تمام تعلق توڑ چکا تھا۔ مالا کو طلاق دے چکا تھا۔ تب بھلا وہ کیونکر واپس پلٹتی...... طلاق کے بعد وہ عیسیٰ پر حرام ہوچکی تھی اور اس نے بقائمی ہوش وحواس عیسیٰ کا فون سنا تھا۔ عیسیٰ نے واپسی کا کوئی رستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔ ہلکی سی گنجائش بھی ہوتی تب بھی مالا سارے گھاؤ بھلا کر واپس علی عیسیٰ کی زندگی میں لوٹ جاتی۔ وہ اس کی زندگی تھا، اس کے بغیر زندگی میں نہ کوئی رنگ بچا تھا اور نہ کوئی خوشی...... ابوبکر شریعت کی رو سے بتا رہا تھا کہ ابھی مکمل طلاق نہیں ہوسکتی۔ کوئی نہ کوئی گنجائش نکل ہی آئے گی۔ اگر عیسیٰ چاہے تو...... مگر عیسیٰ کیونکر چاہتا......؟ اگر اسے اتنا ہی خیال یا احساس ہوتا تو وہ طلاق ہی نہ دیتا۔ اسے فاحشہ، بدکردار اور اتنے غلیظ الفاظ کہتا۔ بغیر کسی ٹھوس شہادت اور ثبوت کے اسے بدکردار کہہ کر طلاق دینے والا علی عیسیٰ اس کے کسی مجرم کو سامنے تو لاتا۔ آخر عیسیٰ نے کس کے ساتھ مالا کو نتھی کرتے ہوئے اتنا بڑا بہتان لگایا تھا؟ کم از کم وہ کسی کا نام تو لیتا...... اویس یا آفاق؟ یہ دو لوگ ہی تو مالا کے آس پاس تھے۔ جب کسی کا نام لیے بغیر وہ اسے بدکردار کہہ کر اپنی زندگی سے نکال سکتا تھا تو پھر واپسی کا بھلا کیا سوال......؟

مالا کی حالت بہت شکستہ تھی۔ ہیرا اور ابوبکر اسے واپس پاکستان جانے نہیں دے رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے مالا کچھ صحت مند ہوجائے۔ مگر مالا یہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ پھر ہیرا اور ابوبکر جیسے بے بس ہوگئے۔ مالا کا ویزا اور پاسپورٹ اس کے پاس ہی تھا۔ نبی کی مہربانی، ممی کا پہلا اور آخری

مالا کی ذات پر احسان...... وہ خود تو اپنی ہی لالچ کی آگ میں جل گئی تھی مگر جاتے، جاتے بھی نیکی...... ہاں، کم از کم ایک نیکی اپنے اعمال نامے میں لکھوا گئی۔ مون، کے ساتھ مل کر دولت کے لالچ میں اسے برباد کرنے والی اپنی ہی لالچ کی آگ میں جھلس گئی تھی۔ وہ فلیٹ، کار اور سپر اسٹور اس کے پچھلوں کی عیش کا سبب بن گیا تھا۔ اور خود نینی نے بھلا کیا خریدا......؟ دنیا میں بھی آگ اور آخرت میں بھی آگ...... آخر عیسائی مذہب کا بھی تو معاد پر ایمان ہوتا ہے۔ بھلا انسان سمجھتا کیوں نہیں......؟ اپنے سامنے کھلی نشانیاں دیکھ کر بھی عقل کو بیچ میں نہیں لاتا؟ جو کسی کی خاطر کنواں کھودتا ہے، بالآخر اس کنویں میں پہلے خود گرتا ہے، دوسروں کی راہ میں انگارے بچھا کر اپنی زندگی کو لوگ گلزار کیسے بنا سکتے ہیں؟ خواہشات کے تلاطم پر جانے والے خواہشات کی موجوں کا پیچھا کرنے والے یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ دنیا تو آخر اتر ہی جاتے ہیں۔

مالا مری ہوئی نینی کی روح کے سامنے بھی احسان مند تھی۔ مالا پر اس نے ایک نیکی تو کر ہی دی تھی۔ اس کے دوپٹے کے کونے میں بندھا پاسپورٹ، کاغذات جیسے آگے کے سفر کو آسان کر گئے تھے۔ اور مالا کو اللہ نے صبر اور شکر کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ جانے اس سے کہاں بھول چوک ہوئی تھی جو اتنی شدید پکڑ میں آ گئی۔ مگر اس نے پھر بھی اللہ سے صبر اور دعا کے ساتھ مدد مانگی تھی۔ دعا کے بارے میں اسے کامل یقین تھا۔ خلوص دل اور دکھے دل سے نکلی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات تھی کہ قبولیت انسان کی مرضی سے نہیں، صرف اللہ کی رضا سے ہوتی ہے اور مالا نے خود کو اللہ کی رضا میں راضی کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، جس نے بھی کیا...... مالا نے اپنے سارے معاملات کو اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ تب اس کے دل میں سکون اتار دیا گیا۔ حالانکہ جو عمر بھر کی بے قراری تھی اس کا خاتمہ تو نہیں ہو سکتا تھا مگر مالا نے صبر کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

پھر وہ اتنی خوش نصیب تو تھی ہی جو اسے راہ چلتے ہوئے ہیرا جیسی دوست مل گئی۔ وہ جو مالا کے لیے پری بدیع الجمال بن گئی تھی۔ اللہ آسمانوں سے مدد کے لیے پریاں نہیں اتارتا۔ بلکہ انسانوں کو وسیلہ بنا دیتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ رستے میں کھڑے خضر نہیں ملتے؟ اسے تو رستے میں کھڑا خضر بھی مل گیا۔ وہ رستہ بھٹک رہی تھی، منزل بھٹک رہی تھی۔ اسے تو شہزادہ سیف الملوک بھی مل گیا۔ ڈاکٹر ابوبکر جیسے فرشتے کی صورت میں...... جس طرح شبنم کے قطرے مرجھائے ہوئے پھول کو تازگی بخشتے ہیں اسی طرح ابوبکر اور ہیرا کی محبت، خلوص اور نرم الفاظ نے اس کے مایوس دل کو تازگی اور ڈھارس پہنچائی تھی۔

دکھ انسان کے مرنے سے نہیں ہوتا بلکہ اپنائیت، محبت اور خلوص کے تعلق کے ٹوٹ جانے کا ہوتا ہے۔ جب دل اداس ہوتا ہے تو یادوں کے تعاقب کی طرف نکل جاتا ہے اور جب فگار ہوتا ہے تو خود ایک عذاب انگیز یاد بن جاتا ہے۔ دل کے رستوں پر چلنا آسان نہیں ہوتا۔ اور دل کے رستوں سے اترنا تو اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ تسبیح کے دانوں پر ایک ورد کرتے، کرتے جا بجا دھاگا ٹوٹ جانے سے تسلسل تو ٹوٹ ہی جاتا ہے مگر ورد کبھی نہیں بھولتا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ محبت اتنی نہ کرو کہ اس کی جدائی نہ سہہ سکو۔ مگر کہہ دینا ہمیشہ سہل ہوتا ہے جو سہتا ہے خبر بھی وہی رکھتا ہے اور ہیرا جو پری بدیع الجمال کی طرح اس کے لیے روشنی کا مینار بن کر کھڑی تھی۔ دن رات جیسے اسے ایک ہی سبق یاد کرواتی۔

''اپنے ماضی کو بھول جاؤ...... ماضی میں بند کیا رکھا ہے مالا......! اللہ نے چاہا تو تمہاری زندگی پھر سے گلزار ہوگی۔'' وہ اسے طوطے کی طرح رٹواتی

تھی جب تک ٹکٹ کنفرم نہ ہوگئی۔ وہ قطرہ قطرہ اس کے کانوں میں نصیحتیں ٹپکاتی رہی۔ ”بھول جاؤ تمہارے ماضی میں کچھ نہیں رکھا۔“

بھولنا آسان نہیں تھا مگر وہ اپنے دوستوں کو مطمئن ضرور کر لیتی تھی۔ پھر صرف چار دن کے بعد اس کی سیٹ بھی کنفرم ہوگئی۔ راہ چلتے خضر اسے منزل تک پہنچانے ائرپورٹ آئے تھے۔ نم آنکھوں کے ساتھ اس اجڑی مالا کو الوداع کہتے ہوئے ان کے چہرے غمزدہ تھے۔ اگر مالا مجبور نہ کرتی تو ابوبکر کے لیے عیسیٰ تک پہنچنا کچھ مشکل تو نہیں تھا۔ مگر مالا نے اسے ایسا نہ کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ جب واپس پلٹنا ہی نہیں تھا تو پھر وہ مڑ مڑ کر کیوں دیکھتی؟

جہاز جب آسمان کی وسعتوں میں تیرنے لگا تو اجڑی پجڑی مالا کے آنسو پھر سے رواں ہوگئے۔ ضبط کرتے کرتے بھی ٹانکے ادھڑ گئے تھے۔

نچلی بلندی سے جہاز اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ بادلوں کا سفید دھواں چھٹ رہا تھا۔ دھنکی ہوئی روئی جیسے دور کوہساروں پر مجمع بنائے بین کررہی تھی۔ من ہائیم کے نواحی جنگلات اب کوسوں دور تھے۔ لال چھتوں والی آبادیاں سرخ نشان بن چکی تھیں۔ بواریا کے کھیت جس میں ہری اور بھوری بستی فصلوں کی تازہ کٹائی ہوئی تھی۔ ایک نکتے کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ جہاز پھر یوگوسلاویہ اور آسٹریا کے ملکوں سے گزر رہا تھا۔ من ہائیم بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ من ہائیم اس سے بچھڑ گیا تھا۔ دریائے نیکر اس سے جدا ہوگیا تھا۔ بیلے کے پار جنگلوں میں مور رونے لگے تھے۔ تالاب پہ پریاں اتر آئی تھیں۔ بدیع الجمال صدمے سے بکھری تھی اور شہزادہ سیف الملوک اسے الوداع کہہ رہا تھا۔ آدم اور حوا کی ازل سے چلتی کہانی کا بالآخر اختتام ہوگیا تھا۔ ”ترکِ وفا“ کا بالآخر انجام ہوگیا تھا۔ زندگی ایک دفعہ تو رک گئی تھی مگر زندگی رک کہاں سکتی ہے۔ اس نے تو چلتے ہی جانا ہے۔ چاہے جتنے بھی نشیب و فراز آتے رہیں۔ جتنے بھی دکھ... درد اور غم کے پہاڑ آتے رہیں۔ چاہے جتنی بھی مشکلات سے اٹی سرحدیں آتی رہیں۔ زندگی نے تو آگے ہی بڑھنا ہوتا ہے اور زندگی آگے بڑھتی ہی رہی مگر مالا نے اپنی زندگی سے وفا کو ترک کردیا تھا۔ اس کا وفاؤں سے بھروسا اٹھ گیا تھا۔ وہ پچھلے چھ ماہ کو سوچتی تو اک خواب کی سی کیفیت لگتی۔ جیسے کوئی سنہرا خواب اچانک کسی چھناکے سے توڑ دیا جائے۔ مالا کو لگتا اس کے ساتھ کوئی انہونا واقعہ پیش آیا ہے۔ حالانکہ اس دنیا میں اور بھی نہ جانے کتنے بھیانک اور برے سانحے پیش آتے ہوں گے۔ اسی سفر کے دوران مالا کے ساتھ بیٹھی لڑکی نے اسے روتے ہوئے دیکھ کر اپنی دردناک کہانی سنائی تھی۔ وہ بھی مالا کی طرح طلاق کا بدنما داغ لیے واپس جا رہی تھی۔ اس کا شرابی، بے غیرت اور ذلیل شوہر اسے فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ نہ جانے کیسے اپنی جان بچا کر بھاگی تھی۔ اس لڑکی کی کہانی سن کر بھی مالا کو اپنا غم بہت بھاری لگ رہا تھا۔ مالا کو یوں محسوس ہو رہا تھا جس دکھ اور عذاب سے وہ گزری ہے۔ ایسے حالات کسی اور کو پیش نہیں آسکتے تھے۔ اس کے ساتھ کوئی انوکھا اور انہونا... واقعہ پیش آیا تھا۔ مالا کا ذہن صدمے کی اس کیفیت سے نکل نہیں پا رہا تھا۔ وہ دورانِ سفر صرف روتی رہی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بھی چپ نہیں کرسکی۔ اس کے آنسو تھمنے والے ہی نہیں تھے۔

وہ لاہور پہنچ کر بھی روتی رہی تھی۔ ان کے گھر جیسے صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ جیسے کہرام مچ گیا تھا۔ جیسے کسی کی موت واقع ہوگئی ہو۔ پورا خاندان جمع تھا اور سب کرید کرید کر مالا کی کہانی سننا چاہتے تھے۔ مالا نے بس اپنے باپ کو صرف اتنا بتایا تھا۔ ان جملوں میں اس نے اپنی پوری کہانی سمیٹ ڈالی تھی۔

”اس نے مجھے فاحشہ، بدکردار اور غلیظ الفاظ کہے۔ اس نے مجھے بدکرداری کے جرم میں طلاق دی ہے۔“ جرمنی آنے اور جانے میں کتنا فرق تھا۔ وہ

جب جا رہی تھی تو زمین پر پیر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے گئی تھی اور روتے ہوئے اجڑ کر واپس آ گئی تھی۔ مالا کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ ڈیڈی کو صدمے کی شدت نے اسپتال پہنچادیا تھا۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا۔ علی عیسیٰ، مالا کو بدکرداری کے جرم میں کیسے طلاق دے سکتا تھا؟ ان کی پاکباز، نیک، حیادار بیٹی..... آخر ان کے کون سے تکبر بھرے الفاظ منہ پر پڑے تھے۔ انہیں لگا جیسے وہ منہ کے بل آ گرے ہیں۔ زمین پر، پستی میں، پاتال میں۔

''معاف کرنا حسیب.....! تم نے تربیت تو ٹھیک کی ہے، بیٹی کی مگر مغربی ماحول میں رنگی ہوئی ہے۔ آخر میری مالا کا مون بیٹی کے ساتھ کیا موازنہ..... وہ شرم و حیا کا پیکر، سادہ، نیک طینت، حیادار، باکردار جبکہ مون تو.....'' وہ بھائی کا لحاظ کر کے چپ سے کر گئے تھے۔ ورنہ مون کے لیے بے شرم..... بے غیرت، فاحشہ اور بدکردار جیسے الفاظ ضرور استعمال کرتے۔ دراصل انہوں نے یہ الفاظ کہے نہیں تھے مگر سوچے ضرور تھے۔ اور وہ جو باہر کھڑی دروازے کی جھری میں سے جھانک رہی تھی وہ جیسے لوگوں کے دماغ میں گھس کر جاننے کا دعویٰ تھا۔ وہ کیسے نہ ان کی سوچ کو پڑھ آتی؟ اس نے تایا کے دماغ کو کھوج لیا تھا۔ ان کی سوچ کو کھوج لیا تھا۔ تب اس کے اندر نفرتوں کا طوفان ابل پڑا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ تایا کو منہ کے بل گرانا ہے۔ ان کی حیادار بیٹی کو ذلیل کرنا ہے، ان کے تکبر کا مزہ چکھانا ہے تب وہ اپنی محبت کو بھول گئی تھی۔ اسے صرف اپنا انتقام، توہین، اور ذلت یاد رہی تھی۔

حالانکہ جتنا وقت اس نے مالا کو خوار کرنے اور تایا کو ذلیل کرنے کی پلاننگ میں ضائع کیا تھا اتنا وقت اپنی محبت کے حصول میں صرف کرتی تو آج بامراد ہوتی۔ وہ ذی شاہ کے دل کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لینے کی طاقت رکھتی تھی مگر اس نے آخر کیا، کیا؟ نفرتوں کے زہر پھونکتی رہی، شیطانی منصوبے اور پلاننگ میں خود کو بھی برباد کرتی رہی اور آج تہی داماں تنہا، اکیلی، بیمار، بدحال اور دنیا کے لیے ایک غلیظ مجرم بن گئی۔

خواہش نفرت کے لیے ہو یا محبت کے لیے تپتے صحرا کے مانند ہے۔ جس پر پاؤں رکھنے سے سوائے آبلوں کے کچھ نہیں ملتا۔ محبت کی انتہا ہو یا نفرت کی دونوں رستے جنون کی طرف لے جاتے ہیں۔ مون حسیب کو ذرا سے انتقام، حسد اور ذلت کے جذبے نے انسان سے حیوان بنادیا تھا۔

اگر مالا کو علی عیسیٰ مل سکتا ہے تو مون کو ذی شاہ کیوں نہیں؟ اگر تایا کی بیٹی باحیا باکردار ہوسکتی ہے تو مون حسیب کو بدکردار کیوں کہا گیا؟ کیا وہ تایا کی ایسی غلیظ، گندی اور کریہہ سوچ کی حقدار تھی؟

اس کے دماغ نے اسے جس راہ پر چلایا وہ چلتی گئی۔ دراصل وہ نفس کے شر کا شکار ہوگئی تھی۔ اور مالا صرف صبر کا شکار ہوئی۔ اس کے صبر نے اسے پھر بھی نہیں کیا۔ اگرچہ اس نے اپنا شوہر کھودیا، بچہ کھودیا۔ باپ بھی کھودیا مگر پھر بھی ایک صبر کے حصار سے کبھی نہیں نکلی تھی۔ اس کے صبر نے اسے گندے پانی سے نتھار کر صاف ستھرے طریقے سے باہر نکال دیا اور مون حسیب کے انتقام، حسد اور نفرت کے جذبے نے اسے ذلت کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔

☆☆☆

اسپتال کی سفید گلاس ونڈو پر جالی دار نائیلون کا پردہ پڑا تھا۔ باہر کا سورج پگھل چکا تھا۔ رات تپش کی چونٹیوں سے رینگ، رینگ کر نیچے اتر رہی تھی۔ سفید مرغابیاں جھیلے کی طرف رواں تھیں۔ انہیں اپنے گھونسلوں کی طرف جانے کی جلدی تھی۔ اسپتال کے کمرے میں موت جیسی خاموشی طاری تھی۔ وہ دونوں جیسے کسی پتھر کے مجسمے میں ڈھل چکے تھے۔ ذی شاہ کی آنکھوں میں سوالوں کا ایک طوفان

اندر ہا تھا۔
منکشے نے وہی غلیظ سی مورگن روک پہنی تھی جس کی شرٹ پر گندگی لگی تھی، بلوز نے نما شرٹ جو اسی چغے کا کوئی حصہ تھی۔ اس کے بالوں کا گھونسلا گردن کے پیچھے لٹک رہا تھا۔ گرد آلود، پیچیدے ہوئے بال، میلا کچیلا چہرہ اور عجیب تر مقناطیسی جھلکی ہوئی آنکھیں..... آہ گیلی آنکھیں جو کسی کی بددعا کا عکس نظر آرہی تھیں۔

ذی شاہ کے اندر سوالوں کا ایک بھونچال اٹھ رہا تھا۔ وہ منکشے سے پوچھنا چاہتا تھا..... ''ولین ہاؤس میں کس کا قتل ہوا؟ اور علی عیسیٰ نے مالا کو جو اچانک فون کیا تو اس کے پیچھے مون کی شیطانی چال تو نہیں تھی؟ کیا عیسیٰ نے مالا کو ہپناٹزم کی نیند میں طلاق دی تھی؟ کیا ایسا ہی ہوا تھا؟ ہاں یقیناً ایسا ہی ہوا تھا۔'' ذی شاہ کے اندر باہر جھکڑ چل رہے تھے۔ آندھیاں اٹھ رہی تھیں۔ طوفان بپھر رہے تھے۔ منکشے خاموش تھی۔ ''آخر یہ بول کیوں نہیں رہی اس نے مون حسیب کو کب قتل کیا؟ اور منکشے تھی کون.....؟'' ابھی تو بہت کچھ جاننا باقی تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر منکشے کا کپکپاتا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس کا ہاتھ کسی رعشہ زدہ مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔

''تم نے مقدس قرآن کی قسم کھائی ہے، تم مجھ سے نفرت نہیں کرو گے ناں.....؟'' منکشے اٹھ کر ایک دم ذی شاہ کے پیروں کو پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ جیسے پھر سے بھونچکا رہ گیا۔

''یہ منکشے کیا کر رہی ہے..... اتنی خبطی اور پاگل..... میں تو اس کا علاج کرواتے کرواتے بوڑھا ہو جاؤں گا۔'' وہ جیسے تھک کر سوچنے لگا۔ منکشے اسے ہمیشہ حیران ہی تو کرتی تھی۔

''نہیں..... کبھی نہیں، قیامت تک نہیں۔'' ذی شاہ نے نرمی سے کہا۔ آخر منکشے ایک عظیم کارنامہ سر انجام دے کر بیٹھی تھی۔ وہ مون حسیب کو قتل کر کے اس کا نشان زمین پر سے مٹا چکی تھی۔ اس نے ذی شاہ کے حصے کا کام کر دیا تھا۔ ورنہ مون کے ناپاک خون سے ذی شاہ کو اپنے ہاتھ رنگنا پڑتے۔ وہ بھلا منکشے سے کیوں نفرت کرتا۔

''تم مجھے کوئی..... سزا بھی نہیں دو گے، وعدہ کرو؟'' وہ ایک مرتبہ پھر وعدوں کی لمبی فہرست پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ ذی شاہ کچھ زچ سا ہو گیا۔ ''ابھی سے اتنے وعدے..... بعد میں نہ جانے کیا حال کرو گی۔''

وہ سر جھٹک اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو گیلی آنکھوں کو صاف کر رہی تھی۔ ''اللہ! یہ گیلی آنکھیں.....!'' اس کا دل پھر سے اختیار کی حدیں توڑنے لگا تھا۔

''نہیں..... اس لیے کہ میرے پاس جزا اور سزا کا کوئی اختیار نہیں.....'' اس نے منکشے کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا۔ منکشے کے دل کو جیسے ڈھارس پہنچی تھی۔

''تم مجھ سے ہمیشہ محبت کرتے رہو گے؟ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' گیلی آنکھوں پر آس تڑپ رہی تھی۔ ذی شاہ سے یہ منظر بھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ وہ فطرتاً نرم دل تھا اور عورت کے آنسوؤں سے جلد پگھل جاتا تھا۔ اور یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔

''واہ ذی شاہ، دل لگایا بھی تو کہاں؟ عمر بھر آنسو پونچھتے رہو گے۔'' وہ جیسے بے بس ہو گیا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا پھر جیسے کوئی الہامی قوت اس کے دل پر اچانک وارد ہوئی تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔

''میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' ذی شاہ بولتے، بولتے اچانک رک گیا تھا۔ جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹا تھا۔ جیسے کسی حقیقت نے اپنا بھیانک چہرہ دکھایا تھا۔ جیسے کوئی سچ کھل کر اچانک ذی شاہ کے سامنے آ گیا تھا۔ ذی شاہ کو لگا تھا اس کی روح کسی نے کانٹوں پر گھسیٹ دی ہے۔ آلپس کے کوہسار

اس کے وجود کو ریزہ، ریزہ کر گئے تھے۔ بیلے کے کنارے جیسے آگ لگ گئی تھی۔ دریائے نیکر نے جوش کھایا تھا۔ کوئی ابلتی ہوئی اذیت ناک حقیقت ذی شاہ کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اس کے وجود میں چنگاریاں بھرنے لگی تھیں۔ خون دماغ پر چڑھنے لگا تھا۔ آنکھوں میں شعلے بھر گئے تھے۔ ماتھے کی رگ پھڑک رہی تھی اور وہ رشتوں کے پل صراط پر کھڑا تھا۔ نہ آر جا سکتا تھا نہ پار..... آخر منکشے کونسا ایسا... بھیانک انکشاف ہی تو کرنے والی تھی۔ اس کے وعدوں نے جیسے ذی شاہ کے ہاتھ پیر باندھ دیئے تھے۔ وہ ایک جال میں جکڑ گیا تھا۔

''منکشے! مجھ میں سچ سننے کی طاقت ہے۔ مجھے سچ بتا دو۔'' وہ جیسے ضبط اور صبر کے زہریلے گھونٹ بھر کر بول رہا تھا ورنہ تو اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی جیسے کچھ انہونا ہی تو ہونے والا ہے۔ منکشے آخر کیا بولنے والی تھی؟ آخر کون سا راز مزید فاش کرنے والی تھی؟

''مون حسیب نے جو کچھ مالا کے ساتھ کیا تھا..... وہ تم جان چکے ہو۔ پھر آگے کیا ہوا؟ کتاب کا ایک باب، ختم ہوا اور دوسرا کھل گیا۔ ایک کہانی ختم ہوئی اور دوسری شروع ہوئی۔ مکافاتِ عمل کا سلسلہ اتنی جلدی شروع ہو جائے گا؟ یہ تو مون کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ جب ساری طاقت نچڑ گئی اور سارے حساب بے باق ہو گئے تب ضمیر نے اپنی عدالت لگالی۔ مون حسیب کی زندگی کا سکون مٹ گیا۔ کتابچے کھل گئے۔ حساب نئے نکل آئے۔ کچھ حساب اس نے بے باق کیے تھے اور کچھ حساب دینے کی باری اس کی بھی آ گئی تھی۔ اسے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ دوائیاں کھا کھا کر تنگ آ چکی تھی۔ خوف اسے گھر کے اندر ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ اس کی بھوک مٹ چکی تھی۔ سکون بک گیا تھا، چین کھو گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے ماہر نفسیات کے در کو پکڑ لیا۔ ڈاکٹرز اس کا علاج کرتے رہے۔ مگر ضمیر پر پڑا بوجھ نہ ختم ہوا۔ ڈاکٹر نے اس کی ٹیلی پیتھی کی مشقیں بند کروا دی تھیں اور اسے گناہ کے حصار سے نکالنے کی جدوجہد کرنے لگے۔ انہی دنوں مون کی ملاقات ڈاکٹر ابوبکر سے ہو گئی پھر جو پرانے دفتر کھلے تو مون نے اپنے ضمیر کا ایک، ایک بوجھ اتار دیا۔ شاید ڈاکٹر ابوبکر اسے دھتکار ہی جاتے مگر ایک مسیحا ہونے کے ناتے انہیں مون پر ترس آ گیا۔ انہوں نے مون کا علاج کرنا شروع کیا۔ اسے دورے پڑنے کم ہو گئے۔ خوف بھی جاتا رہا۔ مگر وہ گناہ کے احساس سے کبھی نہ چھٹکارا پا سکی۔ پھر اسے ڈاکٹر ابوبکر نے کہا۔ اس نے جس کی ذات پر ظلم کیا ہے اس سے معافی مانگ لے۔ مون کو تین سال بعد امید کی کرن نظر آئی تھی۔ وہ جو اپنے زوال کی طرف جاتے ذہن سے کام لینا ترک کر چکی تھی ایک مرتبہ پھر پُرجوش ہو گئی۔ تب تین سال بعد اس نے پھر سے کسی انسانی ذہن کے ساتھ نشریاتی رابطہ قائم کیا تھا۔ اسے لگتا، وہ ہیرے سے گریفائیٹ میں بدل گئی ہے۔ اس کی کوئی صلاحیت کام نہ آ سکے گی مگر کچھ مہینوں کی کوششوں کے بعد مون نے کامیابی کے پہلے قدمچے پر پاؤں رکھ لیا تھا۔ اس نے مالا کے بھائی کی تصویر نکالی اور کچھ مہینوں کی مسلسل مشقوں کے بعد ذی شاہ کے ذہن اور لاشعور سے رابطہ کر لیا۔ حالانکہ ڈاکٹر نے اسے منع کر رکھا تھا۔ اگر وہ مزید اپنے دماغ سے مشکل کام لے گی تو اس کی شریان بھی پھٹ سکتی تھی مگر اسے اپنے ضمیر کے بوجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے مالا کے بھائی تک پہنچنا تھا..... وہ مالا تک نہیں پہنچ سکتی تھی مگر اس کی روح کے سامنے سرخرو تو ضرور ہو سکتی تھی۔ ذی شاہ کو ''جرمنی تمہیں بلا رہا ہے۔'' جیسا پہلا پیغام بھیج کر وہ یکے بعد دیگرے مزید پیغام ارسال کرتی رہی تھی۔ پھر ایک دن جب وہ سفید نائیلون کے جالی دار پردے کو ہٹائے آسمان کی طرف دیکھتی بڑی پرامید کھڑی تھی تب اس کی چھٹی حس نے بہت عرصے بعد

پہلا الارم بجایا تھا۔

وہ ڈورنج لینڈ میں پہنچ گیا۔" مون کی گیلی آنکھوں میں خواب اتر آئے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے عذاب اتر آئے تھے۔ شاہین لمبی اڑان بھر کر آرہا تھا۔ شاہین اس کے خوابوں اور عذابوں کا حساب کرنے آرہا تھا۔ شاہین جیسے اپنا شکار ڈھونڈنے آرہا تھا۔ شہنشاہ شاہین...... ادھیراج، خاقان، سلطان، شکاریوں کا بادشاہ...... اپنے "شکار" کی تلاش میں بالآخر پہنچ چکا تھا اور اس شکاریوں کے بادشاہ، خاقان، سلطان اور شہباز کے سامنے اس کا شکار بیٹھا ہے۔ چاہے جو دل کرے سزا دے۔ موت کے گھاٹ اتار کر زندگی سے نجات دے یا پھر گولیوں سے بھرا پستول نکال کر سینے میں گولیاں اتار دے۔ شکاری کو اختیار ہے۔ جو دل چاہے فیصلہ کرے...... میں ہی منکشے حسیب عرف مون اپنے باپ کے چمن میں کھلنے والا خوشبودار پھول اور آسمان پر چمکنے والا داغدار چاند...... سر جھکائے، بارِ ندامت کو اٹھائے، پھانسی کا حکم سننے کے لیے تیار ہوں۔ میں تمہارے خاندان کی مجرم ہوں۔ اپنے باپ کی بھی مجرم ہوں، اپنے بھائی کی مجرم ہوں۔ اور تمہاری معصوم پاکباز بہن کی بھی مجرم ہوں...... مجھ وحشی کو، مجھ پاپی گناہ گار کو جو چاہے سزا دے لو۔ پر نفرت کا زہر میرے من میں نہ اتارنا...... ایک فقط تمہاری آنکھ میں اتری نفرت میں ہرگز برداشت نہیں کرسکوں گی۔" گیلی آنکھوں والی لڑکی اس کے پیروں میں گری دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

وہ لڑکی جو کبھی غرور و تکبر کے عالم میں زمین پر اکڑ کر چلتی تھی۔ جس کے ریشمی سلک کے فراک اور سر پر رکھا ہیرے اور یاقوت کا کراؤن اسے کسی ریاست کی شہزادی جیسا روپ دیتا تھا۔ جس کے بل کھاتے بال اپنی چمک دمک اور حسن کے باعث لوگوں کے دلوں کو کھینچ لیتے تھے۔ جس کی برقی لہروں کو چھلکاتی آنکھوں کے سحر سے کوئی بچ نہیں پاتا تھا جو اپنی دونوں آنکھوں سمیت لوگوں کے ذہنوں میں گھس جاتی تھی۔ جسے دماغ پر اور ذہنوں پر حکمرانی کرنے کا نشہ تھا۔ جو ذہنوں کو تسخیر کرکے ان پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتی تھی۔ وہی منکشے عرف مون حسیب بے بسی کی تصویر بنی زمین پر گری پڑی تھی۔ جسے اللہ نے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کیا تھا جسے بلندی اور اونچائیوں کی سمت بھیجا تھا۔ جسے اللہ نے اونچا مقام دیا تھا۔ وہی مون حسیب منہ کے بل زمین پر گری پڑی تھی۔ اس لیے کہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی ہوجانے کے بعد اللہ پر بھروسا کرنا چھوڑ چکی تھی۔ اس میں خودی آگئی، اس میں تکبر آگیا، غرور اس کے سر پر چڑھنے لگا اور اس نے اللہ پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا...... پر اللہ نے اس مون حسیب کے ساتھ کیا، کیا تھا؟ جب وہ اپنی سرکشی کے غرور میں کھو کر حد سے بڑھنے لگی اور غرور نے اسے پاتال کی طرف بھیجنے کے لیے اس کی ہستی کو ہلایا تب اللہ نے اسے سہارا دیا۔ اس کا غرور اسے عروج سے زوال تک لے آیا تھا۔ اس کا غرور اسے بلندی سے پاتال کی طرف لے آیا تھا۔

"میں نے پاپا کی جلی ہوئی لاش کو دیکھ کر مون حسیب کو اسی لمحے قتل کردیا...... ہاں، میں نے اپنی ہستی کو مٹا ڈالا، میں مون حسیب کے خوشنما لبادے سے نکل کر منکشے میں بدل گئی۔ میری ماں نے مجھے منکشے کہا تاکہ پھول کی طرح خوشبوئیں بکھیرتی رہوں...... پر میرے باپ نے مجھے منکشے سے "مون" بنادیا۔ آسمان کا چاند...... داغدار چاند، بلندی پر غرور کے ساتھ اپنے سے نیچے کی دنیا کو دیکھنے والا چاند...... مجھے عروج کا نشہ چڑھ گیا۔ مجھے ہر بندہ کم تر لگتا۔ میں آسمان کا چاند تھی۔ اور باقی لوگ ستاروں کے مانند میرے اردگرد طواف کرنے والے حقیر لوگ...... مجھے میرے تکبر کی سزا ملی۔ میں جو خود کو

عقلِ کُل کا مالک سمجھتی تھی۔ بیدی ٹونگ میں میرے جیسا دماغ کسی کا نہیں تھا۔ یہ اعلیٰ پائے کا دماغ مجھے، ذرا سی سوجھ بوجھ نہ دے سکا۔ ایک ان دیکھے، معمولی غصے، انتقام، حسد میں جھلس کر میں کتنے لوگوں کو برباد کرتی رہی۔ مجھے تو کوئی بھی معاف نہیں کرے گا۔ نہ پاپا، نہ تایا، نہ عیسیٰ، نہ مالا...... نہ آفاق اور نہ سوزن......" وہ ذی شاہ کے پیروں میں گری تڑپ رہی تھی۔ اس کا کمزور وجود جھٹکے کھا رہا تھا اور ذی شاہ کے اندر رنگ کے بھانبڑ اٹھ رہے تھے۔ نفرت، غصے اور انتقام کے شعلے بھڑ رہے تھے۔ اس کا دماغ جیسے سائیں، سائیں کر رہا تھا۔ اندر اک طوفان مچل رہا تھا۔ اس نے اپنے پیروں پر گری سسکتی کو زور دار ٹھوکر ماری تھی۔ دراصل کسی کی طرح دھتکارتا ہوا باہر نکل آیا...... اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ پیر کہیں رکھتا اور قدم کہیں پڑتا۔

"اللہ کوئی اتنا شاطر بھی ہو سکتا ہے؟" ذی شاہ کا دل جیسے پھٹ رہا تھا۔ دماغ میں انگارے بھر رہے تھے۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ بے خیالی سے چلتا ہوا کتنے لوگوں سے ٹکرایا تھا۔ دو نرسوں سے، ایک ڈاکٹر سے، دو مریضوں سے اور اب پھر کسی وجود سے ٹکرا رہا تھا۔

"ابھی تو یہ آدھی کہانی سنی ہے...... ابھی کچھ سچائی باقی ہے۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔" کسی نے اسے دونوں کندھوں کے بوجھ سے آزاد کروایا تھا۔ ذی شاہ کو سمجھ ہی نہیں آئی اس کے سامنے کون کھڑا تھا؟ یہ اجنبی، خوب صورت، خوش پوشاک جوان کون تھا؟ وہ پاگلوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔

"پہلی مرتبہ ملاقات ہو رہی ہے۔ تم کیسے پہچان پاؤ گے۔" مقابل کے چہرے پر نرمی اتر آئی تھی۔ ذی شاہ اب بھی پاگلوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو مگر اسے کچھ سمجھ

نہیں آرہا تھا۔ اس کا دل بند ہو رہا تھا۔ وہ شاک کی کیفیت میں تھا۔

”میں جانتا ہوں، تم اس وقت شاکڈ ہو..... دراصل جس منکشے سے تمہیں محبت ہوگئی ہے وہ مون حسیب نکلے گی، تمہاری بہن مالا کی مجرم یہ حقیقت تمہارا ذہن قبول نہیں کر رہا..... کچھ وقت لگے گا تم اس حقیقت کو تسلیم کرلو گے۔ یہ جو اضطراب، نفرت اور غصہ اور انتقام آگ بنا تمہیں بھسم کیے دے رہا ہے یہ تھم جائے گا۔ وقت مرہم ہے، وقت زخموں پہ کھرنڈ جما دے گا۔ میں تم سے کل ملوں گا، افراہیم کے گھر..... تب تک تم نارمل..... ہاں، کچھ تو نارمل ہو جاؤ گے۔ آخر ابھی آدھا سچ تو تمہیں ابھی سننا ہے۔ اس کے لیے بڑے حوصلے، ضبط اور صبر کی ضرورت ہے۔“ وہ مہربان جوان اسے ہاتھ تھام کے گاڑی تک لے آیا تھا۔ پھر اسے افراہیم کے گھر چھوڑ گیا۔ آخر وہ کون تھا؟ اتنا مہربان، حلیم، شفیق..... اسے کیسے پتا تھی۔ ذی شاہ، افراہیم کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ جوان واپس چلا گیا تب ذی شاہ کو اس کے نام کا خیال آیا تھا۔ اس نے اس خوش پوشاک سے مہربان شخص کا نام تو پوچھا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

اسے گھر میں دیکھ کر بندیا نے سارا لاؤنج سر پہ اٹھالیا تھا۔ آں..... ہاں نہیں، بندیا تو نہیں..... وہ تو ایمل تھی، بندیا جیسی۔

”ذی آگیا..... ذی آگیا.....“ ایمل قلانچیں بھر رہی تھی۔ اس کے اسپتال ایڈمٹ ہونے کے دنوں میں ایمل خوب مرجھا گئی تھی۔ ایک ہی تو دوست ملا تھا، وہ بھی بیمار ہو گیا۔ آنٹی، ایمل کی چیخیں سن کر باہر آگئیں۔ پھر جیسے انہیں بھی شاک لگا۔

”افراہیم تمہیں لینے گیا تھا بیٹا! تم اکیلے کیسے آگئے؟“ وہ متفکر سی اس کا ہاتھ پکڑے گیسٹ روم کی طرف لے آئی تھیں، وہ آنٹی کے ساتھ گھسٹتا چلا آرہا تھا۔ بے دم، مدہوش، گم صم، متحیر، حیران، شاکڈ.....

”یہاں بیٹھو..... تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ عینی اور افریشم بھی آئے تھے۔ تمہارے لیے فکرمند ہیں۔“ آنٹی نے بولتے ہوئے اسے بیڈ پر بٹھا دیا تھا۔ پھر اسے دودھ کا گلاس دے کر آرام کرنے کی تلقین کرنے لگیں۔ ایمل کی خواہش تھی کہ وہ ذی شاہ سے باتیں کرے مگر ممی کے ڈانٹنے پر چپکی رہ گئی۔ آنٹی کو ذی شاہ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اسے، دودھ کا گلاس اپنی نگرانی میں پلا کر باہر چلی گئی تھیں۔ تب وہ بے دم ہو کر بستر پر ڈھے گیا تھا۔ پھر جیسے پوری فلم ریسوں، دھاگوں اور الجھنوں کو کھولتی اس کے دماغ میں ریورس ہونے لگی۔

جاگنگ کرتے ہوئے اچانک لاشعور میں ہلچل سی مچنا..... جیسے کوئی پیغام، جیسے کوئی ای میل کا موصول ہونا..... دفتر میں کام کے دوران پھر سے سابقہ کیفیت..... ”جرمنی مجھے بلا رہا ہے۔“ پھر سے وہی پیغام..... عینی کی سالگرہ والے دن اس کا فنکشن سے اپ سیٹ ہونا..... جیسے پھر سے کوئی پیام وصول ہونا..... لاکھوں، ہزاروں میل کی دوری سے کوئی انسانی ذہن اتنی طاقت رکھ سکتا ہے۔ جو ایک دماغ سے دوسرے دماغ تک سوچ اور خواہش کو منتقل کردے۔ وہ اس تجربے سے خود نہ گزرتا تو کبھی ٹیلی پیتھی کی حیثیت اور علم کو تسلیم نہ کرتا مگر اب جیسے معاملہ دوسرا تھا۔ اس کا جرمنی اچانک آنے کا فیصلہ، جس کے پیچھے منکشے کی کوششیں بدرجہ اتم موجود تھیں پھر اس کا منکشے کی طرف مائل ہونا۔ منکشے سے محبت کا اظہار..... منکشے کی موجودہ بدحالی کے باوجود اس سے محبت کا ہو جانا۔ اس کی بے ترتیب زندگی؟ یقیناً اس نے اپنے تئیں یہی سزا منتخب کرلی تھی۔ وہ اسی سزا کے ساتھ زندگی کی سانسیں پوری کر رہی تھی۔

تو منکشے اس کی آمد سے باخبر تھی۔ اس کی تصویر سے محبت کرنے والی عجیب تر لڑکی..... وہ اتنی عجیب

آخر کیوں تھی؟ اور اس نے دوسروں کی زندگیوں کو اتنا عجیب کیوں بنا دیا تھا؟ جیسے پرت در پرت بے شمار سچائیاں واضح ہوگئی تھیں۔ منکشے کی خود سے نفرت، اذیت، دکھ، کرب وہ تو سراپا سزا بن چکی تھی۔ بھلا اسے اور کیا سزا دی جاتی۔ وہ تو زوال پزیر، پاتال میں گری، دلدل میں دھنسی نشانِ عبرت بن چکی تھی پھر اس کے وعدے، قسمیں..... ''مجھ سے محبت کرتے رہنا۔'' گیلی آنکھوں والی عجیب تر لڑکی کم از کم ذی شاہ کے لیے پل صراط بن چکی تھی۔ آخر وہ کیا کرتا؟ کیسا فیصلہ کرتا؟ وہ اسے کتے کی طرح دھتکار آیا تھا۔ ہاں وہ اسی ذلت کی حقدار تھی مگر یہ دل..... ذی شاہ کو لگا، جیسے کوئی اس کے دل کا کھینچ رہا تھا۔

مگر فی الحال اسے دل کی پکار پہ کان نہیں دھرنے تھے۔ اپنی بہن مالا کے لیے سوچنا تھا۔ ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ کے ساتھ۔ جلد بازی کے فیصلے نقصان دیتے ہیں۔ اور اس میں اب مزید خسارہ اٹھانے کی طاقت نہیں تھی۔

مون کا عیسیٰ کو ہپناٹائز کرنا..... عیسیٰ کی فون کال؟ وہ کڑی سے کڑی ملا رہا تھا۔ ''اگر عیسیٰ نے ہپناٹزم کی نیند میں مالا کو طلاق دی تھی تو کیا یہ طلاق مؤثر تھی؟ کیا طلاق واقع ہوچکی تھی؟'' ذی شاہ کا ذہن اب دوسری طرف سوچ رہا تھا۔ حواس کچھ ٹھکانے آئے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی بیدار ہوگئیں۔ اسے جیسے اندھیرے میں ایک کرن دکھائی دی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے شامی کو کال کی تھی۔ وہ پاکستان کے نامور علما کے نمبر پوچھ رہا تھا۔ شامی نے دو ایک گھنٹے تک اسے کئی علما کرام کے نمبر سینڈ کردیے تھے۔

وہ بار بار ہر عالم کو کال کر کے پوچھتا۔ پوری تفصیل بتاتا۔ اپنی بہن کے درد، کرب اور اذیت سے لے کر مون حسیب کی شیطانیت تک کس طرح اس نے انتقام، حسد، ضد، جنون اور غصے میں آ کر اس کی بہن کو برباد کیا تھا۔ کس طرح اس نے عیسیٰ کو ہپناٹائز کر کے مالا کو طلاق دلوائی تھی۔ ایک ایک بات پوری تفصیل سے بتاتا پھر اس کی التجا پر تمام علما کرام نے اپنا تمام تر علم بروئے کار لا کر باقاعدہ نشست رکھ کر اس مسئلے پر غور وفکر کیا تھا۔ اس سلسلے میں شامی بھی ان سے رابطہ کیے ہوئے تھا۔ ہر طرف سے جوابات، دلائل جواز ملنے کے بعد علما کرام نے متفقہ طور پر اپنی رائے ذی شاہ کے گوش گزار کردی تھی۔

''ہماری شریعت، مذہب اور دین کے مطابق یہ طلاق مؤثر ہے، کسی بھی صورت واپسی ممکن نہیں۔ سوائے حلالہ کے جبکہ تین سال کی مدت بھی گزر گئی اور شوہر کی طرف سے کوئی رجوع نہیں ہوا۔'' علما کرام نے متفقہ طور پر فیصلہ سنا دیا تھا اور ذی شاہ پھر سے ڈھے گیا۔ اس نے اگلا پورا گھنٹا بحث کی تھی کہ شاید کسی طرح کوئی صورت نکل آئے۔ کسی طرح مالا کی زندگی میں موجود گھٹن ختم ہوسکے۔ کسی طرح طلاق کا بدنما داغ دھل سکے۔ مگر اس کی ہر کوشش بیکار گئی تھی۔

انہوں نے بڑے تحمل سے اور نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔ ''جس طرح شراب کے نشے میں یا شدید غصے کی جنونی کیفیت میں بھی طلاق مؤثر ہے اسی طرح، ہپناٹزم کی نیند میں بھی طلاق واجب ہوجاتی ہے۔ شراب کی حالت میں بھی بندہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتا۔ وہ جو بول رہا ہوتا ہے اسے خبر نہیں ہوتی مگر طلاق واجب ضرور ہوجاتی ہے۔ اسی لیے نشہ حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ عقل کو سلب کرلیتا ہے۔ اسی طرح گہری نیند سے مشابہ ایک ایسی حالت جس میں معمول یا سونے والا اپنے عامل یا ہپناٹسٹ کی ہدایات، ترغیبات یا تحریکات (تحیشن) سے پوری طرح باخبر رہتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہپناٹزم کی نیند اور قدرتی نیند میں بہت سی حالتیں مشترک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہپناٹزم کی گہری سے گہری نیند میں معمول کا عامل کے ساتھ رابطہ قائم رہتا ہے۔

جبکہ قدرتی نیند میں انسان ہر شے سے ہی نہیں اپنے وجود سے بھی بے خبر ہوجاتا ہے یہ بات محض قیاسات یا مفروضات پہ مبنی نہیں۔ ہم انیس علما نے باقاعدہ رات بھر بیٹھ کر تحقیق اور ریسرچ کی ہے۔ یہ معاملہ کوئی معمولی نہیں۔ ہمارے ذرا سے الفاظ یا ہلکی سی غلطی کسی کو گناہ گار بنا سکتی ہے۔ بلاشبہ یہ شرعی مسئلہ ہے۔ انتہائی باریک اور کٹھن۔ اس پر شدید سوچ بچار کے بعد رائے دی گئی ہے۔ ہپناسز اور نیند بظاہر ایک ہی حالت ہے۔ اب کوئی شخص نیند سے اٹھ کر اپنی بیوی کو کھڑے، کھڑے طلاق دے اور بعد میں کہے میں تو نیند میں تھا۔ آخر طلاق کوئی کھیل یا تماشا تو نہیں.... ہپناسز کی نیند اور قدرتی نیند بظاہر ایک ہی حالت کے دو نام ہیں۔ یہ بات مفروضات پہ مبنی نہیں۔ اسے.... الیکٹرو انسیفلوگرام یا انسلیو گرام کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے۔ اس آلے کی مدد سے ہپناسز اور قدرتی نیند سونے والے دو، دو گروپوں کا الگ، الگ مشاہدہ اور تجزیہ کیا گیا تھا۔ ہپناسز اور قدرتی نیند کے پہلے درجے میں فرق کرنا اس لیے کٹھن تھا کہ استعمال کیا جانے والا آلہ محض اس مقصد کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ تحقیق سے پتا چلتا ہے، قدرتی نیند کے چوتھے درجے میں نظر آنے والی ڈیلٹا ویوز ہپناسز کے چوتھے درجے میں نظر نہیں آسکی تھیں۔ ای ای جی کے پیٹرن جو ہپناسز کے دوران دیکھے گئے وہ نیند کے بجائے بیداری کی حالت میں نظر آنے والے پیٹرن تھے۔ ہم ہپناٹسٹ کی گہرائی میں نہیں جائیں گے مگر ہمیں جو مستند انفارمیشن ملی ہیں اس کے مطابق ہپناٹزم کی نیند میں معمول جو کچھ بھی کہتا بولتا یا سنتا ہے۔ وہ مکمل طور پر باخبری کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی قدرتی نیند میں اگر ایسا واقعہ پیش آئے تو اس پر الگ سے غور کیا جاسکتا ہے۔ جیسے شراب میں انسان اپنے حواس میں نہیں ہوتا مگر طلاق واجب ہوجاتی ہے۔ اسی طرح ہپناٹزم کی نیند میں بھی انسانی شعور بیدار نہ ہونے کے باوجود بھی طلاق ہوجاتی ہے۔" وہ اسے بڑی تفصیل سے بتارہے تھے۔

"ٹرانس ایک الگ چیز ہے اور ہپناٹزم الگ..... جب ہپناٹسٹ نے اپنے معمول آپ کے بہنوئی سے کہا۔ "تم بالکل خالی الذہن ہوجاؤ۔" تو اس نے سجیشن قبول کرتے ہوئے اپنے ذہن سے تمام خیال نکال دیے۔ یوگا اور روحانی ریاضت میں بھی یہی ہوتا ہے مگر چونکہ ہپناٹسٹ ایک بدعمل کروانا چاہ رہا تھا سو اس نے معمول کو گہری نیند میں بھیج کر اپنی مرضی کے الفاظ کہلائے۔ صورت کوئی بھی ہو، کہنے والا اپنی بیوی کو ٹیلی فون پر طلاق دے رہا ہے' کیا خبر اسے ہپناٹائز نہ کیا گیا ہو، وہ اپنی مرضی سے طلاق دے رہا ہو۔ آپ کی بہن نے بقائمی ہوش و حواس طلاق کے الفاظ سنے تو پھر شبہے کی کہاں گنجائش نکلتی ہے؟ عموماً ایسے مسئلے ہمارے پاس نہیں آتے، یہ اپنی نوعیت کا الگ کیس ہے۔ بہرحال، اللہ آپ کی بہن کو صبر جمیل عطا کرے۔ اس کی زندگی میں آسانیاں آئیں اور وہ پچھلی زندگی کو بھول کر نئی زندگی کی شروعات کرے۔" مولانا صاحب نے انتہائی تفصیل سے ذکی شاہ کو سمجھاتے ہوئے آخر میں دعائیہ کلمات کہے تھے پھر فون بند کردیا۔ اسی طرح بہت ڈھیر سے ڈھیرے ہی سہی امید کا ایک، ایک دروازہ دھڑ دھڑ بند ہوگیا تھا۔ ذکی شاہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا کہ کسی لحاظ سے کوئی راہ نکل بھی آتی تو علی عیسیٰ اپنی پرسکون زندگی میں دوبارہ بھونچال یا بے ترتیبی لے آتا۔ افریشم اور اب موحیٰ کے بعد مالا کے لیے اس کی زندگی میں بھلا کہاں گنجائش نکلتی تھی؟

مگر کبھی، کبھی ناممکن نظر آنے والے کام اللہ ممکن بنادیتا ہے۔ بس اللہ کی ذات پر بھروسا شرط ہے۔ وہ جو امید کو ہاتھوں سے پھسلائے تھکے ہارے انداز میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھا تھا یک مرتبہ پھر دعا سے مدد مانگنے لگا۔ ہاں..... دعا ہی

تو تھی جو انتقام، غصے، جنون اور اندر بھڑکتی نفرت کو مدغم کر کے بجھا سکتی تھی۔ وہ منکشے سے مقدس قرآن پہ ہاتھ رکھ کر قسم نہ بھی کھا چکا ہوتا تب بھی اس سے انتقام نہ لیتا..... وہ اپنی بہن کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے شانت ہو رہا تھا۔ ہاں..... سزا کا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو سب سے برتر، عظیم، بلند اور طاقتور ہے۔ جبکہ ذی شاہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک حقیر انسان، جو دنیا میں فساد برپا کرنے، شر پھیلانے نہیں آیا تھا اور نہ نفرت، انتقام اور جزا اور سزا کا اختیار رکھتا تھا۔ گر منکشے سے انتقام لینے کی کوشش بھی کرتا تو کم از کم مقابل کی طاقت دیکھ کر اسے زندہ لاشوں سے انتقام نہیں لینا تھا۔ پھر منکشے نے جو اپنے لیے سزا منتخب کی تھی وہ کم ہر گز نہیں تھی۔ جب تک زندہ رہتی، اسی سزا سے لطف اندوز ہوتی اور ذی شاہ اللہ کی بارگاہ میں جھکا اپنی بہن کے لیے اور اپنے لیے کسی عظیم الشان صبر کی دعا کر رہا تھا۔

”اے میرے اللہ! تو جانتا ہے، میں نے آج تک کسی کا حق نہیں مارا۔ کسی کا دل نہیں دکھایا، کوئی غیر شرعی بد فعل میں مبتلا نہیں ہوا، پاک روزی کماتا رہا ہوں۔ اور تو میری نیت سے واقف ہے، میں یہاں اپنی بہن کے مجرم کو ڈھونڈنے آیا تھا، انتقام، نفرت اور غصے کے جذبات لے کر آیا تھا۔ اے میرے اللہ! میں تجھے گواہ بنا کر کہتا ہوں، میں نے اپنے دل سے انتقام، نفرت، غصے کے جذبات اکھاڑ پھینکے ہیں۔ بے شک تیرے عدل کا ترازو میرے انتقام سے بڑا ہے اور میں نے اس دنیا میں تیرا بہترین عدل دیکھا ہے۔ میری بہن کی مجرم ذلت کی زندگی گزار رہی ہے جو تو نے اسے نعمتیں عطا کیں، ان سے بھی مبرا ہو چکی ہے۔ وہ ایک مفلس، کنگال اور قابلِ رحم حالت میں ہے۔ تیرے عدل کے سامنے میرا سر جھک گیا ہے۔ اے اللہ! تیرے انصاف پر اور بھی پیار آتا ہے۔ اور تیری عظمت کے سامنے دل اور بھی جھکنے لگتا ہے۔ تو نے مالا کا انتقام اس دنیا میں پورا کر دیا۔ برباد کرنے والے خود بھی برباد ہو گئے۔ ذلیل کرنے والے خود بھی ذلیل ہو گئے۔ رسوا کرنے والے خود بھی رسوا ہو گئے۔ اے اللہ! تیرے جلال کو دیکھ کر میرا دل خوفزدہ ہو گیا ہے۔ میں انتقام کے جذبات سے خالی ہو چکا ہوں۔ اے اللہ! تیری رحیمی کو دیکھ کر میرا قلب اور بھی نرم ہو چکا ہے۔ میں نے معاف کرنے کا سوچ لیا ہے تو میری مدد فرما۔ اے اللہ..... ! میں تجھ سے مالا کے لیے صبر اور رحم کی دعا کرتا ہوں۔ وہ اپنے مجرموں کو معاف کر کے اس جہان میں اور اس جہان میں مقبولیت پا لے کہ تجھے معاف کرنے والے پسند ہیں۔ اور تیری رضا میں راضی ہونے میں ہی فضیلت ہے۔“ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے نم تھا۔ اب وہ اپنے من کو ہلکا پا رہا تھا وہ کچھ، کچھ پُرسکون اور مطمئن بھی ہو رہا تھا۔ ہاں، جب دل سے انتقام کے جذبات اکھاڑ دیے جائیں تو اللہ رحم اور نرمی خود بخود اتار دیتا ہے۔ اس کا دل ہلکا ہو رہا تھا جیسے نرم اور سبک ہوا ہوتی ہے یا جیسے نرم بادلوں کے بگولے......

”ہاں، دعا تو مانگنی ہی چاہیے۔ کیونکہ ممکن اور ناممکن تو ہماری سوچ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں.....“ کوئی چپکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ ذی شاہ نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بھیگا چہرہ پونچھ کر گردن موڑتے ہوئے دیکھا۔ وہی خوب صورت سا خوش پوشاک نوجوان اندر آ رہا تھا۔ پھر وہ اس کے قریب ہی کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ ذی شاہ نہ ٹھٹکا تھا نہ چونکا تھا جیسے اس جوان کا روزانہ ہی اس کے کمرے میں چلے آنا معمول تھا۔ وہ اب بڑے دھیان، تحمل اور برداشت کے ساتھ اس جوان کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ اس گھر میں آنے والا جوان کوئی اجنبی نہیں..... ورنہ کم از کم اسے

گیسٹ روم میں آنے نہ دیا جاتا۔ تھوڑی دیر بعد اس جوان نے بڑی محبت کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

''میں آفاق ہوں...... بہت دفعہ منگشے نے میرا ذکر اپنی کہانی میں کیا ہوگا۔ کبھی اچھے الفاظ میں، کبھی برے الفاظ میں، میں انی یعنی افریشم کا شوہر ہوں۔ مالا کی بہت، گہری سہیلی تھی انی...... چند دن پہلے میرا بیٹا بھی ہوا ہے۔ وہ میرا اور انی کا بیٹا ہے۔ میری دادی اور ماں کی منتوں، مرادوں کے بعد پیدا ہونے والا...... خیر، اس بات کو چھوڑو...... میں اپنی کہانی بلکہ علی عیسیٰ کی کہانی کا آغاز کہاں سے کروں......؟ ٹھہرو پہلے تمہیں کچھ اور بتاتا ہوں۔ جب تم نے ڈوئچ لینڈ آنے سے پہلے ہیرلخ فرم کو ای میل سینڈ کی تھی۔ مجھے زیادہ سوچنا نہیں پڑے گا...... کل کی تو جیسے بات ہے۔'' آفاق سر جھکائے بڑے تحمل کے ساتھ گفتگو کا آغاز کر رہا تھا۔ اور ذی شاہ کا...... رواں رواں جیسے کان بن گیا۔ بھلا یہ انکشاف کیا کم تھا کہ افراہیم کا بہنوئی کم از کم علی عیسیٰ نہیں۔

☆☆☆

ذوالفقار احمد انڈسٹریز کی طرف سے ہیرلخ فرم میں ایک ای میل آئی تھی جس بندے نے ای میل سینڈ کی تھی سب سے پہلے تو آفاق اس کا نام پڑھ کر حیران ہوا تھا۔ ''ذی شاہ احمد ولد ذوالفقار احمد'' یہ نام اگرچہ نیا تھا مگر اجنبی ہرگز نہیں۔ آفاق نے کئی مرتبہ عیسیٰ کے منہ سے یہ نام سن رکھا تھا۔

''مالا کو ڈھونڈنے کوئی نہ بھی آیا تب بھی تم دیکھ لینا، ذی شاہ کسی روز اچانک آجائے گا۔'' علی عیسیٰ کا تفکر آفاق کی جان نکال لیتا تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ آفاق، اپنے یار دلدار کو پریشان دیکھ لیتا۔ تب وہ عیسیٰ کو تسلی دیتا تھا۔

''اتنے سال ہوگئے کسی نے خبر نہیں لی۔ وہ تو جیسے بھول ہی گئے مالا کو۔'' آفاق کی تسلیاں بھی عیسیٰ کو مطمئن نہیں کر پاتی تھیں۔ ESP کی حامل قوت اس کی بہن میں ہی نہیں تھی بلکہ علی عیسیٰ کے اندر بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اسے ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ ذی شاہ بھی نہ کبھی ضرور آئے گا۔ مالا اپنے بھائیوں میں زیادہ تعریف ذی شاہ کی کرتی تھی۔ یقیناً وہ بہن کو لاپتا پا کر ضرور جرمن آتا اور عیسیٰ کا یہ خدشہ... بے بنیاد نہیں تھا۔ اب یہ قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ من ہائیم کی اٹھارہ فرمز میں کام کرنے والے اور اونرز علی عیسیٰ کا نام رکھنے کے باوجود ذی شاہ نے ای میل ہیرلخ فرم کو سینڈ کی تھی۔ جس دن ذی شاہ کی ای میل آئی، اس دن آفاق ساری میٹنگ کو بھاڑ میں جھونک کر لیپ ٹاپ اٹھائے گھر بھاگ آیا تھا۔ علی عیسیٰ اس حادثے کے بعد دفتر نہیں جاتا تھا۔ اس نے تمام انتظامی کام آفاق اور میکس کے سپرد کر دیے تھے۔ گویا وہ ایک طرح سے پوری دنیا سے کٹ چکا تھا۔ اسے دنیا کے ہنگامے اور مصروفیت کسی عذاب سے کم نہیں لگتے تھے۔ وہ تو سانسوں کا بوجھ مشکل سے اٹھائے ہوئے تھا۔ جیسے جینا بھی ایک سزا ہی تو تھا۔ آفاق کو حواس باختہ اپنے فلیٹ میں دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ اس کا فلیٹ آفاق کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ آفاق کے پاس اس کے گھر کی ڈپلی کیٹ چابی بھی تھی وہ جب دل چاہے آسانی کے ساتھ خود ہی آجاتا تھا۔ عیسیٰ تمام، بار اٹھ کر دروازہ کھولنے کی زحمت سے بچ جاتا تھا۔

آفاق سرخ چہرہ لیے حواس باختہ اس کے بیڈ پر ڈھے گیا۔ عیسیٰ کے پوچھنے پر وہ پورا جگ پانی کا چڑھا کے اب تفصیل بتانے کی پوزیشن میں آیا تھا۔ پھر اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن کر کے ایک فولڈر کھولا تھا یہ ایک ای میل تھی۔ پاکستان سے ذی شاہ نے بھیجی تھی۔ جس میں اس کا نام، پتا، ولدیت ٹیلی فون نمبر، فیکس، گھر کا ایڈریس، ای میل ایڈریس سب کچھ لکھا تھا۔ کاروباری اثاثوں کے متعلق، بینک بیلنس، اس کا بڑا بھائی ذیشان کیا کر رہا تھا؟ اس کے

اندر کون سی برانچ تھی؟ اور ان کے مالی وسائل کیا تھے؟ پوزیشن کتنی اسٹرانگ تھی؟ سب کچھ درج تھا۔ یہ ای میل پڑھ کر عیسیٰ، آفاق کی طرح حواس باختہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ایک طویل گہری سانس لے کر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ آفاق نے بڑے اضطراب کے عالم میں اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

''وہ بزنس ویزا لے کر جرمنی آنا چاہتا ہے، اب کیا کریں؟'' آفاق کے مارے تفکر کے پسینے چھوٹ رہے تھے مگر علی عیسیٰ بڑا مطمئن تھا۔ اس نے کہا بھی تو صرف اتنا.....

''یہ تو ہونا ہی تھا۔ ذی شاہ نے جرمنی آنا ہی تھا۔ تم اسے مثبت جواب بھیج دو۔'' عیسیٰ کے الفاظ اسے بھونچکا کر گئے تھے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ چیخ پڑا۔ ''ذی شاہ بزنس کرنے نہیں آرہا۔ انتقام لینے آرہا ہے..... تیرے گریبان کو پکڑے گا آکر۔'' آفاق مارے غم اور فکر کے ادھ موا ہو رہا تھا۔ مگر علی عیسیٰ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''اس کا حق بنتا ہے، میں ان لوگوں کا مجرم ہوں، مجھے جو چاہے سزا دیں۔'' عیسیٰ کی آواز بھیگ گئی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر اسٹڈی روم میں بند ہو گیا۔ آفاق کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ اپنے یار کے کرب سے واقف تھا۔ پچھلے تین سال سے ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا تھا پھر بھی صبر میں کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے کبھی کسی سے شکوہ نہیں کیا تھا بلکہ اپنی بہن سے کوئی سوال نہیں کیا، کوئی دفعہ نہیں لگائی۔ برا بھلا نہیں کہا۔ بس صبر کا جام بھر کے دنیا سے الگ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ رکھا تھا۔ جب اللہ بہترین تدبیر کرنے والا تھا تو پھر وہ کیوں اپنی مشکلات میں اور اضافہ کرتا۔

اس نے ماں کی جدائی پر صبر اور شکر کرلیا تھا مگر ایک دفعہ پھر گڑھے مردے اکھڑنے والے تھے۔ ذی شاہ کسی اور ہی مقصد کے لیے آرہا تھا۔ وہ کاروبار کرنے نہیں آرہا۔ بلکہ علی عیسیٰ کے زخم ادھیڑنے آرہا ہے۔

وقت برا تھا یا اچھا گزر ہی گیا تھا۔ وہ لوگ اس انتظار میں تھے کہ ذی شاہ قیام کہاں کرتا ہے؟ آفاق کے ذرائع بڑے اسٹرانگ تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ افراہیم کے ذی شاہ سے اچھے تعلقات ہیں۔ یعنی ذی شاہ، آفاق کی سسرال میں ٹھہرا تھا اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا تھی۔ آفاق نے جلد ہی افراہیم کو بھی ذی شاہ اور علی عیسیٰ کے رشتے کا بتا کر چپ رہنے کی تاکید کردی تھی۔ افراہیم اچھا تھا راز رکھنے کے معاملے میں۔

پھر وہ بھی دن آگیا۔ جب ذی شاہ اور علی عیسیٰ کی پہلی ملاقات بیرلنچ میں ہوئی تھی۔ اس دن انی کی طبیعت خراب تھی۔ آفاق کو مجبوراً گھر رکنا پڑا تھا۔ علی عیسیٰ کو خود ذی شاہ سے ملنے جانا تھا۔ پھر پورے تین سال بعد وہ اپنے ہی دفتر گیا تھا۔ جہاں کی ہر چیز بہت اجنبی اور عجیب لگ رہی تھی۔ دل چاہتا تھا سب کچھ تہس نہس کردے۔ اس شان وشوکت اور آن بان کی اسے ضرورت ہی کہاں تھی۔ دل پر صفِ ماتم بچھی تھی۔ روح کرلا رہی تھی اور وہ کسی پتھریلے مجسمے میں ڈھلا ذی شاہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ ذی شاہ اسے کبھی پہچان نہیں سکتا تھا۔ البتہ عیسیٰ نے اسے پہلی نگاہ میں ہی پہچان لیا تھا۔ اس کے دل پر بوجھ سا لد گیا۔ جی چاہتا تھا اپنا گریبان پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جائے۔ جس زندگی میں سکھ نہیں..... اس زندگی کا بھلا کیا فائدہ.....

میٹنگ کے دوران عیسیٰ نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ سامنے بیٹھے انسان کا مجرم ہے۔ اور جرم کرنے والے کی نگاہ کبھی نہیں اٹھتی۔ علی عیسیٰ کی نگاہ بھی جھک گئی تھی پھر کبھی اٹھ ہی نہیں سکی۔

دوسری طرف آفاق نے افریشم کو سمجھا رکھا تھا کہ عیسیٰ کا ذکر ذی شاہ کے سامنے کب، کب کرتا ہے؟ تاکہ وہ عیسیٰ کا نام سن کر چونکتا رہے۔

پھر جب ایک مرتبہ افریشم، آفاق کو عیسیٰ کے متعلق ہدایت دے رہی تھی تب ذی شاہ بھی قریب تھا اور وہ اپنے تئیں کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔ جبکہ افریشم اور آفاق، عیسیٰ کا خیال اپنی جان سے بھی بڑھ کر رکھتے تھے۔ عیسیٰ اگر ذرا سا بھی بیمار ہو جاتا تب آفاق کی جان پہ بن جاتی۔ دراصل عیسیٰ سے محبت اور لگاؤ تو آفاق کو تب سے تھا جب اجنبی لوگوں کے اس من ہائیم میں عیسیٰ نے اسے سہارا دیا تھا۔ وہ عیسیٰ کے متاثرین میں سے تھا۔ اور عیسیٰ سے عقیدت کی حد تک محبت کرتا تھا۔ اول تو عیسیٰ اس کا محسن تھا۔ دوسرے دوست بھی بن چکا تھا۔ آفاق تو اس کے سامنے عمر بھر سر نہ اٹھا سکتا۔

اسی لیے جب آفاق کو عیسیٰ کی بہن کے ''خطرناک'' ذہن کے بارے میں علم ہو گیا تھا تب سے وہ چاہتا تھا کہ عیسیٰ یا انکل کو کچھ نہ کچھ بتا دے۔ مگر یوں تھا کہ نمک حلالی، حیا اور لحاظ آڑے آ جاتا۔ وہ کس طرح بغیر کسی ثبوت کے مون پہ انگلی اٹھاتا۔ حالانکہ بیدی لونگ میں ڈچ سیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ مون کی لگام پروفیسر جیسے شیطان کے ہاتھ میں چلی گئی ہے اور وہ مون کو بھی اپنے ساتھ دلدل میں دھنسا دے گا۔

یہ اسی وقت کی بات ہے جب مون کی صلاحیتوں کے جوہر آفاق پر کھلنے لگے تھے۔ یقین تو اسے پہلے ہی آ چکا تھا۔ مگر جس صبح اس نے سوزن کو لاؤنج کے دروازے میں کھڑے، کھڑے ہپناٹائز کیا تھا تب وہ ششدر رہ گیا تھا۔ آفاق کو لگتا تھا کہ مون کسی نہ کسی کو نقصان ضرور پہنچائے گی۔ اس کے بعد مالا کی زندگی میں پے در پے خوف داخل کیا گیا۔ ایک واقعے کا تو آفاق چشم دید گواہ تھا۔ تب اسے مون پر پورا شک نہیں بلکہ یقین ہو گیا۔ وہ مالا کو خوفزدہ کرنے رات کی تاریکی میں آتی تھی۔ اسی طرح ثبوت کی تلاش میں ایک دن آفاق کو مون کا قیمتی کراؤن مل گیا تھا۔ اب تو شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کراؤن پھولوں کے جھنڈ کے پاس گھاس پر گرا تھا۔ آفاق نے فل ثبوت کے ساتھ جب عیسیٰ پر حقیقت منکشف کی تب عیسیٰ نے ماننے سے انکار کر دیا بلکہ آفاق کو بے انتہا تشدد کا نشانہ بنایا۔ پھر انکل کی اچانک ڈیتھ نے آفاق کو بوکھلا دیا تھا جبکہ عیسیٰ کو... تو سدھ بدھ بھول گئی۔ آفاق تب بھی عیسیٰ کو نہ چھوڑتا، اس کے پاس رہتا مگر عیسیٰ نے اسے دھتکار دیا تھا وہ اتنا بے غیرت نہیں تھا جو عیسیٰ کے تلوے چاٹتا رہتا۔ آفاق دکھی دل کے ساتھ گھر چھوڑ گیا۔ اور اس کے گھر چھوڑنے کے بعد وہ بھیانک حادثہ پیش آیا۔

''مون نے اپنے شیطانی ذہن کا استعمال کر کے عیسیٰ کو ہپناٹائز کیا اور مالا کے لیے فحش الفاظ کہلوائے۔ اس کے بعد عیسیٰ باہر چلا گیا پھر جو مالا کو فون کال موصول ہوئی تھی وہ عیسیٰ کی نہیں تھی بلکہ اس خطرناک لڑکی تھی جو جانوروں اور انسانوں کی آواز نکال لیتی تھی۔ مون نے عیسیٰ کی آواز میں مالا کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔ تب طلاق کے بھیانک الفاظ سن کر مالا نے خود کو آگ لگا لی۔ وہ عیسیٰ کے گھر تک جل کر خاکستر ہو چکی تھی۔ ایک پرچہ وہاں لکھا پڑا تھا۔ جس میں مالا نے اپنی خودکشی کا اعتراف کیا تھا۔ بس یوں سمجھو...... عیسیٰ اس پرچے کو پڑھ کر پاگل سا ہو گیا... اس نے مالا کو طلاق نہیں دی تھی۔ مگر وہ کیسے یقین دلاتا؟ مالا تو مر کر مٹی ہو چکی تھی۔ اس کی صورت پہچاننی مشکل تھی۔ پھر بعد کے حالات بڑے دردناک تھے۔ مالا کی بھیانک موت کا صدمہ عیسیٰ کو نیم پاگل کر چکا تھا۔ پولیس نے ہی پوسٹ مارٹم رپورٹ بنوائی، مالا کو دفن کر دیا گیا۔ مگر وہاں ہوش کسے تھا؟ مجھے تب اطلاع ملی جب عیسیٰ کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا...... اور وہ اسپتال میں لاوارث پڑا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا پھر بھلا کسے یاد رہنا تھی عیسیٰ کی دی گئی ذلت اور مار...... جتنا اس نے مجھے

میرے نکاح والی رات مارا تھا۔ اللہ کی قسم! آج تک ہڈیوں سے درد اٹھتا ہے۔ پر میں ساری ذلت بھلا کر عیسیٰ کی بچی سے لگ گیا۔ اسے صحت مند ہوتے ہوتے نو دس ماہ لگ گئے۔ بعد میں جو اگلے چھ ماہ تھے وہ اسے مالا کی موت کا یقین دلاتے گزر گئے۔ وہ کچھ سنبھلا تو مالا کی نمازِ جنازہ ادا کرنے کا سوچا۔ وقت نے ڈھیرے، ڈھیرے ان تین سالوں میں زخموں پر کھرنڈ جما ہی دیے تھے پر خدا کی قسم! میرے یار نے مالا کے بعد اپنے اوپر ہر خوشی حرام کر لی۔ اگر مالا جل کر خاکستر ہو گئی تھی تو عیسیٰ بھی زندہ لاش بن گیا۔ مجھے وکیلِ صفائی مت سمجھنا...... میں تو اللہ کو حاضر و ناظر جان کے قسم کھانے کے بعد کہتا ہوں۔ عیسیٰ قطعاً...... بے قصور ہے...... ڈیڑھ سال تک اسے اپنا ہی ہوش نہیں رہا تھا۔ آپ لوگوں کو کوئی اطلاع نہ دے سکا۔ اب جو چاہے میرے عیسیٰ کو سزا دے لو... وہ تو ویسے بھی زمین پر خود کو بوجھ سمجھتا ہے۔" آفاق نے نم آلود آواز میں اپنی بات مکمل کی۔ تب وہ لمحے بھر کے لیے منجمد ہو گیا تھا۔ کیونکہ ذی شاہ نے اٹھ کر اسے سینے میں بھینچ لیا تھا۔

"تیری یاری کو تو سیلوٹ کرنے کو دل چاہتا ہے وکیلِ صفائی! جا، اپنے عیسیٰ کو بتا دے، اس کی مالا زندہ ہے، جلنے والی لاش اس خبیث نینی کی تھی اور یہ بھی اسی پروفیسر نے کوئی چال کھیلی تھی۔" ذی شاہ شدتِ جذبات میں اسے بھینچتا منکشف سے لی گئی معلومات اسے فراہم کر رہا تھا جبکہ آفاق "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیے بیچ کی طرف بھاگا تھا۔ کیا مالا کے زندہ ہونے کی خبر کوئی معمولی تھی؟

☆☆☆

پھر ملن کی گھڑی بڑی عجیب تھی۔ وہ دو چچا زاد ایک دوسرے سے صدیوں بعد جیسے مل رہے تھے۔ زخم، زخم اور فگار، فگار سے۔

عیسیٰ کی آنکھیں نم تھیں تو ذی شاہ سے ضبط کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ آخر اتنے صبر آزما انتظار کے بعد بالآخر اس نے علی عیسیٰ کے گریبان کو چھو ہی لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بھینچ بھینچ کر مل رہے تھے۔ جیسے بیچ میں سالوں کی جدائی اور فاصلے کبھی تھے ہی نہیں۔ ایک دوسرے کو طویل تر حکایت سناتے ہوئے وہ گھنٹوں ایک دوسرے میں گم رہے تھے۔ پھر ذی شاہ نے عیسیٰ کو روک دیا تھا۔ وہ کوئی دلیل، وضاحت یا صفائی میں اس کے کہے الفاظ نہیں سننا چاہتا تھا۔

"کسی صفائی، وضاحت یا دلیل کی ضرورت نہیں جانِ من......! تیری تو صورت پر "سچ" لکھا ہے۔ بس اب پاکستان چلنے کی تیاری پکڑ...... اُدھر تو آج عید کا جشن منایا جا رہا ہے۔" وہ بھیگی آواز میں بولتا عیسیٰ کو فدا ہو جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پاکستان میں مژدۂ جاں فزا سنا دیا گیا تھا اور مالا ساری حیا اور لحاظ بھلائے چیخ، چیخ کر ذی شاہ سے التجا کر رہی تھی۔

"صرف ایک مرتبہ عیسیٰ کی آواز سنوا دو۔" مگر ذی شاہ بھی اسے ستا، ستا کر جیسے اپنے من کو شانت کر رہا تھا۔ ایمل اپنے لاڈلے کو بھلائے اس دلچسپ کہانی کا اینڈ سن رہی تھی جبکہ آفاق اسے جتا، جتا کر بتا رہا تھا۔

"افراہیم نے تمہیں ویلکم ان من ہائیم" لکھ کر ویلکم کیا تھا۔ تم تو اتنے بدھو تھے پھر بھی نہ سمجھ سکے۔ افراہیم کے ہر دوست کو اس کی بہنیں اتنے لاڈ سے ویلکم نہیں بولتیں۔ یہ تو علی عیسیٰ کی وجہ سے تم ہماری آنکھوں کا تارہ تھے۔" آفاق کے جتانے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ ہاں، یہ تو حقیقت تھی، بھلا ذی شاہ نے اس بارے میں پہلے کیوں نہیں سوچا تھا؟ اسے احمق بنا کر ایمل سمیت باقی سب لوگ بھی خوب انجوائے کر رہے تھے۔ جبکہ عیسیٰ بڑی حسرت سے ننھے موسیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ ذی شاہ اس کی حسرت کا مفہوم سمجھتا تھا۔ اسی لیے اپنے بازو کو عیسیٰ کے بازو پر

دراز کر کے بڑی محبت سے بولا۔
"ہر کام میں اللہ کی بہتری اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کی چیز تھی اس نے لے لی۔" اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر عیسٰی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
"ہاں..... تم نے ٹھیک کہا..... اللہ کی رضا میں راضی ہو کر ہی سکون ملتا ہے۔ وہ اللہ گڑھے مردوں کو اکھاڑ کر سامنے لے آیا۔ میں ڈیڑھ سال سے ایک قبر پر فاتحہ پڑھتا، پھول چڑھاتا اور مالا کا نام لے کر روتا رہا ہوں۔ نایا جی سے اتنی شرمساری تھی کہ تم لوگوں کو فون کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ میں اتنا نااہل نکلا کہ ان کی پھولوں سے گندھی مالا کی حفاظت نہ کر سکا۔ مالا اتنی اذیت ناک موت کا شکار ہوئی کہ میں اس کی شکل ہی ڈھونڈتا رہ گیا تھا۔ ڈیڑھ سال تک چڑیلی پگھلا مالا کا چہرہ مجھے راتوں کو اٹھ، اٹھ کر رونے پر مجبور کر دیتا تھا۔ میں تو پاپا کی موت ابھی بھلا نہیں پایا تھا کہ مالا کی بھیانک موت نے مجھے مخبوط الحواس کر دیا۔ تم وہ چہرہ دیکھتے تو ر پڑتے اور عمر بھر خود کو معاف نہ کرتے
اس چہرے، پر نہ آنکھیں تھیں، نہ ناک، نہ ہونٹ..... نہ بال، نہ چڑیلی..... وہ تو ہڈیوں کا کوئی انجر پنجر تھا۔ مجھے ڈیڑھ سال تک یقین نہیں آیا کہ وہ لاش مالا کی تھی۔ بھلا مالا جیسی معصوم، بے گناہ، سادہ لڑکی کو ایسی بھیانک موت..... آخر اس نے کون سا اتنا بھاری گناہ کیا تھا جو اسے اتنی دردناک موت ملی..... پھر وہ پرچہ میرے دل کو روگ لگا گیا۔ میں نے کب مالا کو طلاق دی؟ وہ میرے آنے تک انتظار تو کر لیتی۔ اتنے پچھتاوے تھے کہ حد نہیں..... بس سمجھو زندگی مالا کے ساتھ ہی قبر میں اتر گئی تھی۔" عیسٰی ابھی تک ان کرب انگیز ساعتوں کے اثر میں تھا۔ اور آفاق چاہتا تھا کہ عیسٰی کوئی پچھلی بات نہ کرے۔ وہ جلد اسے موسیٰ کی طرف متوجہ کر چکا تھا مگر عیسٰی کا دل تو مالا میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ بھی مالا کی طرح اس کی آواز سن کر یقین کرنا چاہتا تھا کہ سچ میں مالا زندہ ہے؟ مالا زندہ تھی؟

اسی دنیا میں موجود تھی؟ مگر آفاق نے اسے فون نہیں کرنے دیا..... "آمنے سامنے جا کر بات کرتا۔ مالا سے جوتے کھاتا..... اور مجھے یاد کرتا۔ قسم سے ذرا مدد نہیں کروں گا تمہاری..... مجھے اتنے جوتے مارے تھے حد نہیں۔" آفاق دہائیاں دیتا چیخ رہا تھا۔ پھر وہ لوگ واپس جانے کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ آفاق، افریشم اور موسیٰ بھی عیسٰی کے ساتھ ہی پاکستان جا رہے تھے۔ آفاق نے اپنی دادی کو گڑے بنوا دیے تھے۔ ماں، باپ کو حج کروا دیا تھا۔ دو بہنوئی سیٹ ہو چکے تھے، دو کو اب کرنے جا رہا تھا۔ بہن کی شادی بھی کرنا تھی۔ وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو رہا تھا۔
افریشم پہلی مرتبہ سسرال جا رہی تھی، اس لیے بہت خوش تھی۔ البتہ ایمل کا موڈ سخت آف تھا۔ وہ اپنے لاڈلے کی جدائی میں ابھی سے منہ بسورے بیٹھی تھی مگر اس کے منہ بسورنے سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔ جانے والوں نے تو جانا ہی تھا۔
جانے سے پہلے عیسٰی بوواریا گیا تھا۔ تانتے اور [illegible] سے ملا۔ سوزن سے تو کب کے تعلقات بحال ہو چکے تھے۔ مالا کے مرنے کی خبر سن کر سوزن خود بخود چلی آئی تھی۔ عیسٰی کی بیماری کے دنوں میں آفاق کے ساتھ ساتھ رہی۔ وہ مون کو ہی مالا کی موت کا ذمے دار سمجھتی تھی۔ آفرین تھی عیسٰی کے صبر پر..... وہ مون کا نام سن کر بس اتنا ضرور کہتا۔
"پلیز سوزی.....! میرے سامنے اس کا نام مت لیا کرو۔" عیسٰی کا چہرہ کرب کی سرخی سے برہم ہو جاتا۔ تب سوزن نے مون کا ذکر کرنا خود ہی چھوڑ دیا تھا۔ عیسٰی بوواریا جاتے ہوئے سوزن کی بیٹی کے لیے ڈھیروں تحائف، کپڑے، چاکلیٹس اور کینڈیز وغیرہ ضرور لیتا تھا۔ اب بھی ڈھیروں تحائف لے کر گیا تھا۔ سوزن اور میکس کی شادی ہو گئی تھی سوزن اب بھی بوواریا میں گروسی کے پاس رہتی تھی۔ اس کی بیٹی

بہت خوب صورت تھی۔ اسی جیسی پھولے، پھولے چکنے سرخ گالوں والی۔ البتہ میکس من ہایم میں تھا۔ ہر ویک اینڈ پر گھر جاتا اور آفاق کے ساتھ ہیر لٹ کے تمام انتظامات کو سنبھالے ہوئے تھا۔

جیسے سب کی زندگیوں میں ترتیب آگئی تھی ایک بے سکون تھا تو صرف علی عیسیٰ...... نہ جانے کس گناہ کی سزا مل رہی تھی۔ ہاں تب وہ یہی سمجھتا تھا مگر وہ سزا کہاں تھی؟ وہ تو آزمائش تھی جو اللہ نے اپنی مدت پوری ہوجانے کے بعد خود بخود ختم کردی تھی۔

سوزن اور میکس انہیں ائر پورٹ چھوڑنے آئے تھے۔ آفاق جاتے سمے تک بھی میکس کو ہدایات دیتا رہا تھا جو وہ پوری تسلی کے ساتھ سنتا رہا پھر جب جہاز فضا کی بلندیوں میں تیرنے لگا تب عیسیٰ نے آفاق سے کہا تھا۔

"ایک دفعہ وہ میری خاطر اپنے گھر کو چھوڑ کر آئی تھی ایک دفعہ میں اس کی خاطر جا رہا ہوں۔ دعا کرنا...... وہ مجھے دھتکار نہ دے۔" عیسیٰ عجیب پژمردہ سا تھا تب آفاق چونک کر بولا۔

"ایویں نہیں معاف کرے گی۔ تیرا قصور ہی کیا ہے؟ اور پھر ذی شاہ نہیں بتا رہا تھا۔ پاکستان میں جون کے مہینے میں عید کا چاند نکلا ہوا ہے۔ وہ لوگ تمہارے انتظار میں دل بچھا کر بیٹھے ہیں۔" آفاق نے برجستہ کہا تھا اور اس نے شاید نہیں یقیناً سچ کہا تھا۔ وہ ائر پورٹ پر اترے تو پورا خاندان ہنستا کھلکھلاتا نظر آرہا تھا۔ مالا کے دونوں بھائی (تیسرا ابھی جرمنی میں تھا) کیونکہ ذی شاہ کی سیٹ دو دن بعد کی تھی۔ تائی، عینی اور نہ جانے کون، کون...... اس نے بندیا کو پہچان لیا تھا البتہ عینی اپنے نخرے سے ہی پہچان کروا گئی تھی۔ ذیشان کا رویّہ بہت مختلف تھا۔ وہ تو ذی شاہ سے بڑھ کر محبت کا مظاہرہ کررہا تھا۔ حالانکہ ذیشان کی خودغرضی کے بارے میں وہ بہت نہ سہی کچھ نہ کچھ ضرور جانتا تھا۔ مگر اس وقت وہ قطعاً کسی اور روپ میں تھا۔ یہاں بھانت، بھانت کے لوگ تھے۔ جو عیسیٰ کے گرد مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ البتہ آفاق اور افریشم اس جھمگٹے سے نکل کر اپنے گھر چلے گئے تھے۔ آفاق چار سال بعد تو اپنے گھر والوں سے ملنے والا تھا۔ اس کی بے تابی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور علی عیسیٰ کے اضطراب کا بھی کوئی شمار نہیں تھا پر وہ جسے دیکھنا چاہتا تھا وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ کہاں تھی؟ دل بے قرار پاگل ہورہا تھا۔ تب ایمل جیسی مالا کی نٹ کھٹ بہن اس کے کان میں گھس گئی تھی۔

"ایک ہزار نفل پڑھنے کی منت مان رکھی ہے مالا نے۔ ابھی تو آٹھ سو بھی نہیں ہوئے۔" بندیا شرارتی نظروں سے اسے دیکھتی تنگ کررہی تھی۔ عیسیٰ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"ایک ہزار......؟" وہ بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔

"وہ تو دو ہزار نوافل پڑھنے کی منت مان رہی تھی میں نے کہا ایک ہزار کافی ہیں۔" بندیا اپنی ذہانت کا مظاہرہ کررہی تھی۔ تب عیسیٰ گھڑی اور کیلنڈر کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اگلے دو دن تک بھی مالا کی منت پوری ہونے والی نہیں تھی اور پھر اس کا اندازہ درست نکلا تھا۔ مالا اگلے دو دن بھی نظر نہ آئی۔ البتہ گھر میں مہمانوں کی آمد بڑھتی گئی۔ لوگ عیسیٰ کو یوں چھوتے، اس طرح ملتے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو یا کوئی متبرک چیز...... یہ اور بات تھی کہ سوال کسی نے نہیں کیا تھا۔ یوں لگتا تھا ذی شاہ گھر والوں کو پوری کہانی سنا چکا تھا...... علی عیسیٰ اور مالا کی کہانی......

پھر دو دن بھی گزر گئے۔ مالا نظر نہ آئی۔ اب تو عیسیٰ کا ضبط جواب دے گیا۔ تب بندیا ایک ننھی سی چٹ اٹھا لائی۔ مالا نے بلایا تھا یعنی مژدۂ جاں فزا سنایا تھا اور جب وہ مہمانوں سے مل، مل کر نڈھال ہوتا مالا کے کمرے کی طرف آیا تب عینی کو جیسے موقع مل گیا۔ وہ ان دنوں اپنے گھر سے اِدھر ہی ڈیرا

لگائے ہوئے تھی اور مہمانوں کے ڈھیر کی وجہ سے اسے عیسٰی سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ پھر جب اس نے آنکھوں میں مکاری بھری معصومیت کے ساتھ عیسٰی سے پوچھا کہ طلاق کے بعد صلح کرنا کس شریعت کی کتاب میں لکھا ہے وہ بھی تین سال کی مدت گزرنے کے بعد...... اب رجوع کرنا سمجھ نہیں آرہا۔'' عینی نے ڈوپٹے گھما کر عیسٰی کو مخاطب کیا تھا تب وہ لمحے بھر کے لیے تھم سا گیا۔ یقیناً فطرت نہیں بدلتی اور عینی کی تو بدل ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک گہری سانس کھینچ کر تحمل سے بولا۔

''میں نے مالا کو طلاق کب دی؟ کوئی پھولوں کی مالا کو گلے میں لٹکا کر پھر اتار سکتا ہے؟'' اچانک کمرے سے نکلتی مالا کو دیکھ کر علی عیسٰی نے اپنی بات مکمل کر لی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک روشنی اتر آئی۔ پورے تین سال بعد وہ من ہائیم کے قبرستان سے جیسے نکل کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ نماز کے انداز میں دوپٹا لیے پاگل ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالے علی عیسٰی کو یک ٹک دیکھ رہی تھی اور عیسٰی کو لگا جیسے وقت کی نبضیں تھم گئی ہوں۔ عینی کو اپنی موجودگی قطعاً بیکار لگی۔ وہ مالا جیسی عام سی لڑکی پر رشک کرتی وہاں سے ہٹ گئی۔ آخر کیا تھا اس عام سی لڑکی میں جو علی عیسٰی کو جرمنی کا حسن بھی باندھ نہیں سکا؟ حسد کرنے والے آج بھی موجود تھے۔ رشک کرنے والے بھی موجود تھے۔ چاہے خطہ کوئی سا بھی ہوتا۔ حسد کرنے والے ختم نہیں ہو سکتے ہیں۔ نہ حسد کرنا چھوڑ سکتے ہیں۔

''مجھے حسد کرنے والوں سے بہت ڈر لگتا ہے عیسٰی! میں نے تین سال کا عذاب بھگتا ہے۔ میں اب کسی کے حسد کی آگ میں مزید نہیں جھلس سکتی۔'' مالا دھیرے دھیرے چلتی اس کے قریب آگئی تھی۔ جیسے کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ جیسے کوئی سہانا خواب دیکھ رہی تھی اور عیسٰی جیسے اس کا نقش دل میں اتار رہا تھا۔ اس سادہ سے چہرے پہ نہ کوئی غصہ تھا، نہ خفگی، نہ کوئی ناراضی، نہ گزرے ہوئے تین سالوں کی اذیتوں کا حساب درج تھا۔ وہاں تو صرف ایک شکر کی تحریر رقم تھی۔ صبر سے شکر تک کی منزل اور کچھ بھی نہیں۔ عیسٰی کے دل میں مالا کی محبتوں کا چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔ وہ شاید مالا جیسا صابر نہیں تھا۔ وہ اپنے دل کی حکایت اسے سنانا چاہتا تھا۔ ایک، ایک صدمے اور دکھ کی کہانی سنانا چاہتا تھا مگر اس شکر کا پیکر بنی لڑکی نے اسے روک دیا۔

''ماضی میں کچھ نہیں رکھا علی عیسٰی! آپ شکر ادا نہیں کرتے۔ وہ اللہ جو جدائی کے بعد ملن کی رُتوں کو واپس لایا ہے اور میں شکوہ کر کے اور دکھ سن کر ناشکری نہیں بننا چاہتی۔ مجھے میرے اللہ کا شکر ادا کرنے دیں۔ میں اس قابل نہیں تھی جتنا اس نے مجھے نواز دیا۔ میرا علی عیسٰی مجھے لوٹا دیا۔'' وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ آسودگی کے آنسو تھے۔ شکر کے آنسو تھے، یہ ملن کی رُت میں خوشی کے آنسو تھے۔ علی عیسٰی نے ان آنسوؤں کو کسی انمول خزانے کی طرح اپنی پوروں میں سمیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

اس کی فلائٹ میں گھنٹے بھر کا وقت رہ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے چلے جانا تھا۔ من ہائیم سے دور، مغربی جرمنی سے دور...... پھر نہ جانے کبھی دوبارہ آنے کا موقع ملتا یا نہیں؟

پاکستان میں اس کے گھر خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔ ممی اور اس کے بھائی خوش تھے۔ بندیا خوش تھی اور سب سے بڑھ کر مالا اور علی عیسٰی خوش تھے۔

ذی شاہ کو لگتا جیسے وہ اپنی بہن کے سامنے عمر بھر کے لیے سرخرو ہو گیا ہے۔ کیا تھا جو دل کا ایک کونا اداس تھا۔ کیا تھا جو دل کے ایک کونے میں اندھیرا تھا۔ باقی دل پر تو مسرت کا راج تھا ناں...... خوشی

جس کا ذائقہ تین سال بعد اس نے چکھا تھا..... اور اب وہ اس خوشی میں کچھ آنسو سمیٹتے ویلس ہاؤس کی مالک کے پاس اسپتال آرہا تھا۔

وہ اس کی ہمیشہ جیسی منتظر بیٹھی تھی۔ پہلے کی طرح ویران، نڈھال، غمزدہ.....

''مجھے لگ رہا تھا تم ضرور آؤ گے۔'' وہ جیسے مرتی، مرتی پھر سے زندہ ہوگئی تھی۔

''تم ......اور تمہارے اندازے..... کب غلط ثابت ہوتے ہیں؟'' ذی شاہ دھیرے، دھیرے چلتا اس کے قریب آگیا تھا۔

''طنز کرتے ہو؟'' گیلی آنکھیں مسکرادیں۔

''نہیں ...... سچ کہتا ہوں۔'' وہ بھی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا تھا مگر پھر بھی مسکرا نہ سکا۔ کتنا مشکل تھا مسکرانا بھی.....

''مان لیتی ہوں۔'' گیلی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں..... تب ذی شاہ کچھ سوچ کر جیسے اس کی روح میں چھپے کچھ کانٹے نکالنے لگا تھا۔

''سوچا، جانے سے پہلے تمہارے سینے میں اٹکی ایک پھانس تو نکال جاؤں ..... تمہاری اذیت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ کمبخت محبت جو ہوگئی ہے۔'' ذی شاہ نے اس کے چہرے پر پھیلے کرب کو دیکھ کر نرمی سے کہا۔ اس کا روم، روم جیسے کان بن گیا تھا۔

''اس رات جو لوگ عیسیٰ کے گھر پٹرول کی بوتلیں لے کر آئے تھے۔ انہوں نے ننی کو جلایا تھا، مالا کو نہیں...... مالا زندہ ہے اور ابو بکر جو تمہارے معالج ہیں ان کی مہربانی سے وہ بحفاظت ہم تک پہنچ گئی تھی۔ اب تو عیسیٰ بھی پاکستان چلا گیا۔ دکھ ہماری زندگیوں سے نکل گئے۔ زندگی کی بے ترتیبی میں ترتیب آگئی۔'' ذی شاہ کے اندر سکون کی لہریں اتر آئی تھیں۔ پھر اس نے دیکھا۔ گیلی آنکھوں میں تشکر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ وہ جیسے گردن ڈھلکائے شکر کے سمندر میں ڈوب گئی تھی۔

''اللہ تیرا شکر..... مالا زندہ ہے۔ اور میرے بھائی کی زندگی میں بہار آگئی۔ وہ اپنوں میں چلا گیا۔ اسے اپنوں کی ہی تو تلاش تھی۔'' گیلی آنکھیں بہتی چلی گئیں۔ اس کے سینے سے پھانس حقیقتاً نکل گئی۔ وہ جو تین سال سے مالا کی موت کو بھلا رہی تھی جیسے ایک دم شانت ہوگئی۔ پروفیسر بشر نے اس کے ساتھ بڑا داؤ کھیلا تھا۔ ننی کو جلا کر کہا کہ مالا کو جلا دیا گیا ہے۔ ساتھ ایک تحریر بھی رکھوا دی تھی۔ تب مون، پروفیسر کے ساتھ بہت لڑی۔ اس نے مالا کو علی عیسیٰ کی زندگی سے نکالنا تھا اسے قتل نہیں کرنا تھا۔ وہ جیسے پاگل ہوگئی تھی۔ اسی پاگل پن میں مون نے پروفیسر پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ مگر وہ بچ کر بھاگ نکلا۔ بعد میں اس نے ڈیزی اور ڈیانا کو غائب کروا دیا تھا۔ مون تب تک پروفیسر کی اصلیت جان گئی تھی۔ وہ اعلیٰ ذہنوں کا سوداگر تھا۔ اور ڈیزی، ڈیانا کو اسمگل کر کے کروڑوں ڈالر کما چکا تھا۔ اب اس کی نظریں مون پر تھیں مگر مون کو نہ جانے کیسے اس کے منصوبے کی بھنک پڑ گئی۔ اس نے پروفیسر کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی تھی مگر پروفیسر اسی شب مفرور ہوگیا..... اور پھر اپنے گندے وجود کے ساتھ ایک فضائی حادثے میں جہنم کی آگ کا ایندھن بن گیا۔ کروڑوں ڈالر بینکوں میں پڑے سڑتے رہے قیمتی اثاثے حکومت نے ضبط کر لیے اور پروفیسر کا اعلیٰ مگر شیطانی دماغ زوال پذیر ہوگیا۔

آخر برائی کا انجام برائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا پھر بھی انسان ہے کہ سمجھتا ہی نہیں۔ پھر کبھی پروفیسر کی طرح آگ کا شکار بن جاتا ہے اور کبھی منکشے کی طرح خود اپنی ذات کے لیے بھی بوجھ.....

مون کے روم میں آنے سے پہلے وہ ڈاکٹر ابوبکر سے ملنے گیا تھا۔ ان کا اور ہیرا کا شکریہ ادا کیا۔ جن کی مدد اور تعاون نے مالا کو بحفاظت ان تک پہنچا دیا تھا۔ ورنہ کتنی ہی مالائیں حالات کی ستم ظریفی کا

شکار ہوکر پردیس میں رُلتی رہ جاتی ہوں گی پھر مون کے حوالے سے بات ہوئی تو ابوبکر نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اسے سمجھایا تھا۔
''ڈاکٹر ایک مسیحا ہوتا ہے..... اس کے سامنے دشمن بھی مر رہا ہو تو اس کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، مون حسیب بہت غیر معمولی ذہن رکھنے والی لڑکی تھی۔ میں اسے پہلی نظر میں پہچان گیا۔ وہ کسی اعلیٰ اور قیمتی ہیرے کے مانند تھی۔ مگر اس کے تراشنے والے ہاتھ ٹھیک نہیں تھے۔ ان ہاتھوں میں مہارت تو تھی، ایمانداری نہیں تھی۔ انہوں نے ہیرے کو گریفائیٹ بنادیا مگر مون گریفائیٹ بن کر بھی بیکار ہرگز نہیں..... وہ جانتی تو جلد ٹھیک ہوسکتی ہے۔''
ڈاکٹر ابوبکر بڑا پُرامید تھا۔ ذی شاہ مسکرا کر بوجھل دل کے ساتھ سنتا رہا اور اب مون کے چہرے پہ اترا اطمینان دیکھ کر اس کا دل کچھ اور بجھ گیا تھا۔ وہ مالا کے زندہ ہونے کا سن کر بہت خوش تھی اور عیسیٰ کے پاکستان جانے کا سن کر شکر بجا لارہی تھی۔ جبکہ ذی شاہ کی واپسی نے اسے پتھر کی مورت بنادیا تھا۔ اس کے جانے کا سن کر منکشے کی سانس تک رک گئی۔
''اپنا وعدہ بھول گئے؟'' اس کی آنکھوں میں آس تھی۔ دل میں درد کا طوفان اٹھنے لگا تھا۔
''نہیں، یاد ہے۔'' وہ نرمی سے بولا تھا۔ منکشے جیسے کھل اٹھی۔ آہ..... بھلا مُردوں سے کیا انتقام لینا۔ اسے منکشے کی حالت دیکھ کر رونا آگیا۔ وہی گندی سی مورگن روک پہنے..... انتہائی اجڑی، ویران اداس.....
''تو پھر.....؟'' منکشے نے گیلی ہوتی آنکھوں کو رگڑا۔
''میں جلد آؤں گا..... دعا کرنا عیسیٰ اور مالا تمہیں معافی کا سندیسہ تھمادیں۔ آخر، سب سے زیادہ وہ نقصان تو ان کا ہی ہوا ہے.....'' عیسیٰ نے اس سے مون کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی مگر ذی شاہ اس کے اندر کا احوال جانتا تھا۔ پھر بھی منکشے کے ہاتھ میں آس کا دیا پکڑا دیا۔
''کیا سچ.....؟'' وہ جیسے پاگل ہوگئی۔
''ہاں..... اب اجازت دو اور وعدہ کرو، اب کہ برس جب آؤں تو تم اس غلیظ حلیے میں نہیں ہوگی۔'' ذی شاہ جاتے، جاتے پلٹ آیا تھا۔ وہ ہنستے، ہنستے رو پڑی۔
''وعدہ رہا..... جلدی آنا..... یہ نہ ہو گیلی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بنجر ہوجائیں۔'' وہ بھی وعدہ لے رہی تھی۔ ذی شاہ نے اس کی آس نہ توڑی۔ منکشے کی آنکھوں میں ستارے بھر کے لوٹ آیا۔ کاریڈور کی طرف جاتے اس کے پیر من، من کے ہورہے تھے۔ وہ جیسے قدموں کو گھسیٹ، گھسیٹ کر چل رہا تھا۔
کون جانے آنے والا وقت کیا سوغات لاتا تھا؟ کسے خبر تھی؟ کہ عیسیٰ اور مالا، منکشے حسیب کو معاف کردیتے۔ یہ گزرتا وقت ہی بتا سکتا تھا، کیا پتا کہ وقت زخموں پر کھرنڈ جما ہی دیتا۔ عیسیٰ اور مالا اپنی زندگی میں آنے والے وہ تین بھیانک سال بھلادیتے کسے خبر تھی؟
جاتے، جاتے سفر پہ دل کیوں اتنا بوجھل تھا؟ آنکھیں کیوں بھر، بھر آرہی تھیں۔ یہ اداسی کا طوفان کہاں سے اٹھ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ پلٹ کر ایک مرتبہ تو اس عجیب تر غیر معمولی ذہن رکھنے والی لڑکی سے شکوہ کرتا۔ آخر اس نے اپنی زندگی کے ساتھ، ساتھ اور لوگوں کی زندگی کو کیوں عجیب تر بنادیا تھا؟ وہ خود تو برباد ہوئی تھی مگر اوروں کو بھی بے سکون ہی کیے رکھا تھا۔ وہ اپنے زخمی دل کا کس سے حساب لیتا؟ وہ کس کے گریبان کو پکڑتا؟
''تم نے اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا منکشے! اور میرے ساتھ تو بالکل بھی نہیں..... تصویر سے عشق کیا تھا، وجود سے کرلیتیں، جتنا مالا کو برباد کرنے میں وقت

تباہ کیا تھا، اتنی کوشش میرے دل کو اپنی طرف مائل کرنے میں کرتیں۔ کم از کم کچھ حاصل تو ہوتا؟ کیسا اعلیٰ دماغ پایا تھا تم نے...... اگر ٹیلی پیتھسٹ بنی بھی تھیں تو اس اعلیٰ پائے کی صلاحیت سے کسی کو نقصان تو نہ پہنچاتیں۔ مخلوقِ خدا کی خدمت کرتیں اور آج تمہارے اس اعلیٰ ترین ذہن کو زوال نہ آتا......'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ جہاز میں بیٹھ رہا تھا۔ اس کا دل بوجھل، اداس اور ویران تھا جبکہ من ہائیم کے ایک اسپتال کی گلاس ونڈ میں کھڑی وہ غیر معمولی ذہین لڑکی گیلی آنکھوں کو پونچھتی مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پہ آس کا ایک دیپ جل رہا تھا۔ جب تک یہ دیپ جلتا رہتا، اس کی زندگی نے آگے بڑھتے ہی رہنا تھا۔ وہ اپنے صحت مند ہونے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے غلیظ جذبے بدلنے کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ اسے بیدی ڈیوڈ کی عمارت میں پھر سے ایک اسکول بنانا تھا۔ معذور بچوں کے لیے اسکول...... ہاں، وہ خود کو بدل رہی تھی، اس کی آنکھوں میں روشنی بھر رہی تھی۔ اچھی امید کی روشنی...... وہ معذور بچوں کو سہارا دے کر اپنے نامۂ اعمال کے بوجھ کو کچھ تو ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں انتظار کا ایک دیپ جل رہا تھا۔

☆☆☆

مون حسیب اپنی نوعیت کا ایک الگ ہی کیس تھی، وہ اپنی طرز کی ایک منفرد قسم کی لڑکی تھی، انفرادیت اس کا پہلا عشق تھا۔ وہ ہزاروں لوگوں میں خود کو منفرد کرنے کا اسم جانتی تھی۔ اور اس کی یہی انفرادیت، اعلیٰ مضبوط دماغ جو میلوں کے فاصلوں پر موجود انسانوں کے دماغوں کو کھنگالنے کی طاقت رکھتا تھا بالآخر زوال پذیر ہو ہی گیا تھا۔

تاریخ اپنے ہیروز کو کبھی نہیں بھولتی مگر مون حسیب نے اپنے خاندان کے لیے کوئی تاریخی واقعہ رقم نہیں کیا تھا۔ اس کا اعلیٰ دماغ خود اس کے اپنے

قابلِ غور

☆ نظر اور نصیب کا کچھ ایسا اتفاق ہے کہ نظر کو اکثر وہی چیز پسند آتی ہے جو نصیب میں نہیں ہوتی اور نصیب میں لکھی چیز اکثر نظر نہیں آتی۔

چلنے والے دونوں پیروں میں کتنا فرق ہے ایک آگے ایک پیچھے پر نہ تو آگے والے کو غرور ہے اور نہ ہی پیچھے والے کو توہین کا احساس...... کیونکہ انہیں پتا ہے کہ پل بھر میں یہ بدلنے والے ہیں۔

اسی کو زندگی کہتے ہیں

☆ زندگی میں اگر کچھ کھونا پڑے تو یہ دو فقرے یاد رکھنا۔

جو کھویا ہے اس کا غم نہیں...... لیکن جو پایا ہے وہ کسی سے کم نہیں۔

☆ جو نہیں ہے وہ ایک خواب ہے۔ جو ہے وہ لاجواب ہے۔

کچھ چیزیں زندگی کی وضاحت کرتی ہیں۔

☆ آپ کا صبر...... جب آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہو۔

☆ آپ کا رویہ جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔

مرسلہ: ثانی شفق، ڈی جی خان

کام بھی نہیں آسکا۔ دراصل مسئلہ صرف یہ تھا کہ اس نے اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا غلط اور ناجائز استعمال شروع کر دیا تھا۔ اس کے غرور، تکبر اور ناشکرے پن نے اسے پستیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا دیا تھا۔ تکبر جس کی انتہا پستی کے علاوہ کچھ نہیں...... خدا کو وہ خودی پسند نہیں جو انسان کو انسانیت کی معراج سے گرا ڈالے اور مون نے اپنے غرور، تکبر اور خودی میں آکر صرف اپنا ہی نقصان کیا تھا۔ ایک وقت ایسا تھا جب وہ مالا کو خوار کر رہی تھی، ایک وقت اب اللہ

نے اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا جب وہ خود خوار ہو رہی تھی۔ اس کا چین، سکون چھین لیا گیا تھا، اس کی اعلیٰ دماغی قوتوں، طاقت اور صلاحیتوں کو سلب کر لیا گیا تھا۔ جب وہ ایک عام انسان کے بجائے خود کو کچھ اور برتر سمجھنے لگی تو خدا نے اس کو عطا کی گئی وہ سیڑھی ایک جھٹکے کے ساتھ کھینچ لی تھی جس کی بدولت وہ ایک ہی جست میں بہت بلندی تک پہنچ رہی تھی۔

اسے گیلی آنکھیں ایک سزا کے طور پر عطا کر دی گئی تھیں۔ یقیناً مون انہیں اپنے لیے ایک سزا ہی سمجھتی ہو گی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی اللہ اپنے اس بندے کو ٹھوکر دے کر اٹھاتا ہے جو اسے بہت عزیز بھی ہوتا ہے۔ مون کی گریہ زاری اور خوف و ہراس نے اللہ رحیم کے رحم اور فضل کو پکارا تھا پھر وہ کیسے نہ توبہ کی پکار پر توجہ دیتا؟ وہ اللہ، جس کا فرمان ہے، اے بندے! تو مجھے تنہائی میں پکار، میں تیرا ذکر تنہائی میں کروں گا، تو مجھے مجمع میں بیٹھ کر پکار، میں تیرا ذکر فرشتوں کی مجالس میں کروں گا۔ تو میری طرف چل کر آ...... میں تیری طرف دوڑ کر آؤں گا۔ تو پھر اللہ رحیم کی رحیمی کا مینہ کیونکر نہ برستا؟ یقیناً منکشے حسیب کے آنسو رائیگاں نہیں گئے تھے۔ گیلی آنکھوں کے کرب اور اضطراب کو قبولیت کا مقام اور سہارا مل گیا تھا...... مگر پھر بھی، دلوں پر لگے زخم مندمل ہونے میں کچھ وقت تو لگنا ہی تھا؟ اذیتوں کے باب ہمیشہ کے لیے بند ہونے میں وقت تو لگنا ہی تھا۔

ابھی تو وہ لوگ خود سراپا سوال تھے۔ عیسیٰ کی آمد سے پہلے بھی اور عیسیٰ کے چلے آنے کے بعد بھی مالا کے گرد سوالوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ لوگ اپنی فطرت سے عاجز تھے اور مالا اپنے صبر پر مجبور تھی۔ لوگوں کے نوکیلے سوال، تیکھے رویوں اور تلخ باتوں کو اب ہنس ہنس کر پی جاتی تھی۔ پہلے ایسے رویوں پر رو لیا کرتی تھی۔ اب ہنس لیا کرتی تھی کیونکہ عیسیٰ کی واپسی کا نہ تو کسی کو گمان تھا نہ یقین...... اور شاید لوگوں کے یقین کرنے میں بھی کچھ وقت تو لگنا ہی تھا۔ بہرحال آہستہ، آہستہ ہی سہی، زندگی کی بے ترتیبی ختم ہو رہی تھی۔ عیسیٰ نے اسے پہلی اور آخری مرتبہ مون کا ذکر کر کے بتایا تھا کہ وہ منکشے حسیب کیا تھی؟ اور کیا ہو چکی تھی؟ اللہ کا انصاف اتنا عظیم ہو گا! مالا کو یقین آ گیا پھر ایسا یقین آیا کہ سجدے سے سر اٹھ ہی نہیں سکا تھا۔

تین سال تک وہ ایک اندھیری قبر میں زندگی کی بوجھل سانسیں لے رہی تھی۔ تین سال تک وہ خاندان بھر کی نگاہوں میں سوالیہ نشان بنی رہی تھی۔ تین سال تک وہ اپنے ہی گھر والوں کی نظروں میں مجرم بنی چھپتی رہی تھی۔ آخر عیسیٰ نے اسے کیوں طلاق دی؟ اس سوال کا جواب وہ آج تک کسی کو نہ دے سکی تھی۔ مالا سے ان آنکھوں کے زہریلے سوالوں کی چبھن برداشت کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ تب وہ گھر کے سب سے تاریک گوشے میں چھپ کر اپنے لیے امان تلاش کرتی۔

تین سال کے کرب، اذیت، درد اور ذلت کو بھلا دینا آسان نہیں تھا۔ وہ چاہ کر بھی من ہائیم کے رویے کو بھلا نہیں پاتی تھی۔ وہ من ہائیم کی یادوں کو مر کر بھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ وہ مون کے دیے گئے ذلت کے زخموں کو بھی بھول نہیں سکتی تھی۔ اور یہی حال، قریب، قریب، علی عیسیٰ کا بھی تھا، وہ مون کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ سوزن نے مالا سے فون پر بات کر کے گزری ہوئی بے شمار یادوں کو دہراتے ہوئے مون کا ذکر کیا تب بھی علی عیسیٰ نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ جب عیسیٰ نے منع کر دیا تھا پھر مالا کیسے اس کی حکم عدولی کر لیتی؟ وہ سوزن سے اس کی بیٹی کے متعلق باتیں کرتی رہی، مالا اپنے پیاسے من کو شانت کر رہی تھی۔ اس کا بیٹا اگر آج موجود ہوتا تو سوزی کی بیٹی اور رانی کے بیٹے سے بھی بڑا ہوتا...... مالا کے دل میں ٹیس سی اٹھنے لگتیں۔

آخر وہ مون کا دیا کون، کون سا زخم بھلاتی؟ اپنے بھائی کی آنکھوں میں انگڑائیاں لیتی محبت کو دیکھ کر ضبط،

صبر اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کر بھی لیتی تو عیسیٰ کو کون سمجھاتا؟ وہ عیسیٰ جس نے من ہائیم کو ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلا دیا تھا۔ ہاں، علی عیسیٰ ایسا کر بھی سکتا تھا مگر مالا کے لیے من ہائیم بھلانا آسان نہیں تھا۔ وہاں ذی شاہ کے کچھ ادھورے خواب بکھرے تھے، وہی ذی شاہ، اس کا پیارا بھائی...... جو بغیر کسی طمع یا لالچ کے محض مالا کی خاطر اتنی دور کا سفر کر کے مغربی جرمنی میں اپنی بہن کے مجرم کو تلاشنے گیا تھا۔ اس سفر میں ذی شاہ نے اپنا کتنا بڑا نقصان کیا تھا؟ اس سفر نے مالا کے بھائی سے کیا کچھ نہیں چھین لیا تھا۔ وہ بھلا کیسے ان باتوں کو نظر انداز کر دیتی؟ اگر ذی شاہ، مالا کے لیے اتنی بڑی قربانی دے سکتا تھا، اپنے دل، خواب اور محبت کو دفنا سکتا تھا تو کیا مالا اتنی خود غرض بہن تھی جو اپنے بھائی کے ایک بھی خواب کو نہ لوٹاتی؟ پھر بھلا موٗن حسیب جیسی خود غرض بہن بیٹی اور مالا جیسی کھری، خالص اور محبت کرنے والی بہن اور لڑکی میں کیا فرق رہ جاتا۔

مالا کو بس علی عیسیٰ تک یہی فرق پہنچانا تھا اس کے بعد ہر مرحلہ آسان تر ہو جاتا...... مالا کو کسی ایسے وقت کا انتظار تھا جب عیسیٰ سے اپنی بات پورے استحقاق کے ساتھ منوا لیتی۔

پھر اللہ نے اسے اس حسین ترین ساعت سے نواز دیا جو عیسیٰ اور مالا دونوں کا اولین خواب تھی۔ جب مالا نے ایک سنہری صبح بری بدیع الجمال جیسا حسن رکھنے والی بچی کو جنم دیا تھا۔ تب شاید حقیقت میں ڈیڈی کے گھر ستاروں کی بارات اتر آئی تھی۔ نہ یہ بچی ان کے لیے بے انتہا مبارک ثابت ہوئی تھی۔ اس صبح مالا کا بھائی زیشان اور عینی بھی ہمیشہ کے لیے گھر لوٹ آئے تھے۔ عینی کی گود ہنوز خالی تھی اور مالا کی بیٹی کے سحر، کشش اور محبت نے ان دونوں کو کھینچ کر واپس اپنے مدار میں کر لیا تھا۔ ممی، زیشان اور عینی کی واپسی پر نہال تھیں۔ بندیا، اینجل کی طرح خالہ بن کر اتراتی پھرتی تھی اور علی عیسیٰ کا چہرہ چودھویں کے چاند کے مانند چمک رہا تھا۔ آج مالا نے ذی شاہ کو بھی بڑے دنوں بعد مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

''ارے یہ تو منکشے جیسی ہے۔'' اس نے بچی کو گود میں لے کر چوما اور پھر کچھ چونک سا گیا۔ اس نے گلابی، گلابی بچی کے نقوش میں آخر اپنا پسندیدہ چہرہ کھوج ہی لیا تھا تب مالا کے دل میں اپنے بھائی کے لیے ٹیس سی اٹھی تھی۔ وہ آج بھی اکیلا اور ادھورا تھا۔ اپنے گم شدہ حصے کو من ہائیم کے اسپتال چھوڑ کر آیا تھا پھر کیسے مکمل ہو جاتا؟ مالا کا دل دکھ سے بھر گیا۔ کاش، اس کے پاس کوئی ایسا اسم ہوتا جو وہ عیسیٰ کے دل کا ہر کواڑ موٗن کے لیے کھول پاتی پھر زندگی میں کچھ بھی ادھورا نہ رہتا...... اگر ایسا ہو جاتا تو کیا تھا؟ تھوڑا سا ظرف ہی تو بڑا کرنا تھا۔ تھوڑا سا دل ہی تو بڑا کرنا تھا۔ ذرا سی نرمی، تھوڑی سی حلیمی، کچھ وسعت القلبی کا مظاہرہ اور...... اور جیسے ادھوری خوشیاں مکمل ہو جاتیں...... مگر علی عیسیٰ؟ مالا ایک ٹک اسے دیکھتی جانے کیا، کیا سوچے جا رہی تھی جب عیسیٰ کی آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی تھی۔

''اللہ رے یہ منکشے جیسی ہو۔'' عیسیٰ نے جس بے ساختہ انداز میں دہل کر کہا تھا پھر ذی شاہ کا ایک دم نظر چرا جانا...... مالا کے دل پر بوجھ سا بڑھ گیا۔ پھر ذی شاہ اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے دل میں کرب کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ بھائی کی تنہائی اسے دھیرے، دھیرے شرمندہ کرتی جا رہی تھی۔ نہ وہ اس کی خاطر جرمنی جاتا نہ وہاں سے محبت کا روگ لگا کر آتا...... مگر یہ سب تو جیسے طے تھا اور ہو کر ہی رہنا تھا۔

☆☆☆

پھر لمبی ساعتیں لمحے، گھنٹے، دن، ہفتے، مہینے اور موسم گزر گئے تھے۔ بہاریں آتی جاتی رہیں۔ سے بدلتے رہے۔ وقت پھسلتا رہا...... ایک انتہائی چمکیلی صبح گلاس ونڈو کی سلائیڈ ہٹا کر دیوار پر لگے کیلنڈر کو

دیکھتا عیسیٰ کچھ چونک کر بڑے خوشگوار لہجے میں بیٹی کے ساتھ مصروف سی مالا کو مخاطب کر کے بولا تھا۔

''ارے..... دیکھو تو مالا.....! دو سال گزر گئے..... اور پتا ہی نہیں چلا۔'' عیسیٰ کی مسکراتی آواز نے مالا کی توجہ کھینچ لی تھی۔ وہ گول گوتھنی سی مریم کو کپڑے پہناتی مسکرادی تھی۔

''اچھا وقت گزرتے پتا ہی نہیں چلتا..... بس اللہ خیر کا وقت ہی گزارے۔'' وہ دھیمے سُروں میں بولتی عیسیٰ کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے دل کے قریب محسوس ہوئی تھی۔ مالا کو دیکھتے جیسے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہونے لگتی تھیں۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ دو سال کا وقت گزر گیا ہے۔ اتنی جلدی، اتنی سُبک خرامی کے ساتھ.....؟ دو سال پہلے اسی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر وہ مالا کو یک ٹک دیکھے جارہا تھا۔ وہ جو سو نفل کی منت مانے کھڑی تھی اور ہر دو رکعت کے بعد نیت باندھ لیتی تھی۔ محمد علی عیسیٰ اس کے ساتھ پورے سو نفل نہیں پڑھ سکا تھا۔ البتہ شکرانہ اس نے ضرور ادا کیا تھا۔ مالا کو نفل پڑھتے دیکھ کر اسے عینی کی باتیں یاد آرہی تھیں۔

''طلاق کے بعد صلح کرنا کس شریعت کی کتاب میں لکھا ہے؟ وہ بھی تین سال کی مدت گزر جانے کے بعد..... حلالہ کے بغیر.....؟'' ان الفاظ کی چبھن عیسیٰ کبھی بھلا نہیں پایا تھا۔ وہ جب، جب عینی کی اس بات کو سوچتا، اس کا خون کھول اٹھتا تھا۔ تب مالا کو جیسے صدیوں بعد دیکھنے کی خوشی میں وہ عینی کا منہ نہیں توڑ سکا تھا۔ اس نے بہت ہلکے پھلکے لہجے میں بات کی تھی مگر اندر اس کے جو طوفان اٹھے تھے ان کا شور آج تک اس کے کانوں میں پھڑ پھڑاتا تھا۔ اس وقت ضبط کے پل صراط سے گزر کر آج وہ اس مقام تک پہنچا تھا کہ اپنے اور مالا کی طرف اٹھنے والی ہر انگلی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا..... تب عیسیٰ کو لگتا تھا، طعنہ دیتے لوگوں کے چہروں کے پیچھے مون کا چہرہ ہے۔ اسی مون کی وجہ سے انہیں پل، پل جینا اور مرنا پڑتا تھا۔ لوگوں کی بکواس سننا پڑتی تھی۔ ہر روز پل صراط سے گزرنا پڑتا تھا۔ آخر مون کی وجہ سے ہی تو یہ عذاب بھگتنے پر وہ لوگ مجبور کردیے گئے تھے پھر مون کو بھلا عیسیٰ کی نگاہ میں کیسے معافی مل جاتی؟ وہ جب، جب سوچتا تھا زہر آلود ہوجاتا۔ اندر آگ بھڑک اٹھتی تھی اور یہ آگ کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ مالا کی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی..... وہ تو دھیرے، دھیرے ہی سہی، اس کے دل پر جمے زنگ اتار رہی تھی، یہاں آکر بے بس ہوجاتی تھی۔ عیسیٰ کم از کم مون کے موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر اس نے واپس جانے کی بھی کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ ہیرنج کی ایک برانچ کو یہاں اسٹیبلش کرلیا تھا۔ ان دو سالوں میں اس نے یہاں بھی خوب ترقی کرلی تھی۔ مس ہائیم کی فرم کا انتظام اب بھی آفاق دیکھتا تھا۔ میکس اور آفاق کی وجہ سے عیسیٰ کو کسی بھی قسم کی کوئی فکر نہیں تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن سوزن کی فون کال آگئی۔ مون کے بارے میں سوزن سے ہر معلومات مل جاتی تھی کہ وہ کتنا بدل گئی تھی، اس نے اسکول کو اسٹیبلش کرلیا تھا، اپنے حصے کی پراپرٹی اور پیسے کو خیرات، زکوٰۃ، صدقات کی نذر کردیا تھا۔ وہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ وہ پہلے جیسی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ بڑے زور کی ٹھوکر کھائی تھی، نہ سنبھلتی تو خود ہی تباہ ہوجاتی۔ سوزن نے ہی مالا کو بتایا تھا کہ ذی شاہ اسے امید کا ایک دیپ تھما کر آیا تھا، وہ اسی دیپ کی آس لیے زندگی کو آگے بڑھا رہی تھی تب مالا نے خود سے ایک عہد کرلیا تھا۔ ویسا ہی عہد جو کبھی ذی شاہ نے کیا تھا۔ علی عیسیٰ تک پہنچنے کا اب مالا کو ذی شاہ کے لیے منکشے حسیب تک پہنچنا تھا۔

اس چمکیلی صبح مالا نے اپنی پہلی فرمائش عیسیٰ کی سماعتوں تک پہنچادی تھی۔

''میں سوزن اور انی سے ملنا چاہتی ہوں......

ہم من ہائیم کب جارہے ہیں؟'' وہ آس بھری نظروں سے عیسٰی کو دیکھتی اس کے قریب آگئی تھی پھر اس نے عیسٰی کے کندھے سے ٹھوڑی ٹکا کر اپنے ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ لیے تھے۔ جیسے ایک حصار سا بنالیا تھا۔ وہ باہر بکھری صبح سے نگاہ ہٹا کر مالا کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''من ہائیم......؟'' عیسٰی جیسے ٹھٹک گیا تھا۔

''ہاں جی...... من ہائیم...... جو آپ کے من میں بستا ہے۔'' مالا دانستہ ہلکے پھلکے لہجے میں بول رہی تھی۔ تب وہ کچھ دیر کے لیے چپ سا کر گیا تھا۔

''من ہائیم جانا ضروری ہے؟ انی اور سوزن کو اِدھر بلالیتے ہیں۔ سوزی ہمارا پاکستان دیکھ لے گی؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ بولا تھا یوں کہ مالا بھی کچھ لمحے کے لیے چپ کر گئی۔ وہ کہہ تو ٹھیک رہا تھا۔ سوزی تو بہت ایکسائٹڈ تھی، میکس بھی یقیناً ان کے بلاوے پر بہت خوش اور پُرجوش ہوتا...... مگر مالا فی الحال خود جانا چاہتی تھی۔ واپسی پر سوزن کو بھی ساتھ لے آتی۔

''من ہائیم جانا ضروری ہے......'' وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی تھی یعنی کہ ٹھوس اور مضبوط لہجے میں...... گویا اس کی بات رد نہ کردی جائے۔ عیسٰی، مالا کے اس انداز سے خوب واقف تھا۔ بھی کچھ بے بس ہوگیا۔

''میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ......'' عیسٰی کچھ بولنا چاہتا ہی تھا جب مالا نے اپنا ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ کر اسے خاموش کروادیا تھا۔ عیسٰی ایک مرتبہ پھر بے بس ہوگیا تھا۔ وہ مالا کی محبت، چاہت اور الفت کے سامنے ہمیشہ بے بس ہوجاتا تھا۔

''میں نے بھی خود سے عہد کیا ہے کہ من ہائیم ضرور جاؤں گی۔'' وہ اپنی بات پر زور دے کر جتا جتا کر بولی تھی۔ عیسٰی جھنجلا کر رہ گیا۔ عجیب مصیبت یہ تھی کہ وہ مالا کی کوئی بات ٹالتا نہیں تھا۔ اول تو وہ کوئی فرمائش نہیں کرتی تھی، اگر کرلیتی تو پھر منوا کر دم لیتی اور یہ فرمائش وہ پچھلے دو سال سے قطرہ، قطرہ اس کی سماعتوں میں انڈیل رہی تھی آخر پتھر میں سوراخ تو ہونا ہی تھا۔

''ٹھیک ہے جناب! کوئی اور حکم......؟'' عیسٰی نے گہری سانس کھینچ کر اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حصار کھینچ لیا تھا وہ جیسے ایک محفوظ ترین پناہ گاہ میں آگئی تھی۔ اسے خود پر ناز سا ہوا۔ تو گویا وہ عیسٰی کے لیے اتنی اہم تھی؟ وہ اس کی خاطر اپنی قسمیں اور عہد توڑ رہا تھا۔ مالا کے قدم زمین پر ٹکنے نہیں پائے۔ خوشی کے مارے اس کا انگ انگ سرشار ہوگیا تھا۔

''تم سوزن اور انی سے ملاقات کرلینا اور میں پاپا اور ممّا کی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر زیارت کرلوں گا۔ آخر دو سالوں سے وہ لوگ میرے منتظر ہوں گے۔ آہٹوں پر چونکتے ہوں گے، کوئی وہاں پھول چڑھاتے اور فاتحہ پڑھنے نہیں جاتا ہوگا۔'' ماں باپ کی اچانک یاد نے اسے بے قرار کردیا تھا تو گویا فیصلہ ہوگیا تھا۔ اسے سوزن اور انی سے ملنے کی اجازت دی تھی۔ یہاں مون کا کہیں بھی ذکر نہیں تھا۔ یہاں وینس یا پیرس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ وہ گروسی، سوزن، افریشم سے مل کر واپس آجاتی۔ خود عیسٰی اپنے ماں، باپ کی تنہا قبروں پر فاتحہ پڑھ لیتا اور پھر دوبارہ واپسی...... اس نے مون کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ مون کا ذکر کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مالا جانتی تھی عیسٰی کے دل پر جمے زنگ اور کائی کو اترنے میں بہت وقت لگے گا۔ وہ بہن جو اسے جان سے بڑھ کر عزیز تھی جس نے دشمنوں سے بدتر سلوک اس کے ساتھ کیا تھا۔ اسے بھلا کیسے معاف کردیتا، مون کی دی گئی ذلت کو بھلا کر کیسے اسے دوبارہ سے دل میں اعلیٰ مقام دیتا؟

ایک ذرا سی ضد، غصے اور انتقام کی خاطر اس نے کیا نہیں کیا تھا؟ عیسیٰ اتنے سال گزر جانے کے بعد اب تو جان ہی چکا تھا کہ مون، مالا سے نفرت کیوں کرتی تھی اس لیے نہیں کہ اسے سوزن اسے بہت محبت تھی اور وہ سوزن کی محبت لوٹانے کے لیے کشٹ کاٹ رہی تھی۔ مون حسیب نے مالا کے ساتھ جو بھی کیا تھا محض اپنی ذات کی خاطر، انتقام کے لیے یا حسد کے تحت اگر مالا کو عیسیٰ مل سکتا تھا تو اسے ذی شاہ کیوں نہیں؟ ایک انوکھی اور عجیب ترمحبت کی خاطر اس نے اپنے بھائی کا دل اور گھر اجاڑا تھا، کیا وہ لڑکی معافی کے قابل تھی؟

کیا مالا کو اجاڑ کر اسے ذی شاہ مل سکتا تھا؟ صرف اتنی سی بات اس اعلیٰ پائے کا ذہن رکھنے والی مون کو سمجھ نہیں آئی تھی۔ اگر ایک نکتہ وہ سمجھ لیتی تو عمر بھر کے لیے فتح یاب ہوتی۔ اسے مالا کو جوا ہارنے کے بجائے جیتنا چاہیے تھا پھر ذی شاہ تک جانے والے رستے کتنے آسان ہو جاتے۔

مگر اکثر لوگ جو خود کو عقلِ کُل کا مالک سمجھتے ہیں۔ چھوٹی، چھوٹی نادانیوں کے باعث ذلیل ہو جاتے ہیں۔ اور بہت قریب کی باتیں انہیں سمجھ نہیں آتیں۔ وہ کنویں سے پانی بھر کر سیراب ہونے کے بجائے اندھا دھند کنویں میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ پھر ڈوبنا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

مالا نم آنکھوں سے سوچ رہی تھی۔ عیسیٰ کا اقرار اس کی پہلی کامیابی تھی۔ بالآخر وہ واپسی کے رستوں کی طرف جانے اور مڑنے کے لیے رضامند تو ہو گیا تھا۔ وہ من ہائیم لوٹنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ وہ من ہائیم جہاں محبت سانس لیتی تھی۔ گوئٹے کے رومان پرور ناول جیسا من ہائیم جس کی شفاف سڑکوں پر خوش پوشاک لوگ چلتے پھرتے تھے۔ شیشوں سے جگمگاتی دکانوں میں چینی گڑیاؤں جیسی سیلز گرلز منتظر کھڑی رہتی تھیں۔ وہی من ہائیم جس کی شفاف سڑکوں پر چلتے اور دکانوں میں گھومتے اکثر پاکستانی لوگ ٹکرا جاتے تھے۔ آغا اور زیتا جیسے ورکنگ کلاس کے لوگ، عیسیٰ جیسے اپر کلاس کے لوگ، سوزن جیسے مذہبی، ایماندار، مخلص...... میکس جیسے شریف، باادب، تمیز دار، ہیرا اور ابوبکر جیسے محسن فرشتے...... اگر من ہائیم میں مون جیسی جادوگرنی بھی تھی تو افریشم اور اس کی ممی جیسے لوگ بھی تو موجود تھے۔ گروسی، تانتے اور وہ ہاؤس فراؤ جس نے مالا کو قہوہ پلا کر اس کی تعریف میں این فاخ پوپے (سادہ گڑیا) بولا تھا۔ مالا کو لگا اسے بوازیا کا حسن پکار رہا ہے۔ من ہائیم میں سانس لیتی محبت التجا کر رہی ہے۔ کچھ ایسی کیفیات علی عیسیٰ کی بھی تھیں۔ اس کا دل ہمک، ہمک کر من ہائیم کی پکار پہ لبیک کہہ رہا تھا۔ اس کا دل من ہائیم کی طرف اڑ رہا تھا۔ وہ اپنے ماں، باپ کی قبروں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔ گروسی سے ملنے کو بے قرار ہو گیا تھا۔ اپنے پیارے دوستوں کی یاد میں مضطرب ہو گیا تھا...... ہاں...... عیسیٰ نے مون کا اب بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ مون کے باب کو شاید ہمیشہ کے لیے بند کر چکا تھا۔ مگر من ہائیم پہنچ کر...... کیا عیسیٰ کے ارادے ٹوٹ پھوٹ جاتے؟ نفرت کا طوفان ٹھنڈا پڑ جاتا؟ وہ مون سے ملنے کے لیے بے قرار ہو جاتا؟ ولیس ہاؤس کی کشش اسے کھینچ کر رائل روڈ کی طرف لے جاتی؟ آگ پہ فطری محبت کے چھینٹے پڑ جاتے؟ نفرت کی آگ بجھنے لگتی، غصے کا دریا اترنے لگتا؟ وقت بدلنے لگتا...... اور علی عیسیٰ کے دل پر مون کی فطری محبت غالب آ جاتی؟ کیا خبر، وقت کا پہیہ الٹا گھومنے لگتا اور علی عیسیٰ دل پہ لگے سارے گھاؤ بھلا کر ولیس ہاؤس کے بند کواڑ کھول دیتا۔

کیا خبر تھی...... کسے خبر تھی...... کہ ایسا ممکن ہو ہی جاتا......

(ختم شد)

بلا عنوان

ناہید سلطانہ اختر



صبح سویرے پوتے کی نگاہوں میں جھلکتی تحقیر اور لہجے سے چھلکتی ناگواری نے سلیمہ حسین کو دم بخود کر دیا اور وہ صدمے کی کیفیت میں برسا برس پہلے اپنے ماضی میں جا کھڑی ہوئیں۔ ان دنوں وہ انگلستان کی ایک یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وطن واپسی پر ایک نیم سرکاری ادارے میں اس ادارے کی دوسری بڑی افسر کی حیثیت سے ملازمت کر رہی تھیں۔ فاروق احمد وہاں

کے سربراہ تھے۔ عمر میں سلیمہ حسین سے دُگنے سے بھی زیادہ اور انتہائی تجربہ کار...... سلیمہ حسین اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود اپنی اعلیٰ تعلیمی قابلیت کے بل بوتے پر ادارے کی دوسری بڑی افسر منتخب ہوئی تھیں۔ ادارے کے ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ملازمین ان کی ماتحتی میں تھے۔ سلیمہ حسین جوان، توانا اور لائق فائق تھیں۔ بیرونِ ملک سے اعلیٰ تعلیمی ڈگری کے ساتھ اور بھی بہت کچھ سیکھ کر لوٹی تھیں۔ کام کے معاملے میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ نہایت سخت گیر مگر کام سے ہٹ کر ان سے اپنے سماجی مراسم میں انتہائی بامروت تھیں۔ چنانچہ ان کے ماتحت بشرطِ فراغت اکثر ان سے اپنے ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ذاتی حالات و مسائل بھی شیئر کرلیا کرتے تھے۔ امداد علی ادارے کا سینئر چپڑاسی اس معاملے میں پیش، پیش تھا۔ پرانا ملازم ہونے کی وجہ سے اسے ادارے ہی نہیں ادارے کے، ہر ملازم کا تاریخ و جغرافیہ ازبر تھا۔

امداد علی کی ڈیوٹی سلیمہ حسین کے ساتھ تھی۔ وہ دن بھر ان کے کمرے کے باہر بید کی کرسی پر بیٹھا سلیمہ حسین کی گھنٹی یا ان کی آواز پر اپنے کان لگائے رکھتا۔ جونہی وہ گھنٹی بجاتیں یا اس کا نام پکارتیں وہ لپکتا ہوا کمرے میں جاتا اور نہایت ادب سے نستعلیق لہجے میں کہتا۔ ''جی سرکار......!'' سلیمہ حسین اس کی سنیارٹی کا لحاظ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں اس کی طلبی کی غایت بیان کرتیں اور وہ تعمیلِ ارشاد میں لگ جاتا۔

سلیمہ حسین کو حسبِ ضرورت چائے اور پانی کی فراہمی اور ان کے مہمانوں کی خاطر مدارات بھی امداد علی کے فرائضِ منصبی میں شامل تھے۔ سلیمہ حسین صبح دس بجے اور لنچ کے وقفے میں چائے ضرور پیتیں...... لنچ کے وقفے میں وہ کھانا کھانے کے بجائے ایک پیالی چائے اور گنتی کے تین بسکٹ لینے پر اکتفا کرتیں۔ امداد علی کو ارٹر پلیٹ میں تین کے بجائے چار بسکٹ انہیں پیش کرتا اور وہ ہمیشہ نہایت مستقل مزاجی سے ایک بسکٹ پلیٹ میں چھوڑ دیتیں جو امداد علی کے حصے میں جاتا۔ لنچ کے وقفے میں سلیمہ حسین کو چائے پیش کرتے ہوئے امداد علی کبھی اپنی تو کبھی دوسروں کی بھی سلیمہ حسین سے کہہ جاتا۔

''سرکار......! یہ اپنے فاروق صاحب کی عزت جاتی رہی ہمارے دل سے۔'' ایک روز لنچ کے وقفے میں امداد علی نے حسبِ معمول نہایت سلیقے سے، سلیمہ حسین کو چائے اور بسکٹ پیش کرتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

''کیوں امداد علی......؟'' سلیمہ حسین نے چونک کر اسے دیکھا۔

''صاحب کردار نہیں ہیں۔'' امداد علی نستعلیق لہجے میں بولا۔

''کیا ہوا؟'' سلیمہ حسین کے لہجے میں تجسس تھا۔

''بات عجیب ہے سرکار......'' وہ محتاط لہجے میں بولا۔

''کیا امداد علی؟''

''سرکار جس نے ہمیں بتائی ہے اس کا ہم اپنے سے بڑھ کر اعتبار کرتے ہیں۔''

''کچھ بتاؤ گے بھی یا......'' وہ جھلا گئیں۔

''ہم نام نہیں لیں گے سرکار مگر ہے وہ اپنے ہی دفتر کا آدمی...... اس کے ہمسائے میں فاروق صاحب کے کوئی دور پار کے رشتے دار آکر بسے ہیں۔ انہوں نے ہمارے دفتر کے اس آدمی کو بتایا کہ یہ جو آپ کے فاروق صاحب ہیں، ان کے والد مزدور پیشہ آدمی تھے۔ راج مستری کا کام کیا کرتے تھے، فاروق صاحب ان کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ انہوں نے محنت مزدوری کرکے بیٹے کو پڑھایا، لکھایا، بڑا آدمی بنایا۔ انہوں نے اپنی پسند سے بڑے گھر میں شادی کی مگر اس باپ کے حق میں جس نے انہیں اس مقام تک پہنچایا انتہائی ناخلف نکلے۔''

''کس طرح......؟'' سلیمہ حسین سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

''ان کے اسی رشتے دار نے اپنے ہمسائے

یعنی ہمارے دفتر کے آدمی کو بتایا کہ فاروق صاحب کی والدہ تو بہت پہلے ان کے بچپن میں ہی گزر گئی تھیں۔ باپ نے انہیں ماں اور باپ دونوں بن کر پالا...... افسری تک پہنچایا لیکن فاروق صاحب کی احسان فراموشی دیکھیے۔ باپ کو ان کے ملنے جلنے والوں کے سامنے آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بیگم کی اس شکایت پر کہ کھانستے، کھنکھارتے، تھوکتے ہیں، سرونٹ روم میں ڈال رکھا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب دفتر کا وہی آدمی بتارہا تھا کہ فاروق صاحب کے اسی رشتے دار نے اسے بتایا کہ ایک مرتبہ فاروق صاحب کے کچھ مہمان آئے بیٹھے تھے۔ ملازم چھٹی پر تھا۔ ان کی بیگم نے والد صاحب کو چائے کی ٹرے ڈرائنگ روم میں پہنچا آنے کو کہا۔ والد صاحب ٹرے رکھ کر واپس جانے لگے تو مہمانوں میں سے کسی نے فاروق صاحب سے پوچھا۔ ''یہ بزرگوار آپ کے گاؤں والے آدمی لگتے ہیں۔'' فاروق صاحب بولے۔ ''جی ہاں پرانا ملازم ہے۔'' والد صاحب کو ان کی اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اسی دن ان کا گھر چھوڑ کر بیٹی داماد کے پاس گاؤں چلے گئے پھر کبھی ان کے گھر نہیں آئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔''

''نہیں امداد علی، ایسا نہیں ہوسکتا، ایسا نہیں ہوا ہوگا...... لوگ بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں...... میں نہیں سمجھتی کہ ایسا ہوا ہوگا۔ کیا کوئی اولاد اتنی ناخلف بھی ہوسکتی ہے کہ اپنے باپ کو ملازم کہے...... نہیں، میں یقین نہیں کرسکتی۔'' سلیمہ حسین نے پوری شدومد سے امداد علی کے بیان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

''سرکار ہم نے تو وہ کہا جو سنا تھا...... واللہ اعلم بالصواب۔'' امداد علی کے چہرے سے شرمندگی جھلکنے لگی۔

''ہر سنی سنائی بات...... اعتبار کرنے کے لیے نہیں ہوتی امداد علی۔'' سلیمہ حسین بولیں۔

''درست فرماتی ہیں سرکار......'' امداد علی نے سلیمہ حسین کی افسری کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے خیال کی مؤدبانہ تائید کی لیکن پل دو پل کے توقف سے دبی زبان سے بولا۔ ''یہ دنیا ہے سرکار...... یہاں سب کچھ ممکن ہے۔''

''فاروق صاحب بڑے ڈیسنٹ آدمی ہیں، وہ ایسا نہیں کرسکتے۔'' سلیمہ حسین بولیں۔

''واللہ اعلم بالصواب سرکار...... آپ چائے پئیں، ٹھنڈی ہوجائے گی۔'' امداد علی نے بات لپیٹتے ہوئے کہا۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ اگرچہ سلیمہ حسین نے امداد علی کی سنی سنائی کو اپنی دانست میں مکمل طور پر رد کردیا تھا لیکن جب تک ادارے میں ان کا اور فاروق احمد کا ساتھ رہا انہیں امداد علی کی اس سنی سنائی کی بازگشت بار بار سنائی دی۔ فاروق احمد کی ادارے سے سبکدوشی کے بعد بھی سلیمہ حسین کو امداد علی کی بات بارہا یاد آئی مگر انہیں اس کی صداقت میں شبہ ہی رہا۔ کون اولاد اتنی ناخلف ہوسکتی ہے کہ باپ کو ملازم قرار دے۔ سلیمہ حسین کے اس ایقان کی وجہ ان کا اپنا خاندانی پس منظر تھا جہاں اولاد کو والدین کا احترام کرنا سکھایا جاتا تھا۔ ان کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھنے کی تربیت دی جاتی تھی۔

☆☆☆

سلیمہ حسین اپنے والدین کے تین بچوں میں دوسرے نمبر پر تھیں۔ سب سے بڑا بھائی تھا۔ یاور حسین، اس کے بعد سلیمہ حسین اور ان سے چھوٹا بھائی دلاور حسین۔

سلیمہ حسین نے اس دور میں انگلستان سے اعلیٰ تعلیمی ڈگری لی تھی جب وطن عزیز میں تعلیم نسواں اتنی عام نہیں تھی۔ ایم اے پاس لڑکیاں بھی کم، کم ہوتیں۔ والد بینکار تھے۔ والدہ گھریلو خاتون، گھر میں خوشحالی تھی، خاندان پڑھا لکھا اور روشن خیال...... تایا کی بیٹی اسکالرشپ ملنے پر ڈاکٹریٹ کرنے باہر گئیں تو ان کے والد نے ذاتی خرچ پر اپنی

بیٹی کو بھی پڑھنے کے لیے انگلستان بھیجا۔ باہر سے ڈگری لے کر وطن لوٹیں تو ایک نیم سرکاری ادارے میں افسر لگ گئیں۔ بعد میں اہلیت، صلاحیت اور تجربے کی بنا پر ایک سرکاری ادارے نے ان کی خدمات حاصل کرلیں۔ اس دوران اپنے ہی ایک ہم پلہ افسر سے ان کی شادی بھی ہوگئی۔ سوئے اتفاق شوہر کا سر نیم بھی حسین تھا سو شادی کے بعد بھی سلیمہ حسین کو اپنے نام کا لاحقہ بدلنے کی ضرورت نہ پڑی۔ زوار حسین سے شادی کے بعد بھی وہ سلیمہ حسین ہی رہیں۔

دونوں کا جوڑا ہر اعتبار سے مثالی تھا۔ زوار حسین چھ فٹ ایک انچ قد کے حامل تھے تو سلیمہ پانچ فٹ سات انچ کی، زوار حسین مردانہ وجاہت کے حامل تھے تو یہ بھی اتنی دلکش کہ جو ایک بار انہیں دیکھتا، دوبارہ دیکھنے کی کوشش دانستہ کرتا۔ جس کر وہ بنتیں وہ سج جاتی۔ وہ اور ان کے شوہر دونوں ہی خوش لباس تھے۔ خوش مزاج تھے۔ دونوں انتہائی سوشل تھے۔ شادی کے بعد دونوں کا حلقۂ احباب مشترکہ ہوگیا تھا۔ سلیمہ حسین شوہر کے دوستوں کی بھابی اور شوہر ان کی دوستوں کے بھائی بن گئے تھے۔ دونوں میں مثالی ہم آہنگی تھی جو ایک کے دل میں ہوتا وہ دوسرے کی زبان پر ہوتا۔ ان کے حلقۂ احباب میں ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کی مثالیں دی جاتیں۔ دفتر سے واپس آنے کے بعد دونوں ہر شام تیار ہو کر کہیں نہ کہیں جانے کو اکٹھے گاڑی میں بیٹھ کر نکلتے تو دیکھنے والوں کو رشک آتا۔ سلیمہ حسین کے شوہر انہیں اپنی بہترین دوست کہتے تو وہ خود کو خوش قسمت ترین عورت قرار دیتیں کہ جنہیں زوار حسین جیسا چاہنے والا شریک زندگی ملا تھا۔ وہ دونوں جس محفل میں بھی ہوتے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے رہتے۔

سلیمہ حسین کو خدا نے بیٹی سے بھی نوازا بیٹا بھی دیا۔ دونوں بچوں کی پرورش ایک صاف ستھری اور سمجھدار ملازمہ کے ہاتھوں ہوئی۔ دونوں کی تربیت میں سلیمہ حسین اور ان کے شوہر نے اپنا، اپنا فرض خوب نبھایا۔ دونوں کو اچھے تعلیمی اداروں میں پڑھایا لکھایا۔ بیٹی نے ڈاکٹری کی ڈگری لی۔ بیٹا انجینئر بنا...... بیٹی کی شادی زوار حسین کے بھتیجے سے ہوئی جو فزیو تھراپسٹ تھا اور اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ انگلستان مقیم...... شادی کے بعد سلیمہ حسین کی بیٹی بھی باہر چلی گئی۔ بیٹے جواد حسین کی شادی سلیمہ اور ان کے شوہر کے ایک مشترکہ دوست گھرانے کی بیٹی سے ہوئی...... اور یوں سلیمہ حسین اپنے دورِ عروج ہی میں بیٹے اور بیٹی دونوں کے گھر بسانے کی ذمے داری سے سبکدوش ہوگئیں۔

سلیمہ حسین کی ملازمت سے سبکدوشی میں کوئی ڈیڑھ برس تھا کہ ان کے شوہر کا اچانک ہارٹ فیل ہوگیا۔ شوہر کی موت ان کے لیے ایک ناقابلِ بیان صدمہ تھی۔ زوار حسین کو ریٹائر ہوئے ابھی دو سال بھی تو پورے نہیں ہوئے تھے، ریٹائرڈ لائف کے دونوں نے کیسے، کیسے خواب دیکھ رکھے تھے۔ برطانیہ کے موسم گرما بیٹی، داماد اور ان کے بچوں کے ساتھ گزارا کریں گے۔ سردیاں بیٹا، بہو اور ان کے بچوں کے ساتھ...... راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے عینکیں لگائے کتابیں پڑھا کریں گے پھر پڑھی ہوئی کتابوں پر ڈسکشن ہوا کرے گی۔ بچوں کے بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق ہوا کرے گا۔ ان کے ساتھ کھیلا کریں گے۔ انہیں ساتھ لے کر باہر گھومنے پھرنے جایا کریں گے۔ ملازمت کی پابندیاں وہ سب کچھ کہاں کرنے دیتی ہیں جو بندے کا دل چاہتا ہے۔ بالخصوص اس صورت میں جب ملازمت کو محض نوکری سمجھ کر نہ ٹالا جاتا ہو بلکہ فرائضِ منصبی کو دل سے ادا کیا جاتا ہو۔ سلیمہ حسین اور ان کے شوہر دونوں ہی اپنی ازدواجی زندگی کی طرح فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں بھی بے مثال رہے تھے۔ دونوں ریٹائرڈ زندگی بھی

مثالی گزارنے کے خواہاں تھے۔ مگر بندہ کچھ سوچتا ہے خدا کو کچھ اور ہی منظور ہوتا ہے۔

شوہر کی موت نے سلیمہ حسین کو اندر باہر یکسر بدل کر رکھ دیا۔ شوہر کی زندگی میں وہ اپنی سج دھج کا اس طرح خیال رکھتیں کہ دیکھنے میں اپنی اصل عمر سے دس سال کم نظر آتی تھیں۔ ان کے بال اس طرح ڈائی کیے ہوئے ہوتے کہ عمر کی چھٹی دہائی میں بھی ان کے بالوں میں کہیں سفیدی نہ دکھائی دیتی۔ وہ بہت سلیقے سے میک اپ کرتیں، ان کے ہاتھوں کی انگلیوں میں ایک، ایک، دو، دو بیش قیمت مرصع انگوٹھیاں ہوتیں، گلے میں طلائی لاکٹ، کانوں میں ٹاپس، دائیں ہاتھ میں ایک مرصع کنگن اور بائیں کلائی پر قیمتی گھڑی ہوتی، جب بھی انہیں وقت دیکھنا ہوتا وہ ایک خاص انداز سے اپنی کلائی گھما کر اس پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتیں۔ ان کا لباس نہایت عمدہ ہوتا، جوتے اور بیگ میں ہمیشہ ہم آہنگی ہوتی۔ ان کے پاس جوتوں، بیگز اور پرسز کا نہایت اعلیٰ انتخاب موجود رہتا۔ وہ موقع کے حساب سے بدل، بدل کر جوتے، بیگ اور پرس استعمال کرتیں۔ خوشبویات کے استعمال کا انہیں حد درجہ ذوق تھا۔ شوہر کے ساتھ وہ جب بھی بیرون ملک جاتیں واپسی پر ان کے سامان میں نہایت عمدہ خوشبویات ضرور شامل ہوتیں..... ان کے عزیز و اقارب کو معلوم تھا کہ انہیں خوشبویات کے استعمال کا کتنا شوق ہے لہٰذا جب بھی انہیں کچھ دینے دلانے کا موقع ہوتا انہیں تحفے میں نت نئی خوشبویات دی جاتیں۔ سلیمہ حسین ہمہ وقت خوشبو میں بسی رہتیں۔ جس راہ سے گزر جاتیں اسے مہکا دیتیں۔

لیکن شوہر کی موت کے بعد سلیمہ حسین کے یہ سارے شوق جاتے رہے۔ وہ بالکل بدل گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی عمر سے کہیں زیادہ دکھائی دینے لگیں۔ ہمیشہ رنگے رہنے والے بال چٹے سر میں تبدیل ہوگئے۔ نہ وہ میک اپ کرتیں نہ زیور پہنتیں..... نہ جوتوں اور بیگ کے استعمال میں ہم آہنگی کا دھیان رکھتیں۔ ان کی آنکھوں میں کاجل کے بجائے اداسی نظر آتی۔ ان کی ہنسی میں اداسی ہوتی، مسکراہٹ میں تھکاوٹ۔ انہوں نے اپنے تمام خوش رنگ ملبوسات ترک کردیے تھے اب وہ عموماً سفید، سیاہ یا بہت ہلکے رنگوں کے کپڑے پہنتیں۔ انہوں نے تقریبات میں جانا بہت کم کر دیا تھا۔ زوار حسین کے بغیر کہیں آنا جانا انہیں نہ جانے کب، کب کی باتیں یاد دلا دیتا۔ سلیمہ حسین بہت اداس رہنے لگی تھیں۔ شوہر کے بعد ان کا اگر کوئی سابقہ معمول بدستور برقرار تھا تو وہ خوشبویات کا استعمال تھا۔ گھر، دفتر، باہر وہ خوشبو اب بھی اسی طرح استعمال کرتی تھیں۔

شوہر کے بعد سلیمہ حسین نے دفتر کے بعد زیادہ وقت یاد الٰہی میں گزارنا اپنا معمول بنالیا تھا۔ نماز کی پابند تو خیر وہ ان کی زندگی میں بھی رہی تھیں لیکن اب زیادہ خشیت سے پڑھتیں۔ قرآن مجید کا مطالعہ زیادہ انہماک سے کرتیں۔ صبح شام شوہر کے ایصال ثواب کے لیے قرآن مجید پڑھنا ان کا ایسا معمول بن گیا تھا جسے وہ کسی صورت ترک نہ کرتیں۔ قرآن شریف کا ایک چھوٹا نسخہ ہمیشہ ان کے بیگ میں موجود رہنے لگا تھا۔ دوران سفر وہ بیگ سے یہ نسخہ نکال کر تلاوت کرنے لگتیں۔ ملازمت سے اپنی ریٹائرمنٹ تک سلیمہ حسین کافی بوڑھی دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہ ایک فرض شناس، دیانت دار اور اپنے ساتھیوں سے احترام و مروت سے پیش آنے والی افسر رہی تھیں۔ ان کے ساتھیوں نے ان کی ذات کا وہ درخشاں دور بھی دیکھ رکھا تھا جب وہ ہنستی مسکراتی اور زندگی کی تابانیوں سے معمور دکھائی دیا کرتی تھیں.....

ریٹائرمنٹ کے وقت ان کے بوڑھے، بجھے، بجھے اور اداس روپ پر ان کے سبھی ساتھی دل گرفتہ تھے۔ اپنی الوداعی تقریر میں انہوں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

''کبھی آنا کبھی جانا یہی ہے زندگی کا چلن.....
ہم زندگی شروع کسی اور طرح کرتے ہیں اس کا اختتام کسی اور طرح سے ہوتا ہے۔''

جوابی الوداعی تقریر میں ان کے ایک ساتھی نے باقی تمام ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ ''میڈم سلیمہ حسین! آپ ہمارے ساتھ اپنی بہت سی اچھی یادیں چھوڑے جارہی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ آپ جہاں رہیں خوش رہیں۔ اپنے بچوں اور ان کے بچوں کے ساتھ بہت اچھی، خوشیوں سے بھرپور زندگی گزاریں..... ہم اپنی یادوں میں آپ کو پھر پہلے کی طرح ہنستے مسکراتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کسی ایک شخص کے زندگی سے نکل جانے سے زندگی کے حسین چہرے کو گرہن نہیں لگنا چاہیے۔ آپ بہت توانا شخصیت ہیں میڈم سلیمہ حسین..... آپ چاہیں تو زندگی کو ویسا ہی کرسکتی ہیں جیسی کے وہ پہلے تھی۔''

''زندگی کا اپنا چلن ہے، ہمیں اس کی حاکمیت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ ہم نہ بھی چاہیں تو وہ ہمیں بزور استبداد سے اپنی رہگزر پر چلاتی ہے۔'' الوداعی لنچ کے دوران سلیمہ حسین نے اپنے ساتھیوں سے غیر رسمی گفتگو میں بڑے دکھ سے کہا۔ یہ کہتے ہوئے سلیمہ حسین کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی دیکھنے میں آئی۔

بالآخر سلیمہ حسین ملازمت سے سبکدوش ہوگئیں۔

☆☆☆

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سلیمہ حسین کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب وہ تھیں اور طویل فرصت..... فرصت جو کبھی ان کے لیے عنقا ہوا کرتی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا کام، دوسری کے بعد تیسری مصروفیت، زوار حسین کی زندگی میں وہ اکثر سوچا کرتی تھیں۔ جب فرصت ملے گی تو وہ اور زوار حسین اکٹھے بیٹھ کر وہ ساری باتیں کریں گے جو عدم فرصتی انہیں نہیں کرنے دیتی تھی۔ اب فرصت تھی مگر زوار حسین نہیں تھے۔ بیٹا، بہو، پوتے، پوتیاں تھے مگر ان سب کی اپنی، اپنی مصروفیات اپنی، اپنی دلچسپیاں تھیں۔

بیٹا صبح دفتر چلا جاتا، شام ڈھلے واپس آتا، بہو کبھی بچوں کو ان کے اسکول بھیجنے میں لگی ہوتی، کبھی ملازمہ سے کام کروا رہی ہوتی۔ کبھی اسے بازار جانا ہوتا، کبھی ٹیلر کو کپڑے سلنے کے لیے دینا ہوتے، کبھی اس کے میکے سے کسی کا فون آجاتا تو کبھی اس کی کوئی دوست اس سے ملنے آجاتی، کبھی چھوٹی کے اسکول میں اوپن ڈے پر اس کی حاضری لازم ہوتی تو کبھی کسی کے برتھ ڈے کا اہتمام درپیش ہوتا۔ چار بچوں کی ذمے داری کوئی کم تو نہیں ہوتی۔

سلیمہ حسین کے دو پوتے تھے دو پوتیاں.....
سب سے بڑی آنسہ تھی۔ اس سے چھوٹا ثاقب، تیسرے نمبر پر عاطف اور سب سے چھوٹی عائشہ.....
چاروں اپنے، اپنے مزاج کے تھے۔ آنسہ کم گو اور زود رنج، ثاقب غصیلا، عاطف انتہائی چلبلا اور بلا کا ڈرپوک، عائشہ باتونی اور ضدی۔ چاروں کی اپنی، اپنی دلچسپیاں تھیں۔ اپنا، اپنا سیل فون، مشترکہ کمپیوٹر اور مشترکہ لیپ ٹاپ، چاروں اپنے اپنے موبائل کو کوڈ لگا کر رکھتے اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو اپنی آئی ڈی نہ بتاتا۔

سلیمہ حسین کو اپنے پوتے، پوتیوں سے بہت پیار تھا۔ وہ اپنے اور ان کے درمیان جنریشن گیپ کو حتی الوسع کم رکھنے کے لیے ان سے انتہائی دوستانہ رویہ رکھتیں۔ ان کے مشاغل میں دلچسپی لیتیں۔ اپنا پیسہ بے دریغ ان کی فرمائشوں پر لٹاتیں۔ ان کا خیال تھا جب مرنے کے بعد بھی سب کچھ انہی کو ملنا ہے تو کیوں نہ میں اپنے ہاتھ سے خرچ کر کے ان کی خوشیوں میں بھی شریک ہوں۔ سلیمہ حسین کی زندگی میں خوشی تھی تو انہی بچوں کے دم سے۔ بیٹی تو اپنے بچوں کے ساتھ کئی، کئی سال بعد وطن آتی تھی اور وہ بھی چند ہفتوں کے لیے۔ سلیمہ حسین کو بیٹی کے بچوں

سے بھی حد درجہ پیار تھا مگر سچی بات یہ تھی کہ پوتے، پوتیوں جتنا نہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان سے ان کی قربت زیادہ تھی۔ چوبیس گھنٹوں کا ساتھ تھا۔ چھوٹا عاطف تو نزوار حسین کی موت کے بعد سونے بھی انہی کے کمرے میں لگا تھا۔

''دادی ڈر لگے تو عاطف کو جگا لیجیے گا۔''

ثاقب شروع شروع مذاق میں کہا کرتا تھا۔

''عاطف کی بہادری کے تو جھنڈے گڑے ہیں۔ رات کو واش روم جانے کو اٹھتی ہوں تو ہڑ بڑا کر پوچھتا ہے کہاں جا رہی ہیں۔'' سلیمہ حسین کہتیں۔

''دادی! بس اب میں آپ کے کمرے میں نہیں سوؤں گا۔'' عاطف کہتا۔

''مت سونا..... میں کوئی ڈرتی ہوں کیا؟''

''ڈرتی نہیں تو شام ہوتے ہی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہماری حاضری کیوں لینے لگتی ہیں۔''

''بھئی نہ تو میں تم لوگوں کے لیے ڈرتی ہوں۔ ہماری امی کہا کرتی تھیں۔ مغرب کے بعد بچوں کو گھر سے نہیں نکلنے دینا چاہیے۔ آسمانوں سے بلائیں نازل ہوتی ہیں۔''

''دادی! عاطف سے بڑی بھی کوئی بلا نازل ہوسکتی ہے آسمان سے۔'' ثاقب کہتا۔

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟'' عاطف آنکھیں مٹکاتا۔

ثاقب زبان چڑاتا۔

عاطف کی زبان بھی منہ سے باہر نکل آتی۔

''توبہ ہے، کیسے بھائی ہو، نہ چھوٹے کو بڑے کا ادب نہ بڑے کو چھوٹے کا لحاظ، ہمارے زمانے میں تو.....'' جنریشن گیپ کو اپنے اور بچوں کے بچوں کے درمیان حائل نہ ہونے دینے والی سلیمہ حسین نہ چاہتے ہوئے بھی روایتی دادیوں والا لہجہ اختیار کرلیتیں۔

''زمانہ بدل گیا ہے دادی۔'' ثاقب کہتا۔

''دنیا اب آپ کے زمانے والی دنیا نہیں رہی، گلوبل ولیج بن گئی ہے۔''

''جبھی تو لوگ بھی بے تھے بنتے جا رہے ہیں۔'' وہ کہتیں۔

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''تم خاک سمجھو گے۔'' وہ پوتے کو تیکھی نظروں سے دیکھتیں۔

''ہوسکتا ہے سمجھ ہی جاؤں..... آپ سمجھائیں تو۔''

''رہنے دو۔'' وہ جھوٹ موٹ کی خفگی دکھاتیں۔

''یار دادی ناراض نہ ہوا کریں۔'' ثاقب ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔

''دادی کو پٹاؤ مت..... کچھ چاہیے ہوگا۔'' عاطف مداخلت کرتا۔

''تمہاری طرح لالچی نہیں ہوں۔''

''اچھا بھئی اچھا، آپس میں لڑو مت۔'' سلیمہ فوراً مان جاتیں۔

☆☆☆

گھر بڑا تھا اور دو منزلہ..... سلیمہ حسین شوہر کے زمانے سے اوپر رہ رہی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد بیٹے نے چاہا کہ وہ نیچے شفٹ ہوجائیں مگر سلیمہ حسین کو گوارا نہ ہوا۔

''میں اوپر ہی ٹھیک ہوں۔''

''اوپر اکیلی رہیں گی؟''

''ثاقب، عاطف میں سے کوئی میرے ساتھ رہ لے گا۔'' ثاقب ماں کا زیادہ لاڈلا تھا۔ قرعۂ فال عاطف کے نام کھلا۔ دن بھر چاروں بچوں کی اوپر نیچے آمد و رفت جاری رہتی۔ سلیمہ حسین کھانے کے اوقات میں یا بغیر ضرورت نیچے چلی جاتیں ورنہ اوپر ہی رہتیں۔ ان کے بیڈ روم کی چاروں دیواروں میں بڑی، بڑی کھڑکیاں تھیں جن سے چہار اطراف کا

منظر نہایت واضح ہوتا۔ اس کمرے میں رہتے ہوئے سلیمہ حسین کو یوں تو برسوں گزر گئے تھے مگر ان کھڑکیوں کی افادیت کا صحیح احساس انہیں اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد ہوا۔ یہ کھڑکیاں نہ ہوتیں تو بند کمرے میں تنہائی کا احساس کتنا زیادہ ہوتا۔

صبح جاگتے ہی وہ سب سے پہلے ان کھڑکیوں پر پڑے پردے سرکاتیں پھر واش روم کا رخ کرتیں۔ فجر کی نماز کے بعد وہ تادیر بڑے سکون سے جائے نماز پر بیٹھی رہتیں۔ ملازمت کے زمانے میں تسبیح اور دعا کے لیے اتنی فراغت، اتنا سکون کہاں میسر تھا۔ دیوار گیر گھڑی کی سوئیوں پر نظر رہتی اور بھاگ دوڑ سی لگی رہتی۔ ناشتا بھی چین سے کرنا نصیب نہ ہوتا۔ بہت سی ضروری باتیں بھی جو انہیں زوار حسین سے کرنا ہوتیں اسی بھاگ دوڑ میں یا تو بہت سرسری سے انداز میں ہوتیں یا بھول کی نذر ہوجاتیں۔ ملازمت انسان کو کچھ دیتی ہے تو بہت کچھ لیتی بھی ہے۔ ان کے دونوں بچوں کی غوں غاں خود ان سے زیادہ تو ان کی ملازمہ نے سنی تھی۔ انہوں نے تو دونوں بچوں کی پیدائش کے بعد مقررہ ضوابط کے مطابق بعد از زچگی، پینتالیس روزہ رخصت کے بعد اپنے دفتر جانا شروع کردیا تھا۔ زوار حسین کی موت کے بعد وہ دنوں یہ حساب لگاتی رہی تھیں کہ زوار حسین سے زندگی کی رفاقت میں انہوں نے کتنے دن، کتنے گھنٹے، منٹ اور سیکنڈز ان کے ساتھ گزارے تھے اور اب فرصت ہی فرصت تھی۔

نماز فجر کے بعد وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتیں۔ تفسیر پڑھتیں۔ نماز اشراق اور خیر و برکت کی دعا کے لیے حسب معمول دو نفل ادا کرتیں پھر ناشتے کے لیے نیچے چلی جاتیں۔ گو بہو، بیٹے نے ناشتے کی ٹرے اوپر بھجوا دینے کی پیش کش بھی کر رکھی تھی مگر وہ نیچے جا کر ناشتا کرنا پسند کرتیں کہ ناشتے کی میز پر بیٹے اور پوتے، پوتیوں سے بھی ملاقات ہوجانے سے دن کا آغاز اور بھلے طریقے سے ہوجاتا تھا۔ بچے ناشتا کر ہی رہے ہوتے کہ ان کے اسکول کی گاڑیاں آنا شروع ہوجاتیں۔ پہلے آنسہ کی پھر دونوں لڑکوں کی پھر عائشہ کی...... سلیمہ حسین دعائے حفاظت پڑھ کر ایک، ایک پر دم کیے جاتیں۔

بچوں کی عدم موجودگی میں گھر میں بیشتر وقت خاموشی ہی رہتی۔ سلیمہ حسین بالائی منزل پر ٹیرس میں بیدی کرسی پر بیٹھی کبھی کوئی کتاب پڑھنے لگتیں کبھی کسی اور چھوٹی سی مصروفیت میں منہمک ہوجاتیں۔ ملازمہ نیچے سے صفائی کر کے اوپر آتی، کام نمٹاتی اور واپس چلی جاتی۔ چلتے پھرتے وہ اپنی زندگی کی تازہ ترین روداد بھی انہیں سنا جاتی۔ میاں نشئی تھا، اسے حد درجہ پریشان رکھتا، تین بیٹیاں تھیں دو بیاہ دی تھیں۔ تیسری کو کسی گھر میں ملازم رکھوایا ہوا تھا۔ نشئی مرد، بیوی اور بیٹی کی محنت کی کمائی ہتھیانے کے لیے مار پیٹ سے کام چلاتا، بیچاری عورت کبھی بازو پر دھبا لیے آتی کبھی اس کے چہرے پر نیل ہوتا۔

دوپہر ہوتے ہی سلیمہ حسین کو بچوں کی واپسی کا انتظار شروع ہوجاتا۔ ٹیرس میں بیٹھی، وہ ہر آنے جانے والی گاڑی پر نظر رکھتیں۔ عائشہ کا وین ڈرائیور دور سے ہارن دیتا آتا۔ ثاقب اور عاطف کی وین ذرا دیر سے آتی، آنسہ کی گاڑی واپسی پر اسے اسٹریٹ کے نکڑ پر اتارتی۔ وہ ٹیرس کا آہنی جنگلا پکڑ کر کھڑی ہوجاتیں اور بھاری بھرکم بستے کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی آنسہ کو دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلاتیں۔ جواباً وہ بھی اپنا ہاتھ ہلاتی اور کشاں کشاں آگے بڑھتی چلی آتی۔

بچوں کی واپسی پر اکٹھے کھانا کھایا جاتا۔ بچے دن بھر کی روداد سنائے جاتے، کبھی اپنی ماں کو مخاطب کر کے کبھی سلیمہ حسین کو......

''آج کیا ہوا دادی......'' عائشہ کہتی۔

''آج کچھ نہیں ہوا دادی۔'' عاطف شرارتاً کہتا۔

''ماما!'' عائشہ منمناتی۔
''ماما۔'' ثاقب اس کی نقل اتارتا۔
''یہ دونوں بہت بدتمیز ہوتے جارہے ہیں دادی۔'' آنسہ کہتی۔
''دادی کو تم سے زیادہ پتا ہے۔'' ثاقب مسکرا کر کہتا اور عاطف کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا۔ ''کیوں عاطف.....؟''
''اور کیا دادی سے زیادہ ہماری بدتمیزیوں کا اور کسے پتا ہوسکتا ہے..... کیوں دادی؟'' عاطف ڈھٹائی اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتا۔
''کان کھینچنے کو جی چاہتا ہے تم دونوں کے۔'' سلیمہ حسین پوتوں کو پیار سے گھورتیں۔
''ارے تو دیر کس بات کی..... حاضر ہیں۔'' ثاقب اپنا کان ان کے سامنے کردیتا۔
''دیکھ رہی ہو آسیہ.....'' سلیمہ حسین بہو سے کہتیں۔
''اپنے ابا کے سامنے کتنے شریف بنے رہتے ہیں دونوں۔'' بہو دونوں بیٹوں کو گھورتی مگر اس کی نگاہوں سے ممتا چھلک رہی ہوتی۔

☆☆☆

سلیمہ حسین کو ریٹائر ہوئے سات برس ہو چکے تھے۔ وہ بہت بوڑھی دکھائی دینے لگی تھیں۔ شاید اتنی بوڑھی نہ دکھائی دیتیں اگر زوار حسین زندہ ہوتے۔ زوار حسین زندہ رہے ہوتے تو وہ اپنے آپ سے اتنی بیگانہ نہ ہوئی ہوتیں جتنی کہ ان کے بعد ہوگئی تھیں۔ عورت اپنے مرد کے لیے ہر عمر میں بننا سنورنا پسند کرتی ہے۔ نہیں چاہتی کہ اس کے ہوتے اس کا شوہر کسی اور عورت کو خواہ وہ بڑھیا ہی کیوں نہ ہو رغبت سے دیکھے اور سلیمہ حسین تو ایسی تھیں ہی نہیں کہ ان کے ہوتے زوار حسین کسی اور کی طرف دیکھ سکتے۔ مگر اب سلیمہ حسین کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کبھی کیسی رہی ہوں گی۔ بھوری آنکھوں والی دلکش و دلربا سلیمہ حسین کی جگہ تو اب ایک بوڑھی عورت لے چکی تھی۔ جس کی آنکھوں میں ہمہ وقت ایک بے نام سی اداسی ہلکورے لیتی رہتی۔ اس وقت بھی جب وہ اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں سے ہنس بول رہی ہوتی تھیں یہ اداسی ان کی آنکھوں سے رفع نہ ہوتی۔

وقت کے ساتھ سلیمہ حسین اپنی ذات سے بالکل ہی بے نیاز ہوگئی تھیں۔ دو، دو تین، تین دن ایک ہی لباس پہنے رہتیں۔ ہفتہ ہفتہ بالوں میں کنگھی نہ کرتیں۔ گرمیوں میں پیروں میں دو پٹیوں کی ہوائی چپل، سردیوں میں بند جوتے ہوتے، ہائی ہیل، سینڈلز، بلاناغہ استری شدہ عمدہ لباس، نفیس جیولری،

باتیں حکمت کی

☆اللہ کی قربت کا بہترین راستہ عاجزی ہے۔
☆ایک میٹھا بول خیرات سے کہیں بہتر ہے۔
☆درخت اپنے پھل سے اور انسان اپنے قول و فعل سے پہچانا جاتا ہے۔
☆یا اللہ ہمیں عاجزی، انکساری، درگزر اور توجہ کرنے والوں میں شامل فرما۔

یاد الٰہی

پیسہ کہتا ہے مجھے حاصل کرو اور سب کو بھلا دو
وقت کہتا ہے کہ میرے پیچھے چلو باقی سب کو بھلا دو۔
مستقبل کہتا ہے کہ میرے لیے کوشش کرو اور سب کو بھلا دو۔
اللہ رب العزت صرف اتنا کہتا ہے کہ اے بندے تو مجھے یاد کر میں یہ سب تیرے قدموں میں ڈال دوں گا۔

از: انجم طاہر، کراچی

میک اپ سلیمہ حسین کے ماضی کا قصہ بن کر رہ گئے تھے۔ ان کے سماجی روابط بہت کم رہ گئے تھے۔ زیادہ تر گھر ہی میں رہتیں۔ بہت ہوا تو بیٹے، بہو اور پوتے، پوتیوں کے ساتھ قریبی لوگوں کی کسی اہم تقریب میں شرکت کرلیتیں ورنہ تقریبات میں شرکت سے بھی حتی الامکان گریز کرتیں۔ جاتیں تو تھک کر واپس لوٹتیں، نہ پہلے کی سی ہمت رہی تھی نہ وہ ولولہ..... اب تو ان کا گویا وہ حساب تھا، حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے۔ زیادہ دیر بیٹھ لیتیں تو اٹھنے کے لیے گھٹنے پکڑنے پڑتے۔ اٹھتیں تو پہلا قدم اٹھانے سے پہلے انہیں اپنے جسم کو حرکت میں لانے کے لیے کچھ اس طرح تیاری کرنی پڑتی جیسے کسی گاڑی کو حرکت میں لانے کے لیے چابی گھمانے سے گیئر میں ڈالنے تک اقدامات کرنا پڑتے ہیں۔ پرانی گاڑی کی طرح سلیمہ حسین کے گوڈوں گٹوں سے بھی اکثر آوازیں آنے لگتیں۔ سچ ہے بڑھاپا برا آیا..... گھر کی نچلی منزل سے اوپری منزل پر اپنے گوشۂ عافیت میں آنے کے لیے تھم تھم کر، جھٹکے لے لے کر زینے کا ایک، ایک قدم پہ نیا، نیا پاؤں، پاؤں چلنا سیکھنے والے کسی ننھے سے بچے کی طرح سنبھل، سنبھل کر چڑھتے ہوئے سلیمہ حسین کو کبھی، کبھی وہ وقت یاد آنے لگتا جب وہ اونچی ایڑی کے جوتوں میں بیک وقت دو، دو اسٹیپ پھلانگ جایا کرتی تھیں۔ وقت انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے۔ اب نہ ان کا وہ رنگ وروپ رہا تھا نہ وہ جوانی ورعنائی..... کبھی آئینہ بغور دیکھتیں تو حسین خدوخال کی سلیمہ حسین کی جگہ انہیں چٹے سر والی ایک بڑھیا نظر آتی جس کی دھندلائی عدسوں والی عینک ناک کے بانسے پر پھسلی پھننگ سے ذرا پرے اٹکی ہوتی۔ آنکھوں میں ویرانی ہوتی، پیشانی پر سلوٹیں، پپوٹے ڈھلکے ہوئے، آنکھوں کے نیچے سرمئی حلقے، ناک کے نتھنوں کے کناروں سے دونوں ہونٹوں کے دائیں بائیں گوشوں تک لکیریں، ٹھوڑی دہری، گردن کی جلد ڈھلکی ہوئی اور سر پر بال اتنے چھدرے، چھدرے کہ مانگ جو کبھی ان کے سیاہ بالوں میں روشنی کی باریک لکیر کی طرح جگمگایا کرتی تھی بھاڑ کی طرح کھلی نظر آتی۔ آئینے میں دکھائی دینے والی اس کہن سالہ مڑی تڑی بڑھیا اور ماضی کی دلکش و دبنگ سلیمہ حسین میں کوئی مماثلت دکھائی نہ دیتی۔ وقت انسان کو کس بری طرح روندتا ہوا گزرتا جاتا ہے۔

سلیمہ حسین جو کبھی ایک بڑے ادارے کی سائننگ اتھارٹی ہوا کرتی تھیں۔ اب ماہانہ پنشن کی وصولی کے لیے پنشن فارم اور چیک بک پر سائن کے علاوہ شاذ ہی کہیں انہیں دستخط کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ جس سلیمہ حسین کے لیے دفتر کا ڈرائیور ہمہ وقت مستعد اور ”میڈم کے لیے گاڑی لگاؤ۔“ سننے کا منتظر رہا کرتا تھا۔ جس سلیمہ حسین کی گاڑی کے آتے جاتے دفتر کے لوگ سلیوٹ کرنے والے انداز میں اپنے ہاتھ پیشانیوں تک اٹھا دیا کرتے تھے وہی سلیمہ حسین صبح بیٹے اور پوتے پوتیوں کو رخصت کرنے کے لیے گیٹ پر کھڑے ہو جانا اپنی اہم ترین مصروفیت سمجھنے لگی تھیں۔ آنسہ یونیورسٹی جانے کے لیے باپ کے ساتھ مین روڈ تک جاتی۔ وہاں سے یونیورسٹی بس اسے لیتی، ثاقب کو کالج جانے کے لیے باپ نے موٹر سائیکل خرید دی تھی وہ موٹر سائیکل پر کالج جاتا۔ عاطف اور عائشہ اسکول کے آخری درجوں میں تھے۔ دونوں کی علیحدہ، علیحدہ اسکول وین انہیں لینے اور واپسی پر چھوڑنے آتی۔ سلیمہ حسین اس وقت تک نیچے ہی رہتیں جب تک بیٹا اپنے دفتر اور بچے اسکول، کالج اور یونیورسٹی نہ چلے جاتے۔ سب سے پہلے عائشہ کی اسکول وین آتی۔ ادھر ساڑھے چھ بجے نہیں ادھر عائشہ کا وین ڈرائیور گیٹ کے سامنے گاڑی روک کر ہارن پہ ہارن بجانے لگتا۔ بہو بیگم بڑبڑاتیں۔

”اس آدمی سے دو منٹ صبر نہیں ہوتا۔ سکون سے ناشتا بھی نہیں کرنے دیتا بچی کو۔“ سلیمہ حسین

لپک کر گیٹ پر جا پہنچتیں اور گیٹ کا چھوٹا پٹ کھول کر باہر جھانکتے ہوئے ڈرائیور سے کہتیں۔

”آرہی ہے..... آرہی ہے۔“ ڈرائیور قدرے ناگواری کا تاثر ظاہر کرتے ہوئے پہلو بدلتا۔ چند سیکنڈ ذرا انتظار کرتا پھر منہ بنا کر کہتا۔

”دیر ہو جاتی ہے ماں جی، باقی بچے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔“ سلیمہ حسین اسے اطمینان دلاتیں۔

”بس آرہی ہے بیٹا۔“ پھر کبھی کبھار دبی زبان سے کہہ دیتیں۔ ”تم سویرے بھی تو بہت آجاتے ہو۔“

”ماں جی ٹائم سوٹ نہیں کرتا ہے آپ لوگوں کو تو چھوڑ دیں۔“ ڈرائیور رعونت دکھاتا۔

”نہ، نہ بیٹا..... میرا یہ مطلب نہیں۔“ سلیمہ حسین فوراً معذرت کرتیں۔

”آج کل اسکول بھی تو گھروں سے دور ہونے لگے ہیں۔ بچوں کو منہ اندھیرے نکلنا پڑتا ہے..... اور تمہیں کوئی ایک بچہ تھوڑی سے جانا ہوتا ہے۔ گھنٹے، سوا گھنٹے کا پھیرا تو ہوتا ہوگا۔“ سلیمہ حسین، عائشہ کو نہ پہنچتے دیکھ کر ڈرائیور کو باتوں میں لگانے کی کوشش کرتیں۔

”صبح ڈیڑھ گھنٹا ماں جی..... دوپہر کو تھوڑا کم.....“ ڈرائیور جواب دیتا پھر منہ بنا کر کہتا۔ ”صبح آپ کی بچی ہی نہیں، سارے بچے دیر کراتے ہیں، اسکول جانے کو دل ہی نہیں چاہتا ان کا۔“

”ہمارا بھی نہیں چاہتا تھا۔“ سلیمہ حسین ڈرائیور کو خوش کرنے کو اس کی تائید کرتیں اور یوں عائشہ کو گویا مزید مہلت مل جاتی۔

عائشہ آتی تو سلیمہ حسین اپنی مٹھی میں دبے پیسے اس کی مٹھی میں دبا دیتیں۔ عائشہ بصد عجلت انہیں خدا حافظ کہتی وین میں بیٹھ جاتی۔ سلیمہ حسین گیٹ پر کھڑے، کھڑے آیت الکرسی پڑھتیں اور نگاہوں سے لحظہ، لحظہ دور ہوتی وین پر دم کر کے پلٹتیں۔

عائشہ کے بعد آنسہ، باپ کے ساتھ مین روڈ تک جانے کو گھر سے نکلتی۔ سلیمہ حسین اسے بھی جیب خرچ دیتیں۔ حفاظت کی دعا پڑھ کر بیٹے کی گاڑی پر حصار باندھتیں اور اس وقت تک گیٹ پر کھڑی اپنا ہاتھ آہستہ، آہستہ ہلاتی رہتیں جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ نہ جانے کیوں انہیں یقین ہوتا کہ بیٹا بیک ویو مرر میں انہیں ہاتھ ہلاتے دیکھ رہا ہوگا۔

ثاقب کا کالج دور تھا۔ پونے آٹھ بجے کے لگ بھگ وہ اپنی موٹر سائیکل پر کالج جانے لگتا تو سلیمہ حسین کار پورچ سے اس کے نکلنے تک ہدایتوں کا سلسلہ شروع کر دیتیں۔ ”آرام سے چلانا بیٹا..... جلدی کی ضرورت نہیں۔ جلدی کس بات کی..... جلدی کا کام شیطان کا۔“

ثاقب منہ میں گھنگھنیاں، کانوں میں تیل ڈالے نے جاتا اور اپنے من کی کرتا..... سلیمہ حسین اسے بھی دعائے حفاظت کے حصار میں گھر سے رخصت کرتیں۔ سب سے آخر میں عاطف کی وین آتی، اپنی پیشانی پر روڈ کی شہزادی کا جھومر سجائے، سبک خرامی سے چلتی۔ عاطف کا اسکول صبح ساڑھے آٹھ کے بجائے سرکاری اسکولوں کی طرح صبح خیز ہوتا تو شاید عاطف ”روڈ کی شہزادی“ کی سبک خرامی کے باعث کبھی وقت پر اسکول نہ پہنچ پاتا۔ اس کے بھی مزے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے اسکول لگتا۔ صاحبزادے آٹھ بجے سے پہلے بستر نہ چھوڑتے۔ اٹھتے جلدی، جلدی ہاتھ منہ دھویا، چائے اُبال پرچ میں ڈال کر ہولے ہولے پھونکیں مار کر ٹھنڈی کر کے دیتیں۔ ناشتا ختم کرنے تک وین آجاتی۔ شاہزادے بن ٹھن کر خوشبو میں بسے وین میں سوار ہوتے سلیمہ حسین اسے رخصت کرنے کو اس سے پہلے ہی گیٹ سے نکلی کھڑی ہوتیں۔ جاتے، جاتے اس کی مٹھی میں جیب خرچ دباتیں تو وہ ایک جھٹکے سے ان سے جیب خرچ لیتا۔ اس جھٹکے کا مطلب اور سبب سلیمہ حسین نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہ کی وہ تو پورا

پوران بچوں کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھیں اور محبت تو ٹھہری پیدائشی اندھی۔

تاہم بہو بیگم اور عاطف سمیت چاروں بچے اس جھٹکے کا سبب خوب جانتے تھے۔ شام کو جب سب بچے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر چہلیں کرتے تو عاطف جھنجھلاتا۔

''یار کیا مذاق ہے صبح جب وین آتی ہے تو دادی مجھ سے پہلے گیٹ پر پہنچ جاتی ہیں۔''

''بیٹا! تم پر دم کرنے کے لیے۔'' بہو بیگم کہتیں۔

''جب پھونکتی ہیں ناں تو میں تو اپنی سانس روک لیتا ہوں۔ یار انہیں اتنی تمیز نہیں کہ ان کے منہ سے جرمز لگ سکتے ہیں مجھے۔'' عاطف ماں کو گھورتا۔

''بری بات بیٹا۔'' بہو بیگم ٹوکتیں۔

''میرے دوست بیٹھے ہوتے ہیں وین میں..... ہنستے ہیں، وہ دادی کو دیکھ کر۔''

''کیوں.....؟''

''دادی کا حلیہ دیکھ کر۔''

''انہیں بتاؤ کہ میری دادی بائیس گریڈ سے ریٹائرڈ ہوئی ہیں۔''

''رہنے دیں یار..... گریڈ کوئی نہیں دیکھتا..... بندے کی اپیرنس دیکھتے ہیں لوگ..... ڈریسنگ، شوز، ہیرڈو۔''

''تمہاری دادی اپنے زمانے کی فیشن ایبل لیڈی رہی ہیں۔'' بہو بیگم کہتیں۔

''رہنے دیں یار..... اب تو.....''

''ہاں، کیا اب تو.....؟''

''میرے دوست پوچھتے ہیں..... یار وہ جو تیرے گھر سے بڑھیا نکلتی ہے وہ بالکل آؤٹ ڈیٹڈ لگتی ہے۔ میں تو شرم سے بتاتا بھی نہیں کہ وہ میری دادی ہیں۔''

''ہائیں.....!'' بہو بیگم نے منہ پھاڑا۔

''دادی نے سن لیا تو۔''

''سن لیں..... ہو کیئرز..... مجھے تو پروا نہیں۔''

''عاطف.....!'' بہو بیگم نے بیٹے کو آنکھیں دکھائیں۔

''نہ آنے دیا کریں انہیں گیٹ پر..... میری انسلٹ ہوتی ہے۔''

''پاپا نے سن لیا تو دماغ ٹھکانے لگادیں گے تمہارا..... اور میں بھلا منع کرسکتی ہوں دادی کو گیٹ پر جانے سے۔''

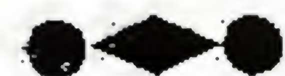
''کسی روز میں خود منع کردوں گا۔''

''پاپا سے خیر منانا بچو.....!'' ثاقب نے ڈراوادیا۔

مگر عاطف کسی دھمکی کو خاطر میں نہ لایا اور ایک صبح جب سلیمہ حسین اسے حسب معمول اسکول کے لیے رخصت کرنے کو خدا حافظ کہنے گیٹ پر کھڑی تھیں اس نے ٹھٹک کر پہلے کن انکھیوں سے وین میں بیٹھے اپنے ہم مکتبوں کو دیکھا پھر سلیمہ حسین پر سرتاپا ایک عجیب سی نظر ڈالی اور الفاظ چبا چبا کر آہستگی مگر انتہائی ناگواری سے بولا۔

''آپ روزانہ باہر کیوں آجاتی ہیں؟''

عاطف کی نگاہوں میں ڈولتی حقارت اور لہجے کی ناگواریت نے سلیمہ حسین کو دم بخود کردیا۔ وہ دعائے حفاظت پڑھنا بھول گئیں۔ عاطف وین میں بیٹھا اور وین روزانہ کی طرح فراٹے بھرتی چلی گئی۔ سلیمہ حسین کو یوں لگا جیسے ان کی سانس ساکت ہوگئی ہو، سکتہ ٹوٹا تو وہ مڑیں اور بھاری قدموں سے اوپری منزل کو جانے والے زینے آہستہ، آہستہ اوپر چڑھنے لگیں۔ روبوٹ کی طرح چلتی وہ اپنے کمرے میں پہنچیں اور قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ آئینے میں نظر آنے والی بڑھیا کو دیکھتے ہوئے انہیں برسوں پرانی امداد علی کی بات یاد آگئی۔ وہ بات جو اس نے فاروق احمد کے بارے میں انہیں بتائی تھی اور انہوں نے اسے سچ ماننے سے انکار کردیا۔ آج برسوں بعد انہیں اس بات کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔



آخر کب تک

غزالہ جلیل راؤ

کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا ہم جواب جاننا چاہتے ہیں اور پھر ایسے ہی سوالوں کو جاننے کی کوشش میں ساری زندگی یوں ہی گزر جاتی ہے مگر جواب نہیں ملتا۔ اور یہ سوالات ہمارے اندر کنڈلی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر لمحہ لمحہ اس پٹاری سے سر ابھار کر خود ہی ڈسنے لگتے ہیں مگر یہ ہم جیسی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے ان سوالوں کے جواب نہیں پاتے اور عمر گزرتی چلی جاتی ہے۔



بعض اوقات ہم انسان کتنے بے بس و مجبور ہوجاتے ہیں کہ لاکھ چاہنے کے باوجود کچھ کہنے کی جرأت کھو بیٹھتے ہیں۔ ایک خوف سا سارے وجود پر طاری ہوجاتا ہے۔ انجانا سا خوف...... یوں محسوس ہوتا ہے کہ زبان سے اگر ایک بھی لفظ نکلا تو اردگرد موجود ہزار ہا لوگ تیروں کی بارش کردیں گے۔ جس سے روح تو چھلنی ہے ہی جسم بھی لہولہان ہوجائے گا اور رسوائی مقدر بن جائے گی۔ کبھی کبھی دل کے کسی گوشے سے یہ خواہش شدت سے سر ابھارتی ہے کہ اس دنیا سے اپنا حق مانگوں، اس معاشرے سے کہوں کہ خدایا مجھے سسکا سسکا کر نہ مارو بلکہ ایک وار سے ہی مجھے ختم کردو۔

میرے اردگرد چلتے پھرتے لوگ مجھے اتنی حقارت سے کیوں دیکھتے ہیں...... شاید اس لیے کہ مجھ جیسی لڑکیوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ معاشرہ انہیں کبھی کوئی باعزت مقام نہیں دیتا...... مگر اس سب میں خود کیا قصور کیا ہے۔ گناہ کسی نے کیا اور سزا مجھ جیسی کتنی ہی لڑکیوں کو مل رہی ہے، آخر کیوں......؟ سزا دینا ہی چاہتے ہو تو اس معاشرے کو دو جس میں نہ جانے ہر لمحے کتنے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ جس میں الہڑ، کنواری دوشیزائیں وقت سے پہلے ہی اپنا آپ کھو دیتی ہیں اور سزا کی صورت میں ہم جیسے وجود دنیا میں آتے ہیں۔ سزا دینا چاہتے ہو تو ان مردوں کو دو جو عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے رسوا کرتے ہیں۔ ہاں میں بھی انہی بدنصیبوں میں سے ایک ہوں۔ میں بھی کچھ نہیں جانتی ...... کچھ بھی نہیں۔ میری ماں کون ہے، کہاں ہے یا میرا باپ کون ہے...... کہاں ہے...... میں یہاں تک کیسے آئی؟ شاید میں خود اپنے آپ کو ہی نہیں جانتی، میری کوئی شناخت نہیں...... میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں بھی اس ادارے میں پرورش پانے لگی۔ جہاں مجھ جیسے ہزاروں بدنصیب تھے۔ ہم سب کا دکھ مشترکہ تھا۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ہمارے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا، ہم سب ایک دوسرے کے غمگسار تھے۔

وقت گزرتا گیا...... ہاں وقت کا کام تو گزرنا ہی ہوتا ہے، وقت کی ڈور کون پکڑ سکتا ہے...... میں بچپن کی حدود کو پیچھے چھوڑ کر جوانی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھ چکی تھی اور مجھے پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی یہ احساس شدت سے ہوا کہ ایسے موڑ پر ایک ماں کی کتنی ضرورت ہوتی ہے میرا دل بھی رات کے ہولناک سناٹوں میں ماں کو پکارنے لگا۔ اس تاریک سی کوٹھڑی میں میرا دل لرزنے لگا۔ میں ان دنوں بہت ہی حساس ہوگئی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ وہ عورت جو میری ماں بنی ہوگی مجھے پیدا کر کے کتنی بے دردی سے پھینک گئی ہوگی، وہ مرد کتنا سفاک ہوگا جس نے مڑ کر میری ماں کی خبر نہ لی۔

اس قید خانے میں مجھ جیسی اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں، بہت سی گناہوں کی پوٹ تھیں...... چند لڑکیاں بیاہی جا چکی تھیں۔ مگر جس شان سے اور غرور سے لڑکیاں اپنے بابل کا گھر چھوڑ کر سسرال کی دہلیز پر قدم رکھتی ہوں گی، وہ غرور اور شان یہاں کی لڑکیوں میں نہ تھی۔

ان چہروں پر تو دکھ، خوف اور شرمندگی رقم ہوتی، میں رفتہ رفتہ بچپن کے دور کو بہت دور پیچھے چھوڑ آئی۔ اب میں مکمل ایک جوان دوشیزہ کا روپ دھار چکی تھی۔

لڑکیوں کے خواب کتنے عجیب ہوتے ہیں، ایک سے ہوتے ہیں، ایک ہی رنگ کے خواب...... ایک پیارا سا گھر، خوب صورت جیون ساتھی، چھوٹے چھوٹے بچے اور بس...... اور اسی کمزوری کی وجہ سے مرد پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسے حسین خواب دکھاتا ہے، ایک جنت نما گھر جس میں وہ ملکہ کی طرح راج کرتی نظر آتی ہے جیسے سنہرے سپنے دکھاتا ہے۔ لڑکیاں اپنی اس فطری کمزوری کی وجہ سے مرد ذات سے مات کھا جاتی ہیں، اپنا آپ کھو دیتی ہیں اور نتیجہ، آہ...... نتیجہ کتنا تلخ ہوتا ہے...... مجھے اعتراف ہے کہ میں بھی بہت خوب صورت خواب دیکھنے لگی تھی کہ یہی تو اپنے بس میں تھے۔

☆☆☆

وہ کتنا حسین دن تھا اور اس دن کا مجھے بھی شدت سے انتظار تھا کہ جب سے مجھے معلوم ہوا... تھا کہ عنقریب میری بھی شادی ہو جائے گی، میرے خواب بہت جلد مکمل ہونے والے تھے، میری چال آپ ہی آپ بدلنے لگی تھی، میں پہروں اس کمرے میں ... دھندلائے ہوئے آئینے میں اپنا آپ دیکھتی..... ان دنوں مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ آنکھوں میں خمار سا اتر آیا تھا۔ میری سہیلیاں مجھ سے چھیڑ خانی کرتیں اور میں سمٹ سمٹ سی جاتی۔

"صائمہ تو بڑی خوش قسمت ہے، تیرا ہونے والا شوہر بالکل اکیلا ہے، نہ ساس کی ٹر، ٹر ہوگی اور نہ ہی نندوں کی لڑائی اور نہ ہی دیوروں کے ناز..... اتنے بڑے گھر کی تو اکیلی ملکہ ہوگی۔" صدف مجھ سے کہتی تو میں نہ جانے کیوں اداس ہو جاتی۔

شاید اس لیے کہ میں رشتوں میں کتنی محبت پانا چاہتی تھی، میں ٹی وی ڈرامے دیکھتی اور وہیں رشتوں کی پہچان کر پائی تھی۔ ایسے خوب صورت رشتے میرے مقدر میں نہ تھے مگر پھر بھی میں خوش تھی، ایک گھر پانے کی خوشی جو تھی۔ ایک تحفظ جو مل رہا تھا۔

ایک روز مجھے پتا چلا کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ بازار جانا ہے کیونکہ میرا شوہر میری پسند کے کپڑے خریدنا چاہتا ہے، میں پسینے میں نہا، نہا گئی۔ مجھے اچانک ڈھیروں شرم آنے لگی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں کونے کھدرے میں چھپ جاؤں۔

مگر مجھے اپنی شرم کو بالائے طاق رکھ کر اس کے ساتھ جانا پڑا۔ فرہاد ایک شاندار پرسنالٹی کا حامل تھا۔ اور میں..... میں تو اسے دیکھ کر ہی نہال ہوگئی۔ اس کی بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر میں سچ مچ خود کو ملکہ تصور کرنے لگی تھی۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ میرے نصیب میں یہ سب کچھ ہے۔ جس کی زندگی کے بائیس سال ایک، ایک چیز کے لیے ترس رہے ہوں، جو لمحے لمحے کی موت مرا ہو، اسے سب کچھ ایک ہی ساتھ مل جائے تو یقین فوراً کیسے آسکتا ہے۔ فرہاد میرے لیے دنیا جہاں کی چیزیں خریدنے میں مشغول تھا۔ اور میں بے جان سی ہو کر اس کے ساتھ، ساتھ پھرتی رہی۔ نہ جانے اس وقت میری کیفیت کیسی ہو رہی تھی۔ میں خود نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

"آؤ میں تمہیں اپنا گھر دکھاؤں!" خریداری کرنے کے بعد اس نے کہا۔ وہ مجھے گھر کا ایک، ایک کمرا دکھا رہا تھا اور میں مبہوت سی اس عالیشان سے گھر کو دیکھ رہی تھی جس میں چند دنوں کے بعد مجھے ملکہ بن کر آنا تھا۔ اس گھر کی ملکہ..... اپنے گھر کی ملکہ..... مگر یہ کیا..... یہ کیا ہو رہا تھا، یہ مجھ سے کیا چاہ رہا تھا..... یہ..... یہ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک کیسے عود آئی۔ اچانک اس کا چہرہ مکروہ ہنسی کیوں ہنسنے لگا تھا۔ میں چیخ اٹھی۔

"نہیں..... ہرگز نہیں۔" میں نے بہ مشکل اس سے اپنا آپ چھڑایا مگر وہ اس وقت مکمل شیطان بن چکا تھا، ہاں، ایک درندہ بن چکا تھا۔ مگر میں اپنا آپ بچانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ میری نظر یکایک قریب کی میز پر پڑی، اس پر ایک شیشے کی بوتل... پڑی تھی۔ میں نے اٹھا کر بے دردی سے وہ بوتل اس کے سر پر دے ماری۔ خون کا فوارہ اس کے سر سے پھوٹا تھا۔ .... مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ مجھے چند سال قید کی سزا سنادی گئی۔ مجھ پر یہ جرم عائد کیا گیا کہ میں نے شہر کے شریف اور معزز سیٹھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے، مجھے کچھ پتا نہیں..... میں نے اپنی صفائی میں کچھ نہ کہا۔ بس چپ چاپ ہتھکڑیاں پہن لیں کہ ایک چپ سو بھید چھپاتی ہے۔ آہ مگر مجھے کوئی تو بتائے کہ اس معاشرے میں کسی لڑکی کو شادی کا جھانسا دے کر کب تک بے وقوف بنایا جاتا رہے گا۔ آخر کب تک.....؟

مڈی ناول



جنگل کا پھول

زاہدہ پروین

چھٹا حصہ

یہاں تو آگہی کے چراغ جل اٹھے۔ خود اس کے ناتواں بدن میں برق سی دوڑ گئی۔ قسمت کی خوبی سے تقرر نامہ تھا بھی نزدیک ترین اسکول کا۔

خان صاحب کی نیکی اور بھاگ دوڑ کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ سب کام نہایت آسانی اور بغیر کسی دقت کے انجام پا گئے۔ پہلے دن ذکیہ خالہ اور خان صاحب بذاتِ خود اس کے ہمراہ اسکول گئے اور جوائن کروا کے آئے۔

یوں شرمین ایک گورنمنٹ ٹیچر ہوگئی۔ ذکیہ خالہ کے مشورے کی روشنی میں اس نے یہ کیا کہ پہلے ماہ اس نے اپنی قریبی ٹیوشنز کو جواب نہیں دیا تھا بلکہ اسکول سے واپسی کے بعد جیسے تیسے کر کے شام کے اوقات میں نبھاتی رہی لیکن جیسے ہی اسے پہلی تنخواہ ملی، دادی اماں نے اس کی گھر، گھر کی ٹیوشنز چھڑا دیں۔

''دادی اماں......!'' وہ ناراض ہو کر بولی تھی۔ ''آخر یہ پابندی کیوں لگا رہی ہیں آپ......؟ آپ کو معلوم ہے سب مل ملا کر یہ ایک اچھی خاصی رقم ہو جاتی ہے۔ اس مہنگائی کے دور میں ہمارے کس قدر کام آسکتی ہے۔''

''ہرگز نہیں......'' دادی اماں نے اس سے بھی زیادہ خفا ہو کر ڈانٹا تھا۔ ''ہمیں تمہاری جان زیادہ عزیز ہے اس پیسے سے اور اب کوئی ضرورت نہیں ہے اخراجات بڑھانے کی، گھر کا نظام جیسے چل رہا ہے ایسے ہی چلنے دو۔ چادر دیکھ کر پیر پھیلانے چاہئیں بس ٹیوشن پڑھانا چھوڑ دو۔'' وہ بے ساختہ مسکرا دی تھی مگر فوراً ہی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

ڈاکٹر خاور کے ہاں کی ٹیوشن اس کے دل کا زخم بن گئی تھی۔

''کاش! میں ڈاکٹر شاکرہ کے کہنے سے ڈاکٹر خاور کے ہاں پڑھانے نہ جاتی۔ اے کاش......! تو پھر اتنی بے کلی تو نہ ہوتی میری۔''

شرمین نے دادی کی طرف دیکھتے، دیکھتے سوچا۔ پھر بہانہ بنا کر اُن کے سامنے سے اٹھ آئی۔ دل بری طرح بھر آیا تھا۔ باورچی خانے میں گھس کر کسی بے کام کے کام میں مصروف ہوگئی۔

کافی دیر کے بعد وہ دوبارہ برآمدے میں آئی تو دیکھا کہ دادی گہری نیند سو رہی تھیں۔ برآمدے کے آخری کونے میں پیاری بوا بھی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ عبداللہ اور ولی اللہ سپارہ پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ شرمین کو ایک گونہ سکون کا احساس ہوا وہ بھی وہیں ایک آرام کرسی پر دراز ہوگئی۔

اسے ڈاکٹر خاور کے ہاں کی ٹیوشن چھوڑے اب کافی دن گزر چکے تھے مگر وہاں کا گزرا ہوا آخری دن اور اس شام کے خوفناک اور اذیت سے پُر لمحات اپنی تمام تر جزئیات سمیت اب تک اس کے دل و دماغ سے چپکے ہوئے تھے بلکہ پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ دھیرے، دھیرے اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور ایک گہری غفلت اور سکوت نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ذہن کی اسکرین پر وہ کربناک واقعہ روزِ روشن کی طرح اجاگر ہوگیا۔

اس دن بھی وہ عام دنوں کی طرح حسب دستور ان کے ہاں ٹیوشن پڑھانے گئی تھی۔ وہاں بھی ہر طرح سے سکون اور شانتی تھی۔ اس بیچاری کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ آج کل ڈاکٹر خاور کس الجھن میں گرفتار اور کیا، کیا سوچتے رہتے ہیں۔

دراصل جب سے سیٹھ رستم علی خان کے ہاں رشتے کی گفت و شنید کا سلسلہ چلا تھا۔ خاور بھی بہت سنجیدہ ہو گئے تھے۔ گو کہ وہاں پرخرم کے رشتے کی بات چیت چل رہی تھی مگر خاور کو اپنے مستقبل کی فکر خود بخود ہونے لگی تھی۔ انہیں اپنی اماں کی طرف سے بہت زیادہ خدشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں کسی دن اچانک ان کی توپوں کا رخ خاور کی طرف ہو جائے...... حالانکہ خود وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس سلسلے میں وہ کس سے مدد حاصل کریں تاہم جانے کیوں اور کیسے ان کے دماغ میں یہ خیال جم کر بیٹھ گیا کہ کسی صورت شرمین کا عندیہ اپنے بارے میں لیں۔ ایسا نہ ہو کہ سارا معاملہ یک طرفہ ہو اور وہ ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ اس تاک میں رہنے لگے......کہ کسی روز موقع ملے تو شرمین سے، خود اس بارے میں پوچھنے کی کوشش کریں۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ خود اس قدر محتاط تھے کہ ہمیشہ

اس سے دور، دور رہے تھے۔

بس ہونی شدنی ہو کر رہتی ہے۔ انہوں نے خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی۔ اس روز بچے اسٹڈی روم سے پڑھ کر نکل گئے تو شرمین بھی اٹھ کر جانے لگی۔ عین اسی لمحے پچھلے دروازے سے کسی نے اسے نام لے کر پکارا۔

''شرمین......!''

وہ ٹھٹک کر تھم گئی۔ زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ گھوم کر دیکھا تو دروازے میں ڈاکٹر خاور کھڑے مسکرا رہے تھے۔

برآمدے میں دروازے کے قریب ہی پڑے ہوئے تخت پر اس وقت نائمہ بیگم بیٹھی ہوئی چھالیا کتر رہی تھیں۔ ابھی، ابھی اصغری ان کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی اور اب وہ...... ایک سکوت کے عالم میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھیں۔ بچے ان کے سامنے ہی پڑھ کر نکلے تھے۔ غیر متوقع طور پر خاور کی آواز پر وہ چونکیں اور کان لگا کر سننے لگیں۔ دوپہر کے سناٹے میں انہوں نے واضح سنا تھا۔

''شرمین۔'' اور غضب یہ ہوا کہ آواز بھی صاف پہچان لی تھی۔

چند لمحوں کے وقفے سے نائمہ بیگم کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ شرمین اور خاور کے مابین کوئی معاملہ چل رہا ہے۔

''خبر نہیں تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ دونوں کب سے...... اور...... کس حد تک بے تکلف ہیں؟''

انہوں نے غضبناک ہو کر سوچا۔ شکی اور وہمی دماغ ایک ہی زقند میں کہیں سے کہیں جا پہنچا۔

انہیں خاور سے زیادہ شرمین پر غصہ آ رہا تھا۔ مارے طیش کے ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کلیجا جل کر خاک ہو گیا۔ رنج اور غصے کی شدت سے حالت غیر ہونے لگی۔ خون کھولنے لگا۔ خاور یعنی اپنے ہی بیٹے کی دشمن، دھیمی سرگوشیاں زہر بھری ہوئی پھنکار بن کر ڈسنے لگیں۔ وہ سراپا گوش بن گئیں۔

جب ضبط کا یارا ختم ہو گیا تو سر دتا رکھ کر قریبی کھڑکی کی جالی سے اندر دیکھنے لگیں۔ عین سامنے شرمین دکھائی دی۔ اس کا رنگین چہرہ اور خمار آلود ادھ کھلی آنکھیں اُن کے حواس پر بجلی بن کر گریں۔ طیش کی شدت سے ہاتھ پیر سنسنانے لگے۔ خاور کی ان کی طرف پشت تھی۔

وہ غیظ و غضب سے کانپتی ہوئی دوبارہ تخت پر بیٹھ تو گئیں مگر اب نگاہیں دروازے پر ٹکی تھیں۔ لمحے صدیاں بن، بن کر سرکے...... شرمین باہر نکلی، خاور غالباً عقبی دروازے سے جا چکے تھے۔

''اِدھر آؤ لڑکی......'' شرمین کے باہر نکلتے ہی نائمہ بیگم نے اسے تحکم سے پکارا۔

وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ کان سائیں، سائیں کرنے لگے۔ پل بھر میں مسکراتا ہوا پھول چہرہ مرجھا کر ڈھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید پڑ گیا۔ وہ بے حد خوفزدہ نظروں سے نائمہ بیگم کی صورت دیکھنے لگی۔ وقت کی سانسیں جیسے تھم گئی تھیں۔ ایک پُر ہول سناٹا طاری ہو گیا۔ اس خاموشی میں وہ سانپ کی طرح پھنکاریں۔

''خاور کو...... کب سے اپنے دامِ الفت میں الجھایا ہے؟'' شرمین کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔

وہ تڑپ کر ایک قدم آگے بڑھی...... مگر منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔

''بولو...... جواب دو...... خاموش کیوں ہو......؟'' انہوں نے دوبارہ آگ کے زہر میں بجھے ہوئے تیر چلائے۔

وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے انہیں تکتی رہی پر بولی کچھ نہیں۔ نائمہ بیگم خود ہی اپنی خشمگیں نگاہیں اس پر ڈال کر حقارت سے بولیں۔

''تم...... دو ٹکے کی چھوکری...... غلاظت کی پوٹ...... اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو......؟ اپنے حسن

اور جوانی کی چھب دکھلا کر شریف اور خاندانی لڑکوں کو پھانستی ہو...... جھونپڑیوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتی ہو...... دور ہو کمبخت میری نظروں کے سامنے سے۔ خبردار...... جو آئندہ یہاں قدم رکھنے کی بھی کوشش کی تو......'' انہوں نے اپنے جوشِ جنوں اور جوشِ خطابت میں اور بھی بہت کچھ کہا، خود انہیں بھی معلوم نہیں کہ کیا، کیا کہا...... بس کہتی ہی چلی گئیں۔ مگر کہتے، کہتے جب نگاہ اٹھا کر دیکھا تو سامنے کوئی بھی نہیں تھا۔ شرمین جانے کب کی جا چکی تھی۔ لرزتی، کانپتی، شرمین...... اپنی تذلیل کروا کر جا چکی تھی...... اور گھر بھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ اس کے ساتھ کیا گزر گئی تھی۔

بے جرم و خطا...... جس جگہ وہ سہمی، سہمی کھڑی ہوئی تھی، عین اسی مقام پر ایک تر و تازہ گلاب کا سرخ، سرخ پھول پڑا ہوا تھا۔

جانے، کیا سوچ کر نائمہ بیگم کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انہوں نے فوراً ہی جھک کر پھول اٹھا لیا اور پتی، پتی کر کے فضاؤں میں اڑا دیا۔

☆☆☆

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ درختوں کے سائے لانبے ہوتے جا رہے تھے۔ وقت گزر جانے کا کوئی احساس ہی نہ رہا تھا۔ دونوں کے دونوں ہی گردنیں جھکائے چپ، چاپ بیٹھے تھے۔ دونوں پر ہی بے شمار افسردگی نے حملہ کر دیا تھا۔ کافی دیر کے سکوت کے بعد بابا رحمت نے ایک لمبی آہ بھری۔ یوں گویا سنبھالا لیا ہو...... پھر خرم کا مضبوط ہاتھ اپنے کمزور ہاتھوں میں لے کر بولے۔

''خرم بیٹے......! وہ سب تو گئی گزری...... بھولی بسری باتیں ہو چکیں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ آج اتنی مدت کے بعد میں نے تمہیں یہ تمام داستان کیوں سنائی؟ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ غور سے سنو بیٹا...... یہ سب بتا کر میں تمہیں اس امر کا احساس دلانا چاہتا ہوں کہ...... شادی درحقیقت زندگی بھر کا ایک مضبوط بندھن ہوتا ہے، یہ کوئی معمولی سنجوگ نہیں ہوتا۔ جو ہر روز توڑا اور باندھا جائے۔ اگر خدانخواستہ نیت کھوٹی ہو تو...... میرا خیال ہے کہ انجام بھی کھوٹا ہوتا ہے۔ نیت اور ارادہ پکا اور سچا نہ ہو تو ایسے انمول بندھنوں سے دلوں کو حقیقی اور سچی خوشی نصیب نہیں ہوتی بیٹا...... آگے تم خود بہت سمجھدار ہو۔ میں تو ایک جاہل اور پرانے دور کا...... بوڑھا دیہاتی آدمی ہوں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ سچائی ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ میری تم سے التجا ہے میرے بیٹے کہ میری ریشم کو زندگی کے کسی بھی دور میں کبھی دھوکا مت دینا۔''

خرم نے چونک کر بے اختیار ان کی طرف دیکھا...... ان کی بوڑھی آنکھوں میں اشکوں کے شفاف موتی اٹکے ہوئے لرز رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔

وقت بھی تھا اداس اداس شام بھی تھی دھواں، دھواں
ایسے میں کیا کچھ کہانیاں، یاد سی آ کے رہ گئیں

خرم نے بازو پھیلا کر انہیں سمیٹ لیا اور وہ ایک بچے کی طرح معصومیت سے خرم سے مخاطب تھے۔

''...... اس کا خمیر وفاؤں...... اور صرف وفاؤں سے گندھا ہے۔ وہ فقط ایک ہی زبان جانتی ہے۔ خلوص اور بے لوث چاہتوں کی زبان...... میں نے کبھی اسے نرم ترین الفاظ میں بھی نہیں ڈانٹا...... اس کا دل بہت چھوٹا ہے...... بہت ننھا سا ہے...... اگر کبھی خدانخواستہ...... تم نے کبھی اس کا دل میلا کر دیا تو وہ جی نہ سکے گی۔ وہ بہت سیدھی اور کمزور لڑکی ہے...... آڑے ترچھے حربے کبھی نہ آزمانا اس پر...... میں نے اسے بہت تکلیفیں اور اذیتیں سہہ، سہہ کر پالا ہے۔ اس کی پرورش میرے لیے آسان نہ تھی۔ اس کی آنکھ کا آنسو...... میرے دل کا زخم اور روح کا روگ نہ بنا دینا۔ میں اپنی زندگی کی تمام تر نیک دعاؤں، تمناؤں اور خواہشوں کے ساتھ اسے

تمہارے سپرد کروں گا۔ خدا کے بعد تمہی اس کے حامی و ناصر ہو گے۔ دیکھو۔۔۔۔۔! میرے بھروسے اور مان کو کبھی ٹھیس نہ پہنچنے دینا۔ اب یہ سب کچھ تمہارے اپنے رویئے اور سلوک پر منحصر ہوگا۔ اور۔۔۔۔۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ بھی تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔'' وہ چپ ہوئے تو دیر تک ان کی گلوگیر آواز اور بھیگا ہوا لہجہ خرم کی سماعت سے ٹکراتا رہا۔ بازگشت لوٹ پھیر کر سنائی دیتی رہی۔

جس روز سے یہ رشتہ طے ہوا تھا اور رحمت بابا کے عزیزوں نے متفقہ طور پر اپنی منظوری دی تھی، بابا کے دل ودماغ ایک شدید قسم کے بوجھ اور گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ رات دن ایک مسلسل الجھن میں گرفتار رہنے لگے تھے، ہر لمحہ اور ہر وقت دلگرفتہ اور مغموم سے۔۔۔۔۔ کسی خاص تفکر نے انہیں ایک دم سے زیادہ بوڑھا اور زیادہ کمزور کر ڈالا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر، دل ہی دل میں کسی طرح کی ادھیڑ بن میں مصروف رہنے لگے ہوں۔ دراصل اتنے دنوں سے وہ اپنے آپ کو منانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اسی جدوجہد میں دن گزرتے گئے کہ وہ اپنے ہونے والے داماد کو اپنے ذاتی راز میں کس طرح شریک کریں؟ اور آج۔۔۔۔۔ بالآخر وہ دل کڑا کر کے خرم کے روبرو سب کچھ کہہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے بہت دن سوچنے کے بعد اپنے راز پر سے پردہ اٹھا دیا تھا اور اب بہت ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ اب انہیں کوئی الجھن تھی نہ پشیمانی۔۔۔۔۔ بلکہ سب کچھ کہہ ڈالنے کے بعد خود کو بہت مطمئن محسوس کرنے لگے تھے۔ اس اہم ترین گفتگو کے بعد بھی دونوں کے درمیان دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ مگر اب موضوع بدل چکا تھا۔

بابا ایک دفعہ پھر اٹھ کر چولھے کے قریب گئے، راکھ کرید کر انگارے نکالے اور بڑے اہتمام سے دوبارہ چائے چڑھانے لگے۔ ذرا سی دیر غور کرتے کے بعد خرم نے بھی اپنے دل کی بات کہہ ڈالنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

''بابا۔۔۔۔۔! شادی کے بعد میرا ارادہ شہر میں رہنے کا نہیں ہے۔'' جس وقت رحمت بابا اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھما رہے تھے، خرم نے نہایت اعتماد کے ساتھ نظریں جھکائے، جھکائے کہہ ڈالا۔

''تو پھر بیٹا۔۔۔۔۔؟'' بابا نے سادگی سے پوچھا۔

''میں۔۔۔۔۔ یہیں اسی علاقے میں رہوں گا اپنی بیوی کے ساتھ۔''

''کیا مطلب؟'' وہ بالکل نہ سمجھے۔

''میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔'' اب خرم نے انہیں صاف الفاظ میں آگاہ کیا۔ ''کیونکہ۔۔۔۔۔ شہر میں میرا کوئی ہے ہی نہیں۔۔۔۔۔ وہاں اتنی دور کرائے کے گھر میں رہ کر کیا کروں گا؟ پھر یہ کہ میری ملازمت بھی یہیں کی ہے۔ ہر روز آنے جانے کا مسئلہ رہے گا۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ یہیں آپ کے قریب رہوں گا۔۔۔۔۔ فی الحال میں ریسٹ ہاؤس میں اپنی رہائش رکھوں گا۔''

بابا رحمت خوشی سے اچھل پڑے۔ پیالی میں سے چائے چھلک کر ان کے کپڑوں پر گری مگر انہوں نے قطعی کوئی پروا نہیں کی۔ انہوں نے کہا۔

''بیٹا۔۔۔۔۔! تم سچ کہہ رہے ہو۔'' انہوں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

''جی بابا جان۔۔۔۔۔! بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' خرم نے بڑے اطمینان اور سچائی سے جواب دیا۔ پھر مسکرا کر پوچھا۔ ''بابا جان۔۔۔۔۔! آپ کو برا تو نہیں لگا؟ آپ خوش ہیں ناں۔۔۔۔۔؟''

قدرتی بات تھی بابا کو اس اطلاع سے دلی خوشی محسوس ہوئی۔ یہ خبر، جیسے ہی خرم نے تصدیق اور وضاحت کی تھی۔ انہوں نے دل ہی دل میں سیکڑوں بار اپنے رب کا شکر ادا کیا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ خرم سے رشتہ طے ہوتے

وقت یہی ایک دکھ اور کرب ان کو مسلسل چاٹ رہا تھا کہ اُن کی واحد اکلوتی اولاد ان سے جدا ہو کر معلوم نہیں کتنے طویل فاصلے پر جا بسنے والی تھی۔ مگر خرم کے فیصلے نے ان کے تنِ مردہ میں گویا جان ڈال دی تھی۔ ایک تازہ روح پھونک ڈالی تھی۔ وہ جیسے ایک دم ہی دوبارہ جی اٹھے تھے۔

''نہ بیٹا..... تم خوش ہو تو تمہاری خوشی میں میں خوش..... میرا خدا خوش، میں تو ویسے ہی شہر اور شہر کے فاصلوں سے بہت ڈرتا ہوں۔ کبھی وہاں رہنے سہنے کا اتفاق نہیں ہوا ناں.....'' وہ خوشی سے بے حال ہو کر بولے۔

''خیر..... میرے لیے شہر میں رہنے کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہے مگر یہ کہ فی الحال اپنی سہولت کی بنا پر یہ فیصلہ کیا ہے۔'' خرم نے دل ہی دل میں مطمئن ہو کر کہا۔

سادہ لوح بابا نے اس کے لفظ فی الحال پر غور نہیں کیا بلکہ خرم کے اٹھ کر جاتے ہی حقے کی نے ایک طرف ہٹائی اور خود لاٹھی ٹیکتے ہوئے مسجد کی طرف چل دیے تاکہ ریشم کے شادی کے بعد یہیں رہنے کی خوشخبری اپنے غمگسار مولوی جی کو سنائیں اور ساتھ ہی شکرانے کے نوافل ادا کر سکیں۔

اور پھر بالآخر..... وہ مبارک ساعت آ پہنچی..... جب خرم اور ریشم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

نکاح مولوی صاحب نے ہی پڑھایا تھا۔ گو کہ تقریبِ نکاح انتہائی سادہ اور محدود سی تھی مگر بستی والوں کی خوشی دیدنی تھی۔ ان خوشیوں میں ہر چھوٹے بڑے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ بستی بھر میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لوگوں نے حسبِ توفیق جنگلی پھولوں اور پتوں سے ہی بابا رحمت کا جھونپڑا اندر باہر سے سجا ڈالا تھا۔

جبکہ باراتیوں میں دولھا کے علاوہ اس کے خانساماں اور چند مزدوروں کے سوا اس کا کوئی قریبی دوست تک نہیں تھا۔ منی سی بارات، جسے بابا رحمت نے بخوبی بہترین استقبالیہ سے نوازا تھا۔ ذرا سی بارات پر ان سادہ دلوں کو اعتراض تک کرنا نہ آیا تھا۔ ہاں بری کے خوش رنگ اور خوب صورت جوڑوں کو دیکھ، دیکھ کر ضرور ان لوگوں کی عقلیں حیران تھیں کہ ایک سے ایک بڑھ کر تھے۔ پھر زیورات نے تو لڑکیوں بالیوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر ڈالی تھیں۔ سب آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر ان لوازمات کو دیکھ رہی تھیں۔ ریشم کی اعلیٰ و ارفع قسمت پر رشک آ رہا تھا انہیں۔ بات تھی ہی رشک پیدا کرنے والی اور پھر نہلے پر دہلا میک اپ کا سامان..... کسی عورت کو بھی میک اپ کا استعمال نہیں آیا۔ نکاح کے بعد چند لڑکیوں نے مل کر کسی نہ کسی طرح جیسا بھی آیا اس کا ہار سنگار کیا تھا۔

بابا رحمت نے کھانے کا انتظام بہت اچھا کیا تھا۔ انہوں نے سویرے ہی سویرے کئی بکرے ذبح کروا ڈالے تھے۔ موہن داس اور چند دوسرے ہندو گھرانوں کا کھانا انہی کے مطابق علیحدہ پکوایا تھا۔ آخر کو اس موہن داس کی بیٹی بسنتی، ریشم کی واحد پکی سہیلی تھی۔

سفید شلوار سوٹ میں اپنے دراز قد کے ساتھ بات، بات پر ہنستا مسکراتا خرم آج سب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ آج سج بھی بہت رہا تھا۔ جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چندا۔ ایسے خوب صورت اور خوش باش دولھے پر سب نثار ہوئے جا رہے تھے۔ خرم نے عام روایتی دولھاؤں کی طرح سہرا وغیرہ تو نہیں باندھا تھا ہاں تازہ گلابوں کے مہکتے ہوئے ہار..... ضرور اس کے گلے میں پڑے تھے۔ وہ ہنس رہا تھا، مسکرا رہا تھا۔ اندرونی خوشیوں کی جوت سے اس کی آنکھیں ہیروں کے مانند جگمگا رہی تھیں۔ وہیں اندر کہیں اپنوں کا مان توڑ ڈالنے کی اذیت بھی پنجے گاڑے تھی۔ لیکن اس دکھن کا احساس

کم..... بہت ہی کم تھا۔

نمازِ مغرب سے فارغ ہو کر سب نے مل کر کھانا کھایا اور اس کے بعد ہی ریشم کی رخصتی عمل میں آئی۔ یوں بابا رحمت کا پہلا اور آخری فرض پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ انہوں نے اسے مختصر سا جہیز بھی دیا تھا۔ خرم اسے رخصت کرانے کے لیے جیپ لایا تھا۔ جسے وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ باراتی پیدل واپس لوٹ گئے تھے۔

☆☆☆

''آپا..... ! لڑکی ہے کس قدر خوب صورت..... یہ تو آپ مانیں گی !'' جب سے سیٹھ رستم علی خان کے ہاں سے ہو کر آئے تھے نائمہ بیگم یہ جملہ بلا مبالغہ سیکڑوں بار دہرا چکی تھیں۔

جواب میں پھوپی شمسہ بیگم زبان سے ہاں میں ہاں ملا ضرور دیتی تھیں مگر دل میں سخت ناراض تھیں۔ رستم علی خان کی لڑکی بلاشبہ بہت حسین اور نازک تھی مگر اس کی ظاہری وضع قطع اور پہناوے پر شمسہ بیگم سخت بدمزہ تھیں۔ اس کی بڑی بہن بھی اسی ننگے پہناوے میں قریب کھڑی دکھائی دی تھی۔ حیرت شمسہ بیگم کو بیڈمنٹن کھیلنے والے اس کے شوہر پر بھی تھی جسے بیوی پر اعتراض تھا نہ سالی پر۔

ایک نائمہ بیگم تھیں کہ ہر معاملے کو نظر انداز کر کے فرخندہ کے حسن و جمال پر مرمٹی تھیں اور جب سے آئی تھیں دن رات اسی کے قصیدے گاتی رہتی تھیں۔ آج کل پھوپی کا ان کی طرف جانا محال ہو رہا تھا۔ اِدھر یہ وہاں پہنچیں اور نائمہ بیگم نے رستم علی خان کے رہن سہن اور سوسائٹی میں اعلیٰ مقام کے گُن گانے شروع کیے۔

شمسہ بیگم کو ان کے گُن گانے سے کوئی چڑ یا اعتراض نہ تھا بلکہ ان کی کم فہمی اور خوش گمانی پر حیران تھیں۔ ان کے اور سیٹھ رستم علی خان کے رہن سہن اور طور طریقوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک دفعہ کے جانے سے یہ تضاد صاف نظر آ گیا تھا مگر جانے کیوں نائمہ بیگم اس حقیقت سے صاف پہلوتہی برت رہی تھیں یا سمجھنا نہیں چاہ رہی تھیں۔

ایک محبت کرنے والی پھوپی ہونے کے ناتے وہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا کوئی بھی بھتیجا کسی نئی پریشانی میں مبتلا ہو کر زندگی بھر کا عذاب بھگتے۔ مگر بیچاری اپنی منہ زور اور مزاج کی تیز بھاوج کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ اس لیے دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں۔

بچوں کے سوا گھر میں کوئی ایسا نہیں تھا کہ جس سے اندر کی باتیں کرکے جی کی بھڑاس نکال سکتیں۔

چنانچہ صورتِ حال یہ تھی کہ جو نائمہ بیگم کہتیں، یہ چپ چاپ سنتی رہتیں۔ اس نئے رشتے کے متعلق اپنا اظہارِ خیال اس لیے بھی شمسہ بیگم کے لیے دشوار گزار تھا کہ یہ ان کی صرف نند ہی نہیں بلکہ مستقبل قریب میں ان کی ہونے والی سمدھن بھی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ یہ کچھ سمجھانے کی کوشش کرتیں اور نائمہ بیگم کو برا لگ جاتا۔ آخر کو ان کی بیٹی کی ہونے والی ساس تھیں۔

ایک دن..... خدا کا کرنا یہ ہوا کہ صورتِ حال نے دوسرا ہی رخ اختیار کرلیا۔ نائمہ بیگم آج کل خرم کے رشتے کے لیے سنجیدہ تھیں اور اسی کے لیے وہ رستم علی خان کے ہاں گئی تھیں۔ ہوا یہ کہ اصغری آئی اور آکر ایک فسوں پھونک کر چلتی بنی۔ آج وہ ہمیشہ کی طرح دیر تک بیٹھی بھی نہیں۔ اس کی گل افشانی پر نائمہ بیگم تو ہق دق رہ گئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں پتنگے لگ گئے۔ جیسی بیٹھی تھیں، ویسے ہی اٹھ کر شمسہ بیگم کی طرف چل دیں حالانکہ خود اُن کے ہاں بہت کم آتی تھیں۔

شمسہ بیگم شام کے کھانے کی ہدایات دے کر انہی کی طرف آنے والی تھیں۔ انہیں دیکھ کر دوبارہ بیٹھ گئیں۔

"آپ نے کچھ سنا آپا!" وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے شکایتاً بولیں۔ "سیٹھ رستم علی خان کی بیگم صاحبہ نے کہلایا ہے کہ رشتے کی بات چیت اگر آگے بڑھانی ہے تو اپنے ڈاکٹر بیٹے کی بات کریں..... ہمیں اپنی بیٹی کے لیے ڈاکٹر کا رشتہ چاہیے۔" وہ خاموش ہوکر اپنے ہونٹ کاٹنے لگیں۔ تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے اور سخت پریشانی میں مبتلا ہوگئی تھیں۔

لیکن خلافِ توقع شمسہ بیگم کو رتی برابر حیرت نہ ہوئی۔ وہ اطمینان سے بیٹھی پان بناتی رہیں۔

"حیرت کی بات ہے آپ کو ذرا سی بھی فکر مندی نہ ہوئی۔ یہاں ہول، ہول کر جان آدھی ہوچکی ہے....." ان کی خاموشی پر نائمہ بیگم نے تبصرہ کیا۔

"تو..... اس میں حیرانی والی کون سی بات ہے؟ تم نے اس دن ان کی باتیں نہیں سنی تھیں جب ہم ان کے ہاں گئے تھے۔" شمسہ بیگم نے قدرے مسکرا کر جواب دیا۔

"ایسا..... کب کہا تھا انہوں نے؟" اب نائمہ بیگم نے حیران ہوکر پوچھا۔

"لو اور سنو..... اسی بات پر تو کس قدر جرح کی تھی انہوں نے..... بار، بار ہیر پھیر کر خاور کے متعلق ہی سوال جواب کیے جارہی تھیں۔ میں تو اسی روز ان کا مدعا سمجھ گئی تھی۔" شمسہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

"معلوم نہیں کیا کہہ رہی ہیں آپ! میری سمجھ سے باہر ہے۔" نائمہ بیگم الجھ کر بولیں۔

"کیا کریں..... تم تو کبھی، کبھی یونہی کھو جاتی ہو۔ اگر کچھ سمجھائیں تو بلاوجہ میں برا مان جاؤ گی، اس لیے خاموش رہ جاتے ہیں۔ جو تم آج ان کے سمجھانے سے سمجھی ہو، اسی روز سمجھ سکتی تھیں۔"

"کمال ہے آپ نے تو وہاں سے واپسی کے بعد سے آج تک بھی ایسی کوئی بات اشارتاً بھی نہیں کی تھی۔ اگر میں نہیں سمجھی مگر آپ سمجھ گئی تھیں تو کچھ مجھے بھی بتایا ہوتا۔" نائمہ بیگم منہ بگاڑ کر بولیں۔

"تمہیں کس نے یہ سب بتایا؟ کیا رستم علی خان کی بیگم نے یہ سب باتیں فون پر کی ہیں تم سے؟" شمسہ بیگم نے رکے بغیر موضوع بدل کر پوچھا۔

"آج..... اصغری آئی تھی ان کی بھیجی ہوئی۔ وہی سب کچھ بتا کر گئی ہے جو انہوں نے کہلوایا، وہ کہہ گئی۔" نائمہ بیگم ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئیں۔ پھر تھم کر جواب دیا۔

"ہوں....." شمسہ بیگم نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا۔ "پھر..... اب کیا سوچا ہے تم نے؟" نائمہ بیگم سٹپٹا سی گئیں۔ کوئی جواب نہ بن پایا ان سے۔ شمسہ بیگم ان کی کشمکش کو خوب سمجھ رہی تھیں۔ خود ہی بولیں۔

"اس امر میں مشورہ طلب کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اسی اصغری بی سے کہلوا دیا ہوتا ہمیں ابھی اپنے

چھوٹے بیٹے کی شادی کرنی ہے۔"

"ہاں آپ، خود ہی بتائیں کس قدر غیر واجب شرط لگا ڈالی ہے۔ ان لوگوں نے۔ خاور کے لیے تو واقعی ابھی ہم نے سوچا بھی نہیں ہے۔ یہی خیال ہے کہ پہلے بابر اور خرم سے فارغ ہو لیں۔" نائمہ بیگم نے حوصلہ پا کر کہا۔

"بالکل درست فیصلہ ہے تمہارا...... اب یوں کرو کہ ان بیگم صاحبہ کو فون کر دو۔ اپنا نظریہ اور فیصلہ انہیں سنا ڈالو۔ پھر آگے ان کی مرضی۔" شمسہ بیگم نے سہولت سے انہیں سمجھایا۔

"آپ کا کہنا درست ہے...... مگر میرا خیال ہے کہ فون کے بجائے ہم خود ہی کیوں نہ چلے جائیں ان کے ہاں......؟ ہوسکتا ہے آمنے سامنے کی ملاقات میں زیادہ مناسب طریقے سے بات چیت ہو جائے اور ہم انہیں اپنا نظریہ اچھی طرح سمجھا سکیں۔" نائمہ بیگم کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

شمسہ بیگم ان کی ہٹ دھرمی اور مستقل مزاجی پہ دنگ رہ گئیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس رشتے پر دل و جان سے مرمٹی تھیں۔ اور کسی صورت بھی اس خیال سے دستبرداری کی حامی نہ تھیں۔

"بھئی جو چاہو کرو، تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔" انہوں نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"بس آپ میرے ساتھ چلی چلیے گا۔ اس بار میں خود ان سے بات کروں گی۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور میری ذمے داری کو محسوس کریں گی۔ آخر ہمارے خرم میں کمی ہی کس بات کی ہے؟ فقط عمروں میں چند سالوں کا فرق ہے، ورنہ تینوں بھائی ماشاءاللہ ایک جیسے ہیں۔" نائمہ بیگم خوش ہو کر جلدی سے بولیں۔

اب شمسہ بیگم نے خاموشی اختیار کر لی۔ سمجھ گئی تھیں کہ بھاوج اپنے جی میں آئی کر کے رہیں گی۔ اب کچھ سمجھانا، کہنا فضول تھا۔

نائمہ بیگم ان کی طرف سے مطمئن ہو کر کچھ کہنے کو تھیں کہ دفعتاً خاور اور بابر یکے بعد دیگرے اندر

نیا سال

مارک ٹوئین نے نئے سال کا آغاز ہوتے ہی اپنے ملنے جلنے والوں سے کہا۔

"میں نے پختہ ارادہ کر رکھا ہے کہ اس سال کم از کم میں اپنی آمدنی اور وسائل کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کروں گا۔ چاہے اس کے لیے کہیں سے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔"

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

داخل ہوئے۔

"ارے...... اماں آپ یہاں بیٹھی ہیں؟" آتے ہی بولے۔

"کیوں، کیا ہمارا یہاں آنا منع ہے؟ یا برا لگ گیا کسی کو؟" انہوں نے تنک کر جواب دیا۔

"بھئی برا کسے معلوم ہوگا۔ کیسی بے تکی بات کر رہی ہو؟" پھوپی شمسہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

اتنے میں روبی ملازمہ سے شام کی چائے اور لوازمات اٹھوائے ہوئے اندر آئی اور کھانے پینے کا سامان سجا دیا۔

"کہیں دکھائی نہیں دے رہے بچے کہاں ہیں سب کے سب؟" بابر نے ادھر اُدھر دیکھ کر دریافت کیا۔

اچانک کھلے دریچے سے شٹل کاک اڑتی ہوئی آئی اور مزے سے چائے کے ایک کپ میں غوطہ زن ہوگئی۔ شٹل کاک کے تعاقب میں ایک عدد گیند بھی تھی۔

نائمہ بیگم کے، ہائیں، ہائیں کرتے گیند ایک زناٹے سے فراٹے بھرتی ہوئی آئی کھٹاک سے سامنے والی دیوار سے ٹکرائی پھر دھپ سے بابر کے قدموں میں آگری۔ سب سکتے کے سے عالم میں بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ فقط نائمہ بیگم نے بڑ بڑانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بچوں کو اور ان کی شرارتوں کو برا

بھلا کہہ رہی تھیں اور زور، زور سے خفا ہو رہی تھیں۔
اسی دوران دروازے میں سے شامی نمودار ہوا مگر یہاں سب کو جمع دیکھ کر برق کی طرح لہراتا رفو چکر ہو گیا۔ خاور نے لپک کر اس کے پیچھے جانا چاہا مگر پھوپی نے منع کر دیا اور سنجیدگی سے کہنے لگیں۔
''اس وقت کی ڈانٹ پھٹکار بیکار ہے، کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ یوں بھی اسکول کے بعد ساری شام فارغ رہتے ہیں۔ ان کا کیا قصور جب کوئی پڑھانے والا بھی نہیں رہا۔ فراغت میں شیطانیاں ہی کریں گے۔''
''کیوں...... بھئی ٹیوشن سے کیوں فارغ ہیں؟'' خاور نے چونک کر پوچھا۔
''آپ پرسوں ہی تو آئے ہیں اسلام آباد سے اور کل اتوار تھا اس لیے آپ کو کیا معلوم...... ان کی ٹیوٹر تو بہت دنوں سے غیر حاضر ہیں۔'' معصومہ نے منہ بنا کر کہا۔
''کیوں، کیا ہوا؟ کہاں گئیں؟'' خاور نے بے اختیار بلند آواز میں پوچھا۔
''اس کی غیر حاضری کو تو دس پندرہ دن گزر چکے ہیں۔ ہمیں تعجب تو بہت ہے۔ ایسی بے مروت اور بد اخلاق لڑکی نہیں تھی وہ کہ بغیر کسی عذر کے چپ چپاتے چھوڑ جاتی۔ تمہارا انتظار تھا کہ آ کر معلومات کرو گے۔ یہاں تو بچوں نے اس کے بغیر اندھیر مچا رکھا ہے۔'' شمسہ بیگم نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بتایا۔ اتنا کہہ کر انہوں نے پچھلے دنوں رونما ہونے والا واقعہ خاور کو تفصیل سے سنایا کہ جب کھیل کھیل میں ہی کامی کے بلے سے افشاں زخمی ہوئی تھی اور پھر کیسا ہنگامہ مچا تھا۔ خاور کو بچوں کے کارناموں کی تفصیل سننے سے زیادہ فکر شرمین کے عجیب و غریب رویے کی ہو رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر حد سے زیادہ پریشان ہوا تھے۔
''ہاں کیا پتا بیچاری پر کوئی مصیبت آ پڑی ہو...... یا پھر ہو سکتا ہے خدانخواستہ بیمار پڑ گئی ہو؟'' روبی کسی خیال سے رنجیدہ ہو کر بولی۔
نائمہ بیگم جو چپکی بیٹھی سب کی باتیں سن رہی تھیں۔ اتنے دنوں کے بعد ان کا غم و غصہ دوبارہ عروج پر پہنچ گیا۔ تیوری چڑھا کر بولیں۔ ''اے ایسی چلتی پھرتیوں پر کیا مصیبت آئے گی؟ وہ تو خود اپنی ذات سے دوسروں کو مصیبت میں گرفتار کر ڈالیں۔ گندی نالی کا کیڑا ہمیشہ غلاظت پسند کرتا ہے اور وہیں پھلتا پھولتا ہے۔''
پورے کمرے پر ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ بابر، خاور، روبی اور معصومہ حیرت سے منہ پھاڑے ان کی صورت تکنے لگے۔ شمسہ بیگم بھی پان چبانا بھول گئیں۔
''اے دلہن...... یہ تم کیا بک رہی ہو! دشمنوں کے حواس تو نہیں جاتے رہے؟ کیسی نیک بخت اور بھولی بچی تھی بیچاری...... جسے تم نے یوں زبان اٹھا کر دے ماری۔ ایسی بھی کیا تنک مزاجی......! تمہارے ہمارے آگے بھی بچیاں ہیں، ذرا خوف خدا سے سوچ سمجھ کر بولا کرو۔'' پھوپی نے نہایت دکھ اور افسوس کے ساتھ کہا۔
نائمہ بیگم کو بھلا کہاں کسی نے ایسی کھری سنائی ہوں گی اور وہ بھی خود ان کے بقول دو ٹکے کی چھوکری کے لیے۔ وہ تو ویسے ہی شرمین کے نام اور ذکر سے خار کھائے بیٹھی تھیں۔ طیش کے عالم میں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ غیظ و غضب سے کپکپا اٹھیں۔ دبنگ لہجے اور زوردار آواز میں غرائیں۔
''آپا جان! آپ بہت بھولی اور سادہ لوح ہیں...... آج کل کی ان گلی، گلی...... گھومنے والیوں سے ناواقف ہیں! اس لیے ان کی نیک نیتی کے گن گا رہی ہیں۔ اپنے گھر اور اپنے بچوں کو باہر کی غلاظت سے پاک صاف رکھنا میرا فرض ہے...... میں اپنی اولاد کی نگہبان ہوں، ان کا اچھا برا سوچنا سمجھنا...... میرا کام ہے کسی دوسرے کا نہیں...... میں

اپنے کنبے اور اولاد کی مکمل طور سے مالک و مختار ہوں بھلا اس معمولی سی لڑکی کو نت نئے فتنے جگانے اور جادو چلانے کے لیے اپنے گھر میں ٹھہرائے رکھتی؟ بچوں کے لیے ٹیوٹر ایک نہیں ہزار مل جائیں گے...... مگر اب وہ لڑکی میرے گھر کے اندر قدم نہیں رکھ سکتی...... ورنہ میں اس کو مارے جوتیوں کے فرش کر ڈالوں گی۔ سب اچھی طرح سے سن لیں۔ میں نے اسے نکال دیا ہے ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے...... اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔ کبھی نہیں...... اس کو ٹیوٹر رکھ کے مجھے اپنے بچوں کو بگاڑنا نہیں ہے۔ اور خبردار جو کسی نے اسے یہاں دوبارہ بلانے کی کوشش کی تو۔ چاہے وہ میری اولاد ہی کیوں نہ ہو...... اس کا حشر بگاڑ دوں گی۔ خوب کان کھول کر سن رکھیں سب......'' آخری بات انہوں نے خاور پر ایک گرم سی نگاہ ڈال کر کہی تھی۔ پھر ایک لمحہ رکے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔

وہاں موجود افراد کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب کے دل زور، زور سے دھڑک رہے تھے مگر زبانوں پر قفل پڑے تھے۔ دفعتاً خاور کا چہرہ تمتما اٹھا۔ سانس تیز، تیز چلنے لگی۔ انہوں نے ماں کے پیچھے لپکنا چاہا تھا مگر...... بابر نے سختی کے ساتھ ان کا ہاتھ تھام لیا۔ انہوں نے دو تین دفعہ جانے کے لیے ہاتھ چھڑایا مگر بابر کی گرفت بہت سخت تھی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ مارے، دکھ، خفت، پریشانی اور ہتک کے خیال سے خاور کا چہرہ دھواں، دھواں ہو رہا تھا۔

بابر آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں ماں کی واجب الاحترام ہستی کی اہمیت اور عزت کا احساس دلا رہے تھے لیکن زبان ہر کسی کی بند تھی حتیٰ کہ پھوپی شمسہ بیگم کی بھی۔

خاور مجبوری و بے بسی کی تصویر بنے کھڑے ہونٹ کاٹ رہے تھے۔

☆☆☆

''بس بی بی...... اپنا تو یہی حال ہے روزے میں بغیر زردہ، تمباکو کے جانو دم نکل کر رہ جاتا ہے۔ اب آنکھوں سے یونہی ڈھلکا بہتا رہے گا۔'' پیاری بوا نے ایک لمبی جمائی لی اور آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی کو دوپٹے کے آنچل سے پونچھتے ہوئے بولیں۔

شرمین کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''پیاری دادی...... ! آپ پکوریوں کا سامان یونہی رکھ دیجیے۔ میں دہی بڑوں سے فارغ ہو کر خود ہی بنا لوں گی۔'' وہ دہی بڑوں کے لیے دہی پھینٹتے ہوئے بولی۔

''کام کرتے رہنے سے وقت بھی کٹتا ہے اور ہاتھ پیر بھی چلتے رہتے ہیں۔ یہ سوچ کر آ جاتی ہوں باورچی خانے میں۔ ورنہ تو اللہ رکھے تم بھی کچھ کرتی رہتی ہو۔ ہمارا کیا ہم تو اب بیٹھے، بیٹھے کھانے کے رہ گئے ہیں بیٹا...... اللہ تمہیں سکھی رکھے۔ تمہاری خوشیاں پوری کرے۔'' وہ بیزاری کے عالم میں دوسری جمائی لے کر بولیں۔

''بس آپ تو بات سے بات نکال لیتی ہیں۔ چلیں آپ دادی اماں کے پاس جا کر بیٹھیں۔ وہ اکیلی بیٹھی ہوں گی۔'' شرمین نے شرمندہ ہو کر کہا۔

''اکیلی کہاں ہیں، ان کے پاس خان صاحب کی بیگم آئی بیٹھی ہیں۔'' پیاری بوا نے مسلسل ہاتھ چلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا تو ذکیہ خالہ آئی ہوئی ہیں۔ چلیے اچھا ہے، آج انہیں روزہ افطار کرنے کے لیے روک لیں گے۔'' شرمین نے خوش ہو کر کہا اور مزید تیزی سے کام نمٹانا شروع کر دیا۔ شرمین کی گورنمنٹ نوکری ہو گئی تھی تو اس رمضان، افطار اور سحر کا اہتمام بھی کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ بازار سے بس فرنی ہی آ جاتا ورنہ شرمین، سموسے، چھولے، پکوریاں اور پکوڑے وغیرہ سب کچھ گھر پر ہی تیار کر لیا کرتی تھی۔ ٹیوشن نہ ہونے کی وجہ سے وقت بھی مل جاتا تھا۔ ساتھ میں پیاری بوا بھی اس کا ہاتھ بٹاتی رہتیں۔ ادھر اُدھر

کے چٹکلے سناتی رہتیں یا زور شور سے جمائیاں لیتی رہتی تھیں۔ جب تک شرمین سب کچھ پکا کر فارغ ہوئی، دادی اماں نے ولی اللہ کے ہاتھ پھل کاٹ چھانٹ کر بھجوا دیے۔

اس نے جلدی، جلدی افطاری کی ایک ٹرے تیار کر کے اسے ایک دسترخوان سے ڈھکا اور عبداللہ کو دے کر مسجد روانہ کر دیا پھر ہاتھ خشک کرتی ہوئی باہر آ گئی۔ ذکیہ خالہ، دادی کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔

''السلام علیکم خالہ جان.....'' اس نے ادب سے انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام..... جیتی رہو بیٹی، سدا خوش رہو۔ کیا کر رہی تھی ہماری بچی؟ افطاری کی تیاری میں مشغول تھی؟''

''جی خالہ جان.....'' شرمین نے ادب سے جواب دیا پھر موقع غنیمت جان کر اضافہ کیا۔ ''خالہ جان.....! آج آپ روزہ ہمارے ساتھ افطار کیجیے گا۔''

''ارے، ہاں ذکیہ..... ذرا ہمارا دماغ دیکھو..... ہم بھول ہی گئے یہ بات کہنی۔'' دادی اماں جلدی سے بولیں۔ ذکیہ خالہ ہنسنے لگیں..... ہنستے، ہنستے بولیں۔

''ہم..... روزہ کیا افطار کریں گے..... آج ہمارا روزہ ہی نہیں ہے۔''

''ارے!'' شرمین کی زبان سے بے ساختہ نکلا لیکن دادی اماں بولیں۔

''تو..... کیا حرج ہے۔ روزے داروں کے ساتھ ثواب تو ملے گا ناں۔''

''اور وہ جو..... گھر میں ایک بڑے میاں بیٹھے ہیں وہ کیا کریں گے؟'' ذکیہ خالہ نے مسکرا کر یاد دلایا۔

''ان کو میں افطاری بھجوائے دیتی ہوں۔'' شرمین نے تیزی سے کہا۔

''پگلی! وہ تیرے دلارے خالو ابا افطاری کھاتے ہی کب ہیں؟'' خالہ ذکیہ نے پیار سے اسے ایک ہلکی سی چپت لگائی۔

''اے بیگم..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ بھلا خان صاحب افطاری کیوں نہیں کھاتے؟ کیا دوبارہ سے روزے پر روزہ رکھ لیتے ہیں؟'' پیاری بوا بھی ایک طرف بیٹھی یہ باتیں سن رہی تھیں اور اونگھ رہی تھیں۔ ہڑبڑا کر پوچھنے لگیں۔ سب ہنسنے لگے۔

ذکیہ خالہ ہنس چکیں تو انہیں سمجھا کر کہنے لگیں۔

''پیاری بوا..... وہ روزے پر روزہ نہیں رکھ لیتے ہیں بلکہ کھجور سے روزہ کھولنے کے بعد وہ افطاری کے چکر میں پڑنے کے بجائے سیدھا سادا بس کھانا ہی کھاتے ہیں۔''

''اوہ..... اچھا.....'' پیاری بوا نے سکون کی گہری سانس لی جیسے تفصیل معلوم کر کے انہیں اطمینان حاصل ہو گیا ہو۔ دوبارہ اپنی سٹر پٹر میں الجھ گئیں۔

''تو..... انہیں افطاری پسند نہیں ہو گی۔'' حیرت شرمین کو بھی تھی۔ اس نے پوچھا۔

''بس وہ اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتے۔ کہتے ہیں کہ اس طرح بھوک خراب ہو جاتی ہے۔ ایسے جمعہ کے دن تم نے جو دہی بڑے بھیجے تھے وہ تو خوب مزے لے لے کر کھائے تھے۔'' شرمین اٹھ کر مسکرائی ہوئی اور باورچی خانے میں آ گئی۔ ناشتے دان میں خان صاحب کے لیے دہی بڑے اور دیگر افطاری رکھی اور ذکیہ خالہ کو ناشتے دان تھما دیا۔ انہوں نے منع کیے بغیر رکھ لیا۔

دوبارہ باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ذکیہ خالہ کا آج کا موضوع ان کے نئے کرائے دار تھے۔ جو کسی گاؤں وغیرہ سے آ کر یہاں شہر میں آباد ہوئے تھے اور مذہب سے تعلق تھا مگر خان صاحب نے انہیں بغیر بحث و مباحثے اور گہرائی میں اترے آرام سے اپنا کرائے دار بنانا منظور کر لیا تھا۔ اس زمانے میں ایڈوانس وغیرہ کا بھی کوئی رواج یا جھنجھٹ نہ تھا۔ ماہانہ کرایہ طے کیا اور سامان رکھ کر رہنے لگے۔

''اے ظلم! بھلا ہندو کا ہے کو رکھ لیے خان صاحب نے؟ اے نہ ہمارے دین مذہب کے نہ ریت رسم کے..... نگوڑے مارے اپنی پوجا پاٹ کیا کریں گے گھر کے اندر۔ مٹی کے بھگوانوں کو پرنام کریں گے دن رات۔'' پیاری بوا نے دوبارہ لمبی سی جمائی لی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''ارے بوا..... جب خان صاحب کے من میں سما جائے تو وہ ایسی ویسی کسی بھی بات کو دھیان میں نہیں لاتے۔ آج کے نہیں وہ سدا کے ایسے ہی ہیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ معاملہ بچوں کی تعلیم کا ہے تو پھر انہوں نے ہندو یا عیسائی ۔جھٹ سے مکان کرائے پر دے دیا۔ پڑھنے والے بچوں کی ہمیشہ سے وہ بہت قدر کرتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ بہت شریف اور سیدھے لوگ ہیں اور ہمیں تو کرائے سے مطلب ہے۔''

''ہاں سچ تو کہتے ہیں، وقت پر کرایہ دینے والے ہونے چاہئیں۔'' دادی اماں نے ہاں میں ہاں ملائی اور بولیں۔ ذکیہ خالہ کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی وہ دوبارہ بتانے لگیں۔

''اور..... ان میں کا ایک لڑکا تو بہت ہی لائق فائق ہے۔ دراصل اسی کی وجہ سے ان لوگوں نے جگہ کرائے پر لی ہے۔ وہ لڑکا ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ باپ نے اسے بورڈنگ میں بھیجنا پسند نہیں کیا۔ اس لیے انہوں نے گھر کرائے پر لے لیا۔ ابھی فی الحال ماں ساتھ رہ رہی ہے۔'' پوری بات بتا کر ان کی طبیعت کو قرار آیا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

شرمین اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

پیاری بوا بھی اپنے اسٹور میں جا گھسیں۔

''اے ذکیہ! ذرا اس شرمین کو تو سمجھاؤ کسی دن فرصت سے بیٹھ کر۔ میرا تو ناک میں دم کر ڈالا ہے اس نے۔'' دادی اماں کہنے لگیں۔

''ایسا کیا کر دیا شرمین نے؟ اتنی نیک بخت تو ہے بچی ہماری۔'' ذکیہ خالہ نے تعجب سے پوچھا۔

''اے اس نیک بخت کی فرمائش سنو..... سرکاری اور مستقل نوکری کیا لگی ہے، سمجھ رہی ہے دونوں ہاتھوں سے لٹادوں۔ بھلا میں اس طرح کیسے کرلوں؟ کیا کل کلاں جب اس کا بیاہ کروں گی، اس کے لیے جوڑ توڑ کر کے نہ رکھوں؟ اتنے عرصے سے ٹیوشنیں پڑھا رہی تھی، سب کچھ ہی پر لگنے جارہا تھا۔ اب پھر وہی طریقہ رکھوں؟ نہ بابا یہاں کون کچھ کرنے کو بیٹھا ہے۔ اگر اسی طرح خرچ کرتے رہے تو کنویں بھی خالی ہوجاتے ہیں۔ اس لیے میرا کہنا یہ ہے کہ گھر کے خرچ کو بڑھاؤ نہیں بلکہ پہلے جیسی گزر اوقات کرتے رہو۔'' دادی اماں نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''کچھ بتائیں گی بھی یا مجھے ہولائے ہی جائیں گی؟ آخر ایسا کیا کہہ دیا ہے شرمین نے کہ آپ اتنی پریشان ہورہی ہیں اور پریشان کر بھی رہی ہیں۔'' ذکیہ خالہ نے حیران ہوکر پوچھا۔

''شرمین کی فرمائش بلکہ اصرار ہے کہ گھر کی ضروریات کے لیے ایک عدد فریج خرید لیا جائے۔'' دادی نے قدرے تھم کر انہیں دھیرے، دھیرے آگاہ کیا۔

''اچھا تو یہ بات ہے، آپ نے مجھے سہا ہی ڈالا تھا۔'' ذکیہ خالہ نے رکی ہوئی ایک گہری سانس لی۔ اب ان کے چہرے پر اطمینان کے آثار نمودار ہوئے۔

''ٹھیک کہو، ہے یہ ماننے والی بات..... اللہ بخشے، اسد اللہ کے زمانے کا فریج بہت چلا..... مگر کہاں تک ساتھ دیتا۔ آخر دھیرے، دھیرے ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ہم بھی زندگی کی اس آسائش کو بھول گئے۔ مگر اب چار پیسوں کا آسرا ہوا ہے تو صاحبزادی کو دوبارہ ہری، ہری سوجھنے لگی ہے۔ ذکیہ! ہم کہتے ہیں اسے سمجھا کر جانا۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں، اس نے ایسی

کون سی انہونی بات کہہ ڈالی۔ اچھی لڑکیاں گھر گرہستی کے لیے سوچا ہی کرتی ہیں۔ آپ نے تو لے کے بات کا بتنگڑ بنا ڈالا۔ میں بھی کیا قیامت آگئی ہے۔'' ذکیہ خالہ بے اختیار ہنس کر بولیں۔

''لو بھیا..... یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ تمہارا مطلب ہے کہ اس کا مطالبہ درست ہے؟'' دادی اماں تیوری چڑھا کر بولیں۔

''سو فیصد..... درست ہے۔'' ذکیہ خالہ نے پوری طرح جم کر جواب دیا۔ ''اس زمانے میں ایک عدد فریج ہر گھر کی آسائش نہیں بلکہ ضرورت ہے۔ اگر شرمین نے اس انداز میں سوچ لیا تو کوئی جرم کی بات نہیں کی۔ وہ اس مطالبے میں حق بجانب ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ایک ہم ہی ہیں احمق..... تمہیں نہیں معلوم اپنی جان پر پڑنے والی ذمے داریوں نے ہماری راتوں کی نیند اڑا ڈالی ہے۔ میں بھی خیال ہے کہ جہیز کو جو پیسہ پڑا رہے گا ابھی کے کام آئے گا۔'' وہ نہایت پریشانی میں بولیں۔

''آپ اس قدر ہراساں کیوں ہو رہی ہیں؟ جس مولا نے مسائل دیے ہیں وہی وسائل بھی پیدا کرے گا۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ وہ ہمارے لیے ہم سے زیادہ فکر رکھتا ہے۔ پریشان ہونا چھوڑ دیجیے۔ بس دعاؤں پر تکیہ رکھیے۔ اس رحیم و کریم ذات نے ضرور ان بچوں کی بھلائی کے لیے کچھ سوچ رکھا ہوگا۔'' ذکیہ خالہ نے انہی کو تسلی دی اور ملائمت سے بولیں۔ وہ اسی قدر کہنے پائی تھیں کہ فضا میں گولا چھوٹنے کی آواز ابھری۔

''اے ہے، روزے کا وقت ہوگیا۔'' انہوں نے ہڑبڑا کر کہا اور ناشتے دان اٹھا کر تیزی سے اپنے گھر دوڑیں۔ اس واقعے کو بہ مشکل ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ پھر انہوں نے چکر لگایا۔ اس دفعہ ان کے ساتھ تین بچے بھی تھے۔ شرمین سے مخاطب ہوکر کہنے لگیں۔

''لو بی..... ان بچوں کو پڑھاؤ۔ یہ تمہاری شام کی گھر بیٹھے کی ٹیوشن ہیں۔ بہت اچھے گھرانے کے بچے ہیں۔ تمہاری منہ مانگی فیس دیں گے اور گھر آکر پڑھیں گے۔ بس یہ خیال رکھنا کہ..... ان بچوں کی جو فیس آئے گی وہ تم ہر ماہ مجھے ادا کرو گی۔ میں نے تمہاری کمیٹی ڈال دی ہے۔ دوسری کمیٹی تمہیں مل جائے گی اور اس رقم سے انشاء اللہ تمہارا نیا فریج آجائے گا.....'' پھر وہ دادی اماں کو مخاطب کر کے آگاہ کر گئیں۔

''یہ سب انتظام اللہ کی طرف سے ہوگیا ہے۔ اب آپ کو پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں..... فریج بھی گھر میں آجائے گا اور شرمین کی تنخواہ پر بھی کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ٹھیک ہے..... اب تو آپ خوش ہیں ناں.....؟''

☆☆☆

زندگی ایک نئے اور خوب صورت سنہری دور میں داخل ہو چکی تھی۔ پہلی دفعہ بستی کی رہنے والی لڑکی جھونپڑے سے سفر کرتی ہوئی چار کمروں والے پختہ مکان میں جا پہنچی تھی۔

ریشم بی بی نے کبھی خواب میں بھی ایسی سہانی اور روپہلی زندگی کا تصور نہیں کیا تھا۔ خرم کا اپنا وجود ہی کیا کم خواب آور تھا کہ اس کے ہوش و حواس قائم رہتے۔ اوپر سے سونے پر سہاگا اس کی رہائش اور اس میں زندگی کے تمام نئے لوازمات اور موجودگی.....

سچ تو یہ ہے کہ ریشم کی آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ گئی تھیں۔ مہینوں خرم نے اسے کھانا پکانے نہ دیا۔

خانساماں کے ہوتے ہوئے وہ اسے زحمت کیوں اٹھانے دیتا اور ابھی تو ریشم کے ہاتھوں کی مہندی بھی ماند نہیں پڑی تھی۔ وہ ننھے بچوں کی طرح اس کا خیال رکھتا اور دیکھ بھال کرتا تھا۔ جب وہ بابا کا ذکر کرتی خرم فوراً رحمت بابا سے ملانے لے جاتا۔ بستی کی لڑکیاں بالیاں اس کے خوب صورت ملبوسات دیکھ دیکھ کر حیران ہوتیں۔ اس چاند، سورج کی

جوڑی کو رشک سے تکا کرتیں۔

رحمت بابا دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے۔ اوپر والے نے کس شان سے ان کی دعائیں قبول فرمائی تھیں کہ ان کی بھولی بھالی بیٹی ان کی آنکھوں کے سامنے راج کر رہی تھی۔ خوشیاں اور دلی مسرتیں تھیں کہ ریشم بی بی کو بھر بھر جھولیاں مل رہی تھیں۔ وہ صاف و شفاف ٹھنڈی ٹھار لہروں پر رقصاں تھی۔

گھونگھٹ الٹ کر جو خرم نے اسے سب سے پہلا نذرانہ پیش کیا وہ سیلوں کے ذریعے چلنے والا ایک بڑے سائز کا بہت خوب صورت اور پیارے پیارے نغمے، اگلتا ریڈیو تھا۔

وہ بیچاری حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی رہ گئی تھی۔ اسے بھلا کیا خبر کہ مہینوں پہلے اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ ' ریڈا' خرم کے دل و دماغ پر گویا نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اسی روز سے دن رات اس کی تمنا پوری کرنے کی جستجو میں لگ گیا تھا۔

رخصتی کے بعد وہ تمام رات خرم نے اس سے باتیں کرتے، کرتے گزاری تھی۔ اپنی بے پناہ چاہتوں اور بے قراریوں کی باتیں...... اس کی بے نیازی اور بے خبری کی باتیں...... باتیں! دل موہ لینے والی حسین و دلربا باتیں...... باتیں! اپنے ہجر و فراق اور وصال کی باتیں......

اتنی ڈھیر ساری باتیں، داستانیں اور کہانیاں جو ریشم بی بی نے اپنی اب تک کی زندگی میں کبھی کہی تھیں...... نہ سنی تھیں۔ اپنے لیے خرم کے دل میں موجزن احساسات اور جذبات کی طوفانی برساتوں نے اسے فرطِ حیرت اور سرشاری سے گنگ کر ڈالا تھا۔ اتنی بے شمار محبتیں اور انمٹ چاہتیں کہ اس کی جھولی تنگ پڑتی جا رہی تھی۔

اپنی ساری کیفیتیں بیان کر ڈالنے کے بعد اس کی بے تابیوں کی داستان سننے کے لیے جب خرم نے اصرار کیا۔

''تمہیں...... کبھی تو تنہائی میں میرا خیال ستاتا ہوگا، کوئی بات تو یاد آتی ہوگی! تب کیا حالت ہوتی تھی؟'' تو وہ شرم اور حیا سے اور بھی سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

اور بہت سارے دنوں کے بعد ایک روز خرم کے چوڑے شانوں پر سر رکھے اس نے مدھم، مدھم سُروں میں اس کی پوچھی ہوئی بات کا یوں جواب دیا تھا۔

''اچھے تو آپ...... مجھے بہت لگتے تھے...... جب پہلی مرتبہ مکھن لینے آئے تھے...... اسی روز سے۔ مگر میں...... آپ سے کہتی بھلا کس طرح سے؟ بھلا میرا کوئی آپ سے...... نکاح ہو گیا تھا......؟ جو ایسی باتیں کہنے بتانے بیٹھ جاتی۔ آپ مجھے کس قدر بے حیا سمجھتے...... ہمارے یہاں تو ایسا رواج نہیں ہے، ہماری بستی کی ساری لڑکیاں بس اپنے شوہروں سے ہی محبت کرتی ہیں اور شادی سے پہلے کسی سے ایسی ویسی باتیں بالکل نہیں کرتیں۔ ہماری ساری چاہتیں فقط اپنے شوہر کے لیے مخصوص رہتی ہیں۔'' وہ بہت معصومیت اور سچائی سے حالِ دل بیان کر رہی تھی۔

''جب، جب آپ...... مجھے اچھے لگتے تھے ناں تو آپ کو کیا خبر...... مجھے اللہ میاں سے کتنا ڈر لگتا تھا، میں ہر وقت اللہ میاں سے اپنی اس غلطی پر معافی مانگتی رہتی تھی اسی لیے تو آپ کی طرف جی بھر کر دیکھتی بھی نہیں تھی۔''

''میری ناقص عقل میں یہ راز نہیں آتا کہ وہی احساسات اور جذبات جو اب تمہارے دل میں میرے لیے ہیں آخر شادی سے پہلے تمہیں گناہ گار کس طرح بنا سکتے تھے؟ یہ تو دلوں کے معاملے ہوتے ہیں ناں......'' خرم بے ساختہ ہنس پڑا۔ پھر اسے چھیڑنے کے لیے بولا۔

ریشم نے بڑی سادگی سے مگر مضبوط لہجے میں جواب دیا تھا۔ ''دراصل...... نکاح سے پہلے ان خیالات میں اللہ کی رضامندی شامل نہیں ہوتی اور

جس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل نہ ہو، ہمارے مولوی جی کہتے ہیں وہ گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔"

خرم بڑی دیر تک ہنستا رہا تھا۔ دل ہی دل میں یہاں کے لوگوں کے سادہ مگر صادق جذبوں کا قائل تھا۔ واقعی وہ بھول کر جیسے فرشتوں کی بستی میں چلا آیا تھا اور ریشم بی بی کے روپ میں اسے ایک حور مل گئی تھی۔

جنتِ ارضی کی ایسی پاکیزہ حور جسے پا کر وہ اپنے گھربار، بہن بھائیوں اور ماں تک کو فراموش کیے بیٹھا تھا۔ شادی کے بعد دو تین بار گھر گیا ضرور تھا مگر کام کی زیادتی کا بہانہ کر کے دن ہی دن میں لوٹ آیا تھا۔ کچھ تو گھر میں اپنی شادی کا تذکرہ سنتے اور بھی زیادہ وحشت سوار ہوگئی تھی۔ چنانچہ دو چار الٹے سیدھے بہانے کر کے بھاگ لینے میں عافیت نظر آئی تھی۔ اس کے آگے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ گھر والوں سے وہ اپنی خفیہ شادی کو کہاں تک اور کس طرح پوشیدہ رکھے گا چونکہ اس کے اپنے جی میں چور تھا۔ اس لیے وہ اپنی اماں کے سامنے زیادہ دیر تک ٹکے رہنے کی جرأت بھی نہیں کر سکا۔

☆☆☆

جنگل کی ہری بھری معصوم فضاؤں میں وہ ریشم کی ہمراہی میں رنگ بھرے شب و روز گزار رہا تھا۔ ایک سحر آفرینی سی اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ شہد کی شیرینی میں ڈوبے ہوئے پُرکیف لمحے تھے جو رنگین تتلیوں کے تعاقب میں دوڑتے ہوئے بسر ہو رہے تھے۔ جنگلی پھولوں اور خودرو سبزے کی عطر بیز ہواؤں نے اس کے ہوش و حواس اڑا رکھے تھے۔

کبھی کبھی بستی سے ریشم کی سہیلیاں ہمجولیاں آجاتیں تب تو جنگل میں منگل ہو جاتا۔ بڑے سے گھر میں ان کے قہقہوں اور دلکش چہکاروں کی حسین بارات اتر آتی۔ ایسے میں خرم ان سب کو کھل کر ہنسنے کھیلنے کا موقع فراہم کر کے خود باہر چلا جایا کرتا تھا۔

ریشم کی تمام سہیلیوں میں بسنتی پیش پیش ہوا کرتی تھی۔ وہ تو اکیلی بھی اس کے پاس چلی آتی تھی۔ دونوں گھنٹوں سر جوڑے بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔ بچپن کی ساتھ کھیلی سہیلیاں تھیں دونوں کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ خرم بھی اس امر سے آگاہ تھا۔ ریشم کی سہیلیوں میں بسنتی ہی ایک ایسی سہیلی تھی جو خرم سے بھی بے تکلف تھی۔ دونوں کی آپس میں بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

اپنی سہیلیوں سے خرم کا نرم اور پُر اخلاق سلوک دیکھ، دیکھ کر ریشم کا دل مزید ان کی طرف سے محبتوں کی آماجگاہ بن جاتا۔ وہ کس، کس طرح اس کا مان بڑھاتے اور دل رکھتے تھے۔ وہ خود کو دنیا کی حسین و جمیل اور خوش نصیب ترین لڑکی سمجھنے پر مجبور ہو چکی تھی۔ جس خوش رنگ اور خوش آئند زندگی کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ مجسم اور مکمل ہو کر اس کے سامنے تھی۔ اس حال میں دن پہ دن گزرتے چلے گئے۔ ان دونوں کو وقت کے دبے پاؤں گزرنے کا احساس تک نہیں تھا۔ کوئی دن، کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا کہ خرم نے اس سے اونچی آواز میں بات تک کی ہو۔ وہی پہلے دن کا سا محبوب لہجہ...... وہ رکھ رکھاؤ والی حسین باتیں ان کا رویہ بدلا تھا نہ وہ خود بدلے تھے۔ ریشم تو ان کی ریشم ہی تھی، وہ بابا رحمت سے بھی اسی احترام اور الفت سے پیش آتے۔

ہاں کچھ عرصے بعد یہ ضرور ہوا کہ کبھی، کبھار جب وہ شہر جاتے تو ایک آدھ دن کے بعد ہی گھر واپس آتے تھے۔

اس معاملے میں خرم نے بڑی ملائمت سے ریشم کو سمجھا دیا تھا کہ محکمۂ جنگلات کی طرف سے ان پر سو طرح کی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ جن کی ادائیگی کے لیے ان کا شہر جانا ضروری ہے۔ اس دوران وہ اپنی ایک نابینا آنٹی کے پاس رک جاتے ہیں۔ دنیا بھر میں بس وہی ایک ان کی رشتے دار

ہیں۔ جن کی وہ کبھی کبھار خیر خیریت معلوم کرتے رہتے ہیں۔

ریشم کیا اعتراض کرسکتی تھی۔ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ پھر تو خرم جب بھی شہر کے ارادے سے نکلتے، ریشم ان سے، اجازت لے کر بستی میں اپنے بابا کے پاس چلی جاتی۔ اپنے اسی پرانے جھونپڑے میں جہاں اس کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ ہر گوشہ ننھی ننھی یادوں سے مہک رہا ہوتا۔

وہ پہنچتی تو رحمت بابا کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہتا۔ وہ اسے دیکھ، دیکھ کر جیتے اور خوش ہوتے رہتے تھے۔ وہ اسے، کام کاج کے لیے منع کرتے رہتے مگر وہ ہنستی اور ان کے لاکھ احتجاج کے باوجود بھاگ، بھاگ کر ان کا حقہ تازہ کرتی، روٹی پکاتی، ہانڈی رَیلتی، وہی کنڈوں کی آگ سلگاتی، بکری کا دودھ دھوتی اور جھونپڑے کو اندر باہر سے صاف ستھرا رکھتی۔ بابا کے پرانے دھرانے کپڑوں کی مرمت کرتی اور ان کو دھوتی۔ صرف بکریوں کے ریوڑ کو لے کر جنگل کی طرف جانے کی ہمت نہ کر پاتی تھی وہ۔ ظاہر ہے اب وہ فاریسٹ آفیسر کی بیوی تھی۔ اب اور تب کی زندگی میں بہر حال بہت بڑا تضاد حائل تھا۔

اسی زمانے میں ایک دفعہ خرم شہر گئے تو ہفتے بھر واپس نہ آئے۔ ہول، ہول کر ریشم کی بری حالت ہوگئی۔ مگر بابا مطمئن تھے۔ اسے بار بار سمجھاتے، عقل سکھاتے۔

''ارے بھئی..... مرد بچہ ہے، اور پھر سرکاری نوکری والا..... شہر میں دس کام روک سکتے ہیں اس کو ..... تم گھر میں بیٹھی ہوئی کیا جانو باہر کی ذمے داریاں.....'' مگر ریشم کو کسی طور قرار نہ آتا۔

''خدانخواستہ..... کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو..... کہتے ہیں شہر کی سڑکوں پر بہت ساری موٹر گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ بہت بڑے، بڑے بازار ہوتے ہیں جہاں بہت رش اور شور وغل ہوتا ہے۔ وہاں کے ہنگاموں میں انسان پر کچھ بھی گزر جائے..... میں اتنی دور بیٹھی ہوں، مجھے کیا خبر ہوسکتی ہے بھلا.....'' وہ بار، بار سوچتی..... اس کا دل زور، زور سے دھڑکنے لگتا۔ دن بھر سوچ، سوچ کر سر درد سے پھٹنے لگتا۔ خرم کے شہر جانے کی وجہ سے ریشم، بابا کے پاس آئی ہوئی تھی۔

''ایک ہفتے تک تو وہ شہر میں کبھی نہیں رکے۔''

بابا نے اس سے کہا بھی ''چلو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں جب تک خرم نہیں آجاتے، میں خبر گیری کرلوں گا، خواہ مخواہ میں جھونپڑے کی گرمی اور تکلیف جھیل رہی ہو۔'' مگر وہ خرم کے بغیر جانے پر راضی نہیں ہوئی۔

اس روز بھی کام کاج سے فارغ ہو کر تکیے کا ایک غلاف کاڑھ رہی تھی۔ طبیعت پر بے دلی اور افسردگی طاری تھی۔ وقت کاٹے نہ کٹ رہا تھا۔ صحیح معنوں میں کسی کام میں جی لگ نہیں رہا تھا۔ بابا بکریوں کا ریوڑ لے کر جنگل کی طرف نکل گئے تھے۔

خرم کی غیر موجودگی سے اس کا دل مختلف وہموں کا گڑھ بن چکا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ خرم نے اب تک اس کے ہزار ناز اٹھائے تھے مگر شہر کی ہوا آج تک نہیں لگنے دی تھی۔ وہ انہیں کھوجنے کہاں جاتی۔ کس سے ان کی بابت دریافت کرتی؟ ایسا تو کوئی دور، دور تک نہ تھا۔

اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ریشم نے نظریں اٹھائیں، خرم اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے غلاف پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوبارہ ان کی طرف دیکھنا چاہا مگر ایک دم ہی اس کے اور خرم کے درمیان آنسوؤں کے پردے حائل ہونے لگے۔

''ارے..... ارے..... رے..... رونے کیوں لگیں؟'' خرم نے بڑھ کر اسے اپنے سے لگا لیا۔

''کس نے بارڈیا ہماری جان کو؟'' انہوں نے مذاق میں کہا۔ مگر اشکوں کی برسات بھلا کہاں تھمتی۔

اتنے دنوں کی جدائی نے نیم جان کر ڈالا تھا اُسے تو کیا اب رو کر بھی اظہار نہیں کرتی۔ خرم سب سمجھ رہا تھا مگر کوئی جواز پیش نہیں کر رہا تھا۔ جب وہ خوب رو کر جی کی بھڑاس نکال چکی تو ان کی گرفت سے نکل کر دوبارہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ خرم نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''بابا کہاں ہیں؟ چلو اپنے گھر چلتے ہیں۔''

''بابا باہر ہیں، انہیں آنے تو دیں..... پھر چلتے ہیں، آپ اتنے دنوں سے کہاں تھے؟''

''بس ایک مسئلہ ہو گیا تھا اس لیے.....'' خرم بات ادھوری چھوڑ کر کھلے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سے، بابا ہانپتے کانپتے دوڑے چلے آرہے تھے۔

خرم انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے قریب آکر اسے پیار سے گلے لگایا اور لاٹھی ایک طرف رکھ کے فکرمندی سے پوچھا۔

''ابھی ایک لڑکے نے بتایا کہ تم آگئے ہو، ریوڑ جنگل میں چھوڑ کر چلا آیا۔ تم سناؤ بیٹے اچھے تو رہے؟ خیریت تھی ناں؟''

خرم چند ثانیے گردن نیچے کیے بیٹھا رہا۔ چہرے کے تاثرات خوشگوار نہیں تھے۔ پھر ایک گہری سانس کھینچ کر افسردگی سے بولا۔ ''میری آنٹی..... فوت ہو گئیں۔''

''ہائے میرے اللہ.....'' ریشم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ بابا رحمت کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

ہر دم قہقہوں اور شوخ مسکراہٹوں سے شاد و آباد اور جگمگانے والا ماحول یکلخت گھٹ کر رہ گیا تھا۔

گھر کی کھلی، کھلی خوشگوار فضائیں دم بخود تھیں۔ حیران و پریشان تھیں، سارا سارا دن عجیب سناٹے اور سکوت کا عالم طاری رہتا۔ جس شام نائمہ بیگم نے شرمین کے متعلق عجیب و غریب گل افشانی کی، یہ قصہ اسی روز سے چل رہا تھا۔

گھر میں کوئی فرد ایسا نہیں جسے ایسے اندوہ ناک انکشاف سے صدمہ نہ ہوا ہو۔ سب کے منہ اتر کر رہ گئے تھے۔ ایک فقط نائمہ بیگم کی ہستی وہ شقی القلب ہستی تھی جس پر کسی طرح کا اثر نہیں نظر آرہا تھا۔ سب سے قابلِ رحم حال ڈاکٹر خاور کا ہوا..... اگلے دن جو وہ ڈیوٹی پر گئے تو پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ گھر پر عذر کہلوا بھیجا کہ ایمرجنسی ڈیوٹیز پر تعینات ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ڈیوٹی آف ہونے کے بعد وہ سیدھے اپنے ہاسٹل ایریا والے بنگلے پر چلے گئے تھے۔ دراصل وہ تنہائی میں اس اذیت سے پُر کربناک واقعے پر اچھی طرح غور و فکر کرنا چاہ رہے تھے۔

دل کسی نے ان کا جیسے مٹھی میں بند کر لیا تھا۔ وہ حیران تھے کہ اس تکلیف دہ قصے کو وہ سوچیں بھی تو آخر کس طرح سوچیں..... دل و دماغ میں دکھ کی سیکڑوں کرچیاں ایک ساتھ پیوست ہو گئی تھیں۔ ہر سانس گراں بار لگ رہی تھی۔ وہ شرمین سے بری طرح شرمندہ تھے۔ بار بار تاسف سے ہاتھ مل رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔

''کاش میں نے اس روز جذبات کی رو میں بہہ کر اسے نہ پکارا ہوتا! کیونکہ یہ قصہ ٹھیک اسی دن کا تھا اور اس کے دو روز بعد میں اسلام آباد چلا گیا تھا۔ اُف! وہ میرے لیے اپنے جی میں کیا سوچتی ہوں؟ اور جب اماں جان نے اسے معلوم نہیں کن رکیک الفاظ میں برا بھلا کہا ہوگا تو اس کے دلِ ناتواں پر کیا گزری ہوگی۔ ہم لوگ اس کی نظروں سے کس قدر گر چکے ہوں گے۔ اے کاش! میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا ہوتا تو چند جملوں کے عوض وہ معصوم اس قدر بدنام تو نہ ہوتی۔ اُف! اس تمام رسوائی کا باعث یقیناً میں ہی ہوں۔ میں نے اپنی جلد بازی سے ایک پاکیزہ اور عفت مآب لڑکی کے شفاف کردار پر دھبا لگا ڈالا۔ آہ! اب اس کا

ازالہ کس طرح ہوگا؟ یا رب...... ! میں تو اپنی نظروں میں آپ گر گیا۔ اب کیا ہوگا؟ کس کے روبرو جا کر اپنی صفائی پیش کروں؟'' اسی نوعیت کی مختلف سوچیں تھیں جنہیں سوچ سوچ کر ان کا دماغ شل ہو چکا تھا۔ ہوش وخرد دم بخود تھے۔ وہ اپنے گھر کا راستہ بھول گئے تھے۔ دنیا اور دنیا میں رونما ہونے والے انقلابات سے بے خبر ہوتے جا رہے تھے۔ اسی صورت حال میں دو دن اور دو راتیں گزر گئیں۔ گھر بھر میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔

روبی اور معصومہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ ان دونوں نے پھوپی شمسہ بیگم سے رابطہ کیا...... پھوپی نے بابر کو اپنی طرف بلایا اور پوری صورتِ حال ان پر واضح کی۔

بابر حالات کی ستم ظریفی پر دنگ رہ گئے۔ شربین پر عائد سنگین الزامات اپنی اماں جان کی زبانی انہوں نے بھی بذاتِ خود سنے تھے اور دل ہی دل میں سخت متاسف بھی ہوئے تھے۔ لیکن پھوپی جان کے احساس دلانے پر خاور کی دل شکنی کا احساس انہیں بری طرح تڑپا گیا۔ وہ اسی وقت حرکت میں آگئے۔ اتفاق سے خرم بھی اسی دن ڈیوٹی سے گھر کا چکر لگانے آپہنچا۔ بابر نے باہر کسی پارک میں بیٹھ کر خرم کو تمام واقعے سے آگاہ کیا۔ تمام ماجرا سن کر وہ بیچارہ...... سناٹے میں رہ گیا وہ تو اپنی ہی جرأت اور جسارت پر اندر ہی اندر سہا ہوا تھا اور یہاں دوسرا ہی قصہ نکل آیا تھا۔ بچوں کی ٹیوٹر شربین کو بھی وہ دیکھ چکا تھا۔ اماں جان کے دل آزار رویے سے بابر کی طرح اسے بھی سخت تکلیف پہنچی اور دل شکایات سے لبریز ہو گیا۔

خاور کے دلی کرب کو خرم نے پوری گہرائی کے ساتھ محسوس کیا اور فوراً ہی بابر کے ساتھ اسپتال کی طرف چل دیا۔

خاور اسی وقت ڈیوٹی آف کر کے آئے تھے۔ دونوں بھائیوں کو بیک وقت اپنے سامنے موجود پا کر چپ کے چپ رہ گئے۔

تینوں بھائیوں میں کافی بات چیت ہوتی رہی۔ بابر ہر طرح خاور کو تسلی دینا چاہ رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے مگر انتہائی دکھ کے عالم میں بھی خاور نے اماں کے احترام کو ملحوظِ خاطر رکھا اور یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ شربین کے ساتھ ان کے ناروا سلوک کے جواب میں احتجاجاً گھر نہیں جا رہے ہیں بلکہ یہی کہتے رہے کہ اسپتال میں ایمرجنسی ڈیوٹیز کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں لیکن ان کی اتری ہوئی صورت اور گلابی آنکھیں بابر اور خرم کو بہت کچھ سمجھائے دے رہی تھیں۔

بہ مشکل تمام دونوں بھائیوں نے مل کر انہیں گھر واپسی پر مجبور کیا۔ تاہم وہ بے حد متردد اور فکرمند سے رہنے لگے تھے۔ اسپتال سے آکر اپنے کمرے میں خاموش پڑے رہتے یا چھپ چھپ کر سگریٹ پھونکتے رہتے۔ پہلے کی طرح نہ بہن سے چھیڑ چھاڑ کرتے نہ روبی کو ستاتے...... خرم چند دن اِدھر اُدھر کی کہہ کر انہیں بہلانے کی کوشش کرتا رہا مگر بات محض ہوں، ہاں سے آگے نہ بڑھی۔

نائمہ بیگم اس صورت حال کو اچھی طرح سمجھ رہی تھیں مگر دانستہ بات کو کھولنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے خاور کے رویے کو قطعی کوئی اہمیت نہیں دی تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا ان کا دل سخت سے سخت ترین ہوتا جا رہا تھا۔

اس دفعہ خرم نے اپنی شادی کی تیاریوں کے بارے میں بھی تفصیل سنی اور اس کا دل سینے میں دھڑک، دھڑک کر رہ گیا۔ روبی اور معصومہ نے انہیں سیٹھ رستم علی خان کے متعلق جتنی معلومات ان دونوں کو تھی سے اسے آگاہ کیا تھا۔ چنانچہ گھر سے واپسی پر اس دفعہ خرم کا دماغ بہت اپ سیٹ اور پریشان تھا۔ اس دفعہ ریشم کی طرف پیش قدمی کرتے سے خرم کا دل و دماغ سخت الجھن کا شکار تھے۔ اپنی شادی کے متعلق سن کر ہوش اڑ گئے تھے۔ خاور کے قصے نے مزید اماں کی سخت دلی کا پختہ یقین دلا ڈالا تھا۔

ادھر سب کی الجھنوں اور مسائل سے قطع نظر نائمہ بیگم اپنی ہی سٹر پٹر میں مشغول تھیں۔ انہیں کب کسی کے دلی معاملات کی پروا تھی۔

''شام چھ بجے سیٹھ رستم علی خان کے ہاں چلیں گے، تیار رہیے گا۔'' ایک دوپہر انہوں نے شمسہ بیگم کو کہلوا بھیجا۔ وہ کیا کہتیں؟ چپ چاپ چل دیں۔

شام کے چھ ساڑھے چھ کا وقت ہوگا۔ یہ دونوں کار میں ان کی طرف روانہ ہوئیں۔ کوٹھی دور سے نظر آنے لگی تو شمسہ بیگم بولیں۔

''یہ بات ہے غلط...... تمہیں کم از کم انہیں کہلوا دینا چاہیے تھا کہ ہم آرہے ہیں۔ اچانک بلا اطلاع کہیں جانا بہتر نہیں ہوتا۔''

''ارے کچھ نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیں اچانک دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔'' نائمہ بیگم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ شمسہ بیگم خاموش ہوگئیں۔

قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا...... شام کی سرمئی دھندلکے میں کوٹھی کی بلندی پر سرسراتی، لہراتی پھولوں بھری بیلیں جیسے ان کا بھرپور استقبال کر رہی ہوں۔ پھاٹک پر مسلح چوکیداروں کا پہرہ تھا۔

کار پر نظر پڑتے ہی دو پہرے دار بھاگتے ہوئے آئے اور جھانک کر گاڑی کے اندر نظر دوڑائی۔ معلوم نہیں انہیں کیا دکھائی دیا کہ بغیر پوچھے گچھے جھٹ سے بڑا گیٹ کھلوا دیا۔

اندر پہنچ کر یہ دونوں اتر پڑیں۔ ایک اردلی سر پر پگڑی جماتا، وردی کے بٹن لگاتا، کمر پر سنہرا پٹکا درست کرتا کوٹھی کے عقب سے نکلا...... برساتی میں پہنچا اور کوٹھی کے اندر جانے کا دروازہ کھول کر ایک طرف سے ادب سے کھڑا ہو گیا۔

''کیوں نہ ہم ٹینس کورٹ کی طرف چل دیں۔'' اس وقت وہ لوگ وہیں ہوں گے۔ فرخندہ بیٹی سے بھی روبرو ملاقات ہو جائے گی۔'' نائمہ بیگم نے بے حد فخر محسوس کیا۔ شمسہ بیگم کی طرف دیکھ کر سرگوشی میں بولیں۔ شمسہ بیگم ان کا مسرور لہجہ اور سرشاری دیکھ کر چپ کی چپ رہ گئیں اور نائمہ بیگم مزید کچھ کہے بغیر ایک طرف کو مڑ گئیں۔

اردلی دروازہ بند کر کے دوبارہ کوٹھی کے پیچھے چلا گیا۔ یہ دونوں سرخ بجری کی پختہ سڑک پر ہلکے قدموں سے چلنے لگیں۔ چلتے، چلتے ایک پُر فضا باغ کے کنارے پہنچیں۔ یہاں سے بھی ایک خاصی کشادہ پگڈنڈی اندر کو جا رہی تھی۔ اس پر بھی سرخ بجری بچھی تھی۔ ان کے جوتوں کی رگڑ سے ہلکی، ہلکی آہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

سرِ شام چلنے والی خوب صورت خنک سی ہواؤں کے دلنواز جھونکے انہیں چھوتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ہلکی، ہلکی خنکی جی کو بھلی لگ رہی تھی۔ باغ بہت وسیع تھا۔ جگہ، جگہ رنگا رنگ پھولوں کے تختے ہوا سے جھوم رہے تھے۔ باغ میں بے شمار پھولوں کے جھاڑ، پھلوں اور میووں کے درخت تھے۔ نرم، نرم گھاس کا دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ درمیان سے پتھر کی بنی نہر بہتی ہوئی گزر رہی تھی۔ نہر پر دو بڑے، بڑے فوارے تھے۔ باغ میں ہر طرف مرکری ٹیوبز جل اٹھی تھیں۔ جن میں فواروں سے پھوٹتی پانی کی جھالر پوری طرح جھلملا رہی تھی۔

باغ کے اس پار درختوں، پودوں کی اوٹ سے کوٹھی کی اونچی چہار دیواری سے پہلے نوکروں چاکروں کے کوارٹر نظر آ رہے تھے۔ پگڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ایک بوڑھی عورت پتھر کی بینچ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

یہ دونوں اس کے قریب پہنچیں تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ انہیں دیکھ کر وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور اوپر سے نیچے تک دیکھ کر بولی۔

''کون ہیں آپ؟'' شمسہ بیگم رک گئیں۔ مگر نائمہ بیگم سیدھی چلتی چلی گئیں۔ اس کا اجڑا، اجڑا سا حلیہ دیکھ کر انہوں نے اس کے سوال کا جواب دینا غیر ضروری سمجھا تھا۔

باغ کے ایک حسین و جمیل گوشے میں جہاں چنبیلی سے ڈھکے ہوئے ایک کنج کے نیچے بید کی چند کرسیاں اور میز پڑی تھی۔ مگر وہاں کوئی تھا نہیں..... میز پر ایش ٹرے اور شیشے کا جگ شفاف پانی سے بھرا ہوا اور گلاس رکھے تھے۔ مگر نائمہ بیگم کو ٹینس کورٹ کی تلاش تھی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی بھالتی آگے ہی آگے بڑھتی گئیں۔

کوٹھی نہایت شاندار اور خوب کشادہ تھی۔ جگہ جگہ عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی تھیں اور کھپریلوں کی چھتوں پہ دور تک پھیلی بکھری تھیں۔ یہ کچھ اور آگے بڑھیں۔ اب سرخ بجری کی پگڈنڈی ختم ہو چکی تھی اور راستہ سرخ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ دونوں اطراف میں سایہ دار درخت کھڑے لہرا رہے تھے۔ ایک جگہ اونچے سائبان کے نیچے بجلی پیدا کرنے والا بھاری بھرکم جنریٹر نصب تھا جو اس وقت پُرشور آواز کے ساتھ اسٹارٹ تھا۔ قریب ہی وسیع و عریض باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے کا کشادہ چبوترہ فرش سے کم از کم چار ساڑھے چار فٹ اونچا تھا۔ درمیان تنور اور تنور سے کافی ہٹ کر ایک بڑا سا چولہا تھا۔ کھانا پک رہا تھا، روٹیاں تندور میں لگ رہی تھیں مگر ان دونوں کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ یہ آگے چلتی گئیں۔

اب کنکر کی بنی ہوئی نیم پختہ سڑک آگئی۔ ان دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی دیہات میں آگئی ہوں۔ دور دور کھڑے نیم اور جامن کے درختوں کے نیچے برائے نام روشنی تھی۔ درختوں کے اس پار کھلا میدان نظر آرہا تھا۔

''اے آپا! یہ ہم کہاں آگئے؟ وہ ٹینس کورٹ کہاں رہ گیا؟'' نائمہ بیگم کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ گھبرا کر بولیں۔ شمسہ بیگم کے بھی حواس خطا ہونے لگے۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگیں۔

''شاید ہم راستہ بھول گئے ہیں۔'' انہوں نے مضبوطی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اندازے سے اسی طرف چل دیں۔ جس طرف سے آئی تھیں۔

ان کے دائیں ہاتھ پر دور تک سبزہ زار پھیلا تھا۔ سبزہ زار کے ارد گرد طرح طرح کے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ ڈر اور خوف سے ان دونوں کی گھگھی بندھنے کو تھی۔ چلتے، چلتے شمسہ بیگم متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتیں۔

اچانک ایک موڑ پر وہی بوڑھی عورت انہیں دوبارہ نظر آگئی۔ یہاں جگہ جگہ اونچے، اونچے لکڑی کے کھمبوں پر تیز روشنی کے بلب جل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ عورت تیزی سے قریب آئی۔

''کون ہیں آپ؟ اور یہاں کیوں گھوم رہی ہیں؟'' اس نے ایک دفعہ پھر وہی سوال کیا۔

''ہم یہاں..... مہمان آئے ہیں مگر کوٹھی کے اندر جانے کا راستہ بھول گئے ہیں۔ کیا تم ہمیں..... وہاں تک پہنچا دو گی؟'' شمسہ بیگم اسے دیکھ کر رک گئیں اور ملائمت سے بولیں۔

ابھی وہ عورت ان کے سوال کا جواب دے نہ پائی تھی کہ اچانک دور سے گھوڑے کے دوڑنے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ دونوں گھبرا کر سامنے دیکھنے لگیں۔

اس عورت نے جلدی سے ان کے ہاتھ پکڑے اور تقریباً کھینچتی ہوئی ایک قریبی کوارٹر تک لے گئی اور انہیں اندر کر کے دروازہ بھیڑ دیا۔ بھڑے ہوئے کواڑوں سے یہ لوگ بھی نگاہوں سے باہر جھانکنے لگیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کے جھنڈ سے ایک شہسوار نمودار ہوا وہ گھڑسواری کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں چمڑے کا چابک دبا تھا۔ وہ پیروں سے ایڑ دیتے ہوئے گھوڑے کو دوڑا رہا تھا۔ عقب میں شکاری کتوں کا غول تھا جو زور زور سے بھونک رہے تھے اور گھوڑے کے پیچھے، پیچھے بھاگ رہے تھے۔

''یہ ہے سیٹھ رستم علی خان۔'' جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ عورت ایک گہری سانس لے کر بولی۔

ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے اپنے آپ سے ہمکلام تھی۔ رک رک کر بولنے لگی۔

''سیٹھ رستم علی خان..... میرے اکلوتے بیٹے کا سسر..... ہاں سیٹھ کی بڑی بیٹی میری بہو ہے مگر فقط نام کی بہو..... میرے بیٹے کو ان لوگوں نے گھر داماد بنا لیا ہے۔ مجھے مہینوں اس کی صورت دیکھنے کو نہ ملتی تھی۔ بالآخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں یہیں اس کوٹھی میں آپڑی۔ بڑی مشکل سے رو دھو کر یہ کوارٹر ملا ہے۔ اب کبھی کبھی دور سے اپنے بیٹے کو دیکھ لیتی ہوں۔ آج کل انہیں دوسری بیٹی کے لیے ایک گھر داماد لڑکے کی ضرورت ہے۔ دیکھو کون کا الو پھنستا ہے؟''

نائمہ بیگم نے سختی سے شمسہ بیگم کا بازو تھام لیا۔ وہ سر سے پاؤں تلک تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ حالت شمسہ بیگم کی بھی غیر تھی مگر وہ غیر معمولی حوصلے سے کام لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''بہن! ہمیں راستہ بتا دو، ہم راہ بھول گئے ہیں۔'' نائمہ بیگم نے بڑی لجاجت سے اس عورت کو مخاطب کیا۔

''ہاں چلو۔'' وہ اپنائیت بھرے انداز میں بولی۔

''مگر..... اندر تک نہیں پہنچا سکتی۔ ہاں کوٹھی کے اندر تک جانے والے راستے تک چھوڑ کر آجاؤں گی۔''

''نہیں..... نہیں.....'' نائمہ بیگم نے گھبرا کر لرزتی ہوئی آواز میں کانپ کر کہا۔ ''ہم بھی اندر نہیں جائیں گے۔ تم ہمیں کوٹھی سے باہر نکلنے والے پھاٹک تک پہنچا دو۔''

☆☆☆

دادی اماں کے صحنِ گلشن میں بہاریں اتر آئی تھیں۔ سچ کہا ہے کسی کہنے والے نے کہ اگر سکھ کے دن رخصت ہو جاتے ہیں تو پھر دکھ کے دن بھی سدا نہیں رہتے۔

یعنی کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ سو نانی اماں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ان کی زندگی میں بھی سکھ کے دن آپہنچے تھے۔ وہ خود انتہائی، بردبار اور صابر انسان تھیں۔ ان کی قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ برے دنوں میں کبھی چادر سے بڑھ کر پاؤں نہ پھیلنے دیے تھے۔ تینوں بچوں کو بھی اٹھتے بیٹھتے ایسی ہی چھوٹی، چھوٹی نصیحتیں کیا کرتی تھیں کہ خدانخواستہ انہیں زمانے کی ہوا نہ لگ جائے۔

خدا نے اپنے لطف و کرم سے انہیں کئی چھوٹی، چھوٹی خوشیوں سے نوازا اور ان کے روزی روزگار میں خیر و برکت عطا فرمائی۔ گھر میں اندر سے باہر تک سکون اور آسودگی کی بارش برس گئی۔ مسلسل علاج کی بنا پر ان کی کمر کی تکلیف بھی تقریباً رفع دفع ہو چکی تھی۔ وہ ہر لمحہ ہر گھڑی اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں اور اٹھتے بیٹھتے یہی تلقین شرمین کو بھی کرتی رہتیں۔

شرمین کی گورنمنٹ ملازمت کے بعد ان لوگوں کو بے حد سکون کا احساس ہوا تھا۔ دادی اماں سب میں بھرپور طمانیت کا سبب یہ تھا کہ اب اس کو گھر، گھر جا کر ٹیوشن پڑھانے کی حاجت نہ رہی تھی۔ پھر انہی دنوں ذکیہ خالہ کی کوشش سے ایک آسودہ حال گھرانے کے تین بچے گھر پر ٹیوشن لینے آنے لگے۔

ذکیہ خالہ نے نہایت خوش اسلوبی سے اس ٹیوشن کو ایک کمیٹی میں ضم کر دیا اور اس طرح ایک ماہ کے اندر خان صاحب کے ذریعے سے ایک عدد فریج منگوا کر دے دیا۔ شرمین تو خوشی سے ناچ اٹھی۔ اس کا دل و دماغ، باغ باغ ہو گیا اور ذکیہ خالہ کا یہ احسانِ عظیم سر سے پاؤں تک نہال کر گیا۔ ایسے نیکی اور خوبی کے کام تو کوئی بہت اپنا بھی نہیں کر گزرتا۔ ذکیہ خالہ کی ذات اس چھوٹے سے کنبے کے لیے مثلِ فرشتہ ثابت ہوئی تھی۔ اس نیکی کا اجر انہیں خدا ہی دے سکتا تھا۔

یہ تین بچے گھر میں کیا آئے مزید بچوں کی جیسے

مارش ہوگئی چونکہ شرمین کی تعلیمی قابلیت نہایت قابلِ اطمینان تھی۔ تجربے کی دولت بے بہا تھی۔ چند ماہ کے اندر، اندر اس نے باقاعدہ ٹیوشن سینٹر کھول کر اپنی مدد کے لیے دو ٹیچر بھی رکھ لیں۔ اس نے اڑوس پڑوس کی دو قابل اور محنتی غریب لڑکیاں ہائر کر لی تھیں۔

کہتے ہیں ایک در بند ہو تو ستر در کھل جاتے ہیں۔ یہی شرمین کی تقدیر کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اب اس کا گھرانا ایک، ایک پیسے کی محتاجی نہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے لیے اللہ کی پیش بہا رحمت کا در وا ہوگیا تھا۔

تعلیمی قابلیت کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر اسکول کے ماحول میں بھی اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔

ایک وہ وقت تھا جب کہ اسے نائمہ بیگم نے دھتکار کر اپنے گھر آنے سے منع کیا تھا اور وہ اپنی انسلٹ ہونے کے باوجود، دل کا درد چھپا، چھپا کر یہ سوچنے پر مجبور تھی کہ اتنی بہترین اور پیسوں کے لحاظ سے قیمتی ٹیوشنز چھوٹ جانے کے بعد اب وہ اپنے گھر اور گھر کے دیگر مسائل سے کس طرح نمٹے گی؟ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟ کس، کس کے سامنے دستِ سوال دراز کرے گی؟ کیونکہ کچھ بھی تھا ڈاکٹر خاور کے ہاں کی ٹیوشنز اس کی بہترین کفیل تھیں۔ نائمہ بیگم اس کا محنتانہ کھلے دل اور کھلے ہاتھ سے دینے کی عادی تھیں۔ اس معاملے میں وہ بے حد حوصلہ مند اور مخیّر تھیں۔ اپنی پریشانیوں اور فکرات کا حال وہ اپنی دادی سے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ آس پاس کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ اکیلی تن تنہا ہر طرح کے مصائب سے نبرد آزما تھی۔ تب قدرت کو اس کی بے بسی اور تنہائی پر رحم آ گیا اور خان صاحب کی وساطت سے اس کی مشکلات حل ہوتی چلی گئیں۔

آگے چل کر مزید آسانیوں پر آسانیاں ہوتی چلی گئیں۔ بس آخر میں جو رہ گئی وہ ایک کسک سی رہ گئی۔ ایک انمٹ زخم..... ایک سدا بہار دکھ، اپنی کم مائیگی اور نائمہ بیگم کی زبان سے دیے ہوئے گھاؤ کا..... یہ اس کی زندگی کا ایک ایسا رخ تھا جو اسے ہمیشہ کے لیے ہر کسی کی نگاہ سے چھپا کر رکھنا تھا۔ اس بات کی گواہ فقط وہ خود تھی اور اس کا معصوم دل..... جو گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنا دیا گیا تھا۔

ایسے میں جب، جب ڈاکٹر خاور کی صورت اس کے تصور میں آتی دونوں کے درمیان آنسوؤں کے پردے حائل ہو جاتے۔ وہ حیران ہو ہو کر ان سے پوچھتی۔

”اس..... سارے قصے میں آخر میرا کیا قصور تھا؟“ لیکن دور و نزدیک اسے جواب دینے والا کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ اسی سوچ بچار میں دن پر دن گزرتے چلے گئے۔

اس کی گورنمنٹ سروس ہوگئی۔ اس کا ٹیوشن سینٹر خوب چل نکلا۔ گھر میں ماشاء اللہ خوب فارغ البالی اور خوشحالی کا دور آ گیا۔ اپنی مرضی اور خوشی سے اس نے اندر باہر کئی من پسند تبدیلیاں کر لیں۔ گھر میں نیا صوفہ سیٹ آ گیا۔ باورچی خانے کا سامان اور برتن وغیرہ نئے آ گئے۔ عبداللہ اور ولی اللہ دونوں بہترین اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔

دھیرے، دھیرے ہر طرح کا سکون مل گیا تھا مگر کہیں اندر سے وہ کسی طرح ایک عجیب سے خالی پن کا شکار تھی۔ اندر کی زخمی روح زخمی ہی رہی۔ اپنی مصروف زندگی میں فرصت کا ایک لمحہ بھی اس کے لیے لمحہ فکریہ ہی رہا۔

ایک دن وہ بیٹھی کاپیاں چیک کر رہی تھی۔ اس کی فطرت میں ایک عمدہ پہلو یہ بھی تھا کہ کام کے دوران کسی بھی طرح کی الجھن کا شکار ہونا پسند نہ کرتی تھی۔ اپنا کام نہایت توجہ اور دلجمعی سے کرنے کی عادی تھی۔ چند کاپیاں باقی رہ گئی تھیں کہ ذکیہ خالہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔ قریب آ کر دادی اماں کے پاس بیٹھتی ہوئی بولیں۔

میری امی کی زندگی کا دلچسپ واقعہ

قارئین کرام! جب سے میری ماں مجھ سے بچھڑی ہیں، دل چاہتا ہے انہی کی باتیں ہر دم کرتی رہوں کیونکہ آپ بھی تو میرے اپنے ہیں ناں تو آئیں کچھ باتیں میں ان کی آپ سے شیئر کروں۔

میرے ابو میری امی سے گیارہ سال بڑے تھے اور میرے ابو میری نانی جان کے سگے چچازاد بھائی تھے۔ اس رشتے سے وہ امی کے ماموں ہوتے تھے۔ میرے ابو کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ امی بتاتی تھیں کہ انڈیا میں ان لوگوں کا گھر زنان خانے اور مردان خانے پر مشتمل تھا۔ ان کا تعلق زمیں دار گھرانے سے تھا اور اس کے ساتھ ہی پیری مریدی کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ پیر کی حیثیت سے ان کے دادا کی شہرت دور، دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دور دراز سے لوگ دم درود کے لیے آتے تھے۔ امی نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی عمر اس وقت سات سال کی تھی اور ابو اٹھارہ سال کے تھے جب زنان خانے میں داخل ہوتے تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ابو کے دونوں ہاتھ پکڑ کر جھول جاتی تھی۔ اور یہ گیت گاتی تھی۔

ماموں جی ممانی کیسی پان کھا کے پتوریا جیسی
چوکر کھا کر موٹی ہو گئیں جیسی ماموں جی ممانی کیسی
گھنا چکن کر گریا جیسی ماموں جی ممانی کیسی

تب میں نے ان سے ہنس کر کہا تھا کہ ممانی تو آپ ہی تھیں تو وہ ہنسنے لگیں۔ اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ ان کے ابا کا اصول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ ہم بہن، بھائی ادب

”لیجیے...... یہ کڑھی حاضر ہے، ابھی دوپہر میں ہی تیار ہوئی ہے۔ میں نے کہا تازہ ہی پہنچادوں۔ باسی کڑھی کا کیا مزہ......“ انہوں نے سرپوش سے ڈھکا ہوا ایک پیالہ ان کے حوالے کیا۔

دادی اماں نے ڈھکن کھول کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ماشاء اللہ کیا خوب صورت رنگ ہے۔ ذائقہ بھی اچھا ہوگا۔“ انہوں نے کٹورا پیاری بوا کو تھما دیا۔ وہ کڑھی دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

”میں تو بیگم کڑھی چاول کھاؤں گی۔ آپ کے لیے چپاتی پک جائے گی۔“

”ہاں ٹھیک کہا تم نے...... مجھے تو چپاتی ہی بھاتی ہے، باقی رہے یہ تینوں بہن بھائی...... تو کڑھی ان لوگوں کو بھی پسند آتی ہے......“ پیاری بوا کی بات کا دادی نے جواب دیا۔ شرمین مسکرانے لگی۔

”بس...... اپنی اپنی پسند کی بات ہے، آج تو کرائے دار عورت نے بھی مانگ کر کڑھی کھائی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ”بڑی سندر پکائی تم نے۔“ ذکیہ خالہ بولیں۔ شرمین کو ہنسی آگئی۔

”خالہ جان، کسی روز سندر سا گوشت پکا کر کھلاؤ اس کو۔“ شرارت سے بولی۔

”اے ہٹ۔“ وہ بھی ہنسنے لگیں۔ ”بھلا ہندو کبھی گوشت کھائیں گے؟ اور وہ بھی کسی مسلمان کے ہاتھ کا؟“ نانی اماں بھی ہنسنے لگیں۔

”حد کرتی ہو تم لوگ بھی مذاق اڑانے کی۔“ شرمین کاپیاں اکٹھی کر کے اٹھنے لگی تو خالہ کو کچھ یاد آگیا۔

”اے بیٹی...... ! ایک بات پوچھنی ہے تم سے، ذرا سوچ کر جواب دینا۔“ انہوں نے اسے روکتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”پوچھیے خالہ جان! کیا پوچھ رہی ہیں؟“ شرمین نے اٹھنے کا ارادہ ترک کردیا اور ادب سے پوچھا۔ انہوں نے دادی اماں سے پان لے کر منہ میں رکھا پھر رازداری سے پوچھا۔

کے دائرے میں رہتے ہوئے ان سے بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے یعنی امی سے سوال کیا کہ آپس کی شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ امی نے کہا کہ مجھے تو بالکل پسند نہیں ہے۔ ابا نے پوچھا کہ کیوں؟ امی نے جواب دیا کہ ”گر میاں، بیوی میں اختلاف اور جھگڑے ہوں تو اپنے سگے رشتے دار بھی چھوٹ جاتے ہیں۔ اُن کے ابا، امی کی بات سے متفق ہوئے اور کہا۔ ”یہ بات تو ہے۔“ امی نے مجھے بتایا انہیں آپس کی شادی پسند نہیں تھی پھر بھی ان کی شادی آپس میں ہی کر دی گئی..... میں نے امی سے پوچھا۔ ”کیا آپ کو ابو پسند نہیں..... تھے؟“ وہ بولیں اگر پسند نہیں ہوتے تو یہ شادی بھلا ہوتی؟ ہمارے گھرانے میں لڑکیوں سے بھی ان کی مرضی لی جاتی تھی تو میں نے شرارتی لہجے میں کہا کہ نانی جان نے آپ سے رائے لی ہوگی تو آپ نے کہا ہوگا کہ ہاں مجھے تو بہت پسند ہیں۔ تو امی ہنسنے لگیں اور بولیں وہ زمانہ بہت شرم و حیا کا زمانہ تھا۔ لڑکیوں کا اپنی شادی کے ذکر سے ہی شرم سے چہرہ لال ہو جایا کرتا تھا۔ میں نے نظریں نیچی کر کے بہت دھیمی آواز میں کہا تھا کہ آپ لوگوں کی جو مرضی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس طرح یہ شادی انجام پا گئی تھی۔ میری امی ابو کی ہر بات مانتی تھیں ان کی مرضی کے خلاف کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ امی، ابو کو یہ اشعار اکثر سناتی تھیں۔

جو جینے کو کہا تو جی گئے ہم — جو مرنے کو کہا تو مچل گئے ہم

اب اس کے سوا اور کیا چاہیے تو — تیرے اشاروں پر تو چل گئے ہم

میرے ابو یہ اشعار سن کر بہت ہنستے تھے۔

تحریر: سیدہ رفیعہ ابدالی، کراچی

”جو لڑکیاں..... ذرا بڑی عمر کی ہو جائیں تو کیا..... وہ پڑھ سکتی ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ انہیں پڑھنا آ جائے گا؟“

ان کا الجھا، الجھا سا سوال شرمین کے سر سے گزر گیا۔ وہ پوری طرح ان کا مدعا سمجھ نہ سکی۔ الجھ کر دریافت کیا۔

”خالہ جان! آپ کی بات کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”یعنی..... میرا مطلب تعلیم سے ہے، جیسے تمہارے پاس بچے پڑھتے ہیں اگر کوئی زیادہ عمر کا ہو جائے تو وہ بھی پڑھ سکے گا؟“ وہ سمجھا، سمجھا کر کہنے لگیں۔

”کیوں نہیں.....“ شرمین نے فوراً جواب دیا۔ ”تعلیم کے حصول کا شوق ہونا چاہیے۔ عمر راہ میں رکاوٹ تھوڑی بنے گی۔ کوشش اور شوق سے ہر مشکل دور ہو سکتی ہے۔“

”اللہ تمہارا بھلا کرے۔ بس یہی پوچھنا چاہ رہی تھی میں۔ دراصل کسی نے مجھ سے یہ سوال پوچھنے کے لیے اصرار کیا ہے۔ اب تمہارا جواب میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ میں انہیں جا سناؤں گی۔“ ذکیہ خالہ خوش ہو کر بولیں۔

دادی اماں خوب بڑی دلچسپی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھیں، اب انہوں نے بھی دخل دیا اور تجسس سے پوچھا۔

”آخر تم سے کس نے یہ سوال پوچھا ہے؟ کھل کر کیوں نہیں بتا دیتیں..... کہیں خود تمہارا ہی دل تو نہیں چاہ رہا پڑھنے کا؟“

”اے میری توبہ آپا..... آپ بھی بال کی کھال نکالنے بیٹھ گئیں۔ ایک جان فضیحتے میں پڑ گئی میری..... اب اگر پوری بات نہ بتاؤں گی تو آپ سب لوگ ایک کشمکش اور جستجو میں پڑے رہیں گے۔ چلیں سنیے.....“ وہ بے ساختہ ہنس پڑیں اور ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

''نہیں خالہ جان..... رہنے دیجیے۔ دادی اماں تو یونہی کہہ رہی تھیں۔ آپ جب مناسب سمجھیے گا بتائیے گا۔ ورنہ نہیں۔'' شرمین ان کی ہچکچاہٹ بھانپ کر بولی۔

''نہیں، ایسی کوئی شرط والی بات بھی نہیں ہے۔ بتا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے بیٹی کہ ہمارے جو کرائے دار ہیں نا ان کے ہاں گاؤں سے ایک اچھی خاصی عمر کی لڑکی آئی ہوئی ہے۔ وہ اوپر سے یہاں بچوں کا آنا جانا دیکھتی رہتی ہے، اسے پڑھنے کا بہت شوق ہے اسی کی بات کی ہے میں نے۔''

''وہ بالکل پڑھ سکتی ہے خالہ جان، اگر کسی وجہ سے وہ بچپن میں نہیں پڑھ سکی لیکن پڑھنے کا شوق اس کے اندر ہے تو عمر سے کیا فرق پڑے گا؟ بلکہ وہ زیادہ جلدی پڑھ جائے گی۔'' شرمین نے ایک بار پھر انہیں اطمینان دلایا۔

''لیکن ایک بات ہے بیٹا..... اس بیچاری کو شرم بہت آئے گی اب اتنی بڑی ہو کر داخلہ لیتے ہوئے۔ اسکول میں تو چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔ سبھی ہنسی اڑائیں گے۔ اسی لیے اس نے آپ سے مشورہ رائے لینے کا سوچا ہوگا۔'' پیاری بوا بڑے دانشمندانہ انداز میں کہنے لگیں۔

''بوا آپ کتنی دور کی کوڑی لائیں۔'' خالہ نے کہا۔

''نہیں پیاری دادی، اس طرح سے نہیں کہتے۔ تعلیم ایسا زیور ہے جو عمر کے ہر حصے میں خوب سے خوب تر دکھائی دیتا ہے۔ یہ تو سیکھنے والے کے جذبے اور شوق پر منحصر ہے۔ بات شرمندہ ہونے کی نہیں بلکہ عزت کی ہے۔ یہ تو بہت قدر دانی کی بات ہے کہ وہ بڑی ہونے کے بعد یعنی جب بھی اسے موقع ملا وہ پڑھنا چاہ رہی ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی کرنا بہت ضروری ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ ثواب کا کام ہے۔ اگر اس نے مجھ سے پڑھنا پسند کیا تو میں اسے بلا معاوضہ پڑھاؤں گی۔''

شرمین بول رہی تھی اور دادی اماں کے چہرے پر فخر کے آثار تھے۔

☆☆☆

رات کافی بیت چکی تھی۔ مگر وہ دونوں میاں، بیوی اب تک جاگ رہے تھے۔ معلوم نہیں کیسے اور کیوں.....؟ خرم کے منہ سے اس کی کسی فرضی آنٹی کے انتقال کا نکل تو گیا تھا مگر اب کہہ کر پھنس.... گیا تھا۔ سچ کہا کسی نے ایک جھوٹ کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ یہی خرم کے ساتھ ہوا تھا۔

پہلے رحمت بابا سے تعزیت کے کلمات سنتا رہا۔ اب بیوی کو تسلیاں دینی پڑ رہی تھیں۔ ریشم بار بار بھر آنے والی آنکھوں کو پونچھ رہی تھی اور اپنے الفاظ میں شوہر کو تسلی، دلاسہ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

چھت پر چلنے والا پنکھا گھوں، گھوں کر رہا تھا مگر کمرے میں گھٹن اور حبس کا احساس ہو رہا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں خرم کا چہرہ بہت تھکا تھکا اور رنگت اڑی، اڑی سی لگ رہی تھی۔ وہ حقیقت میں پریشان تھا۔

ریشم ایک غمخوار اور ہمدرد بیوی کی طرح ان کی دلجوئی میں شام سے ہی بہت مصروف تھی اور خود بھی آنٹی کے لیے روئے جا رہی تھی۔ اس وقت بھی مزید کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو دوڑی، دوڑی گئی اور تیل کی شیشی اٹھا لائی اور بے حد محبت سے اصرار کرنے لگی۔

''دکھ اور صدمے سے آپ کی نیند اڑ گئی ہے۔ معلوم نہیں کتنے وقتوں سے سوئے نہیں ہوں گے۔ آپ کے سر میں تیل ڈالتی ہوں۔ مالش سے نیند آ جائے گی۔''

''ارے..... نہیں بھئی۔'' خرم نے تیل کی شیشی اس سے چھین کر رکھ دی اور اسے قریب بٹھا کر بولا۔

''آج اتنے دنوں کے بعد تمہارا قرب ملا ہے اور تم ہو کہ سلا دینے کے چکر میں ہو..... دیکھو، اب تم

بھی اس لئے زحمت نہ دی۔ آنٹی بیچاری تو یونہی بہت تکلیف میں تھیں۔ بہت سالوں سے تو آنکھوں سے نابینا ہو چکی تھیں۔ بیمار بھی بہت زیادہ تھیں۔ مجھے تو اس بات کا بہت افسوس ہے کہ بیچاری مرتے وقت مجھ سے کچھ کہہ بھی نہیں پائیں۔“

”ہائے......“ ریشم نے آنسو روکنے کے لیے آنچل کا کونہ منہ میں ٹھونس لیا۔ مگر خرم اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی دھن میں کہے چلا گیا تھا۔

”آخر وقت تک وہ مجھے یاد کرتی رہیں۔ مگر میں ان سے غافل...... یہاں تمہارے پاس مگن رہا۔ وہ تو اتفاق سے ہی محلے کے کسی کام سے شہر گیا تو ان کی طرف بھی چلا گیا۔ جب ان کا آخری وقت آ چکا تھا۔“ ریشم نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا۔

”اور آپ نے مجھے ملوایا تک نہیں...... آخر آپ کے رشتے سے میرا بھی کوئی فرض تھا یا نہیں؟ دیکھنے والے کیا سوچتے ہوں گے؟“

”تمہارا کیا فرض تھا بھلا؟“ خرم نے پھیکی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔

”میں ان کی خدمت کرتی...... ان کی پیار بھری دعائیں لیتی۔“ ریشم نے سیدھے سادے انداز میں جواب دیا۔

”ارے انہیں خدمت گاروں کی کیا کمی تھی۔“ خرم ہنس پڑا۔

”کیوں......؟“ وہ حیران رہ گئی۔

”آپ ہی تو کہتے ہیں کہ آپ کا اور آنٹی کا ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں تھا۔“

”اوہ...... ہاں......“ خرم سنبھل کر بولے۔

”یہ حقیقت بھی ہے، خدمت گاروں سے میرا مطلب ان کے نوکروں سے ہے۔ آخر وہ ایک بڑی جائداد کی مالک تھیں۔ انہوں نے میری پرورش کی۔ روپیہ پیسہ ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا اور جہاں پیسہ ہو وہاں ایک کام کے لیے دس ملازم مل جاتے ہیں۔ اب دیکھو......! میں تو شادی کے بعد مستقل یہیں رہتا تھا ان کا خیال بھلا کون رکھتا تھا۔“ خرم نے بغور اسے دیکھ کر پوچھا۔ پھر ایک ہاتھ سے اس کا سر ہلا کر کہا۔ ”پگلی...... اس دنیا کا یہی دستور ہے کہ...... پیسہ پھینک تماشا دیکھ......“

”لیکن...... پیسے سے انسان سچی خوشیاں نہیں خرید سکتا۔“ ریشم نے بڑی دانشمندی سے کہا۔

”سچی خوشیاں...... بھئی کون سی ہوتی ہیں؟“ خرم نے بحث کرنے کے انداز میں پوچھا۔

”سچی خوشیاں یہی کہ نوکروں کے بجائے اگر کوئی ان کی حقیقی اولاد ہوتی اور ان کی خدمت کرتی وہ بھی اتنی بیمار نہ ہوتیں......“ وہ بھی آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔ جھٹ بولی۔

”بس یہی اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی۔“ خرم نے بات مختصر کرنی چاہی۔ اولاد ان کی تھی ہی نہیں...... شوہر مدت پہلے ایک اچھی جائداد ان کے نام چھوڑ گئے تھے۔ یہی ان کی زندگی تھی۔“

”اگر دیکھا جائے تو انہوں نے آپ کو ہی اپنی اولاد سمجھ لیا تھا۔ مگر افسوس کہ آپ نے بھی ان کا حق ادا نہیں کیا۔“ ریشم نے افسوس کے لہجے میں کہا۔

”حق ادا نہیں کیا...... شادی سے پہلے میں انہی کے پاس رہتا تھا پھر یوں ہوا کہ تمہارے پاس رہنے لگا۔“ خرم کو پہلی بار اس کی صاف گوئی کھلی تھی اور سنبھل کر جواب دیا۔

”خیر......“ ریشم نے اسی لہجے میں کہا۔ ”شادی کر لینے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اپنوں کو چھوڑ دیا جائے یا خدانخواستہ ان کو فراموش کر دیا جائے۔“

”کس نے فراموش کر دیا؟ کس نے کس کو چھوڑ دیا بھئی۔“ خرم نے خود کو نارمل رکھنے کے لیے سگریٹ سلگا لیا۔

”میں برابر جاتا رہتا تھا اور ان کی خیر خبر رکھتا تھا۔“

''مگر مجھے تو کبھی نہیں لے کر گئے۔'' ریشم نے موقع دیکھ کر مشورہ کیا۔

''یہ آج تم...... کیسی باتیں کرنے لگیں ریشم؟'' خرم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بات نکلی تو میں نے کہہ دیا۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''اگر آپ کو برا لگا تو میں اپنا گلہ واپس لیتی ہوں۔ میرا مقصد آپ کا دل دکھانا تو نہیں تھا۔'' اتنا کہہ کر وہ تھمی پھر بولتی چلی گئی۔ ''شہر جانے کا مجھے خود ہی شوق نہیں ہے۔ میں نے دنیا کے رسم و رواج کے مطابق کہا ہے کہ واقعی اگر آپ نے مجھے آنٹی سے ملوایا ہوتا تو میں ان کی خدمت کرتی اور اتنی خدمت کرتی کہ وہ سارے دکھ، درد بھول جاتیں۔ میں اپنی خدمت سے انہیں بتاتی کہ ایک اچھی بہو کس طرح اپنا فرض پورا کرتی ہے اور بیمار ساس کے کس طرح کام آتی ہے۔'' شاید ریشم بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر الفاظ نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ خاموش ہو کر اپنے ہونٹ چبانے لگی۔

خرم اسے دلچسپ نگاہوں سے تک رہا تھا۔ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔

''بولو، بولو...... تم خاموش کیوں ہو گئیں؟ اب تو تمہارے پاس بہت خوب صورت الفاظ کا ذخیرہ آ گیا ہے۔ تمہاری یہ خوبی آج معلوم ہوئی ہے۔''

''آپ...... میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔'' ریشم نے شکایتی نظروں سے دیکھ کر جواب دیا۔

''ارے...... میری توبہ......'' وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جلتی ہوئی سگریٹ ایش ٹرے میں پھینکی۔ دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ کر وہیں بستر پر مرغا بننے کی کوشش کرنے لگا۔ ریشم کے ہونٹوں سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا۔

کافی دیر کے بعد جب وہ گہری نیند سو چکی تھی تو خرم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کی نیند اڑ چکی تھی۔ کافی تھکاوٹ کا شکار ہونے کے باوجود نت نئی سوچوں کی یلغار نے اسے دماغی طور پر الجھا کر رکھ دیا تھا۔ محض اپنی غیر حاضری کی وجہ بتانے کے لیے اس نے ایک عدد فرضی آنٹی کو مار ڈالا تھا۔ اب اسے حالات کی ستم ظریفی پر ہنسی بھی آ رہی تھی اور اپنی کم ہمتی پر شرمسار بھی۔

کتنے افسوس کی بات تھی کہ وہ صحیح صورتِ حال سے گھر والوں کو آگاہ کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا اور نہ ہی ریشم کو اعتماد میں لے سکتا تھا۔ جب اسے بابر بھائی نے خاور بھائی کا مسئلہ بتایا تو محسوس ہوا تھا جیسے وہ اور خاور بھائی دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہوں۔ تب بار بار اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی صورت دل کڑا کر کے، بابر بھائی سے اپنا مسئلہ بھی بیان کر ڈالے مگر باوجود کوشش کے عمل پیرا نہ ہو سکا۔

اور اس وقت تو اس کا دل حلق میں اٹکا تھا جب خاور نے اس سے کہا۔

''خرم! میرا جی چاہ رہا تھا کہ چند دنوں کے لیے تمہارے پاس...... ریسٹ ہاؤس چلا جاؤں تاکہ شکار وغیرہ میں دل بہل جائے مگر اسپتال سے چھٹی نہ مل سکی۔''

اب خرم کو اپنے چاروں طرف خطرے کی گھنٹیاں سنائی دے رہی تھیں اور وہ سخت بے چینی میں مبتلا ہو کر رہ گیا تھا۔

ساون رت آتے ہی جنگل میں منگل ہو گیا۔ ادھر شدید گرمی اور حبس کا زور ٹوٹا ادھر بستی بھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ چرند پرند انسان حیوان ایک نئی امنگ اور جوش و ولولہ محسوس کرنے لگے۔

اکثر شام ڈھلے ریشم، خرم کے ہمراہ باہر گھومنے چلی جاتی۔ جنگل کی آزاد اور کھلی، کھلی فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے اسے عجیب سی لافانی خوشی اور سرمستی کا سا احساس ہوتا۔

ایسا لگتا جیسے بچپن کے ماہ و سال واپس لوٹ

آئے ہوں۔۔ ایسے موقع پر اس کی اور بسنتی کی ہمراہی ضروری ہوا کرتی تھی۔ بہت بچپن میں تو اپنی ہمجولیوں اور سہیلیوں کے ساتھ گھل مل کر کھیلا ہی کرتی تھیں مگر اس گہری اور انمٹ دوستی کا ایک حصہ وہ بھی تھا۔ جو صرف ان دونوں سہیلیوں کے بیچ ہی پروان چڑھا تھا۔ جس میں ہندو مسلم کا کوئی تضاد یا تفرقہ حائل نہیں تھا۔ دونوں جنگل کی کھلی اور آزاد فضاؤں میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے میلوں گھوم آیا کرتیں۔ اب بسنتی کی جگہ اکثر خرم ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ بسنتی اور ان کی دوستی کی قدر خود خرم بھی تہ دل سے کرتے اور کبھی روک ٹوک نہ کی تھی۔

گو کہ بسنتی کی معیت میں یہاں کا چپا چپا ریشم کا دیکھا بھالا تھا مگر خرم کے سنگ، سنگ تو لمحات خوش رنگ، تتلیوں کا روپ دھار لیتے۔ مقام نیا اور ہر بات اچھوتی محسوس ہوتی تھی۔ بعض اوقات دونوں گھنٹوں جنگل کے ہر گوشے میں پیڑوں کے جھنڈ اور پودوں کے سائے تلے گھومتے رہتے اور ڈھیروں باتیں کرتے نہ تھکتے۔

اس سرمئی پڑتی شام میں بھی دونوں دیر تک ہاتھ میں ہاتھ دیے ہری بھری پگڈنڈیوں پر گھومتے رہے۔ خوشیاں، پرندوں کے گیت اور بلند و بالا پیڑوں کی سائیں، سائیں بہت بھلی لگ رہی تھی۔

ماحول میں سبزے کی مخصوص مہک رچی بسی تھی۔ بارشوں کی کثرت سے جگہ جگہ گھاس میں جنگلی پھولوں کے رنگ برنگے بکھرے دمک رہے تھے۔ بیری کی جھاڑیاں چھوٹے، چھوٹے سرخ بیروں کے بوجھ سے جھکی پڑ رہی تھیں اور ایک دلفریب منظر پیش کر رہی تھیں۔ پتے، پتے سے برسات کی بہاریں پھوٹ پڑی تھیں۔ پیڑ پودے ننھی منی حسین و جمیل بوٹوں اور ہریالی کونپلوں سے بھرے پڑے تھے۔ پتوں میں چھپی کوئل نے فضاؤں میں میٹھا، میٹھا رس گھول رکھا تھا۔

دونوں گھومتے پھرتے ندی تک آ نکلے۔

آج یہ لوگ کافی دنوں کے بعد سیر کو نکلے تھے۔ خلاف معمول خرم چپ، چپ سا تھا۔ تاہم ریشم کی بات میں گہری دلچسپی لینے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اندر ہی اندر اپنی اماں جان کی اپنی شادی سے متعلق کوششوں کا تصور اس کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ ریشم کی بھولی بھالی صورت اور من موہنی باتوں سے جدائی کا محض تصور ہی اسے اپنی موت نظر آ رہا تھا۔

ندیا کنارے جامن کے اونچے، اونچے پیڑ لگے تھے جو اس وقت رس بھری جامنوں سے بھرے پڑے تھے۔ کچھ جامنیں پانی کے بہاؤ کے ساتھ، ساتھ بہتی جا رہی تھیں۔ ہنستی کھلکھلاتی ریشم ان کے تعاقب میں چل پڑی۔ خرم بھی ٹہلتے ہوئے اس کے پیچھے چلا جا رہا تھا مگر اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ کسی دوسری سوچ میں گم تھا۔

اچانک ریشم کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ نگاہیں ندی کے دوسرے کنارے، کنارے دور تک لہراتے گلیارے پر لگی ہوئی تھیں۔ جس پر گھریلو سامان سے لدی ہوئی ایک بیل گاڑی ڈھمک، ڈھمک کرتی آگے ہی آگے چلی جا رہی تھی۔ گاڑی بان کے برابر میں چاچا موہن داس پگڑی باندھے بیٹھے تھے۔ ”یہ کہاں جا رہے ہیں؟“ ریشم نے حیرانی سے پوچھا۔

”تمہیں نہیں معلوم یہ شہر شفٹ ہو رہے ہیں۔“ خرم نے فوراً ہی جواب دیا۔

☆☆☆

نائمہ بیگم کی کوٹھی آج کل سناٹوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک گہرا سکوت تھا جو ہر دل اور ہر زبان پر چھا گیا تھا۔

ڈاکٹر خاور بھی بالکل خاموش ہو کر رہ گئے تھے۔ اسپتال سے آکر سارا دن اپنے کمرے میں پڑے رہتے۔ پہلے کی طرح نہ بہن، بھائیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے نہ سب کے درمیان آکر بیٹھتے تھے۔

شرمین کے ہٹائے جانے سے سب سے زیادہ متفکر روبی اور معصومہ تھیں۔ وہ دونوں ہی خاور کے دل کا حال رتی رتی جانتی تھیں۔ جس دن سے نائمہ بیگم نے خود اپنی زبان سے اقرار کیا تھا کہ شرمین کو انہوں نے خود آنے سے منع کیا ہے، ان دونوں کا صدمے سے برا حال تھا مگر افسوس کہ کچھ بنائے نہیں بن رہا تھا۔

اس سلسلے میں بابر بھی کم فکر مند نہیں تھے وہ بھی ہر بات سے آگاہ تھے مگر اس معاملے میں وہ بھی بے بس اور لاچار تھے۔ ماں کے آگے کوئی زبان کھولنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ مگر نائمہ بیگم کو کسی کے احساسات کی پروا ہی کہاں تھی۔ ان کے دل کو تو صرف رستم علی خان کے ہاں جانے کی لگن لگی رہتی تھی۔ چنانچہ ایک دن انہوں نے یہ شوق پورا کرلیا اور شمسہ بیگم کو لے کر ان کے ہاں جا پہنچیں۔

مگر وہاں سے وہ عجیب ہی حال میں واپس آئی تھیں۔

اسی رات انہیں سردی دے کر وہ جاڑا بخار چڑھا کہ سارا گھر ہل کر رہ گیا۔ بخار کی شدت میں انہوں نے رات بھر ہذیان بکا۔ شمسہ بیگم رات بھر ان کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں۔ گھر بھر میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سب پریشان ہوا ٹھے تھے۔ دو تین دن یہی حال رہا۔ تب کہیں جا کر ان کا بخار ٹوٹا تو سب کی جان میں جان آئی۔

اب گھر میں مزید گہری خاموشی کا دور دورہ تھا۔ اماں جان کی طبیعت خرابی کے دوران ڈاکٹر خاور نے پوری طرح مستعد ہو کر ان کی تیمارداری کی تھی۔ دن رات خبر گیری رکھتے رہے مگر جیسے ہی ان کا بخار ٹوٹا...... خاور دوبارہ دور، دور ہو گئے تھے۔

شمسہ بیگم، ہاوج کی خرابی طبیعت کو سمجھ تو رہی تھیں لیکن کوئی تبصرہ کرنے سے گریزاں تھیں۔ اول تو گھر میں بچوں کے سوا کوئی تھا بھی نہیں۔ رستم علی خان کے ہاں جو کچھ ان دونوں پر گزری تھی۔ وہ کس سے کہتیں؟ خود نائمہ بیگم تو علیل ہو کر رہ گئی تھیں۔

کس طرح لرزاں اور خیزاں وہ دونوں واپس آئی تھیں یہ تو خود ان کا دل گردہ جانتا تھا۔ اگر وہ بھلی مانس انہیں نہ ٹکراتی اور کسی نہ کسی طرح انہیں بیرونی گیٹ تک نہ پہنچاتی تو خبر نہیں یہ کہاں، کہاں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتیں۔ انہیں شدید حیرت تو اس بات پر تھی کہ کسی نے ان پر توجہ ہی نہیں دی تھی اور گھر کے اصل مکینوں کو تو شاید معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ دونوں آئیں اور آ کر چلی بھی گئیں۔ یا پھر ممکن ہے وہ لوگ گھر پر ہی موجود ہی نہیں ہوں کیونکہ نائمہ بیگم بغیر اطلاع کے بھی تو گئی تھیں۔

بہرکیف، جو کچھ تھا اب اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے حق میں بہتر ہو گیا۔ ورنہ جس قدر یہ خائف ہو چکی تھیں سامنا ہونے پر بھی نا معلوم اونٹ کس کروٹ بیٹھتا اور ملاقات کا کیا نتیجہ نکلتا؟

اس حرماں نصیب عورت کا خیال آتا تو شمسہ بیگم کو بھی ایک بار تو جھرجھری سی آ جاتی تھی۔ جس نے خود کو سیٹھ رستم علی خان کی سمدھن بتایا تھا۔ اس کا بیان اگرچہ ناقابل یقین تھا تو گہرائی سے غور کرنے پر جھوٹ بھی نہیں لگتا تھا۔ ظاہر ہے وہ تو ان دونوں کو جانتی تھی نہ ان کے ارادے سے واقف تھی جو کچھ ہوا تھا وہ ایک حسن اتفاق کا مرہون منت تھا۔

کافی دن انہی خاموشیوں کی نذر ہو گئے۔ اس دن کے بعد سے اصغری نے بھی کوئی چکر نہ لگایا تھا نہ ہی نائمہ بیگم نے دوبارہ اسے اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ شمسہ بیگم بغور حالات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ایک روز جبکہ سب لوگ اپنی، اپنی مصروفیات میں مگن تھے، نائمہ بیگم خالی الذہنی کے انداز میں لیٹی تھیں، شمسہ بیگم نے سرسری انداز سے پوچھا۔

''اے دلہن! اصغری بہت دن سے نہیں آئی، وہی خیر خبر لایا کرتی تھی رستم علی خان کے ہاں کی،

معلوم نہیں کیا حال ہیں ان کے؟''
''اصغری، اصغری تو آئے بھی نہ یہاں۔''
مارے غصے کے، اچانک ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ لال پیلی ہو کر بولیں۔
''اگر یہاں آئی تو مارے جوتوں کے فرش کر ڈالوں گی کمبخت کا۔'' رد عمل بہت شدید تھا۔ شمسہ بیگم بغور ان کا جلالی چہرہ دیکھنے لگیں۔
''ہم کہتے ہیں آپا اگر کبھی وہ آئے بھی تو ہاتھ پکڑ کر باہر کر دیے گا۔'' وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔
اچانک ایسی بھی کیا راندۂ درگاہ ہو گئی وہ؟''
اب شمسہ بیگم نے زبان کھولی، سنجیدگی سے پوچھا۔
نائمہ بیگم یکلخت خاموش ہو گئیں۔ یوں محسوس ہوا گویا یہ سب کچھ ان سے بے اختیاری میں سرزد ہوا ہو۔
مگر آج تو خدا، خدا کر کے ان کی چپ ٹوٹی تھی۔ شمسہ بیگم نے موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہیر پھیر کر اسی موضوع کو زیر بحث رکھا۔ بالآخر وہ کھل ہی گئیں اور زچ ہو کر کہنے لگیں۔
''آپا! جو کچھ ہوا، اس دن آپ بھی تو ساتھ تھیں۔ جو کچھ ہم پر گزری کیا وہ آپ کے لیے بھی قابلِ برداشت تھا؟''
پھر سارا واقعہ یاد کر کے ان کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔ آج انہوں نے اپنی کیفیت چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔
''خاص طور پر اس عورت کے کردار کو آپ کیا کہیں گی، جس نے آخر تک ہمارا ساتھ دیا اگر وہ ہمیں باہر کے گیٹ تک راستہ نہ دکھاتی تو شاید ہم وہاں کی منحوس اور خوفناک بھول بھلیوں میں بھٹک، بھٹک کر ختم ہو چکتے اور ہمارے گھر میں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو پاتی۔ خدا کی پناہ آج بھی اس رات کو یاد کرتی ہوں تو خدا گواہ ہے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جان سوکھ کر رہ جاتی ہے۔ آپ سچ سچ بتائیں۔'' وہ ان کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگیں۔
''آخر میں جب ہم اس عورت کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے تو بھلا چلا جا رہا تھا؟ یوں نہیں لگ رہا تھا کہ پاؤں رکھ کہیں رہے ہیں پڑ کہیں رہا ہے۔''
''اب ان باتوں سے کیا فائدہ..... ویسے تم زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہو۔'' شمسہ بیگم مسکرا کر بولیں۔
''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' وہ ناراض ہو کر بولیں۔ ''میں تو ساری زندگی اس تجربے کو بھول نہیں سکتی اور ایسے ظالم لوگ کہ ایک غریب ماں سے اس کا جیتا جاگتا جوان جہان بیٹا چھین لیا۔ کہیں دنیا میں ایسی لوٹ مار سنی ہے آپ نے؟ میں تو اس ماں کی بپتا سن کر دنگ رہ گئی۔ اب بھی راتوں کو خوف سے کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ آپا! وہ ہی لڑکا ہو گا جو پہلی ملاقات میں ہم نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا تھا۔ رستم علی خان کی دونوں لڑکیوں کے ساتھ۔''
''ہاں، ہاں وہی تو ہو گا۔'' شمسہ بیگم نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''مگر تم کیوں ان بے فائدہ باتوں کو لیے بیٹھی ہو؟ چھوڑو، کوئی ڈھنگ کی بات کرو، دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔''
''اور ان رستم علی خان کو دیکھا؟ آپ اعتراف کریں یا نہ کریں مگر وہ لوگ دوسرے ہی ٹائپ کے ہیں۔'' نائمہ بیگم نے ان کے سمجھانے کو قابلِ غور سمجھے بغیر کہا۔ شمسہ بیگم نے بغور دریافت کیا۔
''لیکن..... تم نے کیا سوچا ہے؟ اب کس دن چلو گی ان کی کوٹھی پر؟''
''آپ بھی کیسی باتیں کر رہی ہیں۔'' نائمہ بیگم کو جیسے کسی نے ڈنک مار دیا۔ اچھل کر بولیں۔ پھر اچانک بات بدل کر پوچھنے لگیں۔
''آپا! متین بھائی کب آئیں گے زمینوں سے؟''
''شاید کل آئیں گے۔ کیوں خیریت؟'' شمسہ بیگم ان کے اچانک پٹڑی سے اتر جانے پر حیرت زدہ ہو کر بولیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں مطمئن ہو کر

جواب دیا۔

"بس پھر...... کل کی کل دیکھی جائے گی۔" اس روز تو بظاہر یہ بات ختم ہوگئی۔ شمسہ بیگم کسی نتیجے تک نہ پہنچ پائیں اور تمام گفتگو ادھوری کی ادھوری رہ گئی۔

مگر دوسرے دن تمام گرہیں کھل گئیں۔ دس بجے کے قریب، متین احمد اپنی کوٹھی پہنچے، ایک دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد حسب دستور نائمہ بیگم کی طرف آئے۔ انہوں نے پکڑ کر وہیں بٹھالیا۔ شمسہ بیگم بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ تینوں کے درمیان ایک طویل مشاورت کا آغاز ہوا۔ نائمہ بیگم نے ان دونوں میاں، بیوی کے سامنے اپنے دلی منشا ظاہر کردی۔ وہ متین احمد کو مخاطب کرکے صاف گوئی سے بولیں۔

"جو بات میں آپ سے کہنے جا رہی ہوں۔ اس پر کئی دنوں سے غور کررہی ہوں، آپ یہ مت سمجھیے گا کہ بلا سوچے سمجھے کہہ رہی ہوں بلکہ میری دلی خواہش ہے کہ جتنی جلد ہوسکے، آپ مجھے میری امانت دے دیجیے۔ یعنی یہ کہ اب میں بابر کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔" یہ دونوں میاں، بیوی بھونچکے رہ گئے۔

"بھابی صاحبہ! یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟ کیا خرم کا اور خاور کا رشتہ طے کرلیا؟ ابھی چند ماہ قبل تو آپ کا اصرار تھا کہ دو شادیاں ایک ساتھ ہوں گی؟" متین احمد ہکلا کر بولے۔

"ٹھیک فرمایا آپ نے، مجھے اپنا اس وقت کا اصرار خوب یاد ہے مگر اس وقت کے اور آج کے حالات میں بہت فرق ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ میں خرم کے لیے لڑکی تلاش کرنے کا دم خم باقی نہیں رہا۔ اس لیے بہتر ہے ایک ہی شادی ہوتے دیں۔" نائمہ بیگم نے ایک گہری سانس بھر کر کہا۔

متین احمد جو بڑی سنجیدگی کے عالم میں ان کا بیان سن رہے تھے ان کا آخری جملہ سن کر ہنس پڑے۔ انہیں ہنستا دیکھ کر شمسہ بیگم بھی مسکرانے لگیں۔ ان دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر نائمہ بیگم خجل ہوگئیں۔

"کیوں، ایسا میں نے کون سا لطیفہ سنا ڈالا؟" وہ خجل ہوکر بولیں۔ متین احمد ہنسی روک کر بولے۔

"لطیفہ ہی ہوگیا، آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں گویا شادی ہم نے روک رکھی ہے۔ پہلے بھی کہا تھا آج بھی کہہ رہے ہیں، روبی آپ کی امانت ہے جب جی چاہے رخصت کروالائیں۔"

نائمہ بیگم کے متفکر چہرے پر خوشی کی سرخی چھا گئی۔ اب وہ نند کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"کیوں آپا کوئی اعتراض تو نہیں آپ کو؟"

"اے مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا؟ میں خوش، میرا خدا خوش مگر تمہارے اچانک فیصلے کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک ہی کیوں، اللہ رکھے دو بیٹوں کو تو نمٹاؤ۔" انہوں نے فوراً مسکرا کر جواب دیا۔

"دو کو کہاں سے نمٹاؤں؟" نائمہ بیگم نے بیچارگی سے جواب دیا۔

"اب تو میں نے یہ پکا عہد کرلیا ہے کہ سب میں پہلے فقط اور فقط بابر کی شادی ہوگی۔ اللہ رکھے جب ان کی دلہن اس گھر کے آنگن میں آ اترے گی تو وہ خود ہی آپ کے اور معصومہ کے ساتھ مل جل کر خرم اور خاور کے لیے دلہنیں تلاش کرلے گی۔ اس طرح سے اب نئی ترتیب یوں بنی کہ......" انہوں نے گم صم بیٹھے نندوئی کو ذہن نشین کروایا۔

"پہلے بابر کی شادی ہوگی بعد میں خرم اور خاور کی ایک ساتھ ہوگی۔ آخر میں سب بھائی مل کر معصومہ کو نمٹائیں گے۔ بس یہ میرا فیصلہ بھی ہے اور خواہش بھی۔ خوب اچھی طرح سن لیجیے۔"

متین احمد اور شمسہ بیگم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں پھر مسکرا دیے جیسے نائمہ بیگم کا فیصلہ اور خواہش دونوں ہی ان کے لیے قابلِ احترام ہوں۔ برابر کے کمرے میں کھڑی معصومہ تیزی سے نکل کر روبی کی طرف دوڑی۔

(باقی آئندہ)



اگر کوئی اپنا ہوتا

خولہ بنت حوا

''ہونہہ...... بہو بیگم کی حرکتیں تو دیکھو ذرا......
ہر چیز برباد کر کے رکھ دیتی ہیں...... میاں کی کمائی کا
کوئی درد ہی نہیں۔ ایک ہم ہی ہیں کہ ٹوک ٹوک کر
بُرے بنتے جاتے ہیں لیکن بہو پر مجال ہے کہ کوئی اثر
ہو جائے۔'' اصغری بیگم غصے سے بڑبڑائیں اُن کی
آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ کمرے میں بیٹھی نائلہ تک پہنچ
گئی جو پہلے ہی بہ مشکل تمام اپنے آنسوؤں پر ضبط
کے پہرے بٹھائے ہوئے تھی لیکن کب تک......؟
آخر آنکھوں کے پیمان چھلک ہی پڑے اور وہ بے
آواز روتی چلی گئی۔

واقعہ کچھ ایسا بڑا اور برا بھی نہیں ہوا تھا۔ نائلہ
نے صبح ناشتا وغیرہ بنایا اور تینوں نے ہی ایک ساتھ کیا

تھا یعنی نائلہ، اس کا شوہر بشیر اور ساس اصغری بیگم۔ بشیر کے جانے کے بعد نائلہ نے برتن سمیٹے اور گھر کی صفائی کے بعد جیسے ہی برتن دھونے لگی تو گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گر کر ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا، ساس صاحبہ کے مزاج حد درجہ بگڑ گئے۔ نتیجتاً نائلہ کو سارا دن اس واقعے کے حوالے سے طعن طعن سننا پڑی۔ وہ سوچتی ہی رہ گئی کہ گلاس آخر کتنا قیمتی تھا کہ جس کے ٹوٹنے کی قیمت ایک انسان کے دل کو بار بار ٹھیس پہنچا کر وصول کی جا رہی تھی...... وہ اتنی افسردہ بھی نہ ہوتی اگر کبھی اس کی غلطی نظر انداز بھی کر دی جاتی...... وہ تو ویسے ہی پھونک پھونک کے قدم رکھتی تھی۔ پرسوں ہی کی بات تھی ساس کا سفید دوپٹا نیل دیتے ہوئے زیادہ نیلا ہو گیا بس، پھر تو صلواتوں کی بوچھاڑ تھی جبکہ اس نے فوراً ہی اسے تیز گرم بلیچ ملے پانی سے نکال کر دوبارہ پھیلا دیا تھا اور وہ ٹھیک بھی ہو گیا تھا مگر اس کے لیے درگزر اور کوئی معافی نہیں تھی۔

☆☆☆

''اے ہے...... بشیر میاں تم اپنی بیوی کو سمجھاتے کیوں نہیں...... روز ہی کچھ نہ کچھ نقصان کر کے رکھ دیتی ہے۔'' اصغری بیگم نے بیٹے کی دفتر سے واپسی پر اس کے تازہ دم ہونے تک بہ مشکل ضبط کیا اور جوں ہی وہ چائے کا کپ لے کر ان کے سامنے بیٹھا انہوں نے جھٹ اسے گھیرا۔

''کیوں خیریت، کیا ہوا...... کیا کر دیا نائلہ نے؟'' بشیر نے سپ لینے کا ارادہ ترک کر کے کپ منہ سے ہٹایا اور کچھ اچنبھے سے ماں سے استفسار کیا۔

''ارے، کیا کر دیا...... وہی کر دیا جو آئے دن کرتی رہتی ہے۔ آج پھر ایک گلاس توڑ دیا لے کے۔'' انہوں نے مبالغہ آرائی کی حد پار کی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ نائلہ روز ہی کچھ نہ کچھ توڑ ڈالتی تھی ہاں البتہ اس ایک ہفتے میں لگاتار ٹوٹنے والی پلیٹ اور پھر گلاس نے اس کے کھاتے میں اس جرم کو وزنی کر دیا تھا۔ اور دوپٹے والا جرم الگ تھا۔ بشیر نے بیوی کی طرف دیکھا جو پشیمانی سے ہاتھ ملنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہونٹ بھی کاٹ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے پر نائلہ نے بھی اسے دیکھا تو بشیر نے آنکھوں کے اشارے سے اسے تسلی دی اور پھر ماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کوئی بات نہیں اماں...... غلطی آخر انسان سے ہی تو ہوتی ہے۔ ایک گلاس ٹوٹا ہے خدانخواستہ کوئی بڑا نقصان تو نہیں ہوا ناں...... میں اسے سمجھا دوں گا آئندہ احتیاط کرے گی انشاء اللہ...... اب کوئی شکایت نہیں ہوگی آپ کو۔'' اس نے ماں کے ہاتھ کو پکڑ کر تھپتھپایا۔

''ارے، رہنے دو میاں...... تم کیا سمجھاؤ گے اسے، زبان تک تو کھلتی نہیں اس کے آگے اور انسان آخر ہم بھی ہیں، ہم سے تو نہ ہوئیں اس طرح دھڑا دھڑ غلطیاں...... یہ بڑے نقصان کی بھی تم نے خوب کہی یعنی جب تک کوئی بڑا نقصان نہ ہو بندہ احتیاط ہی نہ کرے۔'' وہ نہایت ناگواری سے کہہ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے بھئی مرضی تم لوگوں کی...... اگر میرا ٹوکنا تمہیں ناگوار گزرتا ہے تو آئندہ نہیں بولوں گی۔ ویسے بھی میں تو اب بوڑھی ہو گئی ہوں آخری وقت ہے۔ اللہ، اللہ کروں نا کہ تم لوگوں کو پریشان کروں...... جاؤ بھئی جو تمہاری مرضی، ہم کون ہوتے ہیں بولنے والے۔'' اصغری بیگم نے اک جھٹکے سے اپنا ہاتھ بیٹے سے چھڑا کر مسلسل بولتے ہوئے کمرے کی راہ لی۔

بشیر اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھ کر سوچنے لگا اگر یہی غلطی فاطمہ (بہن) سے ہوئی ہوتی تو بھی امی کیا اسی طرح کے ردعمل کا اظہار کرتیں، فوراً ہی دل کی طرف سے جواب آیا نہیں...... کیونکہ شرط صرف سگے رشتے کی ہے۔

"ستو عزہ، کل تایا اور تائی آرہے ہیں باقاعدہ تمہارا رشتہ لے کر۔" ریشم نے اسے پانی کا گلاس تھمایا اسے لگا گویا جیسے زہر کا پیالہ پینے کے لیے دے دیا ہو۔ ہاتھ کچھ ایسے لرزا کہ سارا پانی چھلک کر کپڑوں پر گر گیا۔

"ہائے نہیں ریشم، یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" اس ے، سفید پڑتے چہرے کے ساتھ کہا۔

"اُفوہ تم تو ایسے پریشان ہو رہی ہو جیسے وہ رشتہ ے، کر نہیں بلکہ خودکش بمبار لے کر آرہے ہیں ہمارا گھر

ناولٹ

بابل تیری دہلیز پر

رضوانہ پرنس

اڑانے کے لیے۔" ریشم نے کچھ حیرت سے اس کی بوکھلاہٹ کو دیکھا۔ ویسے بھی وہ نوٹ کر رہی تھی کہ کچھ دنوں سے عروہ بہت الجھی، الجھی سی رہنے لگی ہے۔ دادی سے بھی کئی بار اس کی کھٹ پٹ ہو چکی تھی ورنہ اس سے پہلے، وہ ان کی روک ٹوک اور بلاوجہ کی ڈانٹ ڈپٹ برداشت کر لیتی تھی۔ بلکہ ریشم کو بھی دادی سے بحث کرنے سے روکا کرتی تھی لیکن اب تو جیسے روز بروز اس کی چڑچڑاہٹ میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

"پلیز ریشم تم امی سے کہہ دو مجھے ناظر سے شادی نہیں کرنی......" عروہ نے بہت ملتجی نظروں سے ریشم کی جانب دیکھا تو اسے ایک دم سے جیسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"کیوں نہیں کرنی تمہیں ناظر بھائی سے شادی؟" اس نے کھوجتی ہوئی نظروں سے عروہ کو گھورا۔

"میری اپنی بھی کوئی پسند ناپسند ہے۔ میں اپنی زندگی جینا چاہتی ہوں۔ دادی اور امی کی دی ہوئی زندگی نہیں۔" اس کے لہجے میں چھپی ہوئی بغاوت نے ریشم کے دل کو دہلا دیا۔

"عروہ یہ بات تم بہت عرصے سے جانتی تھیں کہ تایا اور تائی تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ ناظر بھائی کی پسندیدگی بھی تمہاری نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ امی اور دادی بھی کتنی مطمئن......"

"اُفوہ ریشم، تم سب کے خیالات اور احساسات بیان کیے جا رہی ہو۔ کیسی بہن ہو، میرے دل میں کیوں نہیں جھانکتیں تم!" عروہ نے خفگی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے طعنہ دیا تو ریشم بھڑک ہی تو اٹھی۔

"جب تایا ابو تمہیں اپنی بہو کہہ کر بلاتے تھے، تائی تمہیں اپنے گھر کی رونق کہتی تھیں، ناظر بھائی کے آنے پر حیا کے خوب صورت رنگ اپنے چہرے پر بکھرا کر تم ان سے ملتی تھیں تو کوئی پاگل بھی یہ سمجھ سکتا تھا کہ تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔"

ریشم کی بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔ اسے ایک ماہ پہلے تک واقعی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ خاص طور پر ناظر کی جاب دبئی میں لگ جانے کے بعد وہ اس بات پر خوش بھی تھی کہ اب اس کی جان اس چھوٹے سے گھر اور دادی کی تلخ باتوں سے چھوٹ جائے گی اور وہ دبئی جیسی خوب صورت جگہ پر جا کر ایک بہت رنگین اور حسین زندگی گزارے گی ورنہ ناظر سے اسے کبھی وہ دلی تعلق نہیں محسوس ہوا تھا جو شایان سے ملنے کے بعد اس کے دل میں جاگا تھا۔ اب اس نے جانا تھا کہ محبت جسے اپنا آپ بخش دیتی ہے پھر اسے کسی اور چیز کی طلب نہیں رہتی اگر کوئی آرزو ہوتی ہے تو صرف یہ کہ اپنے محبوب کے نام اپنا ہر جذبہ، اپنی ہر خوشی، اپنے آنسو، اپنی مسکراہٹیں کر کے اس کی محبتوں کی چھاؤں میں ساری زندگی گزار دے۔

شایان سے اس کی پہلی ملاقات اپنی دوست ردا کی شادی میں ہوئی تھی۔ شایان دولہا کے بہت قریبی دوستوں میں سے تھا۔ شادی کی مختلف تقریبات میں دونوں کا آمنا سامنا ہوتا رہا۔ نوک جھوک کب محبت کے خوب صورت احساس میں ڈھلی عروہ کو پتا ہی نہیں چلا۔ اور شایان بنا اجازت اس کے دل میں جذبوں کی تمام تر شدتوں کے ساتھ جلوہ افروز ہو گیا۔ ردا کے ولیمے کا دن اپنی تمام تر جگمگاہٹ کے باوجود عروہ کو اپنے اندر ایک اداسی سی سمیٹے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔ شایان سے آج شاید اس کی آخری ملاقات تھی۔ ولیمے کے بعد ردا اور اشعر کل ہنی مون کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ ورنہ شاید پھر بھی کوئی موقع مل جاتا شایان کو دیکھنے کا اور اس سے ملنے کا...... سب کتنے خوش اور مگن نظر آ رہے تھے۔ بس ایک وہ ہی تھی جو کسی کی جدائی کا دکھ اپنے دل میں بسائے کچھ بھی انجوائے نہیں کر رہی تھی۔ اور وہ بے مہر بھی اس کے احساسات سے بے خبر اپنے دوستوں میں گھرا قہقہے لگا رہا تھا۔ عروہ کو شایان سے گلہ محسوس ہونے لگا۔ اس نے تو کہیں پڑھا تھا کہ محبت اپنی شدتیں خود بیان کر دیتی ہے۔ اس کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لب بے شک خاموش رہیں لیکن دوسرا خود ہی اس خوب صورت...... احساس کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کر لیتا ہے۔

محبت کی نہیں جاتی بلکہ محسوس کی جاتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں اس سے خفا ہونے لگی۔ آنکھوں میں آتی آنسوؤں کی جھلملاہٹ کو چھپانے کے لیے اس نے بے اختیار اپنا چہرہ جھکا لیا۔ تبھی کوئی بہت آہستگی سے اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''سیف یہ دن تو قیامت کی طرح گزر رہا ہے
جانے کیا بات تھی ہر بات پہ رونا آیا''

شایان نے آہستہ سے یہ شعر پڑھا تھا۔ عروہ نے بے اختیار چونک کر سر اٹھایا تو اسے پُرشوق نگاہوں سے اپنی طرف تکتا پا کر نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں دوبارہ بھر آئیں۔

''دیکھیں عروہ پلیز آپ کے یہ آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔ میں بہت دیر سے آپ کی اداسی نوٹ کر رہا ہوں۔'' اس کے لہجے میں اپنے لیے فکر اور پریشانی محسوس کر کے اس نے خفگی سے شایان کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں بھی اپنے دوستوں میں اتنا چہک رہے تھے۔ آپ کے قہقہوں کی آواز مجھے یہاں تک آ رہی تھی۔'' اس کا تپا ہوا لہجہ محسوس کر کے وہ بے ساختہ ہنس دیا اور جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر بہت خاموشی سے اس کی کرسی کے پیچھے پر رکھ دیا۔

''اس میں میرا سیل نمبر ہے۔ میں رات کو آپ کی کال کا انتظار کروں گا۔ بہت ضروری بات کرنی ہے مجھے آپ سے۔'' وہ عجلت میں کہتا ہوا کھڑا ہو گیا کیونکہ اس کے دوست اسے معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے آوازیں دے رہے تھے۔

☆☆☆

اس رات فون پر ان دونوں نے ڈھیر ساری باتیں کی تھیں۔ شایان نے اسے بتایا تھا کہ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ رہتا ہے اور بھابی اس کی شادی اپنی بہن شیفا سے کرنا چاہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ راضی بھی ہو جاتا لیکن عروہ سے ملنے کے بعد اسے ایسا لگا جیسے اسے ہمیشہ سے اسی کی تلاش تھی۔ زندگی اسی کے نام سے شروع ہو کر اسی کے نام پر ختم ہوتی محسوس ہونے لگی ہے۔ عروہ کو اس کی باتیں جیسے کسی اور خوب صورت دنیا میں لے جا رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ بس وقت یہیں تھم جائے۔ پتا نہیں کتنی رات بیت چکی تھی ان دونوں کو کچھ خبر نہیں تھی۔ شایان تو اپنے بھائی اور بھابی کو اگلے دن رشتہ مانگنے کے لیے بھیجنا چاہ رہا تھا لیکن عروہ نے اسے روک دیا۔

''نہیں شایان، پہلے مجھے امی سے بات کر لینے دیجیے۔ اصل میں میرا رشتہ میرے تایا کے بیٹے سے کافی عرصے پہلے ہی طے ہو چکا ہے اور......''

''اوہو تو آپ اپنے تایا کے بیٹے سے منسوب ہیں۔ یہ بات آپ کو مجھے پہلے بتا دینی چاہیے تھی ناں......'' شایان نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ ''آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے عروہ...... ناحق میرے دل نے اتنے ڈھیر سارے خواب میری آنکھوں میں سجا ڈالے۔'' شایان کے لہجے میں شکستگی کے ساتھ ساتھ خفگی بھی جھلک رہی تھی۔

''نہیں نہیں شایان، میں ناظر بھائی سے منسوب نہیں ہوں اور نہ ہی ہمارے درمیان کوئی دلی تعلق ہے۔ بس تایا نے باتوں باتوں میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اسی خواہش کو خود بخود ایک رشتہ تسلیم کر لیا گیا۔'' عروہ کے صفائی دینے پر شایان نے اطمینان کی گہری سانس لی۔

''اس کا مطلب ہے ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ مجھے بھی بھابی کو منانے کی جدوجہد کرنی ہے کیونکہ وہ بھی شاید دل ہی دل میں مجھے دیور کے ساتھ ساتھ بہنوئی بھی تسلیم کر چکی ہیں۔'' اس کی بات پر عروہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔ پھر شایان کی خواہش پر وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں بھی ملی تھی جہاں دونوں نے اپنے مستقبل کے حوالے سے ڈھیر ساری باتیں کی تھیں اور آج ہی تو اس نے شایان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ امی سے حتمی بات کر کے شایان کو رشتہ بھیجنے کا گرین سگنل دے دے گی۔ وہ بہت ہمت کر کے امی کے کمرے کی طرف گئی تو وہاں دادی کو براجمان دیکھ کر

کچھ الجھ سی گئی۔

''آؤ، آؤ عروہ میرا بچہ، ہم تمہاری ہی بات کررہے تھے۔'' دادی نے بہت پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے نزدیک بٹھالیا۔ آج ان کا موڈ کچھ زیادہ ہی اچھا تھا ورنہ عموماً تو وہ جلتے توے پر بیٹھی نظر آتی تھیں۔ وہ بادلِ ناخواستہ بیٹھ تو گئی لیکن اس وقت اسے دادی کی یہاں موجودگی بہت گراں گزر رہی تھی لیکن پھر بھی دادی کے اگلے جملے نے جیسے اس کے ہوش ہی اڑا دیے تھے۔

''تمہارا نکاح ہے پرسوں میرا بچہ...... ارے میرے تو ہاتھ پیر پھولے جارہے ہیں۔''

''جی...... ؟'' اس نے بے حد شاکڈ ہوکر اپنی ماں کی جانب دیکھا۔ زرین نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں ابھی، ابھی آفاق بھائی کا فون آیا ہے۔ اچانک ہی کچھ دیر پہلے ناظر نے انہیں سرپرائز دیا۔ وہ آفس کے کسی کام سے آیا ہے۔ آفاق بھائی کہہ رہے تھے کہ رشتہ لانے کی فارمیلٹی کے بجائے وہ پرسوں نکاح رکھنا چاہ رہے ہیں۔ وہ لوگ اسی سلسلے میں بس آتے ہی ہوں گے تاکہ سارا پروگرام طے کرسکیں۔''

''زرین کے لہجے میں ایکسائٹمنٹ تھی لیکن اس کے تو جیسے ہوش اڑے جارہے تھے۔

''آپ بھی کمال کرتی ہیں امی...... ایسا تو میں اپنی گڑیا کی شادی پر کیا کرتی تھی جو آپ میرے ساتھ کررہی ہیں۔'' اس کے لہجے میں چھپا شدید احتجاج دونوں کو چونکا گیا۔

''ارے، تو ابھی صرف نکاح ہی تو ہورہا ہے۔ کون سا تمہاری رخصتی کیے دے رہے ہیں ہم لوگ...... وہ بھی اس لیے کہ ناظر تمہارے پیپرز وغیرہ تیار کراسکے۔'' دادی نے اس کے احتجاج کو یکسر مسترد کردیا۔

اس نے بہت بے بسی سے ماں کو دیکھا جو دادی کی طرف متوجہ ہوکر ان سے شام کے مینیو کے بارے میں کچھ پوچھ رہی تھیں۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ جہاں ریشم وارڈ روب میں منہ گھسائے نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ عروہ کے چہرے کے تاثرات کو اس نے دیکھا ہی نہیں۔

''عروہ تمہاری ڈیٹ فکس ہونے والے دن میں یہ پنک سوٹ پہن لوں؟'' وہ سوٹ ہاتھ میں لیے اس کی طرف پلٹی تو اس کا ہوا رو چہرہ دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔

''کیا ہوا عروہ...... سب ٹھیک تو ہے ناں......''

وہ پریشان ہوکر اس کے نزدیک چلی آئی۔

''کچھ ٹھیک نہیں ہے ریشم...... ابھی تایا ابو لوگ یہاں آرہے ہیں، پرسوں نکاح کا پروگرام فائنل کرنے۔'' وہ جیسے رو دی۔

''ارے، یہ کب ہوا مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں چلا۔'' ریشم ایک دم پُرجوش ہوکر باہر کی طرف بھاگی اور وہ ڈوبتے دل کے ساتھ گھر میں بکھری خوشگوار سی افراتفری دیکھتی رہی۔ دادی کی ہدایت پر زرین جلدی، جلدی کچن میں کام نپٹا رہی تھیں جبکہ ریشم صفائی میں مصروف تھی۔ وہ چپکے سے گھر کے پچھلے حصے میں چلی آئی اور شایان کو اپنے سیل سے ساری سچویشن سے آگاہ کرتے ہوئے وہ دوبارہ رو دی۔ شایان بھی ایک دم گھبرا گیا۔

''یہ تو بہت برا ہوا عروہ...... ابھی بھابی کامران بھائی سے کہہ رہی تھیں کہ وہ باقاعدہ میرا رشتہ لے کر اپنے بھیا کے ہاں جارہی ہیں۔ میں نے اتفاقاً سن لیا اور اب یقیناً وہ مجھ سے بات کرنے میرے کمرے میں آتی ہی ہوں گی۔'' شایان کے بھی ہوش اڑ رہے تھے۔

''تو ٹھیک ہے، آپ بھابی کی بہن سے شادی کرلیں اور میں ناظر کے نکاح میں آجاتی ہوں۔'' وہ بری طرح سے تپ گئی۔ اس کا مسئلہ سلجھانے کے بجائے وہ اپنی پرابلم سنانے بیٹھ گیا تھا۔

''اچھا، اچھا زیادہ پریشان مت ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس وقت بھابی اور بھائی سے بات کرنا بیکار ہے۔ بہت وقت چاہیے انہیں منانے میں اور ہمارے پاس صرف کل کا دن ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے ایک لمحے کو رکا جبکہ وہ صرف آنسو بہا رہی تھی۔

''سنو عروہ، تمہیں بہت ہمت سے کام لینا ہوگا

اور بس جو میں کہوں وہی کرنا۔'' شایان کا ہر جملہ جیسے بم بن کر اس کے سر پر پھوٹ رہا تھا۔

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں شایان، میں ایسا بھلا کیسے کر سکتی ہوں۔ امی تو مجھے جان سے مار دیں گی۔ میں اتنا بڑا قدم بالکل نہیں اٹھا سکتی شایان۔'' اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں صاف منع کر دیا۔

''اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور حل بھی تو نہیں...... نکاح ہمارے پاس ایک اتنا مضبوط جواز ہوگا جس کے سامنے سب بے بس ہو جائیں گے۔ پلیز عروہ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ یقین کرو بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' شایان کا لہجہ بہت ملتجیانہ تھا پھر کافی دیر وہ اسے قائل کرتا رہا تھا۔ اور یوں کل کا پروگرام فائنل کر کے وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر آئی تو امی اسے ہی ڈھونڈ رہی تھیں۔

''کہاں تھیں تم؟ وہ لوگ کسی بھی وقت آ سکتے ہیں ذرا، اپنا حلیہ درست کر لو۔'' انہوں نے ایک تنقیدی نظر اس پر ڈال کر بہت اکھڑ کر اسے ٹوکا تو وہ کھوئی، کھوئی سی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

تایا ابو اور تائی امی کب آئے، کب واپس گئے گھر میں نکاح کے حوالے سے کیا، کیا پروگرام بنتے رہے اسے کچھ پتا ہی نہیں چلا تھا۔ دماغ بس آنے والے کل میں ہی الجھ رہا تھا۔ ایک عجیب طرح کا خوف دل میں اترا جا رہا تھا۔ تایا نے جاتے ہوئے اسے بہت محبت سے گلے لگایا۔ ''ہمیشہ خوش رہو میری بچی......'' کتنا پیار اور کتنی شفقت جھلک رہی تھی ان کے لہجے میں۔ پتا نہیں کیوں عروہ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ ابو کے مرنے کے بعد کتنا خیال رکھا تھا تایا ابو نے ان سب کا۔ ورنہ تو ان کی اچانک موت نے جیسے گھر میں ہر سو ایسا اندھیرا بکھیر دیا تھا کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ دادی جو پہلے تایا ابو کے ساتھ رہتی تھیں انہوں نے اب زرین اور ان کی دونوں بیٹیوں کو جیسے اپنے پروں میں چھپا لیا۔ اپنے چہیتے بیٹے کا غم سینے سے لگائے وہ پھر اس گھر سے کبھی کہیں گئی ہی نہیں۔ جہاں پر ان کے بیٹے کی بیوہ اور اس کی یتیم بچیاں رہتی تھیں۔

یہ الگ بات تھی کہ ایک تو بڑھاپا اور دوسرے چھوٹے بیٹے کی ناوقت موت نے انہیں اچھا خاصا... چڑچڑا بنا دیا تھا لیکن زرین کو پھر بھی ان سے کافی ڈھارس محسوس ہوتی تھی۔ ان کا اپنا میکا لاہور میں تھا اور میکا بھی کیا...... ماں، باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بھائی کوئی تھا نہیں، دو بہنیں تھیں جو اپنے، اپنے گھروں میں مصروف رہتی تھیں۔ بہنوئی کے انتقال پر کچھ عرصے زرین کے پاس آ کر رکی ضرور تھیں لیکن پھر بہر حال انہیں واپس جانا ہی تھا۔ ریشم کو دادی کی ہر وقت کی روک ٹوک سے سخت الجھن ہوتی تھی لیکن عروہ ان کی سخت باتوں کو بھی ہنس کر ٹال جاتی تھی۔ جانتی تھی کہ ان کی ڈانٹ میں بھی کتنا پیار، کتنی فکر، کتنی اپنائیت چھپی ہوئی ہے۔ تایا ابو کے اصرار پر جو وہ کبھی ایک دو دن کے لیے ان کے گھر رہنے چلی جاتی تو ریشم ان دنوں کو جیسے سیلیبریٹ کرتی اور ہنستے ہوئے ماں کی ڈانٹ بھی کھایا کرتی لیکن عروہ ان کی غیر موجودگی کو بہت مس کرتی تھی۔

''پتا نہیں میرے اور شایان کے نکاح کے بعد سب کچھ ایسا ہی رہے گا جیسے ابھی ہے۔ دادی مجھے معاف کر دیں گی، امی شایان کو داماد مان کر اسے گلے لگا لیں گی۔ کیا میں تایا ابو کی محبت کھو دوں گی؟ ناظر کے دل پر کیا گزرے گی؟'' وہ ساری رات انہی خیالات میں الجھی رہی۔ ایک لمحے کو نیند نہیں آئی تھی اسے۔ صبح کالج کے لیے تیار ہوتے ہوئے وہ چور نظروں سے دادی اور امی کو دیکھے جا رہی تھی۔ ریشم تو غافل پڑی سو رہی تھی۔ اس نے آج صاف کالج جانے سے منع کر دیا تھا۔ عروہ کے تپتے ہوئے سے چہرے کو دادی نے غور سے دیکھا تو پاس بلا کر کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا۔

''عروہ تمہارا چہرہ بہت اترا ہوا لگ رہا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا!'' ان کے فکر مند لہجے پر ایک عجیب سی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اس نے جبراً مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ کتنا بڑا قدم اٹھانے

جارہی تھی وہ۔ صرف ایک شایان کا ساتھ پانے کے لیے کتنی محبتوں کے کھو جانے کا رسک لینے جارہی تھی وہ۔ اس کا ارادہ متزلزل ہونے لگا۔ کاش وہ اتنی اسٹرانگ ہوتی کہ دوٹوک الفاظ میں اپنی پسند کا اظہار کرتے ہوئے ناظر سے نکاح کرنے سے انکار کردیتی۔ اس نے ایک لمحے کو یہ سوچا بھی لیکن پھر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ جانتی تھی کہ جواباً دادی اور امی کا کیا ری ایکشن ہوگا۔ شایان کو پانا تو دور کی بات اس کا گھر سے نکلنا ہی بند کردیا جائے گا اور کچھ بعید نہیں کہ آج ہی اس کا نکاح کردیا جائے۔ ویسے بھی شایان نے کہا تھا کہ بڑوں کی یہ خفگی وقتی ہوتی ہے۔ نکاح کا مضبوط بندھن خود اپنا آپ منوا کر انہیں معاف کردینے پر مجبور کردے گا۔ وہ اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے لرزتے ہوئے قدموں سے گھر سے نکل آئی تھی۔

☆☆☆

''اُفوہ عروہ...... اب اٹھ بھی جاؤ جب سے کالج سے آئی ہو بس سوئے ہی جارہی ہو۔'' ریشم نے کوئی تیسری مرتبہ اسے آکر اٹھایا تھا۔ عروہ کو بالآخر اٹھنا ہی پڑا۔ ورنہ وہ تو ایک سہمے ہوئے کبوتر کے مانند ایسے آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹی تھی جیسے اس کے آنکھیں موند لینے سے اس کی زندگی میں آنے والا انتہائی خطرناک لمحہ کہیں گم ہوجائے گا۔ لیکن ابھی اسے اس مرحلے کو فیس کرنا تھا جس کے لیے لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اپنے اندر ہمت نہیں پیدا کرپارہی تھی۔

''سنو ریشم......'' اس نے کمرے سے باہر جاتی ہوئی ریشم کو تھرتھراتے ہوئے لہجے میں پکارا تو ریشم نے ٹھٹک کراسے دیکھا۔ جس کے زرد ہوتے چہرے پر پسینہ چمک رہا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں عروہ......؟'' وہ بے حد گھبرا کر اس کے نزدیک چلی آئی۔

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ ریشم تم میرا ساتھ دوگی ناں......'' عروہ بے اختیار اس کا ہاتھ تھام کر رو دی۔ دل جیسے خوف سے بیٹھا جارہا تھا۔

''کیا بات ہے اور تم رو کیوں رہی ہو؟'' ریشم کو جیسے اس کے آنسو خوف زدہ کرنے لگے۔

''ریشم تم امی کو منع کردو، میں یہ نکاح نہیں کرسکتی۔'' عروہ کا یہ جملہ اس کے بہتے ہوئے آنسو ریشم کو کسی بہت سنگین معاملے کی نشاندہی کرتے ہوئے محسوس ہوئے۔

''عروہ پلیز ایسی کوئی بات نہ کہنا جو ہم سب کو بے موت ماردے۔'' ریشم کا دل بالکل بند ہونے لگا تھا۔

''ایسی ہی بات ہے ریشم، آج میں نے شایان سے نکاح کرلیا ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی۔ ریشم لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ پیروں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ آنکھوں میں شدید بے یقینی سموئے وہ سکتے کے عالم میں بس اسے دیکھے جارہی تھی۔

''میں بہت مجبور ہوگئی تھی ریشم، میں اور شایان ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ بہت اچھا ہے ریشم یقین جانو......'' لیکن اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ زرین نے جس بری طرح سے اس کو بالوں سے گھسیٹ کر اس کو طمانچوں اور لاتوں سے مارنا شروع کیا تھا وہ جیسے اس کی جان ہی نکال گیا۔ دروازے سے اندر آتی ہوئی زرین کے کانوں میں عروہ کے یہ جملے سیسہ بن کر اترے تھے۔ آنکھوں کے آگے کچھ ایسا اندھیرا چھایا تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہوگئی تھی اور پھر جب دماغ اپنے ٹھکانے پر آیا تو پھر انہیں کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ بس یاد رہا تو یہ کہ وہ عروہ کو ابھی اسی وقت جان سے ماردیں۔ عروہ کی گھٹی گھٹی دلدوز چیخوں سے کمرا گونج رہا تھا۔ دادی گھبرا کر اپنے کمرے سے نکل آئیں اور زرین کو اتنے بے رحمانہ طریقے سے عروہ کو پیٹتے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئیں۔ عروہ کے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے رستا خون...... چہرے پر ناخنوں اور طمانچوں کے نشان انہیں دہلا رہے تھے۔ عروہ زمین پر گری ہوئی تھی اور اب زرین اسے لاتوں سے ماررہی تھیں۔

''پاگل ہوگئی ہو زرین۔'' وہ بے اختیار زور سے

چیخیں اور تیزی سے نزدیک آ کر زرین کا ہاتھ پکڑ کر انہیں روکنے کی کوشش کی۔

''ہاں، ہاں میں پاگل ہوگئی ہوں۔ میں اسے جان سے مار دوں گی۔'' زرین نے ایک بار پھر اسے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا وہ جو دادی کی پناہوں میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک بار پھر ماں کے طمانچوں کی زد میں آ گئی۔ زرین کے چہرے پر ایک وحشت، ایک جنون کی سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ دادی نے انہیں گھسیٹ کر پیچھے کیا۔

''ارے بیٹا! مجھے بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟''

دادی نے زرین کو جھنجوڑ ہی تو ڈالا تو وہ بے اختیار ان کے گلے لگ کر بری طرح سے رو دیں۔ ریشم ایک کونے میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی جبکہ عروہ زمین پر بیٹھی دونوں گھٹنوں میں سر چھپائے سسک رہی تھی۔

''اماں اس لڑکی نے ہمیں بے موت مار دیا۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ اب کیا ہوگا اماں، میں کیسے سب کا سامنا کروں گی۔ آفاق بھائی کو کیا جواب دوں گی۔'' وہ ہذیانی کیفیت میں چیختے ہوئے تقریباً نیم بے ہوش سی ہو کر پلنگ پر گر گئیں۔ دادی کا دل ڈوبنے لگا۔ کسی بہت بڑی انہونی کا احساس کچھ اس شدت سے ہوا کہ انہیں اپنی جان نکلتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔

''نہیں، نہیں میری عروہ کچھ ایسا ویسا نہیں کر سکتی۔ ہے ناں عروہ......'' انہوں نے عروہ کے پاس زمین پر بیٹھتے ہوئے بہت آس سے اس کی جانب دیکھا لہجے میں بے کسی رو رہی تھی۔

''اماں آپ کی عروہ نے نکاح کر لیا ہے۔ ہم سب سے چھپ کر پتا نہیں کس سے شادی کر لی ہے۔'' زرین نے بہ مشکل تمام پلنگ سے اٹھتے ہوئے نفرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تو دادی نے شدید شاک کے عالم میں دو ہتڑ اپنے سینے پر مارے۔ عروہ نے بے اختیار ان کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

''دادی آپ بھی مجھے دل بھر کر مار لیں لیکن خدا کے لیے میری بات سن لیں۔ میں آپ کو شایان کے بارے، میں سب بتا دوں گی۔'' دادی نے انتہائی طیش کے عالم میں اس کے ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے اسے دھکا دیا۔

''بے غیرت، بے شرم خبردار جو اس مردود کا نام بھی لیا اس گھر میں...... ارے کیسی پٹی باندھ دی تھی اس ناہنجار نے اپنی محبت کی تمہاری آنکھوں پر کہ نہ اپنی بیوہ ماں کا خیال آیا نہ بوڑھی دادی کا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ ہم لوگ خاندان والوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ جب کل سب نکاح میں شرکت کے لیے آئیں گے تو کیا ہوگا۔''

وہ بری طرح سے روتے ہوئے بین کر رہی تھیں۔

''اور میں اپنے آفاق کو کیا جواب دوں گی۔ کتنا خوش تھا وہ کل...... صبح سے دونوں میاں بیوی شاپنگ کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔'' اچانک ہی انہیں اپنے بیٹے کا خیال آ کر انہیں مزید توڑ گیا۔

''تم ایسا کیسے کر سکتی ہو عروہ...... تمہیں ہم لوگوں کا ذرا بھی خیال نہیں آیا۔ کتنی بری طرح سے ہماری عزت، ہماری محبت، ہماری خوشیوں کو پامال کر کے ایک اجنبی شخص کو ساری خوشیاں بخش دیں؟'' انہوں نے اتنے درد سے عروہ سے پوچھا کہ جواباً وہ سر جھکا کر بے ساختہ رو دی۔ زرین لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے پاس آئیں۔

''اٹھو اور فوراً اپنے شوہر کو فون کرو کہ ابھی اور اسی وقت تمہیں یہاں سے لے جائے۔ اس کو زیادہ دیر گھر میں نہیں رکھنا چاہیے۔'' زرین کا لہجہ سخت اور اتنا شعلہ بار تھا کہ عروہ کو اپنا آپ جھلستا ہوا محسوس ہوا۔

''امی پلیز مجھے معاف کر دیں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔'' وہ روتے ہوئے ان کے پیروں سے لپٹ گئی۔

''خبردار جو مجھے امی کہا۔ اب ہم لوگوں کا تم سے کوئی رشتہ نہیں...... اب سارے رشتے تم اپنے شوہر اور اس کے گھر والوں میں ڈھونڈو۔'' انہوں نے اتنے زور سے اپنے پاؤں کو جھٹکا دیا کہ وہ ایک طرف گر گئی۔

''دادی...... پلیز امی کو سمجھائیں، میں ایسے کہیں

نہیں جاؤں گی۔'' وہ اٹھ کر دادی سے لپٹ گئی۔

''عروہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ اتنی شدید نفرت جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔'' وہ اسے بے دردی سے، ہٹاتے ہوئے آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ زرین نے سامنے پڑا ہوا موبائل اٹھا کر اسے تھمایا۔

''میں نے کہا نا، تم سے کہ اس شخص کو ابھی فون کرو کہ تمہیں فوراً آ کر لے جائے اور اگر وہ نہیں آتا تو تم خود وہاں چلی جاؤ لیکن میرے گھر میں تم ایک لمحہ نہیں رکو گی۔'' انہوں نے اسے دھکا دیتے ہوئے باہر کی جانب دھکیلا۔

''امی، پلیز ایسا نہ کریں۔'' ریشم جو شدید خوفزدہ سی کونے میں کھڑی رو رہی تھی بے اختیار گھبرا کر ان کے نزدیک چلی آئی لیکن زرین نے اسے بھی ایک طرف دھکیل دیا۔ شدید صدمے اور غصے میں انہیں کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔

''تم اس معاملے میں اگر ایک لفظ بھی بولیں تو میں تمہیں بھی ختم کر دوں گی۔ الماری میں سے چادر نکال کر اسے دو ورنہ باہر سب کی نظروں میں آ جائے گی یہ.....'' ان کے لہجے کی سفاکی عروہ کے ساتھ، ساتھ ریشم کو بھی دہلا گئی۔ اس نے چادر نکال کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے عروہ کو تھمائی اور زرین نے اس کا ہاتھ تھام کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسے دروازے سے باہر کیا اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔ عروہ سکتے کے سے عالم میں باہر کھڑی رہ گئی۔ دروازہ کھٹکھٹانے کا مطلب محلے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ اس نے اپنی سسکیاں روکتے ہوئے شایان کو کال ملائی۔ چہرے پر ماں کی انگلیوں کے نشان اور پھٹے ہوئے ہونٹوں سے رستا خون اور جوڑ، جوڑ دکھتے ہوئے بدن کے ساتھ وہ نسبتاً تھوڑے سے اندھیرے والے حصے میں کھڑی شایان کا انتظار کر رہی تھی جو اس پر پڑنے والی روداد سن کر حواس باختہ ہو کر اس کے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ چادر سے چہرے کو ڈھانپے وہ ایک تسلسل کے ساتھ روئے جا رہی تھی۔

ماں اور دادی کی طرف سے اتنے شدید ری ایکشن کی اس نے کب توقع کی تھی۔ شایان کو دیکھتے ہی اس کے رونے میں مزید شدت آ گئی۔ وہ اس کا یہ حال دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس سچویشن کو وہ کیسے ہینڈل کرے۔ عروہ کو اس وقت کہاں لے کر جائے۔ اس وقت جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ لوگ کسی ہوٹل میں ہی ٹھہر جاتے اور نہ ہی اس کے بینک میں موجود محدود رقم اسے اس بات کی اجازت دے رہی تھی کہ ابھی کچھ ماہ پہلے ہی تو اس نے اپنی جاب اسٹارٹ کی تھی۔ اس نے اپنے ایک دو دوستوں کو فون کیے لیکن انہوں نے بھی معذرت کر لی۔ کسی کو اپنی ماں کا ڈر تھا اور کوئی اپنے باپ سے خوف زدہ..... تب ناچار وہ اسے لیے اپنے بھائی، بھابی کے ہی گھر چلا آیا کہ وہی اس کا بھی مسکن تھا۔ رات کا اندھیرا چار سو پھیل رہا تھا جب وہ عروہ کو لے کر گھر پہنچا۔

''شایان مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اب پتا نہیں یہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔'' عروہ نے متورم آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ رو، رو کر اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں اور چہرے پر خوف کے سائے لرزاں تھے۔ شایان خود بھی دل ہی دل میں بہت خوف زدہ تھا۔ دروازہ اتفاق سے بینا بھابی نے ہی کھولا۔ عروہ سائیڈ پر کھڑی ہوئی تھی اس لیے ان کی نظر اس پر پڑی نہیں

''ارے شایان کہاں رہ گئے تھے بھئی، کال بھی نہیں ریسیو کر رہے تھے، ہم کب سے کھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' انہوں نے اسے دیکھتے ہی اپنی پریشانی کا اظہار کیا اور پھر اسے یونہی گم صم کھڑا دیکھ کر وہ کچھ ٹھٹکیں اور تب ہی شایان نے آہستہ سے عروہ کا ہاتھ تھام کر اندر آنے کے لیے قدم بڑھایا۔ بینا بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ آنکھوں میں شدید تحیر امنڈ آیا۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔

''بھابی یہ عروہ ہے، ہمارا نکاح آج ہی ہوا ہے۔'' بہت رک رک کر شایان نے اس کا تعارف کرایا

تھا لیکن دل اندر سے پتے کے مانند کانپ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ بھائی کا ردِعمل کتنا شدید ہوگا اور عروہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مزید کچھ سہہ سکتی۔ بینا نے بے حد شاکڈ ہو کر ان دونوں کو دیکھا۔ آج اس نے شایان کی پسندیدہ ڈشز بنائی تھیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ کھانے کی ٹیبل پر شایان کو وہ یہ خوش خبری سنائے گی کہ کل وہ شیبنا کے لیے اس کا باقاعدہ رشتہ لے کر جا رہی ہے۔ اس نے تو اپنے میکے میں بھی یہ خبر پہنچا دی تھی۔ اس کی مما کتنی خوش ہوئی تھیں۔ شیبنا کو اس نے شایان کے حوالے سے کتنا چھیڑا تھا لیکن شایان نے تو لمحوں میں اسے ایسا تہی دست کیا کہ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ تبھی کامران بھائی بھی شایان کی آواز سن کر اِدھر ہی آ گئے۔ شایان کے ساتھ سیاہ چادر میں لپٹی ایک لڑکی کو دیکھ کر وہ بھی ٹھٹک کر وہیں رک گئے۔

''کامران ان دونوں سے کہیں کہ فوراً یہاں سے چلے جائیں.. میں ایک سیکنڈ بھی انہیں یہاں برداشت نہیں کر سکتی۔'' بینا جو بہت مشکل سے اپنے حواس کو قابو کرنے میں کامیاب ہوئی تھی کامران کو دیکھتے ہی بری طرح سے چیخ اٹھیں۔

''آخر بات کیا ہے، مجھے بھی تو کچھ پتا چلے۔''

کامران نے بہت الجھ کر ان تینوں کی طرف دیکھا۔ شایان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی بینا پھٹ پڑی۔

''آپ کے بھائی نے اس لڑکی سے نکاح کر لیا ہے۔ ہم لوگوں کی شرکت تو دور کی بات اس نے ہمیں اپنی شادی کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ ارے ایسا تو غیر بھی نہیں کرتے جو آپ کے سگے بھائی نے کیا ہے۔'' کامران بھائی بھی جیسے سناٹے میں آ گئے۔ انہوں نے ناقابلِ یقین نظروں سے شایان کو دیکھا۔

''کامران بھائی پلیز آپ لوگ غلط مت سمجھیں۔ یہ سب بے حد اچانک اور ایمرجنسی میں ہوا ہے۔'' شایان نے بہت گھبرا کر اپنی صفائی دینی چاہی لیکن بینا تو جیسے غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

''میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو ایک منٹ بھی اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔ شریف لڑکیوں کے لیے یہ چلن نہیں ہوتے لے جاؤ اسے فوراً یہاں سے۔'' کتنی حقارت تھی بینا کے لہجے میں عروہ کے لیے جسے وہ برداشت نہیں کر سکی۔

''شایان ان کو بتائیں، میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ نکاح ہوا ہے میرا آپ سے۔ مجھے یوں ذلیل نہ ہونے دیں.. شایان ورنہ میں.....'' جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ کچھ گھنٹوں سے جھیلتی شدید ذہنی اذیت شاید اب اپنی حد ختم کر چکی تھی۔ اس کے زمین پر گرنے سے پہلے شایان نے جلدی سے اسے اپنی بانہوں میں تھام لیا۔

''عروہ، عروہ!'' اس نے بے قراری سے عروہ کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارا۔

کامران بھائی بھی اس کے چہرے پر جھلکتی پریشانی کو محسوس کر کے اپنی خفگی بھلا کر اس کے نزدیک چلے آئے تھے.. وہ اسے اپنی بانہوں میں اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ کامران بھائی نے اس لڑکی کے چہرے پر طمانچوں کے نشان اور پھٹے ہوئے ہونٹوں پر جما ہوا خون دیکھ کر بہت چونک کر شایان کی جانب دیکھا جو عروہ کے چہرے پر پانی چھڑک کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عروہ نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔

باہر سے بینا کے زور زور سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ عروہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گئی اور سہمی ہوئی نظروں سے کامران بھائی کو دیکھتے ہوئے اس نے زور سے شایان کا بازو پکڑ لیا۔ پتا نہیں کیوں کامران کو عروہ کی اس حالتِ زار پر ترس آنے لگا۔

''شایان یہاں آؤ میرے پاس اور بتاؤ کہ اصل ماجرا کیا ہے؟'' انہوں نے بہت نرمی سے شایان کو اپنے پاس بلایا تو وہ بے اختیار آ کر ان کے گلے لگ گیا۔

اپنے چھوٹے بھائی کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو کامران کو اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ کچھ ایسا ہی ہوا تھا جو شایان بے ساختہ رو پڑا تھا۔ ورنہ تو وہ مضبوط دل کا نوجوان تھا پھر بینا کی شدید

مخالفت کے باوجود کامران کے کہنے پر وہ لوگ وہیں پر رہے۔ شایان سے پوری کہانی سننے کے بعد انہوں نے شایان کو معاف کر دیا تھا اور عروہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر گویا اسے اپنے خاندان کی بہو بھی تسلیم کرلیا تھا۔ بینا کو بھی انہوں نے کچھ پیار اور کچھ سختی سے سمجھا کر اس حقیقت کو قبول کرنے پر راضی کرلیا تھا۔ اپنے شوہر کی وجہ سے بینا بظاہر تو خاموش ہوگئی تھی لیکن دل میں دہکتی آگ ٹھنڈی ہونے کے بجائے مزید بھڑکتی جارہی تھی۔

☆☆☆

''عروہ چلو کھانے پر سب انتظار کررہے ہیں۔'' شایان نے دروازے سے جھانک کر اسے پکارا تو بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے ہوئے عروہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں شایان، مجھے بھوک نہیں ہے۔ پلیز آپ لوگ کھالیں۔'' اس کا بجھا ہوا لہجہ محسوس کرکے شایان بے اختیار اس کے نزدیک آگیا۔

''عروہ تم نے صبح ناشتا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کیا تھا۔ ایسے بھلا کیسے چلے گا۔'' شایان نے بہت پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے سمجھانے کی کوشش کی تو عروہ نے کچھ الجھ کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''اس ناشتے اور کھانے سے بہتر ہے کہ آپ مجھے زہر لادیں شایان۔ میں بھابی کی حقارت آمیز نظریں اور طنزیہ جملے سہنے کے بجائے بھوکا رہنا زیادہ پسند کروں گی۔'' شایان ایک لمحے کو چپ ہوگیا۔ اسے خود بھی احساس تھا اپنی بھابی کے اس تذلیل بھرے رویے کا لیکن فی الحال انہیں کچھ کہنا جلتے توے پر ہاتھ لگانا تھا لیکن عروہ اس مصلحت کو سمجھ نہیں رہی تھی۔ وہ ویسے ہی اپنے گھر والوں کے اس شدید ری ایکشن کو کسی صورت بھول نہیں پارہی تھی۔ اس کے گالوں پر پڑے نیل کے نشان اور پھٹے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر بھابی نے طنز کے زہر آلود تیر اس کے دل میں اتارے تھے۔ عروہ کو اپنے چہرے اور جسم پر لگی چوٹوں سے زیادہ روح پر لگنے والے زخم تکلیف دے رہے تھے۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے خاندان سے بے دخل کر دی گئی ہے۔ یہ سوچ کر جیسے اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ پتا نہیں تایا ابو اور تائی کو امی نے کیسے یہ خبر دی ہوگی۔ رشتے داروں کو کیسے سمجھایا ہوگا۔ ناظر کتنا شاکڈ ہوا ہوگا۔ وہ باتیں جن پر اس نے نکاح کرنے سے پہلے اپنی محبت کا جھلملاتا پردہ ڈال دیا تھا اب بھیانک حقیقتوں کا لبادہ اوڑھ کر اسے ڈرا رہی تھیں۔

''سنو شایان تم مجھے لے کر امی کے پاس چلو۔ ہم دونوں مل کر ان سے معافی مانگیں گے تو شاید تمہارے بھی معافی مانگنے سے ان کا دل پگھل جائے۔'' ایک دم ہی یہ خیال اس کے ذہن میں آیا تھا۔ اس نے بہت یاس بھرے لہجے میں شایان سے التجا کی تو وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''نہیں عروہ ابھی جلد بازی مت کرو۔ میں یہ ہی تو تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ بھابی اور تمہارے گھر والے سب ہی ایک ..... کشتی کے سوار ہیں۔ ہمیں بہت احتیاط سے انہیں اس ڈوبتی ہوئی کشتی سے اتارنا ہے۔ تم بھابی کی باتوں کا بھی برا مت مانو۔ انہیں بھی کچھ ٹائم دو، ابھی زخم تازہ اور گہرا بھی ہے۔'' اسے سمجھاتے ہوئے شایان نے لگے ہاتھوں بھابی کی طرف سے بھی صفائی دینے کی کوشش کی تو وہ بپھر ہی گئی۔

''ان کا مقابلہ آپ میری امی اور دادی سے نہ کریں۔ امی کے ساتھ تو میں نے بہت برا کیا ہے شایان..... کتنے لوگوں کو انہیں فیس کرنا پڑے گا۔ ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ایسا قدم اٹھانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لڑکے کا زیادہ کچھ نہیں جاتا البتہ لڑکی کے گھر والے بے موت مر جاتے ہیں۔'' ایک ہی رات میں اسے وہ تمام باتیں سمجھ میں آگئی تھیں جو اتنے دن کی محبت اسے نہیں سمجھا پائی تھی بھی آخری جملہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ شایان نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

''اچھا چلو ابھی ہم چلتے ہیں۔ میں تمہیں کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں لنچ بھی کرواؤں گا۔ یار کچھ تو ہم لوگ اپنی نئی زندگی کو انجوائے کریں۔ تھک گیا ہوں میں

ان ٹینشن بھرے لمحات سے۔'' کتنا تھکا سا لہجہ تھا اس کا۔ عروہ کو اس پر پیار کے ساتھ ساتھ ترس بھی آ گیا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ کہ نکاح کے بعد ایک پل بھی تو دونوں نے خوشی کا نہیں گزارا تھا۔ ایک دوسرے کا ساتھ انجوائے نہیں کیا تھا۔ نئی شادی کا خمار کیا ہوتا ہے اس کا تو مطلب بھی نہیں سمجھ پائے تھے وہ لوگ۔

''آپ کا آئیڈیا تو بہت اچھا ہے شایان، میرا بھی اس تکلیف دہ ماحول سے کچھ دیر کے لیے دور جانے کا دل کر رہا ہے۔ آپ سوچ نہیں سکتے بھابی کتنی دل آزاری کر رہی ہیں میری...... ان کے جملے میری عزتِ نفس پر پتھر بن کر لگ رہے ہیں لیکن......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کچھ تذبذب سے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو شایان بھی فکر مند ہو گیا۔ واقعی اس کا حلیہ اس وقت باہر جانے کا نہیں ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر کامران بھائی کی دی ہوئی دوا لگانے سے سوجن میں کافی کمی آ گئی تھی۔ چہرہ بھی کچھ بہتر ہو گیا تھا لیکن کپڑے کافی میلے اور ملگجے لگ رہے تھے۔ عروہ نے اس کے اترے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کچھ سوچا اور پھر ایک دم پاس پڑی ہوئی اپنی چادر کو اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''چھوڑیں، شایان، کپڑے جیسے بھی ہوں بس دل اندر سے خوش ہونا چاہیے۔ اس وقت ہم دونوں کو جس خوشی اور سکون کی ضرورت ہے اسے میں اپنے ظاہری حلیے کی نذر نہیں کر سکتی۔'' اس کی آنکھوں میں جیسے شایان کی محبت ایک اعتماد بن کر دمک رہی تھی۔ شایان کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔

"thats like a gooo girl" کہتے تکلیف دہ لمحات کے بعد پہلی بار وہ دونوں بے ساختہ مسکرائے تھے۔

☆☆☆

دوپہر تقریباً تین بجے جب وہ شایان کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئی تو بھابی نے سخت آف موڈ کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔

''یہ کیا تماشا بنایا ہوا ہے تم نے شایان۔ اگر نکاح چھپ کر تم لوگوں نے کر ہی لیا تھا تو کم از کم اب تو شریفانہ طور طریقے اپنالو تم لوگ۔ کل رات کو اسے اچانک میرے گھر لے کر آ گئے اور صبح سیر سپاٹے کو نکل گئے... ارے کچھ خاندانی پن تم ہی دکھا دو شایان۔'' ان کا تند لہجہ عروہ کو بری طرح سے سلگا گیا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ میں ایک بہت اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ اور سارے خاندانی رکھ رکھاؤ سے واقف بھی ہوں، آپ کو مجھے کچھ سکھانے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے بہت ہی ترش کر مینا بھابی کو جواب دیا تو وہ مزید سیخ پا ہو گئیں۔

''ہاں، ہاں تم نے اپنے بہت اچھے خاندان سے ہونے کا اتنا اعلیٰ ثبوت دیا ہے کہ صبح سے محلے کی کئی عورتیں آ کر واہ واہ کر چکی ہیں۔ تمہارے کارنامے پر... سب کے سوالوں کے جواب دے، دے کر تھک چکی ہوں میں۔ ہونہہ یہ ہوتے ہیں شریف لڑکیوں کے لچھن۔'' ان کے زہر میں بجھے جملے عروہ کے دل میں اتر گئے۔ دل چاہا بڑھ کر مینا بھابی کا منہ نوچ لے شایان کا چہرہ بھی خفت سے سرخ ہو گیا۔

''نکاح کرنا کون سا غیر شریفانہ فعل ہے بھابی، پلیز آپ عروہ سے اس قسم کی باتوں سے پرہیز کریں۔'' اس کے سخت لہجے پر بھابی نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

''جو لڑکی ماں، باپ کی مرضی کے بغیر ان کی عزت کو اپنے پیروں تلے روند کر نکاح کرے میرے نزدیک وہ فعل غیر شریفانہ ہے۔ ارے میں اس کے خاندان کا ردِعمل اس کے چہرے اور اس کے حلیے سے اچھی طرح جان چکی ہوں۔ اپنے گھر سے دھتکاری گئی لڑکی کو صرف کامران کی وجہ سے اس گھر میں رہنے کی اجازت دی ہے میں نے ورنہ میرا بس چلے تو اس کے گھر والوں کی طرح میں بھی نکال باہر کردوں اسے۔''

عروہ بھاگ کر روتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی تھی لیکن مینا بھابی کی آواز سے بھلا وہ کیسے پیچھا چھڑاتی

جو ایک تسلسل سے اس کے کانوں میں جیسے خراشیں ڈالے جارہی تھی۔ شایان بھی تھوڑی دیر اُن سے بحث کر کے تھکے، تھکے قدموں سے اندر کمرے میں آ گیا۔ وہ سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔ کتنے خوب صورت لمحات گزار کر دونوں ہنستے مسکراتے واپس لوٹے تھے۔ شایان نے اسے تین خوب صورت ریڈی میڈ سوٹ اور کچھ دوسری ضروری چیزوں کی شاپنگ بھی کروائی تھی۔ ریسٹورنٹ کے خوب صورت ماحول میں بیٹھ کر مستقبل کی پلاننگ کرتے ہوئے شایان کی سحر انگیز باتوں میں کھو کر وہ کچھ دیر کو حال میں بکھری تلخیوں کو بالکل بھول گئی تھی لیکن بینا بھابی نے اپنی باتوں سے ایک بار پھر اسے ان تلخ حقیقتوں کے دلدل میں دھکیل دیا تھا جہاں سے نکلنا اسے بہت دشوار لگ رہا تھا۔

آج اس کے نکاح کو پورا ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اور ان تیس دنوں میں کوئی دن بھی تو ایسا نہیں تھا کہ جب اس کا دل لہو لہو نہ ہوا ہو آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو کر چھلکی نہ ہوں۔ بینا بھابی نے جیسے اس پر جینا تنگ کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کے میکے والوں کا آنا جانا بھی کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ کبھی خالہ، کبھی اماں، کبھی کوئی چاچی یا ممانی شایان کے نکاح کی سن گن لینے آ جاتیں پھر جس حقارت آمیز انداز میں عروہ پر تبصرہ کیا جاتا وہ روز بروز عروہ کو توڑتا جارہا تھا۔ اور اب بھی شایان کے آفس جانے کے بعد محلے کی آئی ہوئی کچھ عورتوں کے ساتھ بینا بھابی جس طرح اس کے متعلق ریمارکس پاس کر رہی تھیں۔ وہ جیسے برداشت کا دامن چھوڑ بیٹھی اور تنتناتی ہوئی ان کے سروں پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ لوگوں کو اللہ کا ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا۔ کسی لڑکی کی کردار کشی کرتے ہوئے۔'' اس کا لہجہ شعلہ بار تھا۔

''اچھا تو آپ کا کردار بھی ہے۔'' بینا بھابی نے بڑے تمسخرانہ انداز میں اس کی جانب دیکھا تھا۔

''آپ سے تو اچھا ہی ہے۔ اگر شایان نے آپ کی بہن سے شادی نہیں کی تو بہت گھٹیا طریقے سے آپ بدلہ لے رہی ہیں مجھ سے۔'' اس کا یہ کہنا تھا کہ بینا بھابی غصے سے جیسے دیوانی سی ہو گئیں۔

''ارے میرا احسان مان لو کہ میں نے تم جیسی لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ دی ہوئی ہے جس کے اپنے گھر والوں نے اسے دھکے مار کر گھر سے نکال دیا۔ ارے ہمارے تو محلے میں بھی اعتراض ہو رہا ہے کہ تمہاری وجہ سے ان کی لڑکیوں پر بھی کوئی غلط اثر نہ پڑ جائے۔'' وہ چراغ پا ہو کر اسے بے نقط سنا رہی تھیں اور ان کے پاس بیٹھی ہوئی خواتین اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔

''میری امی مجھ سے وقتی ناراض ہیں۔ میرا میکا اب بھی سلامت ہے میں ابھی اور اسی وقت اپنے گھر واپس جارہی ہوں۔ لعنت بھیجتی ہوں میں آپ پر اور اس گھر پر.....'' وہ روتے ہوئے اپنے کمرے میں گئی۔ سر پر چادر رکھتے ہوئے پرس کو اٹھایا اور اسی تیزی سے باہر نکل آئی۔

''ہاں، ہاں جاؤ اور ہم لوگوں پر رحم کر کے آئندہ اپنی منحوس شکل دوبارہ مت دکھانا۔'' بینا بھابی جیسے آج تمام حدیں ختم کیے دے رہی تھیں۔ بہن کے لیے عروہ کا دیا ہوا طعنہ انہیں بھسم کیے دے رہا تھا۔

''دیکھ لینا میری بہن ہی انشاء اللہ بہت عزت کے ساتھ میری دیورانی بن کر اس گھر میں آئے گی۔ تمہاری طرح گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیاں زیادہ دن گھر نہیں بسا سکتیں۔'' دروازے سے نکلتے ہوئے انہوں نے ایک اور زہریلا تیر اس کے دل پر چلایا تھا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ بے اختیار پلٹ کر انہیں دیکھا۔

''اگر آپ کی بہن کی زبان اور خیالات آپ ہی کی طرح چھچھورے ہوئے تو انشاء اللہ وہ جس گھر میں بھی جائے گی بے عزت ہو کر واپس آئے گی۔'' جواباً بینا بھابی نے بے اختیار کچھ کھینچ کر اسے مارا تھا لیکن وہ دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔ البتہ بہت دور تک اسے بینا بھابی کے چیخ، چیخ کر کچھ کہنے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ رکشے میں بیٹھ کر اسے خیال آیا کہ شایان کو اپنے گھر چھوڑنے کا بتا دے لیکن پھر وہ دھک سے رہ

گئی۔ غصے اور افراتفری میں وہ اپنا موبائل کمرے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔۔ یہ موبائل گو کہ سستا تھا لیکن شایان نے بہت پیار سے لا کر دیا تھا کہ جب دل گھبرائے یا کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اسے فوراً فون کر لے لیکن آج شدید غصے میں بجائے شایان کو فون کر کے وہ خود انتہائی قدم اٹھا کر اس گھر کو چھوڑ آئی تھی اور اک ستم یہ کہ موبائل بھی پاس نہیں تھا کہ وہ شایان کو اپنے جانے کی اطلاع ہی دے دیتی پھر دل ہی دل میں اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے اس نے سوچا کہ آج ہر صورت وہ امی اور دادی کے پیروں پر گر کر انہیں منا ہی لے گی پھر وہیں سے فون کر کے جب وہ شایان کو یہ خوش خبری سنائے گی تو وہ بھی فوراً ہی وہاں دوڑا چلا آئے گا۔ امید کے چراغ دھیمے، دھیمے اس کے دل میں روشن ہو کر جیسے تیزی سے رواں دواں رکشے میں بھی روشنی بکھیرنے لگے۔ چمکتی دھوپ میں نظر آنے والا نیلا شفاف آسمان اسے مزید خوب صورت نظر آ رہا تھا۔ جب رکشا گھر کی جانی پہچانی گلیوں میں مڑا تو رکشے والے کو راستہ بتاتے ہوئے پتا نہیں کیوں اسے اپنے ہاتھ ایک دم سے ٹھنڈے ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ اس نے ایک ماہ میں اپنے موبائل سے کتنی بار بھی گھر کے اینڈ لائن نمبر پر اور کبھی ریشم کے موبائل پر بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن گھر کے فون کو کسی نے اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ ریشم نے محض ایک ہی بار اس کی کال ریسیو کی تھی اور اس کی آواز سنتے ہی لائن کاٹ دی تھی اور اس کے بعد سے مسلسل اس کا سیل فون آف جا رہا تھا۔ عروہ کے لیے اپنا نکاح اب ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گیا تھا۔ کامران بھائی کا رویہ تو اس کے ساتھ ٹھیک تھا لیکن بینا بھابی اور گھر میں آتے جانے والے مختلف افراد نے جیسے اسے خود اپنی نظروں میں گرا کے رکھ دیا تھا۔ جب بینا بھابی کی امی ان کے پاس آتیں تو وہ جان بوجھ کر کچھ زیادہ ہی ان سے لاڈ پیار کا مظاہرہ کرتیں۔ بڑی حقارت اور بظاہر بہت ترس کے ساتھ وہ اس کے میکے کے چھٹ جانے پر ہمدردی کا اظہار کرتیں

کچھ زیادہ ہی میکے پر اپنا مان جتانے لگی تھیں وہ۔ اور ان کا یہ مان ایک زہریلے سانپ کے مانند اسے ایسے ڈستا جس کی اذیت سے وہ تڑپ تڑپ جاتی۔ کئی بار اس نے اپنے گھر جانے کا پورا ارادہ بھی کیا لیکن شایان کے سمجھانے پر اسے مجبوراً رکنا پڑا تھا۔ ویسے اسے خود بھی اندازہ تھا کہ ابھی اسے وہاں جا کر سوائے خواری کے اور کچھ ملنا نہیں ہے۔ لیکن آج بینا بھابی کی باتوں نے جیسے اس کی برداشت ختم کر کے اسے بے اختیار وہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا جو اتنے دنوں سے اسے ایک کشش و پنچ میں ڈالے ہوئے تھا۔

☆☆☆

اس نے رکشا گھر سے کچھ فاصلے پر رکوایا کہ وہ اس وقت محلے والوں کی باتوں اور ان کی نظروں کا سامنا کرنے کا اپنے اندر بالکل حوصلہ نہیں پا رہی تھی۔ چادر سے اپنے آپ کو اچھی طرح لپیٹ کر وہ کپکپاتے ہوئے قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھی۔ اتفاق سے وقت بھی کچھ ایسا تھا کہ بچے اسکول اور مائیں گھر کے کاموں میں مشغول تھیں۔ اردگرد کافی سناٹا تھا۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے کال بیل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دفعتاً اس کی نگاہ گیٹ پر جھولتے ہوئے تالے پر پڑی۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ گھر پر کسی کے نہ ہونے کا احساس .... نہ جانے کیوں اسے دہلا گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی لق و دق صحرا میں بالکل اکیلی کھڑی ہوئی ہے اور کوئی بھی اس کا مددگار نہیں ہے۔ تبھی اسے سامنے سے نفیسہ آنٹی آتی دکھائی دیں۔ وہ کچھ گھر چھوڑ کر رہتی تھیں اور امی سے ان کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ عروہ نے جلدی سے مزید اپنے چہرے کو کچھ ایسے ڈھانپا کہ اب محض اس کی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے گھر والوں نے محلے اور دوسرے جاننے والوں کو اس کے بارے میں کیا بتایا ہے۔ نفیسہ آنٹی اسے گیٹ کے پاس کھڑا دیکھ کر اس کے نزدیک چلی آئیں۔

''آپ کون ہیں؟'' انہوں نے کھوجتی ہوئی

آنکھوں سے اسے دیکھا تو عروہ نے بہت کنفیوز ہوکر سر جھکا لیا۔

''اوہ..... آپ یقیناً زرین کی کوئی رشتے دار ہیں۔ تعزیت کے لیے آئی ہوں گی۔ لیکن وہ لوگ تو آفاق بھائی کے یہاں شفٹ ہوگئے ہیں۔ ارے وہی جو زرین کے بیٹھ ہیں۔'' ان کے لہجے میں افسردگی در آئی اور آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔ عروہ کا دل پاتال جیسی گہرائی میں ڈوبنے لگا۔ نفیسہ آنٹی کس کی تعزیت کی بات کر رہی تھیں۔ کون مر گیا تھا اس کے گھر میں..... پسینے سے اس کا چہرہ بھیگ گیا۔ کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہی تھی وہ نفیسہ آنٹی سے۔ پیر اتنی بری طرح سے کپکپا رہے تھے کہ اس سے کھڑا ہونا محال ہو رہا تھا۔ وہ بے اختیار زمین پر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اگلا جملہ اس کے لیے کون سی قیامت لانے والا تھا۔

''ارے زرین کے مرنے کے کوئی دن نہیں تھے یہ..... میری جانِ جگر میری اکلوتی دوست تھی وہ۔ بے چاری کہ اس کی چہیتی بیٹی عروہ اس کے جنازے میں نہیں پہنچ پائی۔ اسلام آباد گئی ہوئی تھی خالہ کے یہاں اور وہیں اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔'' نفیسہ آنٹی کا دل بھی جیسے بھرا ہوا تھا۔ بین کرنے والے انداز میں بولتی چلی جا رہی تھیں۔ انہوں نے نوٹ ہی نہیں کیا کہ چادر میں لپٹی یہ لڑکی کس مشکل سے اپنی چیخیں روک رہی ہے۔ اپنی ماں کی عزت کا بھرم بھی تو رکھنا تھا اسے۔ ان کے مصلحت آمیز جھوٹ کی پردہ داری بھی تو کرنی تھی اسے..... وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اٹھ کر جانے لگی تو نفیسہ آنٹی نے اسے پکار کر کچھ پوچھا تھا لیکن اس کا سنسناتا ہوا ذہن سوائے امی، امی کی گردان کے نہ کچھ سن رہا تھا اور نہ ہی سمجھ رہا تھا۔

''ریشم بیٹا ذرا دیکھو تو سہی کوئی خاتون دروازے پر آئی کھڑی ہیں۔ شاید زرین کی کوئی دوست ہیں۔'' تایا ابو نے دروازے پر کسی کو کھڑا دیکھا تو ریشم کو پکار کر اس کی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن جواباً ایک دلدوز چیخ نے سب کے دل دہلا دیے۔ عروہ جس نے اپنے گھر سے تایا ابو کے گھر تک ایک انتہائی اذیت ناک سفر بہت برداشت کے ساتھ طے کیا تھا اب جیسے ہوش و خرد سے بیگانہ ہو رہی تھی۔ اس کا بے کسی سے رونا، چیخنا تڑپنا ریشم کا کلیجا چیر گیا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھی تو تایا ابو نے سختی سے اس کا بازو تھام لیا۔

''خبردار جو کوئی اس کے نزدیک بھی گیا۔ کس کا ماتم کرنے آئی ہے یہ۔ اپنی اس ماں کا جسے اس نے خود مارا ہے۔'' ان کی آنکھوں سے جیسے خون برس رہا تھا۔

''تایا ابو میری امی کیسے مر گئیں۔ ارے میری امی کیوں مر گئیں۔ امی میری پیاری امی۔'' اس نے بری طرح سے اپنا چہرہ پیٹ ڈالا۔ دادی بھی اپنے کمرے سے نکل آئی تھیں۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی ان کے نزدیک آئی اور پھر بری طرح سے ان سے لپٹ گئی۔

''دادی مجھے معاف کر دیں، دادی میری امی کو کیا ہوا تھا وہ تو بالکل ٹھیک تھیں۔ ہائے میری امی۔'' اس کی کیفیت بالکل ہذیانی سی ہو رہی تھی۔

''اماں اسے ابھی اور اسی وقت اس گھر سے نکالیں ورنہ خدا کی قسم میں اسے جان سے مار دوں گا۔'' تایا ابو بہت زور سے دہاڑ رہے تھے۔ دادی نے روتے ہوئے اسے زبردستی اپنے آپ سے الگ کرنا چاہا تو وہ ذرا پیچھے ہوئی اور پھر تیورا کر زمین پر گر گئی۔ اس کا ذہن مکمل طور پر اب تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔

''عروہ!'' ریشم چیختی ہوئی اس کے نزدیک آگئی۔ تایا ابو نے بھی گھبرا کر اسے دیکھا جبکہ دادی بری طرح سے روتے ہوئے اس کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے اسے پکار رہی تھیں۔ تائی امی نے فوراً ہی ایمبولینس کال کر لی تھی۔ تایا ابو بھی سب کچھ بھول کر اس کے بے ہوش وجود کو ریشم اور تائی امی کی مدد سے اٹھا کر بستر پر لٹانے کی کوشش کرنے لگے۔

☆☆☆

''ارے مجھے کیا پتا... شاہان کہ وہ کہاں چلی گئی۔ گواہ ہیں یہ سب محلے والیاں کہ کتنی بدتمیزی کی اس

ذلیل لڑکی نے مجھ سے۔'' بینا بھابی نے روتے ہوئے ذرا الجھ کر دیور کو جواب دیا جو اُن سے عروہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''لیکن بھابی صبح تک تو سب ٹھیک تھا۔ پھر ایسی کیا بات ہوئی جو وہ گھر ہی چھوڑ کر چلی گئی۔ مجھے ایک کال تک کرنے کی زحمت نہیں کی اور نہ ہی میری کسی کال کا جواب دے رہی ہے وہ۔'' شایان نے بہت مشکوک نظروں سے بینا کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ لہجے میں چھپی شدید پریشانی بھی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

''ایک مہینے سے وہ میرے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ دل پر جبر کر کے میں اسے سہہ رہی تھی حالانکہ اس کا رویہ ناقابلِ برداشت ہوتا تھا میرے لیے۔ لیکن شایان آج تو اس نے حد ہی کر دی۔ خدا کی قسم مجھے ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ بدتمیزی کی انتہا کر دی۔ محلے کی عورتوں کے سامنے مجھے جتنا ذلیل کر سکتی تھی اس نے کیا ہی لیکن میری شینا نے کیا قصور کیا تھا... صرف یہ ہی نا کہ میری معصوم سی چھوٹی بہن کا رشتہ تم سے ہونے والا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے بینا بھابی کچھ ایسے تڑپ کر روئیں کہ شایان سب بھول کر انہیں چپ کرانے لگا۔

''سوری بھابی، میں اس کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ کچھ بھی ہو اُسے شینا کو درمیان میں نہیں لانا چاہیے تھا۔ خیر اسے آنے تو دیجیے، میں آپ کے سامنے اسے ڈانٹوں گا۔'' وہ حقیقتاً شرمندہ ہو رہا تھا۔

''مجھے نہیں یقین کہ وہ واپس آئے گی شایان۔ رفیعہ خالہ اور ساجدہ بھابی گواہ ہیں۔ وہ صاف، صاف کہہ گئی ہے کہ وہ اس گھر میں کبھی تھوکنے بھی نہیں آئے گی۔ لعنت بھیج کر گئی ہے ہم سب پر..... بقول اس کے یہ شادی اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔''

بینا بھابی کی آواز میں رقت ضرور تھی لیکن لہجہ بہت تپا ہوا تھا۔ آج جو موقع عروہ نے اپنے جذبات میں آ کر انہیں فراہم کیا تھا وہ اس سے پورا فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ عروہ کے کمرے میں پڑا موبائل دیکھ کر انہیں بڑی عجیب سی خوشی محسوس ہوئی تھی گویا آج وقت پوری طرح سے ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ انہوں نے وقت ضائع کیے بغیر وہ موبائل آف کر کے اسے اپنی الماری میں چھپا دیا تھا اور اب شایان کے چہرے پر بکھرے تناؤ کو وہ اور ہوا دے رہی تھیں۔

''شایان کم از کم تمہیں وہ ایک فون کال کر کے اپنے جانے کا تو بتا ہی سکتی تھی۔ ارے محلے کی عورتوں کے سامنے تمہاری عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی اس لڑکی نے۔ شینا کے ساتھ، ساتھ تمہارے کردار کی بھی دھجیاں اڑا رہی تھی وہ۔'' وہ ایک بار پھر رونے لگیں۔ شایان کی آنکھوں میں قہر اترنے لگا۔ دل بری طرح سے عروہ سے بدگمان ہو رہا تھا۔ بس یہ ہی محبت تھی اس کی کہ دو قدم بھی ساتھ نہ چل سکی۔ کیا تھا اگر وہ اسے فون کر کے اپنی پریشانی اس سے شیئر کر لیتی۔ بینا بھابی نے کوئی زیادتی کی بھی تھی تو بے شک وہ کچھ دیر کے لیے باہر جا کر اسے بھی وہیں بلا لیتی پھر دونوں مل کر کوئی حل نکال لیتے اور اب تو شام ہو گئی تھی لیکن اس نے اسے کوئی فون یا میسج کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ اپنے گھر جا کر اسے بالکل ہی بھول گئی تھی۔ کتنا مان تھا اسے اپنی اور عروہ کی محبت پر اور اب بھابی کے سامنے اپنا بھرم ٹوٹ جانے پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی اسے۔

''شایان میری بات غور سے سنو۔ خبردار جو تم نے اسے فون کیا یا اسے لینے کے لیے گئے۔ اب یہ ہم سب کی عزت کا سوال ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں شایان کہ اگر اس کے گھر والوں نے تمہیں ذلیل کر کے اپنے گھر سے نکالا تو میں خودکشی کر لوں گی۔'' بھابی نے بغور اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو دیکھتے ہوئے بے حد جذباتی انداز میں..........
شایان کو جیسے وارننگ دی تو وہ تلخی سے مسکرایا۔

''میں اسے کیسے فون کر سکتا ہوں بھابی، کیا آپ نے مجھے اتنا بے غیرت سمجھ لیا ہے۔ اور اس کے گھر جانے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب وہ لوگ اپنی بیٹی کے ساتھ اتنا برا سلوک کر سکتے ہیں تو پھر میں کس کھاتے میں ہوں۔'' وہ بے دلی سے کہتا ہوا اپنے

لمحے کو بھی اسپتال نہیں چھوڑا تھا۔ عروہ میں تو ان کی جان تھی۔ وہ ان کے مرحوم بھائی کی نشانی ہونے کے علاوہ ان کی بے حد چہیتی بھی تھی۔ بیٹی کی کمی ہمیشہ انہوں نے اسی سے پوری کی تھی۔ وہ تو ان کے ناظر کی دلہن تھی کیسے اور کوئی ان سے چھین کر لے گیا۔ یہ شدید صدمہ انہیں اندر سے بالکل توڑ گیا تھا۔ ان کی عروہ تو بہت نیک اور پیاری بچی تھی یقیناً وہ شخص ہی بہت شاطر تھا جس نے ان کی بچی کو کچھ ایسے بہکایا کہ وہ سب کی محبتوں اور خاندان کی عزت کی پروا کیے بغیر اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس وقت بھی انہیں اس شخص سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی جس نے ان کے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اپنی مظلوم بھابی کی اچانک موت کا مجرم بھی انہوں نے اسی شخص کو ٹھہرایا تھا۔ عروہ سے انہیں نفرت ضرور ہو گئی تھی لیکن اس کی وجہ بھی وہ اس آدمی کو مانتے تھے جس کا نام بھی انہیں نہیں پتا تھا۔

”تایا ابو پلیز آپ عروہ پر غصہ مت کیجیے گا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اسے ریلیکس رکھنے کی کوشش کرنی ہے۔“ ریشم کی آواز پر انہوں نے بے اختیار چونک کر اسے دیکھا۔ وہ روتے ہوئے چہرے کے ساتھ بڑی ملتجیانہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”نہیں بیٹا۔ اس حالت میں بھلا میں اسے کیا کہوں گا۔ ماں کا غم کچھ کم ہے جو میں اسے مزید اذیت میں مبتلا کر دوں۔“ ان کی آواز بھرا گئی تو ریشم ان کے سینے سے لگ کر بے ساختہ رو دی۔

”تایا ابو وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی بہت گم صم ہے۔ آنسو تھم ہی نہیں رہے تھے اس کے...... مجھے اپنی امی کے یوں اچانک چلے جانے کا ناقابلِ بیان دکھ ہے لیکن عروہ کو صدمے کے ساتھ ساتھ یہ گلٹ بھی مارے ڈال رہا ہے کہ امی اس کے دیے ہوئے زخم کو دل پر لے کر اس دنیا سے چلی گئیں۔“ ریشم کی بات پر تایا ابو ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔ کتنے دکھ اور پریشانیاں سہی تھیں ان لوگوں نے عروہ کے جانے کے بعد کیسے کیسے جھوٹ نہیں بولنے پڑے تھے عزیز و رشتے

کمرے میں آ گیا۔ کتنا سناٹا سا بکھرا ہوا تھا اس کے کمرے میں۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر عروہ کا وہ میک اپ کا سامان رکھا ہوا نظر آ رہا تھا جو اس نے بڑے چاؤ سے عروہ کو دلایا تھا۔ الماری میں ٹنگے ہوئے اس کے دو تین سوٹ جو اس نے اس کی پسند سے ہی خریدے تھے اسے بے اختیار عروہ کی یاد دلانے لگے۔

دل کچھ ایسا بے تاب ہوا کہ بھابی سے کیا ہوا وعدہ بھول کر وہ بے اختیار اسے کال ملانے لگا۔ نہ جانے کیوں اس کا دل اب بھی بھابی کی باتوں پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ ان کے سامنے تو بہت کچھ بول کر آ گیا تھا لیکن دل ہی دل میں عروہ کے لیے کافی فکر مند ہو رہا تھا۔ کچھ تو ایسی بات تھی جو وہ یوں گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ بدگمانی پر جب فکر اپنا سایہ پھیلانے لگی تو وہ اسے کال ملا بیٹھا لیکن عروہ کا تو سیل ہی آف تھا۔ ”اُف خدایا میں کیا کروں، کہاں ہو تم عروہ...... کیوں نہیں مجھ سے کانٹیکٹ کر رہیں۔ اتنی جلدی ہمت ہار دی تم نے۔ میری محبت سے زیادہ بھابی کی باتوں کی اہمیت تھی تمہاری نظروں میں۔ کچھ وقت تو دیا ہوتا مجھے...... میں نے تو آج سوچ لیا تھا کہ ہم اس گھر کو چھوڑ کر اپنی ایک الگ دنیا بسا لیں گے۔ عروہ اگر تمہارے موبائل میں کوئی پرابلم ہو رہی ہے تو تم کسی اور طرح سے مجھ سے کانٹیکٹ کر لو۔ پلیز عروہ مجھے تنہا نہ کرو۔“ وہ خاموش زبان سے اسے پکار رہا تھا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ اس کی عروہ پر کتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔

☆☆☆

وہ دو دن بعد آج ہوش میں آئی تھی۔ شدید نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اسے...... یہ دو دن قیامت بن کر گزرے تھے سب گھر والوں پر۔ ریشم کی رو، رو کر آنکھیں سوج گئی تھیں۔ دادی تو جیسے جانماز سے اٹھنا ہی بھول گئی تھیں۔ تائی کا اپنا حال برا تھا۔ بچپن سے ہی وہ انہیں ہمیشہ اپنے دل کے قریب محسوس ہوتی تھی۔ بہت معصوم اور کیئرنگ بچی تھی وہ...... پتا نہیں کیسے اتنا بڑا قدم اٹھا بیٹھی۔ تایا ابو نے ان دو دنوں میں ایک

داروں اور جاننے والوں کے سامنے لیکن اب اپنی گودوں پالی بچی کو اس حال میں دیکھ کر ان کا دل کٹا جا رہا تھا۔ کل تو ڈاکٹرز خاصے ناامید لگ رہے تھے اس کی طرف سے اور تایا ابو نے روتے ہوئے صدقِ دل سے اسے معاف کر کے اس کے بچ جانے کی دعا مانگی تھیں لیکن اب اس کے ہوش میں آجانے کے بعد وہ اس کے پاس جانے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہے تھے۔ اس کی ماں کی تعزیت کرتے یا اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے پتا نہیں کیوں کچھ بھی کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا ان کا۔ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی دل کی لیکن پھر ریشم کے اصرار پہ وہ بوجھل قدموں سے اس کے پاس چلے آئے۔ عروہ نے ان کو دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر جیسے ان سے خاموش معافی مانگی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ تایا ابو نے بے اختیار اسے لپٹا لیا اور وہ ان کے شفیق سینے سے لگ کر جیسے اپنا اختیار ہی کھو بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر نے آ کر جب ڈانٹ ڈپٹ کی تھی۔ بہ مشکل تمام اس نے تایا کو کمرے سے جانے دیا تھا۔

☆☆☆

شایان دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ کامران بھائی کی باتیں اس کے دل کو لگ رہی تھیں۔

''شایان! تمہارا سب سے غلط فیصلہ چھپ کر نکاح کرنے کا تھا۔ تم نے ذرا بھی نہ سوچا کہ اس کے یوں نکاح کر لینے سے اس کی بیوہ ماں اور معصوم بہن کیسے دنیا کو فیس کریں گی۔ اس نے تمہیں اپنے گھر کے سارے حالات بتا دیے تھے پھر تم نے کس دل سے اسے گمراہ کیا۔ تم خود ہی بتاؤ کہ کیا تم اسے وہ عزت دلا پائے جو خاندان میں آنے والی کسی بہو کا حق ہوتا ہے۔ کیسے، کیسے طنز و طعنوں کا نشانہ بنتی رہی وہ لوگوں کے۔ ارے جذبات میں کیے گئے فیصلے کبھی پائیدار نہیں ہوتے شایان۔ محبت کی جگمگاہٹ جب کم ہوتی ہے تب حقیقت ایک اندھیرا بن کر ہر طرف چھا جاتی ہے۔'' شایان نے بہت بے بسی سے انہیں دیکھا۔

''کامران بھائی میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی حالات سے گھبرا کر مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وہ مجھے ایک کال تو کرے میں اس کی ساری فکریں... سارے دکھ اپنے اندر سمیٹ لوں گا۔ وہ کیسے مجھ سے بے وفائی کر سکتی ہے۔ سچ کامران بھائی میرا دل کسی طرح یہ بات نہیں مان رہا۔'' کامران نے ایک سوچتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو شایان وہ تو ساری کشتیاں جلا کر تمہارے پاس آئی تھی۔ بینا کا اتنا برا سلوک بھی تمہاری خاطر سہہ رہی تھی۔ میرے خیال میں کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے ورنہ کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ وہ تم کو ایک کال بھی نہ کرتی۔ شایان اگر تمہیں اس کی محبت اور وفا پر یقین ہے تو تم بینا کی باتوں میں مت آؤ۔ اگر اس کے گھر والے تمہاری بے عزتی بھی کر لیں تو اس کی خاطر سہہ لو لیکن ابھی فوراً جا کر اس کی خبر لو۔'' کامران بھائی کی باتیں ایک آکسیجن کے مانند جیسے ایک بار پھر اسے جینے کی امید دلا رہی تھیں ورنہ وہ اندر سے بالکل ہی مرتا جا رہا تھا۔

''یہ لو میری کار کی چابی اور فوراً جا کر عروہ کا پتا کرو اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔'' انہوں نے جیب سے چابی نکال کر اسے تھمائی تو وہ انہیں شکر گزار نظروں سے دیکھتا ہوا تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ بینا بھابی کچن میں مصروف تھیں وہیں سے انہوں نے اسے باہر جاتے دیکھا۔

''شایان کہاں جا رہے ہو؟'' وہ اسے پکارتی ہوئی تیزی سے باہر آگئیں۔

''بھابی دل گھبرا رہا ہے۔ ذرا دوستوں میں جا رہا ہوں۔'' ان سے کسی بحث میں الجھنے کے بجائے اسے ان کو یہ ہی جواب دینا مناسب لگا۔ بینا بھابی نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور وہ اطمینان کی سانس لیتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ کبھی عروہ کے گھر نہیں گیا تھا۔ بس اسے وہ گلی معلوم تھی جہاں اس کا گھر تھا۔ اس نے کار کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور سامنے کھیلتے ہوئے بچوں سے عروہ کے گھر کے بارے میں پوچھنے کے لیے ان کے قریب چلا

آیا۔ عروہ کا نام سنتے ہی ایک آٹھ سالہ بچہ جوش میں اسے بتانے لگا۔

''ارے انکل! بیچاری عروہ باجی کی امی مرگئی تھیں ناں اس لیے وہ لوگ اپنے تایا ابو کے گھر شفٹ ہوگئے ہیں۔ عروہ باجی تو اسلام آباد میں تھیں جب زرین آنٹی کو ہارٹ اٹیک آیا تھا۔'' شایان ایک لمحے کو تو شاکڈ رہ گیا۔ یقیناً عروہ کو بھی یہاں آکر یہ خبر ملی ہوگی۔ نہ جانے کیا گزری ہوگی اس پر...... تنہا کیسے جھیلا ہوگا اس نے یہ صدمہ۔ شایان کے دل میں ملال اترنے لگا۔ اب اصل مسئلہ عروہ کے تایا کا گھر ڈھونڈنا تھا۔ اس نے بہت بہانے سے محلے کے ایک صاحب سے ان کا ایڈریس لے ہی لیا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ کیسے اس گھر میں داخل ہوسکتا تھا جہاں سے وہ ان کی ہونے والی بہو کو ان سے چرا کر لے گیا تھا۔ وہ کافی دیر سے تایا ابو کے گھر کے سامنے کھڑا اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ تبھی ایک چودہ، پندرہ سالہ لڑکا دروازہ کھول کر شاید دکان سے کچھ لینے کے لیے نکلا تھا۔ شایان لپک کر اس کے نزدیک آ گیا۔

''تم آفاق صاحب کے گھر کام کرتے ہو ناں!'' اس نے اپنے حساب سے تکا لگایا تھا جو ٹھیک ثابت ہوا۔

''اصل میں مجھے ان سے بہت ضروری کام تھا، کیا وہ گھر پر ہیں؟'' دل ہی دل میں ان کے گھر پر نہ ہونے کی دعائیں مانگتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''نہیں صاحب تو اسپتال گئے ہوئے ہیں۔ عروہ باجی کو نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔'' ایک لمحے کو شایان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ذہن جیسے ماؤف سا ہوگیا۔

''اچھا یہ کب ہوا...... کون سے اسپتال میں ہے وہ۔'' گھبراہٹ میں بہت بے ربط جملوں میں وہ پوچھتا چلا گیا۔ لڑکے نے کچھ حیرت سے اس کے پریشان چہرے کو دیکھا۔

''پرسوں جب وہ ہمارے گھر آئی تھیں بس اسی وقت ہوا تھا۔'' وہ کچھ جلدی میں تھا شایان کو اسپتال کا نام بتا کر آگے بڑھ گیا۔ شایان جس تیزی سے کار چلاتا ہوا اسپتال پہنچا تھا تو یہ بھی اُسی کا کمال تھا کہ وہ صحیح سلامت پہنچ گیا تھا ورنہ کئی جگہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوتے، ہوتے بچا تھا۔ راستے بھر اسے اپنے آپ پر جی بھر کر غصہ آتا رہا تھا۔ بھابی کے چڑھانے میں آکر وہ فضول میں دو دن عروہ سے لاتعلق ہوکر بیٹھا رہا تھا۔ کتنی کمزور محبت تھی اس کی۔ اسپتال پہنچ کر اسے کچھ وقت عروہ کا وارڈ ڈھونڈنے میں لگا اور پھر اس کے کمرے کے سامنے جا کر وہ جھجک کر رک گیا۔

وہ حواس باختہ ہوکر یہاں تک آ تو گیا تھا لیکن اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اندر کیسے جائے۔ یقیناً عروہ کے سب گھر والے اس کے پاس ہوں گے۔ اسے دیکھ کر نہ جانے ان سب کا کیا ری ایکشن ہو۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ تبھی ایک کافی بارعب سی شخصیت والے شخص کو اس نے عروہ کے کمرے کی جانب جاتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ شاید باہر سے کچھ پھل وغیرہ خرید کر آرہے تھے۔ شایان فوراً ہی سمجھ گیا کہ یہ عروہ کے تایا ابو ہیں۔ اس ایک ماہ میں عروہ سے ان کے متعلق اتنا سنا تھا کہ وہ اسے مکمل ازبر ہوگئے تھے۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ تیر کی طرح ان کی جانب بڑھا۔

''ایکسکیوزمی...... شاید یہ نوٹ آپ کے پاس سے گرا ہے۔'' عجلت میں اس نے جیب میں پڑا پانچ سو کا نوٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ تایا ابو نے رک کر جیب کو ٹٹولا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں بیٹا، یہ نوٹ میرا نہیں ہے۔'' وہ نرمی سے کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور وہ بے بسی سے ان کی پشت تکتا رہ گیا۔ جب وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہورہے تھے تو شایان کو عروہ کی ایک جھلک سی نظر آئی تھی۔ اس کا بس نہیں چلا کہ وہ بھاگ کر اندر چلا جائے اور عروہ کو اپنے پیار کی پناہوں میں چھپا لے۔ وہ وہیں زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے تھے۔ اتفاق سے تایا ابو موبائل پر کسی سے بات کرتے ہوئے باہر نکل آئے اندر شاید سگنل نہیں آرہے تھے۔

"ارے نہیں، ناظر اب وہ کافی بہتر ہے۔ تمہارے آنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں، نہیں اب میں اسے اس ناہنجار کے پاس ہرگز نہیں جانے دوں گا۔ ارے اس ایک ماہ میں کملا کر رہ گئی ہے میری بچی۔" وہ ناظر سے باتوں میں محو تھے اور شایان کا ذہن ان کی باتیں سنتے ہوئے بہت تیزی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ تایا ابو موبائل کانوں سے لگائے گاہے بگاہے ایک نظر اس نوجوان پر بھی ڈال لیتے تھے جو بے حد افسردہ سا زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی بہت روئی، روئی سی تھیں۔ بات ختم کر کے وہ اس کے نزدیک چلے آئے۔

"کیا بات ہے بیٹا تم کافی پریشان لگ رہے ہو۔ کون بیمار ہے تمہارا؟" ان کے لہجے میں بہت ہمدردی تھی۔ شایان جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"انکل کیا آپ مجھے پانچ منٹ دے سکتے ہیں؟" اس نے اتنے یاس سے پوچھا کہ انہیں مجبوراً اثبات میں سر ہلانا پڑا۔ شایان نے کچھ جھجکتے ہوئے ان کا ہاتھ تھاما۔

"انکل آیا تو میں اپنے دوست کو دیکھنے تھا لیکن جب اچانک آپ پر نظر پڑی تو جیسے میرا دل تھم سا گیا۔"

"کیوں بیٹا اب میں اتنا بھی بھیانک نہیں ہوں۔" آفاق صاحب نے بہت حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"نہیں انکل! ایسی بات نہیں ہے۔ اصل میں آپ کو دیکھ کر مجھے اپنے بابا یاد آ گئے۔ ہو بہو آپ کی کاپی تھے۔ تبھی میں نے پہلے بھی بے اختیار آپ کو روکا تھا حالانکہ وہ پیسے میرے اپنے تھے۔" سر جھکا کر اس نے آخری جملہ سچ بول دیا۔ آفاق صاحب دھیمے سے مسکرا دیے۔

"کوئی بات نہیں، تم میرے بیٹے ناظر کے ہی تو ہم عمر لگ رہے ہو۔ تم پہلے بھی مجھ سے بات کر سکتے تھے ناحق وہ ڈراما کھیلا۔" ان کے لہجے میں شفقت محسوس کر کے جیسے شایان کی جان میں جان آ گئی۔ دس پندرہ منٹ کی اس ملاقات میں اپنی میٹھی زبان سے اس نے کافی حد تک ان کا دل جیت لیا تھا۔ موبائل نمبر بھی ایک دوسرے سے لیے گئے۔ شایان نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی ان کو دے دیا تھا۔ آفاق صاحب کو یہ پڑھا لکھا

غزل

دل مسیحا ہے سمجھتا ہے طبیعت اس کی
نرم گفتار سہی تلخ ہے عادت اس کی

تم ذرا پیار سے پوچھو کہ یہ قصہ کیا ہے
کیوں بھلا چاند نے اوڑھی ہے شباہت اس کی

حسن بکنے پہ جو آیا تو طوائف بن کر
اک تماشائی نے طے کی تھی یہ قیمت اس کی

لوگ اتنے بھی تیرے شہر کے سچے تو نہیں
سن تو لیتی تھی ذرا دیر وضاحت اس کی

دل یہ کہتا ہے چلو لوٹ چلیں اس کے نگر
یاد آتی ہے سر شام رفاقت اس کی

مرسلہ: فرحانہ ناز ملک، ڈی جی خان

بااخلاق اور تمیز دار نوجوان پسند آیا تھا۔

"میرا اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔ بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک میں اپنے آپ کو لیکن اب آپ سے ملنے کے بعد پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اب میں تنہا نہیں ہوں۔" آفاق صاحب کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے کچھ اتنے جذباتی انداز میں یہ جملے بولے کہ ان کے اٹھتے قدم رک گئے۔

"میاں آج کل جو حالات چل رہے ہیں ان میں کسی اجنبی سے اتنی دیر بات کرنا تو دور کی بات میں پاس ٹھہرنا بھی اگنور کرتا ہوں لیکن تمہاری شخصیت تمہاری باتیں تمہارے کردار کی گواہی دے رہی ہیں اور ماشاء اللہ سے جس کمپنی میں تم جاب کر رہے ہو وہاں میں بھی کام کر چکا ہوں۔" آفاق صاحب کی بات پر شایان نے بہت ایکسائٹڈ ہو کر انہیں دیکھا۔

"ارے رئیلی انکل! میرے آفس میں؟" تب آفاق صاحب... تقریباً دس پندرہ منٹ تک اس کی

کمپنی میں کی گئی اپنی جاب کے بارے میں تفصیل بتاتے رہے۔ وہ بظاہر بہت دل جمعی سے ان کی کتھا سن رہا تھا لیکن دماغ بہت تیزی سے آگے کی پلاننگ کررہا تھا۔ تایا ابو کا دل جیتنا ہی جیسے اب اس کی زندگی کا سب سے اہم مشن تھا۔

''اچھا بیٹا، اب میں چلتا ہوں۔ گھر والے پریشان ہورہے ہوں گے۔'' اچانک ہی وہ چونک کر آگے بڑھے۔

''انکل مائنڈ نہ کریں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا کون یہاں ایڈمٹ ہے؟'' اس کے سوال پر انہوں نے رک کر اسے ایک لمحے کو دیکھا۔

''میری بھتیجی کو نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا لیکن اب ماشاءاللہ بہتر ہے۔ شاید کل تک چھٹی مل جائے۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر بتایا اور پھر خداحافظ کہتے ہوئے اندر کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر خاموش کھڑا بند دروازہ تکتا رہا اور پھر تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹ آیا۔ بینا بھابی سے بات کرنے کا تو ابھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ انہیں سرسری سا سلام کرتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ دل جیسے بیٹھا جارہا تھا۔ تبھی اسے کامران بھائی کے زور، زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں وہ شاید بینا بھابی پر برس رہے تھے۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آیا۔ کامران بھائی کچن میں کام کرتی بینا بھابی کے سر پر کھڑے بہت زہر آلود لہجے میں اس موبائل کے بارے میں پوچھ رہے تھے جو اس وقت ان کے ہاتھوں میں تھا شایان ایک لمحے میں عروہ کے موبائل کو پہچان گیا وہ بے قراری سے آگے بڑھا۔

''کامران بھائی یہ تو عروہ کا موبائل ہے۔ آپ کو کہاں سے ملا۔''

جواباً کامران نے ایک تیز نگاہ بینا پر ڈالی جو شدید شرمندگی اور کھسیاہٹ میں اپنی انگلیوں کو مروڑ رہی تھیں۔

''یہ مجھے بینا کی الماری سے ملا ہے۔'' کامران بھائی کے اس انکشاف پر شایان جیسے ششدر رہ گیا۔

''میں نے ہزار بار کہا ہے کہ اگر آپ کو کوئی چیز ڈھونڈنی ہو تو مجھ سے کہا کریں۔ فضول میں میری الماری کو الٹ کر رکھ دیتے ہیں۔'' اپنی شرمندگی پر قابو پاتے ہوئے وہ الٹا ان ہی پر چڑھ دوڑیں۔

''لیکن عروہ کا موبائل آپ کی الماری میں کیسے پہنچا؟'' کامران کے کچھ بولنے سے قبل شایان نے بہت تلخ لہجے میں اس سے پوچھا۔

''ارے مجھے کیا پتا، یہ بھی تمہاری بیوی کی کوئی چال ہوگی مجھے بدنام کرنے کی۔'' وہ روتے ہوئے کمرے میں چلی گئیں۔

''واہ ڈھیٹ لوگوں کی اعلیٰ مثال ہے میری بیوی۔'' کامران بھائی نے غصے میں سامنے رکھی کرسی پر لات ماری۔ اب شایان کو سمجھ میں آرہا تھا کہ عروہ اسے کیوں نہیں کال کرسکی تھی۔ کامران بھائی کو اس نے عروہ کے نروس بریک ڈاؤن اور تایا سے اپنی ملاقات کے بارے میں جب بتایا تو وہ بھی پریشان ہوگئے۔

''شایان اب تم جو بھی قدم اٹھانا بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا۔ اس کے تایا یقیناً تمہیں کسی صورت قبول نہیں کریں گے۔'' ان کی بات بالکل ٹھیک تھی ناظر سے فون پر جس طرح وہ اس سے نفرت کا اظہار کررہے تھے، وہ گفتگو اسے اچھی طرح سے یاد تھی۔ اس کا دل چاہا کل اسپتال سے عروہ کو سیدھا اپنے گھر لے آئے، آخر وہ اس کی بیوی تھی۔ کوئی بھی اسے نہیں روک سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ شدید نروس بریک ڈاؤن کے بعد اسے ٹینشن دینا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اسے صبر سے کام لے کر تایا ابو کا دل جیتنا تھا ان پر اپنا اتنا اچھا امپریشن ڈالنا تھا کہ وہ خود عروہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے پر تیار ہوجائیں۔ لیکن اس کے لیے عروہ کو اعتماد میں لینا ضروری تھا اور وہ کیسے عروہ سے ملے پہلے کیسے اپنی محبت اور اپنے ساتھ کا یقین دلائے؟ یہ ہی فکر اسے مارے ڈال رہی تھی پھر ایک دم ہی اسے ردا اور اشعر کا خیال آیا تھا وہ ہی اس معاملے میں اس کی مدد کرسکتے تھے۔ بینا بھابی نے کمرے میں آکر اپنی طرف سے

بہت صفائی دینے کی کوشش کی تھی لیکن شایان کا دل ان سے کچھ ایسا خراب ہو رہا تھا کہ وہ بنا کوئی بات کیے گھر سے نکل آیا تھا۔ حسب معمول کامران نے زبردستی اپنی کار کی چابی اسے دے دی تھی بقول ان کے ہو سکتا ہے کہ عروہ کو لے کر اسے آنا پڑ جائے پھر بھلا اس حالت میں وہ موٹر سائیکل پر کیسے آتی۔ اسے کتنی تقویت محسوس ہو رہی تھی اپنے بڑے بھائی کے اس خیال اور اس سپورٹ پر...... وہ سیدھا اشعر کے گھر جا پہنچا۔ ان کے ہنی مون سے واپس آنے کے بعد اتفاق سے اس کا ان لوگوں سے ملنا ہی نہیں ہوا تھا۔

ردا اور اشعر دونوں ہی اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی شادی سے شروع ہوا ایک افسانہ اب کتنے عجیب موڑ پر پہنچ گیا ہے۔ انہیں تو اس افسانے کی الف ب بھی نہیں پتا تھی۔ اشعر نے شایان کا اترا ہوا چہرہ، بڑھی ہوئی داڑھی اور آنکھوں سے جھلکتے ایک عجیب سے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے کچھ پریشان ہو کر اس سے وجہ پوچھی اور وہ تو جیسے اپنی داستانِ غم سنانے کے انتظار میں تھا۔

ردا اور اشعر انتہائی شاکڈ کے عالم میں اسے سن رہے تھے۔ ردا کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ عروہ کوئی ایسا قدم اٹھا سکتی ہے۔

''یہ کیسی محبت تھی تم دونوں کی شایان جس کی وجہ سے عروہ نے اپنی ماں کو کھو دیا؟ خاندان کی عزت برباد کر دی۔ کم از کم ہم ہی لوگوں کو کچھ بتا دیتے۔ شاید کوئی راستہ نکال لیتے ہم سب مل کر۔'' اس نے بہت خفگی سے شایان کو دیکھا۔

''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ردا۔ پلیز اب تم بھی زیادہ نشتر نہیں لگاؤ کہ پہلے ہی سب کے طعنے تشنے سن، سن کر دل چھلنی ہو چکا ہے۔'' شایان نے کچھ ایسی عاجزی سے کہا کہ وہ چپ ہو گئی۔ ویسے بھی عروہ کے نروس بریک ڈاؤن کا سن کر وہ فکرمند بھی ہو رہی تھی۔ تینوں کافی دیر بیٹھے اس مسئلے کو ڈسکس کرتے رہے اور جب شایان ان لوگوں کے پاس سے اٹھا تو دل پر چھائی فکر کی دھند کو امید کی چمکتی دھوپ نے کافی حد تک ختم کر دیا تھا۔

☆☆☆

عروہ کتنی ہی دیر ردا کے گلے لگ کر روتی رہی تھی۔ آنسو کسی طرح تھم ہی نہیں رہے تھے۔

''ردا خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ امی اپنے دل پر اتنا گہرا اثر لیں گی تو میں نکاح کرنا تو دور کی بات کبھی شایان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری یہ محبت میری ماں کی جان لے جائے گی۔'' ردا نے تاسف سے اس کی جانب دیکھا جس کی آنکھوں میں پچھتاوا آنسو بن کر جھلملا رہا تھا۔

''ردا میں نکاح کر کے شایان کے ساتھ اپنی سسرال گئی تھی لیکن پھر بھی وہاں سب نے بہت حقارت سے مجھے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کا خطاب دیا۔ میری امی کی دعائیں نہیں تھیں نا میرے ساتھ...... کتنے لوگوں کا دل توڑ کر میں نے شایان کے ساتھ رشتہ جوڑا۔ شاید اسی کی سزا ملی ہے مجھے۔'' کتنی ٹوٹی ہوئی لگ رہی تھی وہ...... آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، زرد چہرہ اور بکھرے بالوں کے ساتھ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ایک ماہ کی دلہن ہے۔

''عروہ تمہیں پتا ہے کہ شایان تمہارے لیے کتنا پریشان ہے۔'' ردا نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بہت راز داری سے اسے بتایا۔ وہ ابھی کچھ دیر قبل ہی اسپتال پہنچی تھی۔ ڈاکٹرز نے عروہ کو مزید دو دن اسپتال میں روک لیا تھا کہ ابھی اس کی طبیعت پوری طرح سے سنبھلی نہیں تھی۔ ردا جب کمرے میں آئی تو ریشم اور تائی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ تایا ابو دادی کو لینے گئے ہوئے تھے۔ ردا کو دیکھ کر وہ دونوں کچھ دیر کے لیے باہر چلی گئی تھیں تا کہ عروہ اپنی دوست سے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔

''مجھے کچھ میں نہیں آ رہا تھا ردا...... کہ میں شایان سے کیسے کانٹیکٹ کروں۔ یہاں پر تو کسی کے سامنے اس کا نام لینا بھی جیسے گناہ میں شمار ہو جاتا۔ سب کے لیے جیسے وہ ہی امی کی موت کا ذمے دار ہے اور شاید یہ لوگ اپنی جگہ درست ہیں۔'' عروہ کی آواز بھرا گئی پھر اس

نے آس بھری نگاہوں سے ردا کی جانب دیکھا۔
''شایان کا کوئی پیغام لائی ہو کیا؟ تم لوگوں کو میرے اوپر گزرنے والی قیامت کا کیسے پتا چلا؟'' ایک ہی سانس میں اس نے دو سوال کر دیے۔ ردا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے شایان کا اس کے گھر جانے سے لے کر تایا ابو سے ملاقات تک کی ساری روداد سنا ڈالی۔ عروہ کو یقین ہی نہیں آیا کہ شایان نے تایا ابو سے مل کر ان سے دوستی بھی کر ڈالی ہے۔
''ردا میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے اگر تایا ابو کو حقیقت کا علم ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟'' عروہ کے چہرے پر خوف کے سائے لرزاں تھے۔
''انشاء اللہ اس وقت تک شایان ان کے دل میں اپنی اتنی جگہ بنا چکا ہوگا کہ وہ اس کی قدر کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' ردا نے پورے وثوق سے اسے تسلی دیتے ہوئے پرس میں سے اس کا موبائل نکالا۔
''اور ہاں شایان نے تمہارا یہ موبائل بھجوایا ہے جو شاید تم جلدی میں گھر بھول آئی تھیں۔ تمہیں جیسے ہی موقع ملے اس سے فوراً کانٹیکٹ کر لینا۔ ان فیکٹ ابھی کمرے میں کوئی نہیں ہے تم جلدی سے اسے اپنی آواز سنا دو... بیچارے کو شاید کچھ قرار آجائے۔'' عروہ نے فوراً ہی نمبر ملایا اور شایان کی آواز سن کر جیسے وہ اپنا اختیار کھو بیٹھی۔
''شایان، میری امی مر گئیں۔ ریشم بتا رہی تھی کہ میرے جانے کے بعد ان کو بالکل چپ لگ گئی تھی۔ یہ میں نے کیا کر دیا شایان۔'' وہ سسک سسک کر رو رہی تھی جبھی نرس اچانک ہی کمرے میں آئی تھی اور اسے یوں روتا دیکھ کر اس نے بہت سختی سے ردا کو ڈانٹا تھا۔
''یہ آپ لوگ پیشنٹ کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سختی سے منع کیا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ڈپریسڈ باتیں نہ کی جائیں انہیں خوش رکھنے کی کوشش کی جائے بھی تو ان کی حالت بہتری کی طرف نہیں جا رہی ہے۔'' عروہ نے گھبرا کر فون بند کر دیا کہ اسی وقت تایا ابو بھی کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔

☆☆☆

''ریشم بیٹا آج ذرا کھانے پر کچھ اچھا انتظام کر لینا۔ میں نے شایان کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔'' تایا ابو کی آواز جیسے امرت بن کر عروہ کے کانوں میں اتر گئی لیکن وہ بظاہر انجان بنی دادی سے اپنے سر میں تیل لگواتی رہی۔ آج اسے اسپتال سے گھر آئے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ ہو رہا تھا۔ شایان سے موقع پا کر وہ روز ہی بات کر لیا کرتی تھی۔ تایا ابو اور دادی نے اسے معاف کر کے اپنی شفقت کی پناہوں میں ضرور لیا تھا لیکن تایا ابو نے اپنی ہر بات سے یہ واضح کر دیا تھا کہ اب وہ عروہ کو کبھی اس شخص کے پاس واپس نہیں بھیجیں گے جس کی وجہ سے وہ لوگ اتنی ذہنی اذیت سے گزرے تھے۔ ان کا پورا ارادہ تھا کہ وہ بہت جلد عروہ کی اس شخص سے خلع کروا دیں گے۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ انہوں نے عروہ سے کبھی اس کے شوہر کا نام تک پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس پورے گھر میں سوائے ریشم کے کسی کو بھی اس کے شوہر کا نام معلوم نہیں تھا جب عروہ اسپتال سے گھر آئی تھی تو ریشم نے اس سے لپٹ کر روتے ہوئے اس سے التجا کی تھی کہ اب وہ کبھی اسے چھوڑ کر نہ جائے۔ کتنی سہمی ہوئی سی لگ رہی تھی اس کی چھوٹی بہن..... عروہ کا ایسے گھر سے چلے جانا ..... امی کی اچانک موت اور پھر ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ کر تایا ابو کے یہاں منتقل ہو جانا جیسے اس کی شخصیت کو بالکل ہی بکھیر گیا تھا۔ دل اتنا چھوٹا ہو گیا تھا کہ بات بے بات وہ رونے لگتی تھی۔ ایسے میں عروہ کو دوبارہ پا کر جیسے اسے ایک عجیب سی تقویت اور ڈھارس کا احساس ہونے لگا تھا اور عروہ نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اب وہ اپنی بہن کو کبھی تنہا نہیں چھوڑے گی۔ جانتی تھی کہ اگر اس بار وہ تایا ابو اور دادی کی مرضی کے بغیر اس گھر سے گئی تو شاید پھر کبھی نہ اپنی بہن سے مل سکے گی اور نہ کبھی اسے میکے کا مان نصیب ہوگا۔ اور یہی بات اس نے صاف صاف شایان کو بھی بتا دی تھی۔
''شایان اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کس طرح عزت سے مجھے میرے گھر سے لے کر جاتے

ہیں۔ میں چاہوں تو ابھی اسی وقت آپ کے پاس آسکتی ہوں لیکن شایان اب میرا دل مزید ذلت سہہ کر اس گھر میں رہنے پر آمادہ نہیں جہاں بینا بھابی اور دوسرے لوگوں کی حقارت آمیز نگاہیں اور طنزیہ جملے مجھے اپنے وجود سے نفرت کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔'' شایان کی بے قراری پر اس دن فون پر اس نے بہت رسان کے ساتھ اسے سمجھایا تھا۔

''عروہ تم میری زندگی ہو مجھ سے اب تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں جیا رہا۔ ہم اپنی خوشیاں بینا بھابی اور ان جیسی دوسری عورتوں کی بھینٹ کیوں چڑھائیں۔ تم واپس آجاؤ، میں نے علیحدہ گھر کا بندوبست کرلیا ہے اور تمہارے تایا ابو کو میں جلد۔۔۔ رام کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔'' شایان کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''نہیں شایان اب مجھے احساس ہوا ہے کہ محبت کو اتنا خودغرض نہیں ہونا چاہیے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے اللہ کے بنائے ہوئے اتنے خوب صورت رشتوں کو روند دیا جائے۔ میں نے اپنی امی کو تو کھودیا ہے لیکن اپنی معصوم بہن کو کھودینے کا مجھ میں بالکل حوصلہ نہیں۔ دادی اور تایا ابو کی محبت اور شفقت کے بغیر صرف آپ کا ساتھ مجھے کبھی مکمل زندگی نہیں جینے دے گا۔ میں سب رشتوں کو ساتھ لے کر جینا چاہتی ہوں شایان۔'' وہ بے بسی سے رودی تھی اور شایان جیسے اس کے دلائل کے سامنے ہار گیا تھا۔ تبھی تو تایا ابو کا دل جیتنے کی مہم اب اس نے کچھ اور تیز کردی تھی۔ اس دن اس نے تایا ابو کو اپنے آفس چائے پر بھی بلالیا تھا۔ اپنے پرانے آفس آکر وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ کتنی ہی یادیں انہوں نے شایان سے شیئر کی تھیں اور اس نے بہت دل جمعی سے انہیں سنا تھا۔ آفس کے سبھی ان کے جاننے والوں نے انہیں عزت سے نوازتے ہوئے شایان کی ریکویسٹ پر ان کے لیے ساتھ چائے بھی پی تھی اور جب ایک بھرپور وقت گزار کر وہ خوشی خوشی گھر واپس لوٹے تو سارا وقت ان کے لبوں پر شایان اور آفس کا تذکرہ اور تعریفیں رہی تھیں جسے عروہ نے چمکتی

آنکھوں کے ساتھ سنا تھا۔ ریشم اس کی غم گسار اور راز دار تھی جو ہمیشہ اس کے ہاتھوں میں امید کی مہکتی کلیاں تھما کر اسے ایک جگمگاتے مستقبل کا خواب دکھلاتی رہتی تھی۔ وہ دل سے اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے دعاگو تھی کہ اسے شایان کے ٹاسک کا علم تھا۔ اگر تایا ابو شایان سے راضی ہوجاتے تو یہ دونوں بہنیں بھی کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتی تھیں۔ ناظر کا بھی فون آتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ابو کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ وہ عروہ کو عزت کے ساتھ اس کے شوہر کے ہمراہ رخصت کردیں لیکن وہ تو یہ بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ جاتے تھے۔ اس کی عروہ سے بھی بات ہوتی رہتی تھی۔ عروہ نے بہت شرمندگی کے ساتھ اس سے معافی مانگی تھی جسے اس نے صاف دلی سے قبول کرلیا تھا۔

''کوئی بات نہیں عروہ، یہ تو دل کے معاملے ہوتے ہیں جس پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ بس تمہارا طریقہ غلط تھا کاش تم مجھ سے بات کرلیتیں تو آج تمہیں اور ہم سب کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔'' ناظر نے کچھ آزردہ ہو کر کہا تو وہ مزید شرمندہ ہوگئی۔

''ناظر اب میں وہ غلطی دوبارہ نہیں دُہراؤں گی۔ مجھے تجربہ ہوگیا ہے کہ اپنے خاندان کے بغیر میں کبھی خوش رہ ہی نہیں سکتی۔ بس دعا کرو کہ اللہ میرے لیے خوشیوں کا در کھول دے۔'' عروہ کی آواز بھرّا گئی تو ناظر نے فوراً ہی تسلی دیتے ہوئے ٹاپک بدل دیا۔

''تم فکر نہ کرو۔ حالات کے اتار چڑھاؤ وقت کے تقاضے ہوا کرتے ہیں اور ہر وقت گزر ہی جاتا ہے۔ بس یقین کو اپنے اندر زندہ رکھنا چاہیے اور ہاں دادی اور امی دونوں مسلسل مجھ پر زور دے رہی ہیں کہ میں ریشم سے میرا مطلب ہے کہ....'' وہ گڑبڑا کر جملہ پورا نہیں کرسکا۔

''ارے یہ تو زبردست نیوز سنائی تم نے۔ کمال ہے دادی اور تائی امی نے کوئی ذکر نہیں کیا۔'' عروہ بہت ایکسائٹڈ ہوگئی۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے عروہ لیکن میں چاہ رہا ہوں کہ تم پہلے ریشم کی مرضی معلوم کرلو، میں یہ ہرگز نہیں

چاہوں گا کہ وہ امی یا دادی کے دباؤ میں آ کر کوئی فیصلہ کرے۔" ناظر کے جملوں میں چھپے اندیشے عروہ کو بے جا نہیں لگے۔ وہ پہلے ہی اس سلسلے میں چوٹ کھا چکا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں ایک انجانی سی خوشی اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ امی کے انتقال کے بعد وہ ریشم کو اپنی ذمے داری محسوس کرنے لگی تھی۔ آج اسے تایا اور تائی کی عظمت کا مزید احساس ہونے لگا تھا جنہوں نے اس کی خطا درگزر کر کے اس کی بہن کو اپنی بہو بنانا چاہا تھا اور ناظر نے بھی کتنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ ان لوگوں کے پیروں پر اپنا سر رکھ دے۔ اگلے ہفتے ناظر آنے والا تھا۔ اداسی کے اس ماحول میں ان دونوں کے رشتے کا یہ خوب صورت سا تانیک بڑی معصوم سی خوشی بن کر سب کے دلوں کو جگمگا گیا۔ ریشم کی رضامندی جاننے کے بعد ناظر کو بھی مطلع کر دیا گیا تھا۔ اس اثنا میں تایا ابو اور شایان کا میل جول بھی کافی بڑھ چکا تھا۔ تایا ابو کے خریدے ہوئے ایک پلاٹ کا بھی کچھ مسئلہ چل رہا تھا جسے شایان نے بھاگ دوڑ کر کے جلدی حل کروا دیا تھا۔ تبھی تو آج اس خوشی میں انہوں نے شایان کی دعوت رکھی تھی۔ عروہ کچن میں دادی کے لیے چائے بنانے جا رہی تھی۔ اچانک ہی تایا ابو اور تائی کی کمرے سے باہر آتی آوازوں پر وہ ٹھٹک کر رک گئی کہ موضوع بحث وہی تھی۔

"تم مجھ سے فضول کی بحث مت کرو امینہ جو شخص کسی لڑکی کو ورغلا کے اس سے نکاح کر لے میں اسے... ناقابلِ اعتبار سمجھتا ہوں اور نہ ہی میری نظر میں اس کا کوئی کردار ہے۔ خدا کی قسم میرے بس میں ہو تو میں اسے گولی مار دوں۔ ارے وہ سونے کا بھی بن کر آ جائے تو بھی میں اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دوں گا۔" غصے میں ان کی اونچی ہوتی ہوئی آواز جیسے عروہ کا دل ڈبونے لگی۔

"لیکن آفاق ذرا یہ بھی تو سوچیں کہ وہ بیچاری آخر اپنی ساری زندگی کیسے گزارے گی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ عروہ ایسے گھر واپس آ جائے گی تو میں کبھی ناظر سے ریشم کی بات نہ کرتی لیکن اب....." وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ہم بار بار ناظر کے احساسات کو مجروح نہیں کر سکتے۔ پہلے عروہ پھر ریشم اور اب دوبارہ عروہ کا نام لینا کوئی تماشا ہے بھلا۔ ویسے تم فکر مت کرو۔ ایک بار اس خبیث سے عروہ کا پیچھا چھوٹ جائے تو ایک بہت اچھا لڑکا ہے میری نظر میں..... اس کی بات چیت سے ہی اس کے خاندانی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔" تایا ابو یہ کس کا ذکر کرنے جا رہے تھے۔ عروہ کا رواں رواں سماعت بن گیا۔

"آپ کا اشارہ کہیں شایان کی طرف تو نہیں ہے۔ اتنے دنوں سے اس کی تعریفیں سن سن کر میرے تو کان پک گئے ہیں۔" تائی نے ہنس کر انہیں دیکھا۔

"ارے میں بلا وجہ کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔ آج کل کے نوجوانوں سے بالکل مختلف ہے وہ..... بہت رکھ رکھاؤ ہے اس میں۔ بڑوں کی عزت کرنا جانتا ہے۔ آفس میں بھی ہر کوئی اس کی عزت کر رہا تھا۔ اس کے اکاؤنٹنٹ صاحب تو کہہ رہے تھے کہ سب سے ایمان دار محنتی نوجوان ہے وہ ان کے آفس کا۔"

"تو آفاق صاحب اتنی کوالٹیز والا لڑکا کیا عروہ سے شادی پر مان جائے گا؟ اگر اسے عروہ کے نکاح اور شوہر کے ساتھ ایک ماہ رہنے کا پتا چلے گا تو آپ کا کیا خیال ہے وہ پھر بھی راضی ہو جائے گا؟" تائی امی کی بات میں وزن تھا وہ ایک لمحے کو چپ سے ہو گئے۔

"خیر یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے تو اس ذلیل آدمی سے عروہ کا خلع کروا دوں پھر اس سلسلے میں بات آگے بڑھاؤں گا۔ تم آج کل میں عروہ سے اس کا مکمل نام اور پتا مجھے لا دو۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ خود ہی طلاق دے دے۔ ویسے ایسے لڑکے پیسوں کے لالچ میں آ کر بھی طلاق دے دیتے ہیں۔"

عروہ ڈگمگاتے قدموں سے کچن میں چلی آئی۔ ریشم نے چونک کر اس کی اڑی ہوئی رنگت کو دیکھا۔

"ریشم تایا ابو، شایان کا نام اور ایڈریس معلوم کرنا چاہ رہے ہیں۔ اب کیا ہو گا؟" وہ سخت خوف زدہ لگ رہی

تھی۔ ریشم نے پیار سے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

"فکر مت کرو عروہ اور پوزیٹو خیالات کا زندگی سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ میں ہر وقت یہ ہی سوچا کرتی تھی کہ تم ایک بار پھر ہم سب سے آملو گی اور دیکھو یہ معجزہ ہی ہے کہ تایا ابو نے تمہیں معاف کر دیا۔" عروہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر سر جھکا لیا۔

"کاش شایان کے لیے بھی کوئی ایسا معجزہ ہو جائے اور ریشم تم کہتی ہو تایا ابو میرا رشتہ شایان سے کرنا چاہ رہے ہیں لیکن کہہ رہے تھے کہ پہلے اس خبیث آدمی سے، مجھے طلاق دلوا دیں گے۔" وہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے تو بولی ریشم بھی بے ساختہ ہنس دی تھی۔



"انکل کھانا تو واقعی میں زبردست پکا تھا۔ میں تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کھا گیا ہوں۔" گرین ٹی پیتے ہوئے شایان نے ایک بار پھر کھانے کی تعریف کی تو دادی نے شفقت سے اسے دیکھا۔

"ارے بیٹا اب اتنے مزے کا بھی نہیں تھا۔ جتنی تم تعریف کیے جا رہے ہو۔ ویسے تمہاری جتنی تعریف آفاق کرتا تھا مجھے تو تم اس سے بھی بڑھ کر لگے ہو۔" شایان کے چہرے، پر دادی کے جملوں نے روشنی بکھیر دی۔ بے ساختہ اس کی نظریں سامنے بیٹھی ہوئی عروہ سے ملی تھیں جب سے وہ آیا تھا چوری، چوری اسے تکتے ہوئے اس کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ بس چلتا تو وہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر ابھی اسی وقت یہاں سے کہیں دور چلا جاتا۔ لائٹ پنک کلر کے سوٹ میں وہ اسے اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کتنی بے بسی محسوس کر رہا تھا وہ...... عروہ اس کی تھی لیکن وہ غیروں کی طرح سب کی نظریں بچا کر اسے دیکھنے پر مجبور تھا۔ کتنے فاصلے حائل تھے ان دونوں کے درمیان پھر بات شعر و شاعری پر چلی تو اس نے تایا کی اجازت سے اپنے پسندیدہ شاعر کے کچھ اشعار اپنی بھاری دلکش آواز میں سنا کر جیسے عروہ سے اپنا حالِ دل کہہ ڈالا۔

وہ بظاہر جو کچھ نہیں لگتے
ان سے رشتے بلا کے ہوتے ہیں
وہ ہمارا ہے اس طرح سے فیض
جیسے بندے خدا کے ہوتے ہیں

عروہ نے بہت اداس نظروں سے اسے دیکھا اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

"بیٹا تم مائنڈ نہ کرنا، اصل میں میری یہ بھتیجی بہت دکھی ہے۔ بہت بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے اس کے ساتھ۔" تایا ابو جیسے موقع ہی ڈھونڈ رہے تھے۔ اس ٹاپک کو چھیڑنے کے لیے۔

"کیسی ٹریجڈی انکل؟" شایان نے بالکل انجان بن کر ان سے پوچھا اور دل ہی دل میں ان... زہر افشانی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا جو ابھی تایا ابو کے منہ سے وہ اپنے لیے سننے والا تھا اور یہی ہوا۔ تایا ابو نے جس طرح دل لگا کر اس کی کردار کشی کی، خوب صورت گالیوں سے نوازا اور ساتھ ساتھ تڑکے کے طور پر دادی کے کوسنے بھی شامل رہے تھے۔ وہ تحمل سے سب کو سنتا رہا بلکہ کئی جگہ پر اسے ہاں میں ہاں ملانے کا فریضہ بھی انجام دینا پڑا تھا۔ ریشم سے اپنی ہنسی روکنا محال ہو رہا تھا، وہ چائے بنانے کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ آئی تھی۔

"دیکھو بیٹا اب تم مجھے اپنے خاندان کے فرد کی طرح لگنے لگے ہو بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تم سے مل کر مجھے اب ناظر کی کمی زیادہ نہیں محسوس ہو رہی۔ بیٹا اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ تم اس ذلیل اور خبیث آدمی سے مل کر اسے مجبور کرو کہ وہ عروہ کو طلاق دے دے اگر میں اس سے خود مل لیا ناں تو ہو سکتا ہے جذبات میں آ کر میں کہیں اس کا خون نہ کر بیٹھوں۔" شایان نے ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھا۔

"لیکن انکل پہلے ہمیں آپ کی بھتیجی سے بھی تو پوچھنا چاہیے کہ وہ طلاق لینا بھی چاہتی ہے یا نہیں آخر نکاح بھی دونوں کی مرضی سے ہی ہوا ہے۔"

"میری بیٹی ایک بار غلطی کر سکتی ہے بار بار نہیں۔ اور نہ ہی میں اس سے یہ حماقت آمیز سوال کر سکتا ہوں۔ شایان اگر تم اس سلسلے میں میری مدد نہیں کر سکتے تو کوئی بات نہیں لیکن مجھ سے آئندہ ایسی احمقانہ بات مت کرنا۔" تایا ابو نے بہت برا مان کر اسے غصے سے دیکھا۔ وہ ان کے کھولتے ہوئے لہجے پر گڑبڑا گیا۔

"نہیں، نہیں انکل آپ فکر مت کریں، میں اس ناہنجار سے ضرور بات کروں گا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ اس میں عروہ صاحبہ کا بالکل قصور نہیں، انشاء اللہ آپ کا کام ضرور ہو جائے گا۔" بوکھلاہٹ میں وہ فوراً ہی ان سے وعدہ کر بیٹھا۔ تایا ابو کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا۔

"ٹھیک ہے، میں عروہ سے اس کا نام اور ایڈریس وغیرہ سب لا کر تمہیں دے دوں گا بس تم جتنی جلدی ہو سکے ہے یہ کام کرو، میری بچی کی زندگی برباد کر کے رکھ دی اس نے ..... بہت معصوم بچی ہے انشاء اللہ میں اسے دوبارہ سے زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دوں گا۔" اپنی ہر بات ہر جملے سے وہ عروہ کو بے خطا اور معصوم ٹھہرا کر اس کی نظروں میں اپنی بچی کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اپنے لیے گالیوں کی یلغار سنتے ہوئے وہ بہت بے بسی سے اثبات میں سر ہلائے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"شایان مجھے تو دور، دور تک اندھیرا سا نظر آ رہا ہے۔ تایا ابو آپ سے جتنی شدید نفرت کرتے ہیں اگر ان پر آپ کی حقیقت کھل گئی تو یہ ساری محبت دھری کی دھری رہ جائے گی۔" عروہ اس وقت آدھی رات کو موبائل پر شایان سے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے آنے والے وقت کا سوچ کر بہت خوف زدہ بھی ہو رہی تھی۔ فکر مند تو شایان بھی تھا لیکن پھر بھی اسے اپنے جذبوں کی سچائی پر بہت بھروسا تھا۔

"اُفوہ عروہ، تم کو ڈاکٹر نے خوش رہنے کو کہا ہے اور تم بلاوجہ کی ٹینشن لیتی رہتی ہو۔ ارے میں ہوں ناں تمہارے ساتھ، تم دیکھ لینا انشاء اللہ ہماری محبت کی ہی جیت ہو گی۔ ٹھیک ہے جذبات میں آ کر ہم دونوں نے انتہائی قدم اٹھا لیا تھا لیکن اس غلطی کی کتنی سزا بھگت چکے ہیں ہم۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے کہ میں تایا ابو کی خوشی اور مرضی سے ہی تمہیں اس گھر سے لے کر جاؤں گا۔ میکے کا مان ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔" شایان اسے کتنے پیار سے سمجھا رہا تھا۔ محبت میں ناممکن بھی ممکن ہی نظر آتا ہے یہ بات اس وقت سو فیصد شایان پر صادق آ رہی تھی۔

"سنو عروہ آج تم اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں اپنے دل میں چھپا لوں۔ پلیز جان کیا ہم کچھ دیر کے لیے کہیں مل نہیں سکتے۔ تم میری ہو کر بھی پرائی کیوں ہو رہی ہو عروہ۔" شایان کے لہجے میں بے تابی کے ساتھ ساتھ بے بسی بھی اُمڈ آئی۔ عروہ کا دل بھی بھر آیا۔ کتنے دنوں بعد دیکھا تھا اس نے شایان کو۔ بے اختیار دل چاہا تھا کہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر اتنا روئے کہ دل کی تمام بھڑاس نکل جائے۔ پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں جیسے جھماکا ہوا۔

"سنیے شایان کل تائی امی کی بھانجی کا بہت سادگی سے نکاح ہے۔ تائی امی کی بہن بیوہ ہیں، بیچاری کے گھر کی پہلی خوشی ہے ان کے اصرار پر کل ہم سب کچھ دیر کے لیے وہاں جائیں گے۔ میں عین وقت پر طبیعت کا بہانہ کر کے رک جاؤں گی۔" شایان خوشی سے کھل ہی تو اٹھا۔

"اُف عروہ تم نے ایک دم سے تپتی دھوپ سے جیسے مجھے ٹھنڈی، ٹھنڈی چھاؤں میں لا کر کھڑا کیا ہے۔ میں خوشی سے کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔" عروہ کو ہنسی آئی تو وہ بھی شرارت سے ہنس دیا۔ "خیر پاگل تو میں تمہارے پیار میں پہلے ہی ہوں لیکن میری دیوانگی کو سمجھنے میں تمہیں کچھ وقت لگے گا۔" عروہ کے گال دہک اٹھے اور پھر کتنی ہی دیر دونوں آنے والے کل میں ہونے والی ملاقات کے سحر میں گم ہو کر اسی کی باتیں کرتے رہے تھے۔

☆☆☆

"سنو عروہ ہم لوگوں کو ٹھیک سات بجے یہاں سے نکل جانا ہے۔ تم جانتی تو ہو کہ تایا ابو وقت کے کتنے پابند ہیں۔ بس تم چھ بجے سے سر درد کی شکایت شروع

کردینا۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔'' ریشم نے بہت آہستگی سے اسے سمجھایا تھا۔ شایان کے کہنے کے مطابق اس نے ریشم کو بھی اپنے پلان میں شریک کرلیا تھا کہ اس سلسلے میں کافی مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔ آج صبح ہی تایا ابو نے اس سے اس کے شوہر کا نام و پتا معلوم کرنا چاہا تھا لیکن اس نے یہ کہہ کر دینے سے انکار کردیا تھا کہ جب تک اس کی طبیعت پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوجاتی وہ اس سلسلے میں الجھنا نہیں چاہتی۔ اور تایا ابو نے اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر فی الحال کچھ دنوں کے لیے اپنا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔

''تائی امی مجھے عروہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ سر میں کافی درد بتا رہی ہے۔ میرے خیال میں اسے گھر پر ریسٹ کرنا چاہیے۔'' ریشم کی بات پر دادی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں، مجھے بھی صبح سے وہ کافی نڈھال سی لگ رہی ہے۔ ابھی اس کی طبیعت پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہے وہاں جاکر تھکن ہوگئی تو اور مسئلہ ہوجائے گا۔'' دادی نے کافی فکرمندی سے کہا تو ریشم نے جلدی سے بات کو مزید آگے بڑھایا۔

''اسی لیے میں نے عروہ کو دودھ کے ساتھ دوا بھی دے دی ہے۔ ہم لوگوں کے جانے کے بعد وہ آرام سے سوتی رہے گی۔'' تائی امی نے فوراً ہی ریشم کو ٹوکا۔

''ارے بھئی اس کو بھلا ایسے اکیلے چھوڑ کر ہم سب کیسے جاسکتے ہیں۔ کسی ایک کو تو رکنا پڑے گا۔''

''ہاں، ہاں میرا بھی یہ ہی خیال ہے۔ میرا ویسے بھی جانے کا زیادہ موڈ نہیں ہے، میں عروہ کے پاس رک جاتی ہوں۔'' دادی نے بہت اطمینان سے اپنی خدمات پیش کردیں۔

''دادی آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ صالحہ آنٹی نے تو سب سے زیادہ آپ ہی سے آنے کے لیے اصرار کیا تھا۔ کتنا دکھ ہوگا انہیں۔'' ریشم نے انہیں جذباتی بلیک میل کیا۔

''اچھا تو پھر تم رک جاؤ اس کے پاس.....'' دادی نے دوسرا حل پیش کیا تو وہ چڑ سی گئی۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر کسی کو بھی رکنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس سر ہی میں تو درد ہے اس کے۔ وہ خود کہہ رہی ہے کہ میں سونے جارہی ہوں پھر کیا میں اکیلے بیٹھ کر مکھی ماروں گی۔ ویسے بھی دادی میں کچھ چینج چاہتی ہوں۔ امی کے جانے کے بعد سوائے اداسی اور آنسوؤں کے زندگی میں اور کچھ باقی رہا ہی نہیں۔'' اس بار سچ مچ اس کی آواز بھرا گئی تو تائی امی نے جلدی سے اٹھ کر اسے گلے لگالیا پھر عروہ نے بھی تایا ابو کو کنونس کرلیا کہ وہ دو تین گھنٹے گھر میں ریسٹ کرے گی فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ سات بجے کے قریب جب وہ لوگ نکاح میں جانے کے لیے نکلے تو عروہ نے فوراً ہی شایان کو انفارم کردیا۔ وہ بھی شاید کہیں آس پاس ہی گھوم رہا تھا۔ پانچ منٹ میں ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ کال بیل کی آواز پر عروہ نے بھاگ کر گیٹ کھولا۔ ایک لمحے کو تو دونوں یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ آس پاس کی جیسے کوئی خبر ہی نہیں رہی تھی پھر شایان ہی کو کچھ ہوش آیا وہ بے تابی سے گیٹ کے اندر جیسے ہی داخل ہوا عروہ بے اختیار اس کے سینے سے لگ کر رو پڑی۔

''بس عروہ میری زندگی۔'' شایان نے بہت پیار سے اس کے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے پلٹ کر گیٹ کو لاک کرنا چاہا تو سکتے کے عالم میں سامنے دیکھتا ہی رہ گیا جہاں تایا ابو کھڑے بہت قہر آلود نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ عروہ کے تو جیسے پیروں میں جان ہی نہیں رہی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔ چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔

''کمینے، بدمعاش، ذلیل انسان تم اتنے بدکردار نکلو گے میں نے تو کبھی سوچا نہیں تھا۔'' وہ غصے میں پاگل ہوتے ہوئے اس کی طرف جھپٹے اور اس پر تھپڑوں اور مکوں کی بارش کردی۔ عروہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور وہ خاموشی سے مار کھائے جارہا تھا۔ اپنے آپ کو بچانے کی ذرا بھی تو کوشش نہیں کررہا تھا وہ۔ اصل میں وہ لوگ تھوڑے سے ہی فاصلے پر گئے تھے کہ اچانک تائی امی کو یاد آیا

کہ وہ نیوتے کا لفافہ تو وہیں میز پر بھول آئی ہیں۔ تایا ابو نے انہیں ٹھیک ٹھاک باتیں سناتے ہوئے کار واپس موڑی تھی۔ ریشم کا دل دھک، دھک کرنے لگا تھا۔

"یا اللہ ابھی شایان وہاں نہ پہنچا ہو۔" اس نے دل ہی دل میں ڈھیروں دعائیں مانگتے ہوئے عروہ کو اپنے موبائل سے چپکے سے کال ملانے کی بھی کوشش کی لیکن اس کا سیل شاید اندر کہیں کمرے میں تھا اس نے کال ریسیو نہیں کی اور جب تایا ان سب کو کار ہی میں بیٹھے رہنے کا کہہ کر خود تیزی سے لفافہ لینے گھر کے گیٹ کی طرف چلے تو ادھ کھلا گیٹ دیکھ کر ہی ریشم کی جان نکل گئی تھی۔ اور تائی امی کے روکنے کے باوجود وہ کچھ سوچ کر تیزی سے گیٹ کا دروازہ جو کہ تایا ابو نے بھیڑ دیا تھا کھولتے ہوئے اندر داخل ہوگئی جہاں تایا ابو شایان کو دیوانہ وار مارتے ہوئے گالیوں سے بھی نواز رہے تھے اور عروہ تقریباً نیم بے ہوش کی دیوار کو تھامے پھٹی، پھٹی نظروں سے شایان کو پٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً تایا ابو عروہ کی طرف مڑے۔

"تم جیسی گری ہوئی لڑکی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ ارے اپنے شوہر سے طلاق لینے تک کا بھی انتظار نہیں کیا اور اس شخص سے بھی......" شایان نے چلا کر درمیان میں ہی ان کی بات کاٹ دی۔

"تایا ابو پلیز عروہ کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات مت کیجیے گا۔ یہ میری بیوی ہے، میری عزت ہے......" تایا ابو شدید شاک کے عالم میں اسے دیکھتے رہ گئے۔ ریشم روتے ہوئے ان کے پاس آ گئی۔

"تایا ابو پلیز ان دونوں کو معاف کر دیجیے۔ ہم دونوں بہنوں کا آپ کے سوا کوئی نہیں۔ پلیز تایا ابو میں اپنی بہن کے بغیر مر جاؤں گی۔" ریشم نے بے اختیار جھک کر ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ عروہ بھی لرزتے ہوئے قدموں سے ان کے نزدیک چلی آئی اور آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ ان کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"تایا ابو آپ مجھے بھی دل بھر کر مار لیجیے لیکن خدا کے لیے مجھ سے اپنی محبت مت چھینیں۔ ابو کے بعد آپ ہی تو میرا سائبان ہیں، مجھ میں دوبارہ بے سہارا ہونے کا حوصلہ نہیں ہے تایا ابو۔" وہ بری طرح سے روتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔ شایان جس کے چہرے پر مار کے بہت واضح نشانات نظر آ رہے تھے اور جسم بھی بری طرح سے دکھ رہا تھا۔ آہستگی سے چلتا ہوا ان لوگوں کے قریب آ گیا۔

"سوری تایا ابو میری وجہ سے آپ کے خاندان نے بہت اذیت سہی ہے لیکن اب جو آپ چاہیں گے وہی ہوگا۔ یہی میرا اور عروہ کا فیصلہ ہے۔ ورنہ میں بہت پہلے عروہ کو یہاں سے لے جا سکتا تھا کہ یہ میرا شرعی حق تھا۔" اس اثنا میں دادی اور تائی امی بھی انتظار سے تنگ آ کر اندر آ چکی تھیں اور دم بخود یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ تایا ابو نے ایک نظر شایان کے زخمی وجود پر ڈالی کس بری طرح سے مارا تھا انہوں نے اس کو لیکن اس نے ایک بار بھی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں نہیں روکا تھا۔ یہ وہی شایان تھا جس کے کل تک وہ قصیدے پڑھتے نہیں تھک رہے تھے۔ دل نے کتنی شدت سے تمنا کی تھی کہ کاش وہ عروہ کی زندگی کا ساتھی بن جائے۔ ان کے مرحوم بھائی کی بیٹیاں...... جن میں ان کی جان تھی اس وقت کس بے بسی سے روتے ہوئے ان سے معافی مانگ رہی تھیں ان کا دل کٹنے لگا تب دادی آگے بڑھیں اور روتی ہوئی عروہ کو بے اختیار سینے سے لگا لیا۔

"آفاق نے نہیں اور شایان کو معاف کر دیا ہے عروہ۔ میں نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں تم لوگوں کے لیے محبت کی روشنی پھوٹتے ہوئے دیکھی ہے۔" دادی کے پُراعتماد لہجے پر تایا ابو نے بے اختیار چونک کر انہیں دیکھا تو وہ آنسو بھری نگاہوں سے مسکرا دیں۔ شایان تایا ابو کے نزدیک چلا آیا۔

"آپ مجھے تھوڑا اور مار لیں تایا ابو لیکن پھر سینے سے ضرور لگا لیجیے گا کہ خدا کی قسم اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں کہ آپ میں مجھے ابو کی جھلک نظر آتی ہے۔" تب آفاق صاحب نے کچھ شرمندگی اور کچھ پیار کے ساتھ بے ساختہ اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ ریشم کو تائی امی چپ کرا رہی تھیں۔

بہتے آنسوؤں کے ساتھ، خوشی سے چمکتے چہرے جیسے دھوپ میں بارش جیسا سماں پیش کر رہے تھے۔

☆☆☆

''ابھی زرین کو گئے دو ماہ ہی ہوئے ہیں اس لیے ہم سادگی سے اپنی بیٹی کو رخصت کر رہے ہیں ورنہ ہمارے دل میں تو بہت ارمان تھے۔'' دادی نے مخملی ڈبا کھول کر اس میں سے، سونے کا کڑا نکالتے ہوئے بینا کا ہاتھ تھاما تو اس نے بہت حیرت سے انہیں دیکھا جو اس کے ہاتھ میں، وہ کڑا پہنا رہی تھیں۔ ''یہ ہمارے خاندان کی روایت ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں کی ساس کو کڑا پہناتے ہیں اور تم میری عروہ کی ساس بھی ہو، نند بھی اور جیٹھانی بھی تو بیٹا یہ ہماری طرف سے ایک حقیر تحفہ ہے تمہارے لیے۔'' بینا نے بہت میریس ہو کر کڑے کو دیکھا۔

''تھینک یو دادی! آپ نے کچھ زیادہ ہی تکلف کر ڈالا۔'' اس نے بے اختیار اٹھ کر شکر گزاری کے احساس کے ساتھ ان کے رخسار پر پیار کیا۔ ساتھ بیٹھی عروہ کی آنکھیں بھی بے اختیار جھلملا اٹھیں اور اپنی دادی پر بے انتہا پیار آنے لگا۔ سونے کا کڑا پہنانا ان کے خاندان کی روایات میں ہرگز شامل نہیں تھا لیکن جب سے انہیں عروہ نے بینا بھابی کی نیچر اور ان کا اپنے ساتھ اتنے خراب سلوک کے بارے میں بتایا تھا تب ہی سے انہوں نے اس مسئلے کا توڑ سوچ لیا تھا اور عروہ کو اس وقت بینا کے ہاتھ میں جگمگاتا یہ کڑا اپنی آنے والی خوشیوں کا ضامن لگ رہا تھا۔ آج تایا ابو نے اپنے گھر پر ریشم کے نکاح اور عروہ کی رخصتی کی چھوٹی سی تقریب رکھی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ نکاح کے بعد رخصتی تک ریشم اور دادی اپنے گھر شفٹ ہو جائیں گے اور عروہ اور شایان ان کے ساتھ رہیں گے۔ پھر ریشم کی شادی کے بعد دادی واپس تایا ابو کے گھر آ جائیں گی اور عروہ شایان کے ساتھ بدستور اسی گھر میں رہے گی تا کہ زرین کا اجڑا ہوا گھر دوبارہ آباد ہو جائے۔ شایان نے تایا سے بہت کہا کہ وہ صرف ریشم کے نکاح تک اس گھر میں رہے گا بعد میں ان لوگوں کا وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا لیکن تایا ابو نے اسے بہت اپنائیت سے ڈانٹا تھا۔

''خبردار جو تم نے انکار کیا۔ ایک طرف مجھے اپنے باپ کی جگہ دیتے ہو اور دوسری طرف داماد والا رویہ اپنا رہے ہو۔ ارے بھئی زرین کا یہ گھر اس کی دونوں بچیوں کا ہے۔ ریشم تو شادی کے بعد شارجہ چلی جائے گی تو بھئی پھر اسے آباد رکھنے کی ذمے داری تمہاری اور عروہ کی ہوئی ناں.....'' انہوں نے بہت پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے قائل کر لیا تھا۔ ناظر کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا اور ویسے بھی تایا نے یہ واضح کر دیا تھا کہ کسی بہن کی کوئی حق تلفی نہیں ہوگی اور جب بھی گھر بکا دونوں بہنوں کا برابر کا حصہ ہوگا۔ فی الحال وہ رخصت ہو کر کامران اور بینا کے گھر ہی جا رہی تھی۔ صبح سے اپنی امی کی یاد اور کمی دونوں کو بار بار رُلا رہی تھی۔ ریشم کے تو آنسو نہیں تھم رہے تھے جبکہ عروہ اپنی چھوٹی بہن کو تسلی اور دلاسے دیتے ہوئے برداشت کی انتہا پر تھی لیکن رخصتی کے وقت تایا ابو، دادی اور تائی امی کی دعاؤں کے حصار میں جب وہ کار میں بیٹھنے لگی تو ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ تب شایان نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''پلیز عروہ ایسے مت روؤ، میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔'' بہت پیار بھری سرگوشی کی تھی اس نے عروہ کے کانوں میں جسے بینا نے سن لیا تھا۔

''شایان ٹھیک کہہ رہا ہے عروہ بس اب تم اپنے ان آنسوؤں کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دو۔'' کتنا محبت بھرا لہجہ تھا ان کا...... عروہ دل ہی دل میں حیران ہو کر اس کے سہارے کار میں بیٹھ گئی۔ ناظر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہت شفقت سے اسے خدا حافظ کہا تھا۔ اس نے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کار کی طرف کھڑے اپنے پیاروں کو دیکھا۔ آج سر اٹھا کر میکے سے عزت اور وقار کے ساتھ اپنی سسرال جاتے ہوئے کتنے خوب صورت تحفظ کا احساس ہو رہا تھا اسے۔ سجی ہوئی کار آہستگی سے آگے بڑھ رہی تھی اور خوشیوں کے چمکتے ہوئے جگنو اسے چار سو محسوس ہو رہے تھے۔



قسط 5

رنگِ خلش

رفاقت جاوید

کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کے حسین لمحے
بھی خلش کی نذر ہوجاتے ہیں اور ہم جوں جوں اس احساس کو من کے
اندر گہرائیوں میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو خلش کے بے حساب رنگوں
کی پردہ کشائی ہمیں مضطرب کرنے لگتی ہے اور مکافاتِ عمل کا کبھی نہ ختم ہونے والا
سلسلہ شروع ہوجاتا ہے.... گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا... سزا تو لازم و ملزوم ہے۔ اس
کے باوجود اپنے شعر سے گہرا ربط و تعلق رکھنا دوا بھی ہے اور عبادت
و ریاضت بھی ہے، لیتا۔ وصل بھی اور وجدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں
دستک کو تیرا ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو

ثمر لاؤنج میں اپنی ہی سوچوں میں گم صم بیٹھی تھی۔ بجلی پانچ گھنٹوں سے بند تھی۔ گرمی کے اس موسم میں پنکھے کے بغیر ایک منٹ گزارنا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ یو پی ایس نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک تو شدت کی گرمی اوپر سے حالات کی تپش نے اسے ادھ موا کر ڈالا تھا۔ عالیہ نے اس کے سامنے ٹھنڈی ٹھار لسی کا بڑا سا گلاس رکھا اور اس کے قریب بیٹھ کر ہاتھ کے پنکھے سے ہوا دینے لگی۔ اس صورتِ حال میں اس کی معمولی سی ہوا بھی غنیمت لگی۔ اس نے ٹھنڈی لسی پیتے ہوئے ماں کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور اپنے اندر کی جلن اور گھٹن سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

''میری جان تمہیں کیا مسئلہ درپیش ہے۔ ایک دم سے بجھ سی گئی ہو۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں تو سعود کی جدائی اور ناراضی کو بھول جاتی ہوں۔ اور تمہارے لیے فکر مند ہو جاتی ہوں۔ مجھے بتاؤ گی نہیں کہ پریشانی کیا ہے؟ اگر بھائی کی بات ہے تو اسے یاد کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ۔'' عالیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''امی! آپ میری طرف سے بے فکر رہیں۔ سعود میرا ایک ہی بھائی ہے بھلانا بہت مشکل ہے، دوسرا کوئی خاص مسئلہ نہیں...... بس اپنی پڑھائی کی ٹینشن ہے۔'' اس نے آنکھیں چرائیں۔

''اس میں ٹینشن لینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ یہ سمسٹر ٹھیک نہیں رہا تو کون سی قیامت آگئی ہے۔ انشاء اللہ اگلا ٹھیک رہے گا اور تمہارا جی پی اے درست ہو جائے گا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ پھر اتنی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جس اولاد سے والدین خوش ہوں وہ ہر امتحان میں سرخرو ہوتی ہے۔ میری جان تمہارے والدین تو ہر دم تمہارا نام جپتے نہیں تھکتے...... کیونکہ تم ہماری بہت بابرکت اور نیک طبیعت بچی ہو۔ یہ بتاؤ جان کہ کہیں کوئی اور پرابلم تو نہیں؟ لگتا ہے کہ کچھ چھپا رہی ہو۔'' وہ استفہامیہ لہجے میں بولی۔

''امی! آپ سے کیا چھپانا؟ دراصل آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی...... پہلے ہی سعود نے کچھ اچھا نہیں کیا...... جب سے غائب ہوا ہے آپ اپنی عمر سے دس سال بڑی لگنے لگی ہیں اور ابو جی کے کندھے تو اس دکھ کے بار سے جھک گئے ہیں۔ نہ جانے ہم سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا ہے کہ پریشانیوں نے ہمیں شکنجے میں لے لیا ہے۔'' وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔

''ایسے مت سوچو میری جان...... یہ زندگی کبھی ایک ہی دھارے پر نہیں چلتی۔ زندگی میں جب بھی انسان کسی آزمائش میں گرفتار ہوتا ہے تو یوں سمجھو کہ اللہ نے اسے یاد فرمایا ہے۔ یقیناً کوئی مرتبہ اور رتبہ بخشنے کو۔ مجھے اس پر پورا ایمان ہے۔ گر اس دنیا میں بندے کی آزمائش ختم نہیں ہوتی بتدریج بڑھتی چلی جاتی ہے تو اگلے جہان کا ٹکٹ کھرا ہے۔'' وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولی۔

''امی سنا ہے پریشانی، دکھ اور تکلیف اکیلے نہیں آتے۔'' وہ بے تحاشا درد سے بولی۔

''تم نے ٹھیک سنا ہے بیٹی، بس اللہ خیر کرے...... اللہ نہ کرے کہ ہماری ایک پریشانی کے ہمراہ کئی پریشانیاں ہمارے گھر کا رستہ دیکھ لیں۔ بس ہر وقت پناہ مانگو، ہم بہت بے ہمت لوگ ہیں، کمزور اور بے دم سے...... اس کی آزمائش پر پورے نہیں اتر سکتے۔'' وہ خوف زدہ سی ہو کر بولی۔

''امی!'' وہ اک طویل توقف کے بعد بولی۔ ''شاید بات پریشانی کی نہ ہو۔ میں نے زیادہ محسوس کر لیا ہو۔ کیونکہ ہماری زندگی میں اس قسم کے انہونے اور عجیب و غریب حادثے کبھی رونما نہیں ہوئے۔ طبیعت اسی وجہ سے سنبھل نہیں پا رہی۔''

''کیا ہو گیا ہے بیٹا؟'' وہ ایک دم سے چونکی ہو گئی۔ ''کس کی اور کون سی بات کو تم نے اس حد تک محسوس کیا ہے کہ تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہی چھن گئی۔''

''امی...... ! وہ دراصل پروفیسر عادل رضا ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ بھی ہیں...... کچھ تنگ سا کرنے لگے ہیں۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بہ مشکل بولی۔

''مثلاً......'' عالیہ ایک دم سے چونک کر سیدھی بیٹھ گئی۔ ''بیٹے میں ماں ہوں تمہاری پریشانی کی اصل وجہ تو نہ جان سکی مگر تمہاری حالت دیکھ کر کچھ اندازہ تو کر ہی لیا تھا...... وہ کیوں تنگ کرنے لگا ہے تمہیں، یہی وجہ تھی کہ تمہارے ابو... کو ایجوکیشن کے سخت خلاف تھے۔ بیٹے ہم مرد کی مینٹیلٹی کو نہیں جان سکتے۔ رحمان کی مان لینی چاہیے تھی۔'' وہ کسی اندیشے سے لرز اٹھی۔

''مجھے بتاؤ وہ تمہیں کیا کہتا ہے؟ اپنے ابو کو نہ بتا دینا۔ مجھے جوتے الگ پڑیں گے اور تمہیں یونیورسٹی سے نکالنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگائیں گے وہ۔''

''امی ہی لائکس می۔'' وہ اٹک، اٹک کر بولی۔

''تو؟'' وہ سوالیہ نشان بن کر بولی۔

''شادی......'' اس نے ایک لفظ کی ادائیگی سے پوری تفصیل بتا دی۔

''کیا تم بھی اسے پسند کرتی ہو؟ دیکھو عورت کی نگاہوں سے مرد، عورت کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے راز کو پالیتا ہے۔ اس نے تم میں کچھ پسندیدگی کے آثار پائے ہوں گے جو اس قدر بے باکی سے اظہار کر ڈالا......'' وہ بیٹی کو پرکھ رہی تھی۔

''شادی! ویسے آئیڈیا برا نہیں...... چلو اس کے خاندان کی جانچ پڑتال کر لیتے ہیں۔ پہلے تم اپنے دل کی سچی بات کرو وہ بھی کھل کر، دیکھو میں تمہاری ماں ہی نہیں اچھی دوست بھی ہوں۔'' وہ تسلی بخش لہجے میں بولی۔

''انکار و اقرار اور پسند اور ناپسند پر تمہارا پورا اختیار ہے۔ یہ اختیار تمہیں اوپر والے نے سونپا ہے۔'' وہ بہت...... سہولت سے بات کر رہی تھی۔

''امی! آپ کو علم ہے کہ میں شادی وادی سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتی۔ آپ خود سوچیں کہ اس میں رکھا ہی کیا ہے جو اپنی اس حسین زندگی کے یادگار دنوں کو قربان کر دوں۔ اس رشتے میں محبت کے بجائے نفرت اور حاکمیت کی جھلک خاصی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ آپ اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑائیں۔ ایسا ہی ہے ناں......؟'' وہ نفرت آگین لہجے میں بولی۔ ''یہ ہر گھر کی کہانی ہے۔ ایک ہی جیسی...... میں اس کہانی کا کردار نہیں بننا چاہتی...... میری زندگی منفرد اور تمام لڑکیوں سے مختلف اور الگ ہونی چاہیے۔ یہی میری آرزو ہے۔'' وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

''پگلی ہو نری...... پڑھا لکھا لڑکا ہے، تمہیں پسند بھی کرتا ہے، ہمیں اور کیا چاہیے۔ اس کے بارے میں سوچو کیونکہ ایک نہ ایک دن تمہارے فرض سے ہمیں سبکدوش تو ہونا ہی ہے۔ یہ پہاڑ جیسی زندگی اپنے ہم سفر کے بغیر نہیں کٹتی۔ والدین کب تک ساتھ دے سکتے ہیں؟''

''امی آپ یقین کریں بالکل ہی گیا گزرا ہے۔ اسے بات کرنے کا تو ڈھنگ اور سلیقہ نہیں...... بھلا اپنے آفس میں بلا کر تحکمانہ لہجے میں اپنی پسند کا اظہار کرنا کہاں کی سمجھداری ہے۔ دوسرا امی، ڈیڈی بے بی ہے۔ انڈر کونفیڈینٹ...... لگتا ہے پی ایچ ڈی کی ڈگری کی طرح اس کی زندگی کی تمام ڈگریاں ہی جعلی ہیں۔ کونفیڈینٹ بننے کی ہر وقت کی کوشش میں سرگرداں و پریشان ایسی ایسی حرکتیں اور باتیں کر جاتا ہے کہ ایک جھٹکے سے حیرت میں دوسروں کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اس نے یہ کیوں کیا اور کیوں بولا۔ حالانکہ ویل ایجوکیٹڈ والدین کی اکلوتی اولاد ہے، لگتا ہے انہوں نے اسے فیک ڈگریز پیسے کے زور پر دلائی ہیں۔'' وہ انتہائی حقارت سے بولی۔

''تم یہ معاملہ ہم پر چھوڑ کر بے فکر ہو جاؤ...... اور اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ تم نہیں جانتیں کہ اچھے اور مناسب رشتے

کی تلاش میں والدین بیچارے زمین آسمان یکجا کرنے کے باوجود بھی ناکام اور پریشان ہی رہتے ہیں۔ بیٹا اگر ہر خوبی کی متلاشی رہوگی اور بلاوجہ کی تحقیق اور اندیشوں میں پڑی رہوگی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ مکمل ذات تو صرف اوپر والے کی ہے۔ مکمل خوبیاں اور تمام صفات اگر ہم اپنے جیسے انسانوں میں تلاش کرنے لگیں تو ہر بچی والدین کے گھر کی دہلیز پر ہی بیٹھی رہے۔" وہ نرماہٹ سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"اگر کوئی انسان نہ تو شکلاً نہ ہی مزاجاً وطبعاً ایک آنکھ نہ بھائے تو اس کے بارے میں آپ کا کیا فیصلہ ہوگا؟" وہ پریشان کن لہجے میں بولی۔

"خدا کے لیے ثمرا..... اتنی چوزی مت بنو۔" وہ ذرا سا الجھ کر بولی۔

"امی..... ! آپ یقین کریں کہ ہماری کلاس کی کیا بلکہ شاید ہر لڑکی ان سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ ان کی باتیں اور حرکتیں بہت irritating ہیں۔" وہ بہ مشکل بول پائی تھی۔

"بیٹا! ان لڑکیوں کی بات چھوڑو۔ تم ان سب باتوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنے ذہن وقلب کا استعمال کرو۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا اپنا فیصلہ بہت خوب رہے گا۔" وہ نرم لہجے میں بولی تو ثمرا نے کوئی جواب تو نہیں دیا مگر چہرے پر بیزاری کا سایہ سا لہرا گیا۔ جسے ماں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

"بیٹا تم ابھی بہت معصوم ہو، ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے لیے کیسا رشتہ چاہیے۔ اسی طرح ہر گھرانے اور ہر لڑکی کی پسند، ضرورت اور مجبوری ہوتی ہے۔ وہ بھی انہی کو مدِنظر رکھ کر رشتے طے کرتے ہیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم تمہاری ڈیمانڈز کو مدِنظر رکھ کر ہی فیصلہ کریں گے۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"تو پھر آپ سن لیجیے کہ اس رشتے کے بارے میں سوچنا بھی درست نہیں..... بس آپ اس مسئلے کا حل بتائیں جو کم از کم میری عقل وشعور سے بالاتر ہے۔" وہ تحمل سے بولی۔

"بیٹے کیسی عجیب باتیں کرتی ہو، یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ گھر بیٹھے بٹھائے ایسا شاہانہ رشتہ اور اتنے ویل ٹو ڈو خاندان سے..... ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے..... بیٹا آئیڈیل کی تلاش میں مارے، مارے پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں..... وہ صرف اپنے ذہن کی پیداوار ہوتا ہے اور دل میں وقتی طور پر بسیرا کر لیتا ہے۔ پریکٹیکل لائف میں اس کی کوئی جگہ اور مقام نہیں ہوتا۔ آئیڈیل تو بے وقعت اور بے حیثیت ہو کر رہ جاتا ہے۔ بیٹا میری زندگی سے سبق سیکھو۔ میں نے اپنی تمام عمر جمع وتفریق اور حساب کتاب کرنے میں ہی گزار دی۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں مالی طور پر میرے جیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے اور اس پر خزاں آنے میں دیر بھی نہیں لگتی۔ مجھے کل کی بات لگتی ہے جب میں کالج میں پڑھتے، پڑھتے رحمان کے گھر آ گئی تھی۔ والدین کا فیصلہ تھا ان سے بہت اچھی نبھ گئی لیکن مالی تنگ دستی نے جوانی کو بہت جلد بڑھاپے میں تبدیل کر دیا۔ مالی تنگی جوانی کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔" وہ اِک طویل آہ بھر کر بولی۔

"میں آپ کی اس سوچ سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ خوشی، سکون اور ایک دوسرے سے محبت، مالی حالات سے مقابلہ کرنے کی قوت دیتے ہیں امی۔" وہ بے ساختگی سے بولی۔

"میں نے کہا ناں..... تمہاری عمر میں ایسی ہی بے وقوفانہ اور طفلانہ باتیں سوچی جاتی ہیں اور وہی سو فیصدی درست بھی لگتی ہیں۔ جب آٹے دال کا بھاؤ پتا چلتا ہے ناں تو پھر ہوش ٹھکانے آنے کا فائدہ نہیں ہوتا۔ پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔" وہ الجھ کر بولی۔

"لگتا ہے اب میری موجودگی آپ کو ناقابلِ برداشت حد تک بھاری محسوس ہونے لگی ہے، مجھے ایسی ہی باتیں کسی بیٹی کی تباہی کا سبب لگتی ہیں۔ اگر آپ نے سوچ ہی لیا تو پھر میری ایک عرض پر توجہ ضرور دیجیے گا۔ سب سے پہلے

مجھے اپنی تعلیم مکمل کر کے، اپنے بوجھ کو اٹھانے کا وقت دیجیے۔ پھر اپنے جیسے لوگوں کا انتخاب کیجیے تاکہ میں انہی کے ماحول کا حصہ بن کر ان کے لیے بہترین مددگار ثابت ہوسکوں۔ میں ایسے گھر کی بہو بننا پسند نہیں کروں گی جہاں قدم رکھتے ہی مجھے کم مائیگی کا احساس آنکھ اٹھا کر دیکھنے پر بھی پابندی لگا دے۔'' وہ ایک دم تیکھی ہوگئی تھی۔''امی شادی نام ہی کمپرومائز اور ایڈجسٹ منٹ کا ہے۔ جب دو مختلف انسان مل جل کر زندگی کے لیے پہلا قدم اٹھاتے ہیں تو بے وجہ اپنی ذات میں پوشیدہ عیبوں اور غیر مناسب عادات پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ فطری امر ہے لیکن کلاس ڈیفرنس سے چشم پوشی کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ جس کی پاداش میں عمر بھر کی سزا مقرر کر دی جاتی ہے اس لیے امی ہم اس جرم کے مرتکب نہیں ہوں گے کیونکہ ان کا اور ہمارا کوئی میچ نہیں۔'' ثمرا نے نہایت سنجیدگی سے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''بیٹا گھر کی دہلیز پر آئی ہوئی دولت، عزت اور شہرت کو لات مارنے والے لوگ ہمیشہ کسمپرسی کا شکار رہتے ہیں۔ شاباش! خوب فیصلہ کیا ہے تم نے۔ تمہارے باپ نے بھی تمام زندگی ہر بار آنے والی نعمتوں کو نہایت تکبر سے دھتکارے رکھا۔ تم دو کے بیچ میں، میں تو پھنس کر رہ گئی ہوں۔'' عالیہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔

''امی! میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے۔ اب آپ جانیں اور آپ کے فیصلے جانیں۔ ہاں اتنا ضرور ایک بار پھر بتاتی جاؤں کہ ایسے سائیکو انسان کے ساتھ آپ کی بیٹی خوش نہیں رہ سکتی۔ ایک تو دولت مند اور اس پر نیم پاگل، دیوانہ اور خبطی انسان...... نہ میری بات سمجھ پائے گا نہ ہی میں اس کی سمجھ پاؤں گی۔'' اس نے ناگواری سے کہا اور وہیں ہونٹے پر آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔

''بیٹا یہ اتنی پریشانی کی بات بھی نہیں کہ تم روگ سے ہی لگ جاؤ۔''

''امی! میں آپ کی تمام بات چیت کا مدعا سمجھ گئی ہوں لیکن سرِعام دل نہیں کسی اور سے شادی کر دیجیے گا۔'' وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔''جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے جان چھڑانا چاہتی ہیں، آپ لوگ بھی عام والدین ہی نکلے...... میں کتنی نادان تھی، یہی سمجھتی رہی کہ میرے والدین عام نہیں خاص الخاص ہیں۔''

''اچھا بھئی، چلو ہم تمہارے دشمن بن جاتے ہیں۔ بیٹھی رہو اسی گھر میں...... کل سعود اور اس کی بیوی کی خوشامدیں کر کر کے زندگی گزارنا۔ اگر یہی تمہارا فیصلہ ہے تو میں مزید تمہیں کچھ نہیں سمجھا سکتی۔'' وہ تنک کر بولتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

''بیٹا! شکر ہے کہ تمہاری طبیعت تو بہتر ہوئی۔ میں اب تم سے تفصیلاً بات کرنا چاہتی ہوں۔ خوشگوار موڈ میں دوسرے کی بات کو مثبت طریقے سے سوچا جاتا ہے۔ ذہن بالکل کلیئر اور آزاد ہوتا ہے۔ فیصلہ کرنا آسان اور سہل ہوجاتا ہے۔'' عالیہ نے ثمرا کو مطمئن اور پُرسکون دیکھ کر ناشتا کراتے ہوئے نہایت خوشامدانہ انداز میں کہا تو ثمرا کا چہرہ ایک دم سے متغیر ہوگیا۔ اور آنکھیں ناگواری کی غمازی کرنے لگیں۔

''فیصلہ میں نے سنا دیا ہے۔'' وہ منمنائی۔

''تمہارے والدین کم عقل اور ان پڑھ نہیں ہیں ثمرا...... وہ دنیا کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہیں۔ وہی فیصلہ ہوگا۔ جس میں تمہاری بہتری ہوگی۔ یہ جذباتی بے تکی باتیں مجھے قطعاً پسند نہیں آئیں۔ میں تو تمہیں بہت دانشمند اور دور اندیش سمجھتی تھی۔ تم بھی سعود کی طرح نادان ہی نکلیں۔'' وہ سرد آہ بھر کر بولی۔

''اب آپ کو سمجھ آئی کہ میں اپنا مسئلہ آپ سے ڈسکس کیوں نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ آپ میری ایک نہیں سنیں گی۔ غور و خوض کرنا تو درکنار...... میں مڈل کلاس موریلٹی کو خوب جانتی ہوں۔ اپنی طاقت سے بڑھ کر لمبی اور اونچی چھلانگ لگا کر ہڈی پسلی ایک کر دینا اور پھر بھی غرور و تکبر سے تن کر چلنا... اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر

پاؤں پھیلانا اور خود کو اذیتوں اور ذلتوں کے حوالے کر کے بھی خوشی کا اظہار کرنا تو کوئی ان کلاس سے سیکھے۔'' وہ بڑے بوڑھوں کی طرح کہہ رہی تھی۔ ''سراسر نادانی ہے امی...... مجھے اس کی بھینٹ مت چڑھائیں۔ میری کم عمری کے تجربات میں کچھ نہ کچھ تو سچائی ضرور ہے۔ میں دوسروں کی دولت کی چمک سے اپنی بینائی کھونا نہیں چاہتی۔ میری آنکھوں کو سلامت رہنے دیجیے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ یہ انمول نعمت مجھ سے مت چھینیں اور میرے کانوں کو اور سوچ کو آزاد رہنے دیجیے تاکہ میرے حواس زندہ رہیں۔'' بولتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے چائے کا مگ وہیں رکھا اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کمرے کی طرف چل دی۔

ماں بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑی۔ وہ اس کی جان چھوڑنے والی کہاں تھی؟ ایسے رشتے کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے بیٹی کی قسمت پر رشک آنے لگا تھا۔ ایسی خوش بخت بیٹی اس کے گھر میں جنم لے گی۔ خوشی سے اس کا پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہا تھا۔ نمرا اپنے بیڈ پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی اور عالیہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کے چہرے پر الفت و چاہ سے بھرپور انداز میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ نمرا اس سے مس نہ ہوئی تو وہ گویا ہوئی۔

''بیٹا انویسٹی گیشن کرنے میں کیا حرج ہے؟ ہمیں اس کی اجازت دے دو۔ وعدہ کرتی ہوں اس کی کسی بھی خامی کو نظرانداز نہیں کروں گی۔ تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو جان۔ مجھ سے آج یقین کیوں اٹھ گیا ہے تمہارا؟''

''آپ کو ان کی ہر خامی خوبی معلوم ہوگی...... کیونکہ پیسوں کی جھنکار اور رزق کی فراوانی کی شان و شوکت ذہن پر تالے لگا دیتی ہے۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ یہ فطری امر ہے۔ فطرت کے سامنے آپ کمزور پڑ جائیں گی کیونکہ جس کے پاس جس چیز کی کمی ہو اس کی اہمیت ہر ضروری شے پر غالب آ جاتی ہے۔ امی پلیز...... بہتر ہے کہ اس کٹھن امتحان میں نہ پڑیں۔''

''تم مجھ پر بھروسا رکھو بیٹے...... جب سے وہ آیا ہے دل میں سکون رہا نہ روح کو تسکین ملی۔ آج کتنے دنوں بعد دل و جان میں طمانیت بسیرا کرتی ہوئی محسوس ہوئی ہے۔ میری جان تم کسی بڑے گھر کی بہو بن کر اس خاندان کا حصہ بننے میں اپنی خوش قسمتی سمجھو...... میں تمہارے ابو سے بھی مشورہ کرتی ہوں۔ دیکھنا تم کہ وہ یہ سن کر کتنے خوش ہوں گے۔ ہم فیصلہ انہیں خوب پرکھنے کے بعد کریں گے۔ تم فکر مت کرو۔'' وہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

''یعنی آپ ان لوگوں سے ہر قیمت ملنا چاہیں گی؟'' وہ تنک کر بولی۔

''جی ہاں بیٹا کیونکہ اس میں حرج ہی کیا ہے...... رشتہ ان کی طرف سے آیا ہے۔ ہمیں غور و فکر تو کرنا چاہیے ناں...... ہم زبردستی تھوڑی تمہیں ان کے سپرد کریں گے۔ ہر طرح سے اپنا اطمینان کریں گے پھر بات آگے بڑھائیں گے۔''

''امی کیا اتنے وسیع و عریض جہان میں سر عادل ہی میرے لیے رہ گئے ہیں۔ آپ کو بار بار...... بتا رہی ہوں۔ وہ حد درجے کا ان اسٹیبل اور ایبنارمل انسان ہے۔ اس کی قربت میں، میں بھی اسی جیسی ہو جاؤں گی۔ پلیز امی سمجھنے کی کوشش کریں۔'' وہ التجائیہ انداز میں بولی۔ تو عالیہ نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے اسی کے ساتھ تمہیں بھی پاگل خانے بھیج دیں گے۔'' وہ مذاقاً بولی۔ ''یعنی ساتھ جئیں گے اور ساتھ مریں گے۔''

''آپ کو مذاق کی سوجھی ہوئی ہے، میری جان پر بن آئی ہے۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''اچھا ایک سوال کا جواب دو۔ ایسی توقع تو نہیں ہے تم سے پھر بھی پوچھنا ضروری سمجھتی ہوں کہ تم کسی اور میں تو انٹرسٹڈ نہیں ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس کا حدود اربعہ بھی بتا دو۔ معلوم کر لیتے ہیں آگا پیچھا۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''اگر ایسا ہوتا تو میں شادی کی مخالفت کیوں کرتی؟ امی پلیز میرے انکار سے غلط نتیجہ اخذ مت کریں۔ اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں تو آپ سر عادل سے مل سکتی ہیں۔ اس کے خاندان کی انویسٹی گیشن کر سکتی ہیں لیکن مجھ پر شک

مت کریں۔ آپ عادل سے مل لیں۔'' وہ تنگ آ کر بولی تو عالیہ نے بیٹی کو گلے لگالیا۔ اور بیسیوں دعائیں دے ڈالیں۔

☆☆☆

ہارن کی آواز پر عالیہ تیزی سے کچن سے باہر نکلی اور مین ڈور کھول کر گیٹ کی جانب چل دی۔ رحمان نے بیوی کی چال میں پھرتی اور تیزی محسوس کرتے ہوئے اس کے چہرے کا بھی بغور جائزہ لیا اور دل ہی دل میں بولے۔

''شاید سعود کی طرف سے کوئی خبر ہو مگر ایسا نہیں ہے ورنہ عالیہ کب کا مجھے یہ مژدہ سنا چکی ہوتی۔'' وہ سوچتے ہوئے گاڑی پورچ تک لے آئے۔

عالیہ نے گیٹ بند کیا اور گاڑی کے قریب آ گئی۔ رحمان نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئے۔ پچھلی سائڈ کا دروازہ کھول کر بریف کیس نکالا اور دوسرا ہاتھ عالیہ کی طرف بڑھا دیا۔ عالیہ نے شگفتہ مسکان سے ان کا استقبال کیا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مین ڈور کی طرف چل دی۔

وہ اپنے کمرے کی طرف اور عالیہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ٹرالی پر چائے کے برتن اور لوازمات رکھ کر لاؤنج میں لیے چلی آئی جہاں رحمان چائے کے انتظار میں موجود تھے۔ ٹرالی کی طرف دیکھ کر خوشگوار لہجے میں بولے۔

''عالیہ! کیا تمہارے میکے سے مہمان آ رہے ہیں؟ خاص کر تھری وچیز۔'' اشارہ اس کی تینوں بہنوں کی طرف تھا۔

''آپ بھی اچھا بھلا موڈ خراب کر دیتے ہیں۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

''بھئی تم خوش بھی نظر آ رہی ہو اور چائے بھی بڑی ہی زبردست ہے۔'' وہ چھیڑتے ہوئے بولے۔ ''عالیہ کیا بات ہے تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' رحمان نے چائے کے ساتھ لوازمات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بیوی کی بے چینی بھی بھانپ لی تھی۔

''وہ دراصل نمرا کے لیے اس کے پروفیسر عادل رضا کی طرف سے پرپوزل آیا ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''پروفیسر عادل رضا! ہاں میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اس کے والد محترم کو۔'' وہ ذرا سوچتے ہوئے بولے۔ ''پروفیسر حسنات علی رضا...... اسلام آباد چھوٹا سا تو شہر ہے۔ سب ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں مگر باپ تو سائیکو مشہور ہے۔ نہ جانے بیٹا کیسا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔''

''اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہمارے معاشرے میں مس فٹ ہونے کی وجہ سے خواہ مخواہ سائیکو کہلانے لگتے ہیں۔ ایسی فضول باتوں پر یقین کرنا حماقت ہے۔ ہم اپنے طور پر سب چھان بین کریں گے پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''پروفیسر عادل کے بارے میں نمرا تو خوب جانتی ہوگی۔ اس سے تمام معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔'' وہ گہری سوچ بچار کے بعد بولے۔ ''اس میں نمرا کی رضا مندی کا بھی دخل ضرور ہوگا۔ وہ کسی ایرے غیرے کو پسند کرنے سے تو رہی۔ ضرور پروفیسر اک بہتر انسان ہوگا جو نمرا نے تمہیں انفارم کر دیا۔'' عالیہ جھینپ سی گئی۔

''میرا خیال ہے یہ یکطرفہ اپروچ ہے۔ آپ اپنی بیٹی کے مزاج سے تو واقف ہی ہیں کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ نہ جانے خود کو کیا سمجھتی ہے؟ اس بار ہم اس کی ایک نہیں مانیں گے۔ مجھے تو سننے میں سب بہترین لگ رہا ہے۔ سب ٹھیک ہو تو لڑکیوں سے کیا مشورہ لینا...... بہت آئیڈیل پرست ہوتی ہیں وہ اس عمر میں۔'' وہ ناگواری سے بولی۔

''بھئی جس نے زندگی گزارنی ہے اس کی پسند در رضا مندی معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ میری بیٹی جیسا کہے گی وہی ہوگا۔'' وہ محبت سے بھرپور لہجے میں بولے۔

''آپ نے ہی اسے سر چڑھا رکھا ہے۔'' وہ خفگی سے بولی۔ ''ورنہ کب کا رشتہ طے ہو چکا ہوتا۔ آپ نے....

بے جالاڈ پیار سے بگاڑ رکھا ہے اسے۔''

''جیسے تم نے سعود کو...... ماں کے لاڈ پیار میں بگڑے ہوئے بچے کبھی سدھر نہیں پاتے۔ باپ توازن قائم رکھتا ہے ہر لحاظ سے۔ سونے کا نوالہ کھلا کر شیر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تمہاری طرح نہیں کہ بیٹے کی ہر خامی و برائی کی پردہ داری رکھی اور انجام کیا ہوا۔'' وہ دکھ بھرے لہجے میں بولے۔

''آپ بھی کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے۔ ہر وقت لعنت ملامت کرنا آپ کا شیوہ بن چکا ہے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے، ایک بیٹے کی دوری اور خفگی کا دکھ، دوسرے آپ کا یہ نامناسب رویہ مجھے پاگل کر کے ہی دم لے گا۔''

''آئی ایم سوری عالیہ...... دراصل میرا دکھ بھی تو بہت بھاری ہے۔ جوان بیٹا ہاتھوں سے ایسے نکل گیا ہے جیسے بند مٹھی سے ریت......'' انہوں نے اس کے کندھے پر بازو رکھ کر پژمردہ لہجے میں کہا تو عالیہ ان کے سینے سے لگ کر آنسو بہانے لگی۔

☆☆☆

''آئزک میں نے تمہارے پیار اور لگن میں اپنے والدین چھوڑے، گھر بار کو خیر باد کہا۔ اپنے تمام کولیگز سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ تمہاری صحبت کے نشے میں، میں تو ہر ایک کو بھول گیا ہوں حتیٰ کہ اپنے مذہب اسلام کو بھی بس تمہاری ڈگر پر چل نکلا اور تم ہو کہ مجھے اکیلا کیے دے رہے ہو۔ چھوٹے سے کمرے میں اکیلے میرا دم گھٹنے لگا ہے۔'' سعود تڑپ کر بولا۔ ''تمہارے انتظار میں ہی بے دست و پا بیٹھا خود کو کوستا رہتا ہوں۔''

''مائی ڈیر! زندگی کسی ایک کے ساتھ گزارنا تو sickness ہے۔ پارٹنر بدلتے رہیں تو اسی میں مزہ ہے۔ تم بھی پارٹنر بدل کر تجربہ کر دیکھو۔'' آئزک نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پارٹنر بدل لوں؟ بھلا نئے سرے سے اپنے تعلقات کسی نئے لڑکے سے کیسے استوار کر سکتا ہوں۔ تمہارے سائے میں چھپ چھپا کر بیٹھا ہوں۔ نہ تو اسٹوڈنٹ ویزا میرے پاس ہے نہ ہی جیب میں پیسہ ہے۔ تم بھی دغا دینے پر تل گئے ہو۔ آئزک ایسا ظلم مت کرنا ورنہ عمر بھر یہاں کی جیل میں گل سڑ جاؤں گا۔'' وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں اپنے انکل کے اسٹور پر نوکری دلوا سکتا ہوں لیکن اب تمہاری کسی پابندی میں ایک پل بھی گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''اس کی وجہ......؟'' سعود حیرت سے بولا۔

''بس میرا دل تمہاری دوستی سے بھر گیا ہے۔ اس بار اپنے جیسے گورے کا انتخاب کیا ہے۔ وہ اچھا دوست ثابت ہوگا۔ آخر ہے تو وہ اپنا۔'' وہ بد لحاظی سے بولا۔ ''اس کے پاس مجھے فیڈ کرنے کے لیے بہت وسائل ہیں، تمہاری طرح کا کنگلا اور بھکاری نہیں ہے جسے مجھے بھرنا پڑ رہا ہے۔ میں ایسی دوستی کے بغیر ہی بھلا ہوں۔''

''جب تک میرے پاس سمسٹر کی فیس رہی تم میرے رہے۔ میری پہچان، میرا روپ، میرا رنگ ڈھنگ سب کچھ بدل کر اب مجھے ایسے بے ہودہ طعنے دینے لگے ہو۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا ظالم کے بچے، تم اپنے ملک میں سیف ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ مجھے ایک کوڑی کا نہ چھوڑا...... دولت اور خونی رشتوں کا احساس زیاں مجھے زندہ درگور کر دے گا۔ مجھے تنہائی اور اس اسیری کی مار مت دو۔''

''تم اپنے ملک واپس چلے جاؤ، سیف ہو جاؤ گے۔ ویسے بھی یہاں پاکی رکنے کے تمام ہتھکنڈے جانتے ہیں۔ مہاگرو ہیں ایسے بلیک دھندے کرنے میں، جاؤ کسی پاکی کا سہارا لو شاید تمہارا مسئلہ حل ہو جائے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

''آتزک ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو کہ تم کیا ہو... کاش میں تمہاری اصلیت جان لیتا!'' سعود نے کانوں سے بالیاں اتارتے ہوئے کہا۔

''تم نے میری شباہت ہی بدل ڈالی، نامراد کہیں کے۔ میں تمہیں سبق سکھا کر چھوڑوں گا۔'' اس نے اپنے لمبے بالوں کی پونی بنائی اور قمیص کے بازو اوپر کر کے آتزک کے لمبے بالوں کو کھینچتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں قتل کر دوں گا اگر تم نے کسی اور کی طرف نظر بھی اٹھا کر دیکھا۔ میرا جتنا پیسہ تم کھا چکے ہو پہلے وہ واپس کرو پھر نکل جانا میری زندگی سے۔ فی الحال تم میرے زر خرید غلام ہو۔ کان کھول کر سن لو۔'' آتزک نے ایک جھٹکے سے اس کے سینے پر لات ماری۔ اور بال چھڑا کر دور کھڑا ہوا کر ہانپنے لگا۔

''تم جانتے ہو کہ کس ملک میں اور کس کے گھر میں کھڑے ہو۔ اپنی حیثیت پہچانو، میں نے تمہارا ایک پاؤنڈ بھی نہیں کھایا۔ بس اس کمرے کا کرایہ تم سے وصول کیا ہے۔'' وہ اسے ایک اور لات رسید کر گیا۔ سعود نیچے گر گیا۔ کوشش کر کے سنبھلا اور کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ وہ مقابلہ نہ کر سکا اور فوراً کمرے سے باہر نکل کر سڑک پر آ گیا اور پولیس کو فون کرنے لگا۔ پانچ منٹ میں پولیس کی گاڑی اس کے ڈربے نما گھر کے باہر کھڑی تھی۔ آتزک نے تمام صورت حالات سے انہیں مطلع کیا اور چند منٹوں میں سعود پولیس کی حراست میں تھا۔ وہ غصے سے آتزک کو گالیاں دیے جا رہا تھا۔ آتزک نے اسے جواباً ایک لفظ نہ بولا۔ تمسخرانہ و فتحمندانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔

''پاکی دہشت گرد خود کو سمجھتا کیا ہے، شکر کرو کہ آج کی رات جیل کی چھت کے نیچے گزرے گی۔ ورنہ سڑک پر اس یخ بستہ برف میں تم فریز ہو جاتے۔ اور کل مرے ہوئے کتے کی طرح اٹھا کر تمہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا

جاتا۔" اس نے اس کے قریب جا کر سرگوشی کے انداز میں کہا تو سعود نے ایک اور گھونسا لگانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پولیس نے اسے ہتھکڑیوں میں بری طرح سے جکڑ لیا تھا۔

☆☆☆

"رحمان..... رحمان، سعود میرا سعود۔" عالیہ سوتے سے چیختی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رحمان کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہڑبڑا کر اٹھے اور ایک دم سے بیٹھ کر آس پاس کا جائزہ لینے لگے کہ وہ کہاں ہیں اور یہ سب شور شرابا، چیخنا چلّانا کیوں ہو رہا ہے؟

"عالیہ ہوش میں آؤ۔" وہ اسے پوری توانائی سے جھنجوڑتے ہوئے چیخے۔

"تم مجھے کسی دن ہارٹ اٹیک کا تحفہ بخش کر ہی جان چھوڑو گی۔" وہ ہوش میں آچکی تھی اور خالی نظروں سے رحمان کو دیکھے جا رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے؟" رحمان نے اس کا سر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"میرا سعود، ہائے میرے دل کا ٹکڑا، رحمان جی میری خوشی کی خاطر سہی..... اسے ڈھونڈ نکالیں۔ وہ ہمیں چھوڑ کر خوش نہیں ہے۔ ذہنی و اعصابی جنگ میں گرفتار ہو کر وہ مجھے پکار رہا ہے۔ اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اسے معاف کر دیں۔ پلیز رحمان درگزر فرما دیں۔" وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

"اگر ایسا ہے تو وہ خود ہی تمہارے پاس آجائے گا۔ فکر نہ کرو۔ باہر کی دنیا بڑی ظالم، خود غرض اور بے حد پُراسرار ہے۔ جب تک وہ اپنے تجربات و مشاہدات سے خود درس نہیں لیتا۔ اسے ہمارا سمجھانا اور مالی طور پر سپورٹ کرنا بیکار ہے۔ بے شک ہمارے لیے خسارہ ناقابل برداشت ہے۔ مگر ہمیں اس کی بہتری کے لیے یہ زہر پینا پڑے گا۔ اس کا اسٹوڈنٹ ویزا کینسل ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ کب تک برٹش گورنمنٹ سے خود کو چھپا کر وہاں کا رہائشی بن سکتا ہے۔ جس دن پکڑا گیا فوراً ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔ اگر بیرا گیری کر کے اپنی فیس ادا کر کے اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہے تو اس سے بڑھ کر ہمیں اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ کہ کم از کم اس نے اپنی ذمے داری تو اٹھائی۔ یہ ٹریننگ اس کی زندگی کے ہر موڑ پر کام آئے گی۔ والدین جب تک بچے کی انگلی پکڑے اس کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں وہ بڑے نہیں ہوتے۔ ہمیشہ مسائل کھڑے کیے رکھتے ہیں۔ میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کر حماقت نہیں کی۔ دیکھنا وہ بغیر پیسے کے راہ راست پر آتا ہے کہ نہیں۔ یہ وقت بتائے گا۔ جب گورے کو محسوس ہوگا کہ اس کی جیب خالی ہے تو اس سے یاری کیونکر رکھے گا۔" وہ اسے تسلی دیتے رہے اور وہ سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

"میں نے اسے حلال روزی سے پالا ہے عالیہ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ حرام سے واپس نہ پلٹے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی پاک ذات پر پورا، پورا بھروسا ہے۔ وہ میری محنت، دیانتداری اور راست بازی ضائع نہیں کرے گا۔ یہ وقتی آزمائش ہے، ہم دونوں کے لیے جان لیوا اور اذیت ناک ضرور ہے مگر ہمیں ایک دوسرے کو تسلی و تشفی دینی ہوگی دعا کرو کہ ہم اس پر پورا اتر سکیں۔ صبر و تحمل اور ثابت قدمی ہمارے سنگ ہے۔ اور ہمارا سعود اپنی اصل شناخت کے ساتھ واپس پلٹ آئے۔ پھر وہ ہم سے بہترین مسلمان ثابت ہوگا اس لیے دل تسلی میں رکھو اور سونے کی کوشش کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں غلط نہیں کہہ رہا۔" وہ نہایت ملائمت سے بول رہے تھے۔

"میں آپ سب کی گناہ گار ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ممتا کی پٹی باندھ لی تھی اور آپ کو مجبوراً بے بس کر ڈالا۔ میں اپنا قصور مانتی ہوں۔" ہرچند وہ بہت آہستگی سے بولی تھی مگر آواز رحمان کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔

"اب پچھتانے سے گزرا ہوا وقت واپس تو نہیں آئے گا۔ قصور میرا ہے عالیہ، میں ایک جوان لڑکے کی ذہنیت اور رجحان کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی کمزور پڑ گیا۔ اسے میں نے کئی بار بڑے گھروں کے اوباش لڑکوں کے

ساتھ گھومتے پھرتے دیکھا تھا۔ تمہیں اس لیے نہ بتا سکا کہ تم میری بات کا یقین ہی نہیں کروگی۔ ہمارا بچہ ان لوگوں میں مالی لحاظ سے مس فٹ تھا۔ اس لیے اس نے ان میں شامل ہونے کے لیے ان کی تمام علتوں کو اپنالیا کیونکہ اسے اسی پر اختیار تھا۔ بدبخت نے یہ نہ سوچا کہ وہ کردار کی مضبوطی اور اخلاقیات کی پائداری سے شرفا واقربا کا ہمنشین بن کر بے پناہ عزت واکرام حاصل کرسکتا ہے۔ میری مثال اس کے سامنے تھی۔ مجھے پیسے کی کمی ضرور ہے مگر مجھے عزت وناموس کی کمی نہیں۔'' وہ پورے اعتماد سے بولے تھے۔

☆☆☆

''سر! دس از ناٹ فیئر..... آج تک میرا جی پی اے 3.5 سے نیچے کبھی نہیں گیا۔ یک دم اتنا بڑا چینج کہ فلنگ ہوتے ہوتے بچی ہوں۔ ایسا ممکن نہیں۔'' ثمرا، سر عادل کے آفس میں بیٹھی استفہامیہ لہجے میں بول رہی تھی اور عادل اسے بے باک نظروں سے دیکھے جارہا تھا۔ چہرہ پُرسکون اور لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔

''ہم یہاں کس لیے بیٹھے ہیں..... تمہیں ہر صورت اور ہر قیمت پر ڈگری دلا کر چھوڑیں گے۔ آج سے مسئلہ تمہارا نہیں رہا۔ اس کی ذمے داری میں اٹھالیتا ہوں۔ تم بے فکر رہو، چاہے کتابوں کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دو۔'' وہ یہ سن کر ایک دم جھینپ سی گئی۔ ''اس کے باوجود بھی ڈگری تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

''ایسی فیک ڈگری کا نہ تو مجھے فائدہ ہے نہ ہی میری قوم کے ان اسٹوڈنٹس کو..... مجھے اپنے زور بازو پر ڈگری حاصل کرنے پر فخر ہوگا۔ اور اس جذبے میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی تو وہ خفیف سا ہوکر اسے دیکھنے لگا..... کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر اس سے مخاطب تھا۔

''پھر تم نے میرے پروپوزل کے بارے میں کیا سوچا.....؟ اپنی سہیلیوں سے بھی مشورہ کیا ہوگا۔ والدین کو انفارم کرنا بھی ضروری سمجھا ہوگا۔'' وہ سنجیدہ اور بارعب لہجے میں بولا۔

''جی آپ نے درست کہا ہے مگر میں اپنا فیصلہ آپ کو سنا چکی ہوں۔'' وہ ذرا سی چڑ گئی۔

''یعنی مطلب یہ ہوا کہ وہ فیصلہ حتمی اور آخری تھا۔ سوچ لو، بدلا بھی جاسکتا ہے۔ فیصلے، حالات وواقعات کے ساتھ بدلے اور توڑے جاسکتے ہیں۔'' وہ استحقاق سے بولا۔

''ڈیگریڈ! غلط فیصلے بدلے جاسکتے ہیں۔ میرا فیصلہ سو فیصدی درست ہے۔ آپ اپنا فیصلہ بدلیں۔'' وہ ایک دم سے بول کر لرز گئی۔

''اطلاعاً عرض ہے کہ میرا فیصلہ قابلِ ستائش اور مستحکم ہے اس لیے قائم ودائم ہے۔'' لہجہ دھمکی لیے ہوئے تھا۔ اسے ایک ان جانے خوف نے ہراساں و پریشان کرڈالا تھا مگر سنبھل کر بولی۔

''آپ اپنا فیصلہ مجھ پر مسلط کرنے سے پہلے میرے اور اپنے پیرنٹس کو اس میں انوالو کریں۔''

''میں ان کی ضرورت محسوس نہیں کرتا..... زندگی میری ہے، پسند بھی میری ہی ہونی چاہیے اور تم بھی اسی فارمولے کے تحت زندگی گزارو۔'' وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے بولا۔ لیکن ثمرا نے اپنی ہمت کو بحال کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

''آپ کی زندگی آپ کے خونی رشتوں سے منسلک ہے اس پر ان کا بھی اختیار ہے۔ ان کے مشاہدات و تجربات کے پیشِ نظر کیے جانے والے فیصلے ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار رہتے ہیں۔ اس لیے سر! اپنی مدرسے کھل کر اس معاملے میں ڈسکس کیجیے۔ انہیں حقیقت اور سچائی سے تمام حالات واضح کرنے میں کوتاہی مت کیجیے گا۔ اور میرے بھی خیالات اور فیصلہ ان تک پہنچا دیجیے گا۔'' اس نے نہایت خوداعتمادی سے کہا تو وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگا۔

''تمہاری منطقیانہ باتیں اور فرسودہ دلائل مجھے قطعاً پسند نہیں۔ اور جو تم کہہ رہی ہو..... کیسی حقیقت اور کیسی سچائی؟ میں سمجھا نہیں۔'' وہ حیران کن لہجے میں بولا۔

''انہیں ہمارا بیک گراؤنڈ بتانا مت بھولیے گا۔'' وہ طنزیہ مسکرائی۔ ''میرا تعلق مڈل کلاس سے ہے۔ جس خاندان میں میرے والد صاحب کے سوا کوئی گزیٹیڈ افسر نہیں ہے۔ زیادہ تر کا بزنس سے تعلق ہے۔ بڑے بزنس نہیں، کہیں آپ خوش فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔ بہت چھوٹے، دال روٹی مہیا کرنے والے بزنس.....''

''اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''سروکار ہونا چاہیے..... کیونکہ یہ گڈے گڑیا کا کھیل نہیں، اسی لیے تو اپنے بزرگوں سے بھی مشورہ کیا جاتا ہے اور ہر طرح کی رائے کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے۔'' پھر اس نے اپنے مالی حالات اور بھائی کی نافرمانی کے بھی قصے سنا ڈالے۔

''میرا ان حالات سے کوئی تعلق و رشتہ نہیں محترمہ..... میرا رابطہ ہے تو تم سے، مجھے اپنے والدین کو ایسی فضول اور غیر موزوں تفصیلات بتانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ تمہاری رضامندی کے بعد انہیں انفارم کردوں گا۔'' اس کے لہجے میں درشتی تھی۔ ''اور اب تم جاؤ اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔''

''وہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کا بدلنا میرے بس میں نہیں جناب۔'' وہ تلملا کر بولی اور جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ ''آپ جس دھاندلی سے میری ڈگری روکنا چاہ رہے ہیں۔ آپ کو اس کا حق نہیں پہنچتا۔ میں وائس چانسلر سے انصاف مانگوں گی۔'' نہ جانے اتنا غصہ اس میں کہاں سے آ گیا تھا۔ شاید احساسِ توہین تھا۔

''تم مجھے غلط مت سمجھو۔'' اس نے اس کی طرف مضطرب ہو کر صلح جویانہ انداز میں کہا۔

''مجھے تم سے پیار ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مجھ میں کس چیز کی کمی ہے جس نے تمہیں انکار کرنے پر مجبور کیا ہے؟'' وہ اب التجا کر رہا تھا۔

''یونیورسٹی کی سیکڑوں دوشیزاؤں اور دنیا کی ہزاروں حسیناؤں میں سے میں نے تمہیں چنا ہے۔ اس عزت افزائی کا ہی مان رکھ لو۔ بہت عاقبت نا اندیش لڑکی ہو۔ چلو اب جاؤ، میری باتوں پر غور کرنا۔'' ایک دم سے پھر اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی اور لہجے میں تبدیلی واقع ہوئی۔ وہ لہجہ جوان کے باپ کا تھا۔ ہر بات منوانے اور اپنے ہر فیصلے پر مستحکم رہنے والا سنگین اور کٹھور لہجہ..... جس کا لبادہ وہ خود پر چڑھانے کا عادی تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اپنی بات دوسروں سے منوانے کا بہترین طریقہ یہی ہے۔ وہ اسے ہراساں و حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ اس وقت حقیقتاً وہ اسے بالکل ہی پاگل اور دیوانہ لگ رہا تھا۔ ایک پل میں میٹھا دوسرے لمحے زہریلا و غیر متوازن اور غیر مناسب۔ وہ کرسی سے بہ مشکل اٹھی۔ اور اللہ حافظ کہہ کر بوجھل قدموں اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ آفس سے باہر نکل گئی۔

سامنے ہی لان میں اس کی تینوں سہیلیاں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ بجھے ہوئے چہرے اور ندامت سے لبریز ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کے قریب آ کر بینچ پر بیٹھ گئی۔ تینوں نے شریر انداز سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

''خبردار جو ایک بھی سوال کیا۔'' نمرا نے نظریں چراتے ہوئے سختی سے کہا۔

''سوالات تو ہم کریں گے، یہ بتاؤ کہ عشق کہاں تک پہنچا؟'' حمیرا نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایسے جنگلی اور وحشی انسان سے عشق تو کیا نفرت بھی نہیں ہے۔ بالکل ہی سرپھرا ہے، نہ بات کرنے کا طریقہ و سلیقہ ہے نہ ہی پہننے اوڑھنے کی تمیز..... اول جلول اور بد دماغ کہیں کا۔ اور سمجھتا ہے خود کو تیس مار خان اور افلاطون۔''

''تو پھر تم تو تیار ہو جاؤ ایم بی اے کی ڈگری اس پر قربان کرنے کو۔'' تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''عزتِ نفس سے بڑھ کر کوئی اور ڈگری اہم نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆☆☆

''ثمرہ! بات آگے کیسے بڑھے گی؟'' عالیہ نے چائے پیتے ہوئے خاصی فکرمندی سے کہا۔

''کون سی بات؟'' اس کے لہجے میں ناگواری تھی اور انداز بھی ویسا ہی تھا۔ عالیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی دلی مراد بر آئی تھی اور بیٹی بیزار اور بے نیاز لگی تھی۔

''بیٹا ہم دونوں کے درمیان ایک ٹاپک چل رہا ہے، تم انجان بننے کی کوشش مت کرو۔ ماں سے تم کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتیں۔ ہماری طرف سے پیش رفت ہونی چاہیے۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار تم سے کیا ہے، اب تم عمل درآمد کے لیے تیار ہو گی تو وہ اگلا قدم اٹھائے گا ناں۔'' وہ ملائمت سے بولی۔

''امی آج بھی میرا وہی فیصلہ ہے۔'' وہ شائستہ لہجے میں بولی۔

''بیٹا تم ضد کے معاملے میں سعود سے چار ہاتھ آگے ہی ہو۔ عورت کی ضد تو بربادی و رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔'' عالیہ کے لہجے میں خفگی سرایت کر گئی۔ ''تم دونوں بچے ایسے کیوں ہو؟ ہر بات اپنی منوانے کا ٹھیکا لے کر پیدا ہوئے ہو۔ ہم سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے؟''

''امی، میں آپ کو ہر اونچ نیچ بتا چکی ہوں، آپ پھر بھی اپنی ہی بات پر ڈٹی ہوئی ہیں۔'' وہ قدرے الجھ کر بولی۔ ''ضدی میں نہیں آپ ہیں۔''

''تم کیا سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے انتظار میں تمام عمر بیٹھا رہے گا۔ اسے رشتوں کی کمی نہیں۔ پلیز بیٹا ہمیں گرین سگنل دو تاکہ کچھ سنجیدگی سے سوچا جائے۔''

''امی! مجھے تو لگتا ہے خوشیاں ہم سے روٹھ گئی ہیں۔ مسائل نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ ہماری عقل ماری گئی ہے۔ سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو گئی ہے۔ سیاہ اور سفید کی تمیز رخصت ہو گئی ہے۔'' ثمرہ کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ ''امی خدارا! اپنے ہوش و حواس میں واپس آجائیں۔''

''جس گھر میں اولاد ہی نافرمان ہو۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دخل کیونکر ہو گا۔ میں نے تمہیں اپنی زندگی کی ہر مشکل اور حسرت سے روشناس کیوں کیا؟ تاکہ تم اپنے مقدر پر نازاں ہو، اقرار کر لو۔'' عالیہ نے خفگی سے کہا۔

''امی وہ بہت ضدی اور غصیلا انسان ہے۔ میں اس کے محبت کے دعوے کیسے یقین کر لوں۔ ایک نظر دیکھ کر کی جانے والی محبت کی عمر بھی اسی طرح کم ہی ہوتی ہے۔ اسے اپنے جذبات پر قابو پانا آتا ہی نہیں..... اتنا پڑھا لکھا ویل ایجوکیٹڈ ہونے کے باوجود نہایت سطحی اور ہر طرح کے رکھ رکھاؤ اور لحاظ اور عزت و احترام سے بالکل ہی بے بہرہ ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ اس قدر گھٹیا انسان ہے کہ میرے انکار پر میرا جی پی اے ڈاؤن کر کے بہت خوش ہو رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس طریقے سے رام کر لے گا۔ وہ اس سے گھٹیا حرکت اور کیا کر سکتا ہے۔ اس کی ذہنیت کا اندازہ آپ اس کی اس قبیح حرکت سے بہت اچھی طرح لگا سکتی ہیں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ تمہاری سوچ جو منفی ہے، اس وقت وہ جو بھی کرے گا تم اسے غلط اور بھیانک گھٹیا پن کا رنگ دو گی۔'' عالیہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''بے وقوف، یہ اس کی پسندیدگی کی انتہا ہے۔ گھٹیا پن نہیں۔''

''امی تو پھر میں آپ پر چھوڑتی ہوں، مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہو گا۔ کیونکہ آپ نے بھی میری ہر بات کو رد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جو مرضی ہے کریں۔'' وہ مفاہمت کے انداز میں بولی۔ ''آپ میری ماں ہیں، ماں اولاد کے لیے بہتر ہی سوچتی ہے اور فیصلے بھی بہترین کرتی ہے اور پھر آپ جیسی اس قدر پیار کرنے والی ماں تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہ ملے۔''

''میری نمرا جیسی تابعدار اور فرمانبردار بیٹی بھی تو شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔'' عالیہ بیٹی کو اپنے ساتھ چمٹا کر فخریہ انداز میں بولی تو نمرا اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے ماں کو تاسف بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

''بیٹا! مجھے سر عادل کا سیل نمبر چاہیے۔ میں خود اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ اس پر نہال ہوتے ہوئے بولی۔

''میں آپ کو سر کا نمبر نہیں دوں گی۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''بلکہ سر کو آپ کا نمبر دینا مناسب رہے گا۔ اگر وہ اس قدر سیریس ہو چکے ہیں.... تو وہ خود ہی آپ سے رابطہ کرلیں گے۔ ممی یہ یاد رکھیے گا میں نے سب آپ پر چھوڑ دیا ہے۔ مجھ سے وعدہ کریں کہ میرے بھروسے کو کھائل نہیں ہونے دیں گی۔ کیونکہ دولت ہر غم کا مداوا نہیں ہو سکتی۔ ہر رشتے کے نبھانے میں ذہنی ہم آہنگی بہت اہم ہوتی ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ تو ہے ہی بہت نازک...... ریشم کے دھاگے کے مانند...... بہت ملائم اور نرم...... جو پہلے دن سے ہی الجھا ہوا ہوتا ہے۔ اسے اٹوٹ بنانے کے لیے اپنے اصولوں کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کیجیے گا۔''

''میں جانتی ہوں، آخر میں نے بھی تو ایک مرد کے ساتھ زندگی کا قیمتی اور بہترین وقت گزارا ہے۔ اس رشتے کا نبھا صبر و تحمل کی بنیاد پر رکھا جاتا ہے۔ تمام مرد، بیوی کے لیے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ ان کے خیالات، ان کی سوچ اور ان کی مردانگی، غیرت وانا بیوی کے معاملے میں بہت اونچی ہوتی ہے۔ چاہے شوہر غریب ہو یا امیر پڑھا لکھا ہو یا جاہل.... بیوی کے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کو اپنی ہتک اور توہین گردانتا ہے۔ تو کیوں نہ کسی مالدار شوہر کا چناؤ کیا جائے۔ آسائشات تو لامحدود ہوں گی۔ عیش تو جی بھر کر کرلو گی۔ پھر شوہر کی تھوڑی نامناسب حرکات کو سہنا بھی آسان ہو جائے گا۔'' وہ اسے سنجیدگی سے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور نمرا ماں کے خیالات سے اتفاق کرنے والی کہاں تھی۔ بس خاموش رہی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کی ماں عادل کے اسٹیٹس کو اہمیت دے گی۔ اس کی دولت پر ہی ریجھ جائے گی۔ کیونکہ ان کی زندگی میں دولت کی کمی جو رہی تھی انہیں ہر مسئلے کا حل پیسے میں ہی نظر آیا کرتا تھا۔ یہی ماں عادل کی پرسنالٹی کو غیر ارادی طور پر نظر انداز کر کے اسے عمر بھر کے لیے آندھی اور طوفان کے سپرد کر دے گی۔ افسوس و رنج سے وہ سوچے جا رہی تھی۔

☆☆☆

''حسنات آپ کے لیے کھچڑی بنوا دیتی ہوں۔ دہی ڈال کر کھا لیجیے گا۔ جسم میں طاقت بھی آئے گی اور معدے کی تیزابیت بھی نہیں بڑھے گی۔'' سائرہ اسٹڈی میں دروازہ ناک کیے بغیر ہی چلی گئی تو انہوں نے کتاب بند کر کے موٹے شیشے کے چشمے سے بغور اسے دیکھا۔

''تم یونیورسٹی جا رہی ہو؟'' وہ بے اختیار ہی بولے۔

''جی حسنات...... آج بہت اہم لیکچر ہے۔ ورنہ ہرگز نہیں جاتی۔'' وہ قریب آ کر بولی۔

''جلدی آ جانا۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بولے مگر اگلے ہی لمحے چہرے پر سختی عود کر آئی جیسے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

''لیکچر ختم ہوتے ہی نکل آؤں گی۔'' وہ دل میں خاصی خوش ہوئی۔ لہجے میں بھی طمانیت تھی۔

''آپ کا ڈوج پر لیٹ کر مطالعہ کر سکتے ہیں اور دوا وقت پر کھا لیجیے گا۔''

''تم میری فکر نہ کرو، آئی ایم فائن۔ اپنا کام کمپلیٹ کر کے ہی گھر آنا۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اب تم جاؤ۔'' وہ بے رخی سے بولے تو وہ ایک دم بجھ سی گئی اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

''حیوان سے انسان بننے تک کا عمل اتنا آسان اور سہل نہیں جتنا میں نے سمجھ رکھا ہے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھی۔ آدھے راستے میں پہنچ کر اسے یاد آیا کہ اس نے خانساماں کو حسنات کے کھانے کے بارے میں

ہدایات ہی نہیں دیں۔ اور وہ بے وقوف مرچ مسالوں والا کھانا بنا کر ان کے آگے جا رکھے گا اور وہ بلا حیل وحجت تناول فرمالیں گے۔ اور پھر رات بھر خود بھی جاگیں گے اور اسے بھی سونے نہیں دیں گے۔ لیکن کیا مجال کہ ان کے روبرو کچھ تسلیم کر جائیں۔ عادل آخر بیٹا تو انہی کا ہے ناں گھر چھوڑا تو پلٹ کر نہ دیکھا۔ ماں کی تمام قربانیاں، محبتیں اور چاہتیں بھلا بیٹھا آخر نیچر ہی نرچر...... (پرورش) پر حاوی ہونے میں کامیاب رہی۔ ہم انسانی نیچر کو نرچر (پرورش) سے سنوارنے کی ناکام کوشش کیوں کرتے ہیں...... اسے اس کی فطرت کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اس کے وجود کو بخشی ہے۔ جو اس کے جینز میں پوشیدہ ہے ہم اسے مان کے کیوں نہیں دیتے؟ ہم کتنے نابلد اور احمق ہیں۔'' وہ تاسف سے سوچتی رہی اور ساتھ ہی اس نے خانساماں کو فون ملا دیا۔

''ہیلو اسلم چاچا...... صاحب کے لیے کھچڑی بناؤ اور گھر کے بنے سادہ دہی کے ساتھ انہیں اسٹڈی میں ہی پیش کر دینا۔ اگر انہوں نے سالن کی فرمائش کی تو کہنا کہ ابھی تیار نہیں ہوا۔ انہیں تو اپنی صحت کی پروا نہیں اس لیے تو طبیعت سنبھل نہیں رہی۔'' وہ فکرمندی سے بول رہی تھی۔ ''تم ان کی نہیں میری ہدایات پر چلنے کی کوشش کرو۔ ہر بار میری غیر موجودگی میں ان کی بات مان جاتے ہو۔''

''بیگم صاحبہ...... میں تو انہیں کہہ دوں گا۔ مگر وہ کچن میں آکر فریج سے لے کر الماریوں تک کی تلاشی لے لیتے ہیں۔ میں ایک ادنیٰ ملازم ہونے کے ناتے انہیں منع کرنے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔ آپ کو صاحب کے مزاج کی تو خبر ہے ناں...... جو سوچ لیتے ہیں وہی کر کے چھوڑتے ہیں۔'' وہ بھی شکایتی لہجے میں بولا۔

''تم یوں کرو ڈنر عین ٹائم پر ہی بنانا۔ ابھی ان کا لنچ تیار کرو۔ رات کو میں خود انہیں کچھ ہلکا پھلکا کھانا بنا کر کھلا دوں گی۔ ابھی تمہاری ذمے داری ہے کہ وہ بدپرہیزی نہ کر سکیں۔ اور ہاں بارہ بجے دوا کی یاد دہانی کرانا مت بھولنا۔'' وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی اور فون بند کر دیا۔ اسے خود [illegible] کی ہمدردی اور فکرمندی پر خود پر حیرت ضرور ہوا کرتی تھی کہ شاید یہ نکاح کے چند بول کا اثر تھا کہ حسنات کی زیادتیوں کی یاد کے باوجود تمام تر وفا اسی سے منسوب تھی۔ جبکہ حسنات کا رویہ تو اسی طرح ٹھنڈا ٹھار تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ سکون محسوس کرتے ہوئے بھی سرد مہری کا اظہار کرتے۔ شاید جنگی ہتھیار ڈالنا فطرت کے منافی تھا۔

یونیورسٹی پہنچ کر اس نے اپنا لیکچر دیا اور کسی سے بات چیت کیے بغیر سرعت سے گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور کو اسپیڈ تیز کا کہہ کر وہ اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ٹریفک لائٹ پر گاڑی رکی تو ساتھ رکنے والی گاڑی عادل کی تھی۔ سائرہ نے چونک کر اس کے ناخوش چہرے کی طرف دیکھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی اور کالر کھلے ہوئے تھے۔ بال بھی بے ترتیب اور آنکھیں اجڑی ہوئی لگیں۔ وہ ایک دم سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ اس سے آنکھیں چار نہیں کرنا چاہ رہی تھی ورنہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بزدل اور بے بس ہو جاتی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوئی۔ یہ سوچ کر کہ ہمیں چھوڑ کر وہ بھی تو پریشان ہے۔ بھلا دلوں کے اور خون کے رشتوں کی حدت اور سرخی کبھی ختم بھی ہوئی ہے؟ یہ رشتے کتنے ہی غیر مناسب کیوں نہ ہوں۔ بہت پیارے ہوتے ہیں۔ ناراضیوں اور نفرتوں کے باوجود جب آمنا سامنا ہو جائے تو وقتی اور عارضی طور پر ہی سہی وجود کے رگ و پے میں سکون اور اطمینان کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔

''مجھے تمہاری واپسی کا انتظار ہے عادل۔ فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے میرے بچے...... اللہ کرے تم اپنی زندگی میں جو بھی فیصلہ کرو بہترین اور کارآمد ہو۔ شاید تم میں کانفیڈنس لیول ہائی ہو جائے اور تم مجھے گناہ گار ٹھہرانا اور مجھ سے نفرت کرنا چھوڑ دو۔ میرے بچے! جب اولاد ماں کی تربیت کو چیلنج کرنے لگے تو ماں پر قیامت طاری ہو جاتی ہے جو قبر میں بھی اس کے ساتھ ہی جاتی ہے۔'' گاڑی نے جنبش کی تو سائرہ اپنی سوچوں کی دنیا سے باہر نکل آئی اور حدِ نظر عادل کی تیز رفتار گاڑی کو دیکھ کر اس کی جان کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

☆☆☆

''سر! میں اندر آسکتی ہوں؟'' وہ آفس کے دروازے کو کھول کر سر اندر کرتے ہوئے بولی تو عادل چونک کر کھڑا ہو گیا۔

''آؤ کسی نے روکا ہے کیا؟ اس آفس کے ہی نہیں اس دلِ ناتوان کے دروازے بھی تمہارے لیے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔'' وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ نمرا کو محسوس ہوا جیسے وہ صیاد کے جال میں پھنس کر پھڑ پھڑانے لگی ہو۔ اس میں برداشت کا مادہ تو بے تحاشا تھا مگر آج لیول کافی ہائی تھا۔ اس نے عادل کے ریمارکس کو نظر انداز کرنے میں ہی عافیت جانی۔ وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے ابھی اسے نوالہ بنانے کی کاوش میں ہو۔

''یہ لیچڑ، غلیظ اور خبیث فطرت میری ماں کو پسند آئے گا؟ ہرگز نہیں...... میری ماں کی پسند ایسی گھٹیا اور حقیر نہیں ہو سکتی۔'' اس کے دل نے سرگوشی کی۔

''کیسے آنا ہوا؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم کیوں کھنچی چلی آئی ہو، نہ بھی آتیں تو پھر بھی مجھے تو فرق نہ پڑتا...... فکر نہ کرو، اگلا سمسٹر خوب رہے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ بغیر محنت کیے کامیاب رہو گی۔'' وہ دل ہی دل میں اپنی بھڑاس نکالتی ہوئی لب بھینچے بیٹھی رہی۔

''چائے یا کافی...... وہ نرمی سے بولا۔ ''یا پھر...... بندۂ خاکی حکم کا پابند ہے۔'' وہ کھل کر ہنسا تو وہ تلملا کر رہ گئی۔ اس نے بیل کا بٹن دبایا تو آفس بوائے اندر داخل ہوا۔ مشکوک نظروں سے نمرا کو دیکھتا ہوا وہ عادل کے قریب چلا گیا۔ نمرا ندامت سے سر سے پیر تک پانی پانی ہو گئی۔ اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اندر دھنس جائے۔

''دو کافی...... خوب مزے دار ہو۔'' عادل نے انگلی کے اشارے سے کہا۔ ''اور کیفے ٹیریا سے دو اسپیشل برگر بھی پکڑ لانا۔'' آفس بوائے نمرا کو کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

''سر مجھے کچھ نہیں کھانا پینا۔ دراصل میں آپ کو اپنی امی جان کا موبائل نمبر دینے آئی تھی۔ آپ ان سے رابطہ کر سکتے ہیں۔'' وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ ''تاکہ آج کے بعد مجھے آفس آنے کی ضرورت پیش نہیں آئے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔''

''گڈ نیوز، مجبوری میں فیصلہ کیا ہے یا سچ مچ میری محبت پر اعتبار کر لیا ہے؟ تم میری چاہ کو جھٹلا نہیں سکتیں۔ میری محبت سے انکار نہیں کر سکتیں۔'' وہ خوشی سے مغلوب ہو کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اضطراری کیفیت اس کے لرزتے ہاتھوں سے معلوم ہو رہی تھی اور وہ آنکھیں جھپکے جا رہا تھا۔ سانس میں بھی خاصی تیزی تھی۔ وہ گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ''مائی گاڈ......'' اس نے دل ہی دل میں تڑپ کر کہا۔

''میری بات غور سے سنو۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''پریشان ہونے کی بات نہیں۔ میرا فیصلہ احمقانہ ہے اور نہ ہی تمہارا۔ میں جانتا ہوں کہ تم عقلمند ہونے کے ساتھ ذہین و فطین بھی کمال کی ہو۔ پریکٹیکل لائف میں قدم رکھو گی تو یہی دانشمندی تمہاری رہبری کرے گی۔'' وہ مدبرانہ انداز میں بولا مگر وہ نگاہیں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ اس کی طبیعت پر دھند سی چھانے لگی۔ اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی۔ اپنی ذات بے وقعت محسوس ہوئی اور اپنا آپ بالکل ہی بے مول اور بے حیثیت لگا۔

''میں اس مینٹل کے ساتھ زندگی کیسے گزاروں گی؟'' وہ سوچے جا رہی تھی۔ ''اللہ کرے امی اسے ریجیکٹ کر دیں۔ یا الٰہی معجزہ دکھا دے اپنی شان کا۔''

''نمرا موقع خوشی کا ہے، دستور کے مطابق۔'' وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''تم ویسے لڑکی کمال کی ہو۔ میرے تصور سے بہت اعلیٰ و ارفع......''

''کم بخت تمہیں میری اذیت کا اندازہ ہو جائے تو شاید اپنی اس ناجائز خواہش اور بے جا ضد سے باز آ جاؤ۔ مگر

تم ایسا نہیں کرو گے۔ تمہارے ذہن میں یہ آرزو پھنس کر رہ گئی ہے کہ تم نے شادی مجھ سے ہی کرنی ہے۔تم دل کے کمزور انسان ہو۔اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبو گے۔آنے والی نسل کے لیے بھی نہ ختم ہونے والا اذیت و کرب ناک سفر تعین کر کے فخر سے کہو گے کہ میرا فیصلہ لاجواب ہے۔نہ جانے تم کس دنیا کے باسی ہو کہ کسی اونچ نیچ کی تمہیں خبر ہی نہیں۔ڈگریاں حاصل کرنے سے عقلِ کل نہیں ہو جاتے ...بے وقوف کہیں کے۔'' وہ دل ہی دل میں اسے کوستی رہی اور اپنی تقدیر پر ماتم کناں ہوتی رہی۔ برگرز اور کافی کے ہمراہ آفس بوائے دروازہ ناک کر کے اندر آیا تو اس نے سکون کی ایک لمبی سانس لی۔اس نے پہلے ایک برگر اور کافی کا مگ عادل کے سامنے رکھا تو اس نے ہاتھ سے ثمرا کے سامنے کر دیا۔اور دوسرا برگر اور کافی کا مگ اپنے سامنے رکھ لیا۔آفس بوائے دونوں کو باری، باری دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ثمرا کو بہت ناگوار گزرا۔عادل نے اس کے چہرے کی ناگواری محسوس ہی نہیں کی۔اپنی ہی لے میں بولنے لگا۔

''تمہاری امی کو اپنا حالِ دل سناؤں گا۔شرطیہ وہ انکار نہیں کریں گی۔'' اس کا دل چاہا کافی کا مگ اس کے چہرے پر پھینک کر یہاں سے بھاگ جائے اور پھر کبھی یونیورسٹی کی طرف رخ نہ کرے۔بھاڑ میں جائے ایم بی اے کی ڈگری اور فیوچر......

''میرا کام ہے، اپنی خواہش کا اظہار کرنا...... تمہارا فرض ہے اقرار کروانا، پیرنٹس سے منوانا۔ہم دونوں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھانے کا فیصلہ کریں تو پھر یہ مسئلہ حل ہوتا نظر آتا ہے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''سر مڈل کلاس کی اولاد اپنے والدین کے فیصلوں پر اعتراض نہیں کر سکتی۔انہوں نے انکار کا فیصلہ کیا تو میری یہ مجبوری ہوگی کہ میں کسی صورت انکار کو اقرار میں بدلنے کی گستاخی نہیں کر سکتی۔'' وہ بے اختیار بولی۔

''تم گستاخی سے میرے ساتھ بھی پیش نہیں آسکتیں۔خیر میرا رتبہ بھی تو قابلِ احترام ہے۔والدین کے بعد استاد کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے۔اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ ایک دم سے flare up ہوا اور زہر خند سے بولا۔''اور میرا فیصلہ سو فیصدی درست ہے۔یہ تو تمہیں ماننا پڑے گا۔میں نہ تو عقل و شعور میں کسی سے کم ہوں نہ ہی کسی قسم کے امتحان سے ڈر کر چھپنے والا ہوں۔'' وہ دانت پیسنے لگا اور انگلیاں مروڑنے لگا تھا۔وہ سہم کر اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں، ہاں اپنی منطق جھاڑو، کچھ بولو، خاموش کیوں ہو؟'' وہ آنکھیں نکالتے ہوئے بولا تو وہ کسی مجرم اور قصوروار کی طرح آنکھیں جھکا کر بیٹھ گئی۔اور دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگنے لگی...... ''میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' وہ ایک دم نارمل ہو گیا۔

''کیا آپ سے، فیصلے کے سامنے والدین بھی خاموش رہیں گے؟'' وہ زبردستی گلو خلاصی کے لیے بولی۔

''ہاں ایسا ہی ہے، میں آزاد ہوں ہر لحاظ سے...... کسی کا پابند نہیں ہوں...... اور نہ ہی اپنی زندگی کو قید و بند کی صعوبتوں میں گزارنے کے حق میں ہوں۔تم بھی غور سے سن لو۔اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں زمانے سے تمہیں چھین لوں گا۔میں نے تمہیں پسند کیا ہے، تم سے محبت کی ہے، یہ مذاق ہرگز نہیں...... آئی ایم ایکسٹریملی سیریس......'' وہ آزردہ مگر مستحکم لہجے میں بولا تو وہ اس کی بے ترتیب، بے معنی و بے مصرف باتیں سن کر رحم لانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔آفس میں خاموشی پکار اٹھی تھی۔جبکہ عادل اپنی مخصوص حرکات میں مگن تھا۔کبھی آنکھیں جھپکتا، کبھی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے چہرے کو کتنے ہی زاویے دیتا اور پھر اس بیدردی سے انگلیاں مروڑتا کہ انگلیاں ٹوٹ کر گر جانے کا خدشہ ہونے لگتا تھا۔ثمرا پژمردگی میں اسے حق دق دیکھے جا رہی تھی۔

☆☆☆

عالیہ موبائل شیلف پر رکھ کر کچن میں بکھرے ہوئے برتنوں کو واش بیسن میں رکھنے لگی۔کچن کے چھوٹے ہونے اور چیزوں کی جگہ کم ہونے کا وہ ہمیشہ ہی گلہ کرتی، کبھی کھل کر تو کبھی دل میں کڑھتی اس وقت بھی یہی عالم تھا۔دو

لوگوں کی چائے بنانے کے بعد کچن کا سماں ہی اور ہوتا۔ لگتا جیسے محلے بھر کے لیے کھانا بنایا گیا ہو..... تمام زندگی حسرتوں میں ہی بیت گئی۔ جبھی موبائل کی بیپ پر وہ چونکی۔ برتن دھوتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر نمبر کو دیکھا۔ ان نون نمبر دیکھ کر وہ پھر برتن دھونے لگی۔ لمبی رنگ کے بعد فون بند ہو جاتا اور اگلے پل پھر اس کی رنگ ٹون بج اٹھتی۔ عالیہ کو بھی ایسی ضد آئی کہ وہ ہر بار دانت پیستی رہ جاتی۔ برتن دھونے کے بعد وہ انہیں خشک کر کے الماری میں رکھنے لگی۔ دوسری طرف کی ثابت قدمی کی داد دیتے ہوئے اس نے فون آن کیا۔ ”کوئی بہت ڈھیٹ اور بے شرم انسان ہے۔ ابھی کم بخت کی کلاس لیتی ہوں۔“

”ہیلو..... کون بول رہا ہے؟“ عالیہ نے رکھائی سے پوچھا۔

”محترمہ عالیہ صاحبہ تشریف فرما ہیں۔ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ عادل نے نرم لہجے میں کہا۔

”آپ اپنا حدود اربعہ تو بتائیے جناب..... کون بول رہا ہے؟ اور آپ کی ڈھٹائی کی داد دیتی ہوں۔ آپ آواز اور ادائیگی الفاظ سے تو خاصے مہذب معلوم ہوتے ہیں لیکن فون کرنے کے اسٹائل سے تو بالکل ہی پینڈو معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے پہلی بار کسی بچے کے ہاتھ کھلونا لگا ہو۔“ عالیہ کام کر کر کے ویسے ہی غصے اور کوفت سے بھری ہوئی تھی۔ تلملا کر پھٹ پڑی تھی۔

”جی میں عادل رضا بول رہا ہوں۔ غالباً آپ نمرا رحمان کی والدہ ماجدہ ہیں۔ میں پہچان گیا ہوں اور آواز و انداز سے ماں، بیٹی کی آواز میں رتی بھر بھی جو فرق ہو۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا تو عالیہ سکتے میں چلی گئی۔ آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی اور وجود پر کپکپی چھا گئی۔

”آنٹی..... میرا اندازہ درست ہے نا جی؟“ دوسری طرف کی آواز پر اس نے تھوک نگلا اور منمنائی۔ اور خود پر تیزی سے قابو پانے لگی۔

”درست بالکل درست..... میں نمرا کی امی ہی بول رہی ہوں۔“

”نمرا نے میرا غائبانہ تعارف تو کرا ہی دیا ہوگا۔“ وہ پر امید لہجے میں بولا۔

”ففٹی پرسنٹ اس نے آپ کے بارے میں بتایا ہے، ففٹی پرسنٹ آپ بتا دیجیے۔“ وہ ہمت کر کے خود اعتمادی سے بولی۔

”آنٹی میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وہ بھی خود اعتمادی سے بولا۔

”بیٹا کسی وقت ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں۔“ وہ اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے بولی۔ ”رحمان صاحب یعنی نمرا کے والد شام کے پانچ بجے گھر آ جاتے ہیں۔“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں کل حاضر ہو سکتا ہوں؟“ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

”ہاں بیٹا کیوں نہیں؟ اپنی امی کو ساتھ لانا مت بھولیے گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولی تو عادل کی تمام خود اعتمادی پر جو بہت عارضی اور وقتی تھی..... یک لخت خاموشی چھا گئی۔ وہ کسی بے جان انسان کی طرح صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ ”امی کو کہاں سے پیدا کروں۔ ممی تو آنے سے رہیں۔“

”ہیلو، ہیلو شاید فون کٹ گیا ہے۔“ دوسری طرف سے عالیہ کی آواز ابھری اور پھر فون بند ہو گیا۔ اور وہ بے بسی و لاچاری سے اپنے موبائل پر نہ جانے کتنی دیر تک نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ یہ آخری جملہ اس کے ردعمل میں اشتعال و انتظار بھرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ وہیں بے چینی و پریشانی میں پتھر بنا بیٹھا رہا۔

عالیہ نے لاؤنج میں وال کلاک کی طرف دیکھا۔ باپ، بیٹی کے گھر واپس آنے کا وقت تھا۔ رحمان اپنے آفس سے سیدھے یونیورسٹی جاتے اور نمرا کو پک کرتے ہوئے گھر آیا کرتے تھے۔ جب بھی نمرا مصروف ہوتی تو اس کی

واپسی حمیرا کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ جبکہ حمیرا اسلام آباد کے دوسرے کونے میں رہائش پزیر تھی۔ اس کے باوجود وہ مائنڈ نہیں کرتی تھی۔ عالیہ سے خوب گپ شپ لگاتی۔ چائے پیتی اور ہنسی خوشی گھر چل دیتی۔

عالیہ نے فریزر سے سموسے نکالے، فرائی کرنے کے بعد ثمرا کے لیے چپس تیار کیے۔ چائے کیتلی میں ڈال کر اس نے اسے ٹی کوزی پہنائی، تمام اشیا ٹرالی پر قرینے سے سجا کر لاؤنج میں پہنچی ہی تھی کہ مین ڈور کی بیل پر اس طرف چل دی۔ دروازہ کھول کر اس نے ثمرا کو پیار کیا۔ رحمان کے سلام کا جواب دیا اور لاؤنج میں آ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دونوں چائے پر پہنچ گئے۔ عالیہ خلاف توقع چہک رہی تھی۔ ایک ان دیکھی سی خوشی اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ عادل کی چند معنی خیز اور لگاوٹ و اپنائیت سے بھرپور باتیں کانوں میں شیرینی گھول رہی تھیں۔ بیٹی کے بڑے گھر کی بہو کے تصور سے ہی وہ نہال ہوئی جا رہی تھی۔ دونوں نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ باپ، بیٹی نے حیرت سے ایک دوسرے کو آنکھ بھی ماری، کندھے بھی اچکائے مگر اس سے سوال نہیں کر پائے۔ کیونکہ وہ عالیہ کو اسی حالت میں دیکھنے کی چاہ میں خاموش رہے۔ سعود کے جانے کے بعد وہ بہت کم ہی ہنسی تھی۔ خوشی کا تو امکان ہی نہیں تھا۔ سوچتے ہوئے ثمرا کی ٹیلی پیتھی کی رگ پھڑکی۔ اور وہ ماں کے ذہن کی سوچ کو پڑھ کر اداس سی ہو کر وہاں سے اٹھی اور چائے کی پیالی اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''ہو نہ ہو عادل کا فون آیا ہوگا۔ امی اسے دیکھے بغیر اتنی شاداں وفرحاں لگ رہی ہیں۔ فقط آواز اور چند باتوں کے بل بوتے پر اس قدر مطمئن ہیں، حیرت کی بات ہے اسے تو ڈھنگ سے بات کرنی تو آتی نہیں۔ امی کیسے امپریس ہو گئیں۔ اگر میری سوچ میری نیت مجھے دھوکا دینے کے لیے تیار کھڑی ہے تو وہ میری تقدیر۔ مجھے تو سو فیصدی امید تھی کہ امی اس کی پہلی بات پر ہی اسے ریجیکٹ کر دیں گی اور میری اس کم بخت مدید سے اور ڈھیٹ انسان سے گلو خلاصی ہو جائے گی۔ مورد الزام میں نہیں میرے والدین ٹھہرائے جائیں گے۔ اور میں ہر طرح کے عتاب، ظلم اور زیادتی سے خوب صورتی سے محفوظ ہو جاؤں گی لیکن یہاں تو معاملہ کافی بگڑا ہوا لگ رہا ہے۔ امی کی باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔ انگ، انگ سے خوشی پھوٹ رہی ہے۔ میں نے تو سوچ سمجھ کر صحیح قدم اٹھایا تھا۔ ان قدموں کا رخ تو دوزخ کی طرف ہے۔'' اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے جسم سے روح کے رشتے کے ٹوٹنے کا گمان ہونے لگا تھا۔ اسی اثنا میں عالیہ کمرے میں داخل ہوئی تو ثمرا..... پلنگ پر چکرا کر لیٹ گئی اور ہانپتی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

''امی..... پانی..... دل گھبرا رہا ہے، سر چکرانے لگا ہے۔''

''بیٹا تمہیں چائے کافی سوٹ نہیں کرتی، میں ابھی لسی بنا کر لاتی ہوں، بتاؤ تو..... ہوا کیا ہے؟'' وہ اس پر جھک کر اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے تڑپ کر بولی۔ ''ابھی تو تم ٹھیک ٹھاک اور خوش باش تھیں؟''

''چکر سا آ گیا ہے۔'' وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی تو عالیہ سرعت سے کمرے سے نکل گئی۔ اگلے ہی لمحے گرم دودھ کا مگ لے کر اس کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی اور محبت آمیز لہجے میں بولی۔

''بیٹا.....! تھوڑی ہمت کر کے اٹھو۔ لگتا ہے بلڈ پریشر لو ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ ابھی ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ایک تو تم سوچتی بہت ہو۔ بھائی کو بھی یاد کرتی ہو۔ میری فکر بھی تمہیں کھائے جا رہی ہے۔ ابو کی بھی فکریں چین نہیں لینے دیتیں اوپر سے پڑھائی کا پریشر..... کس قدر سرسوں کے مانند زرد ہو گیا ہے تمہارا رنگ..... لالی کا تو نشان تک نہیں..... ان حالات میں بیمار نہیں پڑو گی تو کیا پہلوان سومرو بن جاؤ گی۔'' عالیہ اسے دودھ پلاتے ہوئے بولے جا رہی تھی اور ثمرا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ کیا بتاتی کہ جس بیٹی کو وہ تصور میں آکاش کی بلندیوں پر دیکھ کر نہال ہو رہی ہیں۔ صرف ایک لفظ ہاں سے وہ عمر بھر کے لیے اس دھرتی پر خشخاش کے ایک مہین دانے کے سائز کی چیونٹی کی طرح اِدھر اُدھر سرگرداں رہ کر بے مقصد و بے معنی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے گی۔'' مجھ پر ایسا ستم نہیں کیجیے گا

امی۔'' وہ روتے ہوئے سوچے جارہی تھی۔ وہ دودھ پینے کے بعد پھر لیٹ گئی۔ اب آنسو تھم چکے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے نقاہت سے بھرپور لہجے میں بولی۔

''امی اب میں بہتر محسوس کررہی ہوں۔ آپ آج بہت خوش نظر آرہی ہیں۔ اللہ کرے آپ ہمیشہ اسی طرح خوش رہیں...... وجہ تو بتائیں...... شاید میں اور ابو بھی خوشی کے دیپ جلانے میں آپ کا ساتھ دے سکیں۔''

''ہاں بیٹا...... میں بہت خوش ہوں۔ چلو آج تمہاری خانہ آبادی کی شروعات تو ہوئی۔ انشاء اللہ انجام بخیر ہوگا۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے۔'' وہ اس کے ساتھ ہی بیڈ پر لیٹ گئی اور رازدارانہ انداز میں بولی۔ ''ابھی یہ مژدۂ راحتِ جاں تمہارے ابو کو نہیں سنایا۔ آج عادل کا فون آیا تھا۔ کیا سلجھا ہوا پُراعتماد لہجہ تھا اس کا۔ تم نے جو نقشہ کھینچا تھا اس سے تو بالکل برعکس...... دراصل تم ابھی بچی ہو ناں، مردم شناسی سے کوسوں دور...... میں تو اس کے انداز اور لہجے سے ہی اس کی پرسنالٹی کو اسّی فیصد پہچان گئی ہوں۔ باقی بیس فیصد پہلی ملاقات میں ہی جان جاؤں گی۔'' لہجہ مسرت و طمانیت سے لبریز تھا۔ ''پی ایچ ڈی کرنا مذاق نہیں...... عادل جیسے لوگ ہی اس پر کمند ڈال سکتے ہیں۔ تمہاری قسمت پر مجھے ناز ہے، فخر ہے، میری دعا تمہارے ساتھ ہے۔ تم ریلیکس رہو۔ فیصلہ ہم پر چھوڑنے کا اجر بہت بھلا ہوگا۔ میرے بچے دیکھنا تم راج کروگی۔'' عالیہ باتیں کیے جارہی تھی اور وہ ذہنی کھچاؤ اور اعصابی تناؤ میں کھنچتی جارہی تھی۔ اندر ہی اندر لاوا پکنے کا شور سراپا اس کے ہوش و خرد پر چھا سا گیا۔

''نمرا میری جان آنکھیں کھولو، کچھ تو کہو۔ کیا تمہاری اس خاموشی کو خوشی کا نام دے سکتی ہوں؟ ماں تجھ پر واری صدقے جائے۔'' وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ماں کی کم عقلی پر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم آرام کرو...... میں یہ خوشخبری تمہارے ابو کے گوش گزار کردوں۔ کاش میرا مسعود یہاں ہوتا تو آج کتنے مسئلے حل ہوگئے ہوتے۔ بھائی، بہن کی ڈولی کو کندھا دیتے ہیں ان کی عیدیں، شبراتیں ڈھونے کے لیے ہی تو ہوتے ہیں۔ مجھے دیکھو میں بوڑھی ہونے کے قریب ہوں۔ ابھی تک بھائی ہر تہوار پر بھرے ہاتھوں سے حاضری دینے پہنچ جاتے ہیں۔ اللہ کرے تمہارا بھائی تمہاری ڈولی کو کندھا دینے پہنچ جائے۔ ہائے کوئی بہن، بھائی کے رشتے سے محروم نہ ہو۔'' وہ روہانسی ہوگئی اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ نمرا ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''امی کس قدر معصوم ہیں۔ اسے دیکھے بنا ہی رشتہ بھی طے کرڈالا اور میری رخصتی بھی ہوگئی۔ خوش خیالی بھی کیسا عجیب نشہ ہے کہ حقیقت اور سچائی سے کوسوں دور لے جاتا ہے۔ دکھ اور ناکامیاں جو ہمارے نصیب میں رقم ہوتی ہیں نادیدہ خوشیوں میں بدلتی محسوس ہوتی ہیں۔ نہ ان دیکھے، ناشناسا رشتے کس قدر خوب صورت اور قابلِ فخر و قابلِ ستائش لگنے لگتے ہیں۔ اور زندگیوں کے فیصلے کس قدر بہ آسانی کردیے جاتے ہیں۔ شاید میرے لیے بھی ایسا ہی المیہ نازل ہونے والا ہے، امی نے مائنڈ سیٹ کرلیا ہے۔ اپنی آنکھوں پر مثبت عینک لگالی ہے۔ اب عادل کی کوئی حرکت کوئی بات نہ تو انہیں ناگوار گزرے گی نہ ہی غیر مناسب معلوم ہوگی۔ تمام اچھے، اچھے کی رپورٹ تیار کی جائے گی۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھی سوچے جارہی تھی۔ بے چینیوں میں گھری نہ جانے کب تک وہ اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ہر طرف تاریکی نے غلبہ پالیا تھا۔ اس نے ایک دم سے اپنا جائزہ لیا۔ وہ کمرے کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں بدستور بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسی ہی تاریکی اس کے دل پر دبیز تہ جما چکی تھی اور وحشت، ڈر اور خوف رگ و ریشے میں سرایت کرگیا تھا۔ وہ ہمت کرکے بستر سے اتری کمرے کی ٹیوب لائٹ کا بٹن آن کرکے... واش روم میں چلی گئی۔ وضو کرکے باہر نکلی اور جانماز بچھا کر اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگتی چلی گئی۔

جاری ہے



اداسی تم تو شاہد ہو

عالیہ حرا

پروفیسر علی رضا کرمانی باہر ٹیرس پر گرل سے کہنی ٹکائے نیچے دیکھ رہے تھے اُن کی آنکھوں میں فکر اور پیشانی پر تفکر کی نمایاں لکیریں تھیں۔ چہرے پر ترحم کی پرچھائیں، دل میں ملال اور وجود میں دکھ کے بادل گھومتے اِک ہی ورد کر رہے تھے۔

”کیوں؟ کیوں..... آخر کیوں؟ حمزہ ایسا کیوں ہے، اس کے انداز میں اتنی کرختگی، لہجے میں اتنا روکھا پن کیوں آگیا ہے۔ اس کے اطوار میں خود

غرضی کی جھلک گہری کیوں ہوتی جارہی ہے۔ یہ کس کا اثر ہے۔'' اس کی تربیت میں کون سی کمی رہ گئی تھی جو وہ اس قدر ضدی اور اپنی من مانی کرنے والا ہوگیا تھا۔

ابھی ان کی نظروں کے سامنے گیٹ کے باہر جو کچھ بھی ہوا وہ انہیں اچھا نہیں لگا تھا۔

نیچے حمزہ اور اس کے دوست کھڑے تھے' ہاتھوں میں کچھ فائلیں لے کر شاید وہ نوٹس تھے جو حمزہ کو چاہیے تھے۔ فرخ، حماد کو دے رہا تھا جبکہ حمزہ چھین رہا تھا۔ حماد دینا نہیں چاہتا تھا۔ حمزہ نے اس سے نوٹس جھپٹ کر اسے کھری کھری سنادی۔ حماد خاموشی سے کچھ کہے بغیر پلٹ کر چلا گیا۔ اس کے انداز میں خفگی تھی، ناراضی تھی حمزہ کو مطلق اس کی پروا نہیں ہوئی وہ بس فخریہ انداز میں نوٹس حاصل کرنے پر مسکرا رہا تھا۔

''کیسا......؟'' اس نے فرخ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا تھا۔ پروفیسر علی رضا کرمانی کو یہ انداز بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ یہ ہی نہیں انہیں حمزہ کا کوئی انداز بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

صبح وہ اسے راحیل سے لڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس کا دبنگ انداز، کرخت لہجہ، شعلہ بار آنکھیں وہ مسلسل حمزہ کے رویے کو نوٹ کررہے تھے۔

شام کو وہ دادی سے الجھ رہا تھا۔ چند دن پہلے نانا سے لڑکر آیا تھا۔ اپنوں کی محبتوں کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا وہ۔ خود پر بڑا زعم تھا اسے یا وہ اتنی محبتوں کے حصار میں رہ کر مغرور ہوگیا تھا۔

نیچے گیٹ بند کرکے حمزہ اندر آگیا۔ فرخ اور سلیم بائیک اسٹارٹ کرکے جاچکے تھے۔

پروفیسر علی رضا کرمانی ہاتھ پشت پر باندھے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ شام کے سائے آہستہ، آہستہ اپنا سفر طے کررہے تھے... کچھ دیر میں ملگجا سا اندھیرا پھیل جاتا اور پھر گہری رات میں تبدیل ہوجاتا۔ رات جو تاریک بھی ہوتی ہے اور گہری بھی...... خوف کا عنصر بھی ہوتا ہے مگر اسی تاریک رات میں جگنوؤں کی جھلملاہٹ بھی ہوتی ہے اور چاندنی کا سکوت بھی...... یہ انسان کی اپنی قسمت کہ کس کے حصے میں کیا آتا ہے۔

حمزہ احمد علی کرمانی انہیں بے حد عزیز تھا۔ ان کے مرحوم بیٹے کی آخری نشانی...... بہت ناز ونعم کے ساتھ بڑی احتیاط سے پالا تھا اسے۔ وہ اسے بکھرتا نہیں دیکھ سکتے تھے بالآخر مسلسل عرق ریزی سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ حمزہ بھی اسی تیر کا شکار ہوگیا ہے۔ جس کا شکار اسی فیصد نوجوان تھے...... یعنی محبت......! حمزہ کو کسی سے محبت ہوگئی ہے۔ اور وہ اس کی دسترس میں نہیں آرہی یا پھر وہ محبت کے ابتدائی مراحل طے کرتے ہوئے تذبذب کا شکار ہے۔ کچھ تو ایسا ضرور تھا جو وہ ان سے دور ہوتا جارہا تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئے' افق کے پار ڈوبتا سورج ان کے سامنے تھا۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے من پسند منظر تھا۔ مشرق سے ابھرتے سورج کو دیر تک تکنا...... اور افق کے پار ڈوبتے سورج کی زرد شعاعوں کو پڑھنا، زرد آسمان کی زردی کو محسوس کرنا، گر سردیاں ہوں تو خنکی سے حظ اٹھانا مگر آج کل انہیں سب سے اہم مسئلہ حمزہ لگ رہا تھا۔ اور انہیں کچھ کرنا تھا۔ اور انہیں کیا کرنا تھا، انہوں نے سوچ لیا تھا۔ پروفیسر رضا نے کسی سے ہارنا نہیں سیکھا تھا اور انہیں اپنے اس پوتے کو ایک متوازن شخصیت بنانا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے انہوں نے اپنی زندگی میں توازن قائم رکھا تھا اعتدال کی راہ گزر اپنائی تھی اور محبت' عزت، نام سمیت ایک پُرآسائش زندگی بسر کررہے تھے۔ جس کا راز تھا بہترین تربیت، عمدہ اخلاق، اچھی عادات، مضبوط قوتِ ارادی اور بروقت قوتِ فیصلہ کا استعمال...... انہوں نے ایک گہری سانس لی اور دھیرے سے اٹھے اور سیڑھیاں اترنے لگے۔

حمزہ کے اندر انہی صفات کو ابھارنا

تھا..... اپنے پرتو کو وہ کھونا نہیں چاہتے تھے اور روزِ محشر بیٹے کو بھی تو منہ دکھانا تھا۔

☆☆☆

''گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کر لینی چاہییں..... '' بڑے گھمنڈ بھرے انداز میں حمزہ، راحم کو یہ کہہ کر بتا رہا تھا۔ وہ اخبار لے کر اندر آئے تو ذرا چونکے۔

''یار..... معمولی سے گھی کے لیے اپنی مضبوط انگلیوں کو زخمی کرا گے..... چہ..... چہ۔'' وہ سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھے۔

''دادو..... میں نے محاورہ بولا ہے۔'' حمزہ احمد کرمانی نے سر گھما کر انہیں دیکھا۔

''تم نے گھی کا کیا کرنا ہے پیالہ بھر کر لے لو۔'' وہ صوفے پر بیٹھ کر اخبار کھولنے لگے۔

''اُف..... دادو، آج کل معاشرے میں جو ہو رہا ہے میں اس کے متعلق کہہ رہا ہوں، سیدھی بات تو کوئی سنتا ہی نہیں ہے، گھما پھرا کر..... یا پھر چور دروازے ..... اونہہ..... ایک بار ہی ڈنڈے کی زبان استعمال کر لو۔''

''چہ..... چہ.....'' تاسف بھرے انداز میں... انہوں نے دیکھا۔ ''اور انسانیت کے بہترین اخلاق جو والدین اسے سکھاتے ہیں؟''

''آج کل کون دیکھتا ہے۔'' سر جھکا..... پروفیسر صاحب بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے، اِک تناؤ کی کیفیت تھی۔

''یعنی تم بھی بھیڑ چال اختیار کرو گے؟''

''ظاہر ہے چور دروازے کے ساتھ۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''کس جگہ پر.....؟''

اک لمحے کے لیے حمزہ خاموش ہو گیا۔ راحم اسے ذومعنی انداز میں دیکھنے لگا۔

''ہر اس جگہ پر جہاں میرے حق میں میری بات نہیں مانی جائے گی۔''

''تمہاری بات تو ہر جگہ مانی جاتی ہے شرط ہے کہ جائز ہو۔'' راحم کی مسکراہٹ کو غور و خوض سے دیکھا، گویا یہ کچھ جانتا ہے سن گن رکھتا ہے۔

''میں گھر سے باہر کی بات کر رہا ہوں۔''

''گھر سے باہر ہم بلاوجہ نہ تو اپنی منوا سکتے ہیں اور نہ زبردستی کر سکتے ہیں۔ اپنی منوانے کے لیے دلائل مضبوط ہونے چاہئیں۔ اگلا خود ہی راضی ہو جائے گا۔''

''دادو.....'' وہ ان کی جانب گھوما۔

''اگر سامنے والا کچھ سننے پر تیار ہی نہیں ہو تو؟''

''تو پھر بھی ہم اس کے منہ پر پنچ نہیں مار سکتے..... زبردستی کے سودے خوشی نہیں دیتے برخوردار، مزہ جب آتا ہے جب دلائل کے ساتھ سامنے والے کو زیر کیا جائے۔'' حمزہ چپ سا ہو گیا۔

''انسان کی بہترین عادتیں ہی دوسروں کو متاثر کرتی ہیں..... متاثرین میں شامل ہونے سے بہتر ہے متاثر کرنے کی صلاحیت استعمال کرو کہ سامنے والا خود بخود ہی زیر ہو جائے۔'' اخبار کے فرنٹ پیج پر نگاہ ڈالتے ہوئے انہوں نے گہری بات کی۔

''ہونہہ!'' حمزہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

انہوں نے اس کی پشت کو شیشے کے دروازے سے باہر نکلتے دیکھا اور پھر راحم کو دیکھا۔

''کیوں برخوردار..... یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں دادو.....'' وہ ہنسا۔

''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے.....''

''کچھ نہیں وہ دراصل..... اچھا کچھ نہیں۔'' پروفیسر علی رضا کی تمام حسیات اس کے ہچکچانے پر الرٹ ہو گئیں۔

''یونیورسٹی جوائن کی ہے ناں تو اس لیے۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ کے نورِ نظر پورے جوان ہونا چاہتے

ہیں، تمام تر ہتھیاروں سے لیس ہو کر۔"

"یعنی......؟" ابرو تیکھے کیے۔

"اور سمجھ جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔"

راحم ذو معنی انداز میں ہنستا لاؤنج سے باہر جانے لگا۔

پروفیسر علی رضا کرمانی بیٹھے رہ گئے۔ ان کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔

☆☆☆

سب لاؤنج میں جمع تھے، حمزہ خاموشی سے قدرے الگ تھلگ صوفے پر بیٹھا، ہونٹ کا شانی وی کی جانب متوجہ تھا۔ حال سے بے خبر اپنے کزنز سے بے پروا اور اڑا اور راحم سے بھی دور نہایت سنجیدہ اور سوبر بنا بیٹھا تھا۔

"لمحہ فکریہ......" اندر آتے رضا کرمانی چونکے۔ حمزہ کے انداز انہیں چونکا رہے تھے۔

"یہ تو محفل کی جان ہوتا ہے آج اتنا بے جان...... کیوں؟" طلحہ نے اٹھ کر چینل چینج کر دیا۔

"کوئی ڈراما کو میٹری لگا لو......" زیاد کی فرمائش آئی۔

"نہیں موودی...... تھرل والی......" اِک اور فرمائشی آواز آئی۔

"چھوڑ یار کارٹون لگا۔" مراد کیوں پیچھے رہتا۔

"اوئے، بڑا ہو جا...... شرم کر، کارٹون لگا...... اونہہ...... چلو اسٹیج شو لگا لو۔"

"جس نے دیکھنا ہے دیکھے نہیں دیکھنا تو جائے۔" حمزہ کا لہجہ بڑا اروڈ تھا۔

"ہیں...... ہائیں...... اسے کیا ہوا؟" سب کی حیران کُن آوازیں......

"حمزہ غضب تو ہے، تیری بلی کسی نے ماردی ہے؟"

"بلی آئے گی تو ماریں گے ناں۔" راحم کی آواز ہلکی تھی۔ تاہم دادو پیچھے ہی کھڑے تھے، کیسے نہ سنتے۔

"چلو، چلو ہٹو میرا ڈراما شروع ہو گیا۔"

"اور میرا فنی چینل......" سارہ اور ہما آگے پیچھے اندر آگئیں۔

"دادو جان آپ یہاں، تایا ابو آپ کا پوچھ رہے تھے۔"

"جا رہا ہوں، نیوز الرٹ دیکھنے کے لیے رکا تھا۔"

"تو آئیں دیکھ لیں، ہم ریپیٹ میں ڈراما دیکھ لیں گے، چلو ہٹو حمزہ دادو کو دیکھنے دو انہیں کلینک جانا ہوگا۔" حمزہ اٹھا اور لمبے، لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

"اسے کیا ہوا......؟" رضا کرمانی بیٹھ گئے نیوز سے توجہ اٹھ گئی تھی ذہن کہیں اور تھا...... سب ہی حیرت زدہ رہ گئے تھے اس کے انداز پر۔ حمزہ کس تبدیلی سے گزر رہا تھا۔

"دیکھو عبداللہ کہیں نکل نہ جائے۔ رضا کرمانی بیٹھتے، بیٹھتے اٹھے اور باہر نکل گئے۔ چلتے چلتے انہوں نے یونہی باہر کی جانب نگاہ کی۔ حمزہ لان کی گھاس پر اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔

"کیا ہوا...... حمزہ؟" بے ساختہ آواز دی۔

"جی کچھ نہیں......"

"اندر سے ایک دم کیوں آگئے؟"

"حبس ہو رہا تھا اور سب اپنے، اپنے پروگرام دیکھ رہے تھے۔"

"تم کیوں نہیں بیٹھے......؟"

"میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔" اس نے رخ موڑ لیا۔

"تو تمہارا دل کیا چاہ رہا ہے۔" وہ قریب آگئے۔

"پاپا جانی آئیں، کلینک بند ہو جائے گا۔" جبھی عبداللہ کرمانی بھی باہر آگئے۔

"ہاں چلتے ہیں۔" رخ بیٹے کی جانب کیا۔

"حمزہ تمہیں کیا ہو رہا ہے، کتنی فاسٹ بائیک چلا رہے تھے تم۔ بابا اسے سمجھائیں، میں نے خود دیکھا اور سلطان صاحب بھی اس کی ریش ڈرائیونگ کی شکایت کر رہے تھے۔"

"کیوں حمزہ......؟" وہ فوراً کلاس لینے کے موڈ میں تھے۔

"دادو...... سب میری جاسوسی کیوں کرتے

ہیں۔'' زچ بھرا انداز......

''تمہارا رویّہ اتنا زچ کرنے والا، اتنا روڈ کیوں ہوتا جا رہا ہے۔''

''نہیں، وہم ہے آپ کا.....'' سر جھکا۔

''ہیں..... کیا کہا تم نے، میں نفسیاتی ہوں۔'' قدرے زور سے حیران کن انداز میں کہا۔

''میں نے یہ نہیں کہا.....''

''خیال رکھا کرو حمزہ..... تم ہمیں بہت عزیز ہو، بہت محبت اور احتیاط سے تمہاری پرورش کی ہے پاپا نے۔'' عبداللہ کرمانی نے آگے بڑھ کر سمجھایا۔

حمزہ نے سر جھکا لیا۔

''یہ آج کل کی نسل.....'' رضا کرمانی نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''بڑے بوڑھوں کی باتوں کو ان کی بڑبڑاہٹ سمجھتے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے دادو۔ آئندہ خیال رکھوں گا مگر.....'' وہ دھیرے سے ہنسا۔

''تھرل.....''

''تھرل..... گیا تیل لینے..... تم میرے بیٹے کی نشانی ہو۔''

''ہوں.....''

''آئیں پاپا دیر ہو رہی ہے۔'' عبداللہ نے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ رضا کرمانی، حمزہ پر نگاہ ڈالتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ پھر سے لان کے چکر کاٹنے لگا۔ اداس، ملول، قدرے پریشان.....

☆☆☆

''دادو.....'' ان کے پاس بیٹھا حمزہ بالآخر دل کی بات کہنے پر مجبور ہو گیا۔

''جی.....!'' انہوں نے کتاب پر سے نگاہ نہ اٹھائی۔

''میں آپ کا پسٹل دیکھنا چاہتا ہوں۔'' لفظوں پر ان کی نگاہ ٹھہر گئی۔

''کیوں، تم نے ون فائیو جوائن کرنا ہے، دورانِ تربیت خود ہی سیکھ جاؤ گے۔'' انہوں نے اس کی بات کو لاعلمی لیا۔

''یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر.....؟''

''میں بھی اپنا پسٹل لائسنس کے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔'' دھیرے سے کہا۔

''کیوں.....؟'' انہوں نے کتاب بند کر دی۔

''آپ کی طرح میرا شوق ہے۔''

''شوق..... یا تھرل.....؟ ہم نے تو اس عمر میں آ کر بطور حفاظت رکھی ہے۔''

''میں بھی.....''

''حمزہ.....'' سنجیدگی کی گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

''آج کل تمہارے معمولات میرے لیے لمحۂ فکریہ ہیں۔''

''کیوں.....؟'' سنجیدگی کی ایسی نگاہ تھی گویا ہنسنا بھول گیا ہو۔

''تمہارا لہجہ..... تمہارا انداز..... تمہارا رویّہ..... کیونکہ انسان کا کردار ہی ہوتا ہے جو اسے ہمیشہ بلند یا پست رکھتا ہے۔''

''میں بہت طاقتور بننا چاہتا ہوں۔'' اس کا لہجہ سپاٹ اور کافی پختہ تھا۔ علی رضا کرمانی اسے دیکھے گئے۔

''پسٹل رکھ کر تم طاقتور بن سکتے ہو کیا؟''

''جی کیوں نہیں۔''

''تمہاری سوچ غلط ہے، ہتھیار رکھنے سے انسان طاقتور نہیں بنتا..... ہتھیار..... دوسرے انسانوں کو خوفزدہ کر دیتے ہیں۔ ہراس پھیلاتے ہیں۔ اک بات یاد رکھنا، انسان طاقتور جب بننا چاہتا ہے جب اسے کچھ برا کرنا ہو، ورنہ دنیا میں کچھ پانے کے لیے آپ کا اعلیٰ اخلاق ہی کافی ہے۔ انسان طاقت تین چیزوں سے حاصل کر سکتا ہے، دولت سے، ہتھیار سے اور اخلاق سے..... یاد رکھنا اخلاق سے جیتی ہوئی جنگ ہمیشہ کامیاب رہتی ہے۔'' ان کا فلسفہ گہرا تھا۔

''طاقتور بھلا کیوں بننا چاہتے ہو؟ کیوں

طاقت چاہیے تمہیں؟"

"تاکہ یہ محبت کی جنگ جیت سکے۔" راحم اس کا دستِ راست کسی کام سے لائبریری کے اس حصے کی جانب آ رہا تھا وہ رک گیا۔

"ہیں.....!" وہ چونکے تھے۔

"راحم..... پلیز....."

"کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"تم میرے دوست ہو۔"

"دوست ہی دوست کا راہنما ہوتا ہے مگر ایک اچھا دوست، اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔"

"تم نے رازداری کا وعدہ کیا تھا....." حمزہ کو غصہ آ رہا تھا۔

"ہاں، اگر وہ تمہارے لیے مثبت ہوتا پھر....."

"مگر یہ مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔" دونوں میں بحث شروع ہوگئی۔ علی رضا کرمانی الجھے انداز میں دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ بحث بڑھی۔

"ایسی کون سی بات ہے جو مجھ سے چھپائی جا رہی ہے؟" دونوں یک بیک خاموش ہوگئے۔

راحم ذومعنی انداز میں مسکرانے لگا۔

"بولو....."

"دادو....." حمزہ کرسی کھسکا کر اٹھا اور باہر نکل گیا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟"

"محبت.....! دادو اسے محبت ہوگئی ہے۔" راحم نے اِک جملے میں مکمل کہانی بیان کی۔

"یہ تو مجھے معلوم ہے....." رضا کرمانی ہنسے۔

"ہیں..... آپ کو کیسے معلوم؟"

"اس کی خاموشی، راتوں کو جاگنا، تارے گننا، بے سبب اداسی اور..... اور بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہو جانا۔"

"واہ..... کیا نقشہ کھینچا ہے۔"

"اس میں خاص کیا ہے، یہ تو آج کل نوجوانوں کا شغل ہے۔" ہاتھ میں پکڑی کتاب انہوں پھر سے کھولی۔ "ہو جائے گا ٹھیک کچھ دنوں میں۔" وہ اپنا مطلوبہ صفحہ تلاش کرنے لگے۔

"نہیں دادو..... رانجھے کی اولاد..... سیریس ہے وہ۔"

"ہیں....." وہ اس کی بات پر چونکے۔

"میرا مطلب ہے کہ....." راحم جھینپ گیا۔

بات نہ بن پڑی۔

"چلو کتنا سیریس ہے شادی کر دیں گے۔" انہیں حمزہ کی خوشی عزیز تھی۔ "اہلِ کتاب ہی ہیں ناں....."

"جی....."

"پھر کیا ڈر..... غریب، غربا سب چلے گا میرے بیٹے کی پسند معمولی نہیں ہوگی۔" وہ مسکرائے۔

"جی....."

"مگر راحم..... حمزہ گم صم اور اداس کیوں ہے اتنا؟" پھر کتاب بند کر کے اسے کریدا۔

"جی مسئلہ ہی تو ہے۔"

"محبت تو رخِ روشن پر گل کھلا دیتی ہے، آنکھیں چمکتی ہیں۔"

"جانتا ہوں۔" اندر آتی دادی کو دیکھا۔

"پھر کوئی اور خاص بات..... ہے کیا؟" رازداری اختیار کی۔

"جی....." راحم سنجیدہ ہوگیا۔

"کیا.....؟" تمام حسیات الرٹ ہوگئیں۔ دادی قریب آگئیں۔ "بولو....."

"لڑکی کسی اور کو چاہتی ہے۔" جلدی سے کہانی کا اینڈ بتایا۔

"اُف..... میں تھک گئی۔" فرحت آرا قریب آگئیں۔ علی رضا کرمانی کے ابھرتے ہوئے جذبات پر اوس کی بوندیں گرنے لگیں۔

☆☆☆

"محبت زبردستی نہیں برسائی جاتی اور یہ ضروری

نہیں کہ ہمیں جس سے محبت ہو جائے وہ بھی ہمارے عشق میں بے دم ہو۔ سب کی منزلیں جدا اور طریقہ محبت الگ ہو سکتا ہے۔ اس پر ہمیں اختیار نہیں ہے حمزہ...... ورنہ میرے بچے میں تیرے لیے تارے توڑ کر لا دیتا۔" حمزہ کی کہانی نے انہیں اداس کر دیا تھا۔

"اسے پڑھنے کے لیے باہر بھیج دیتا ہوں۔ اس کی شادی کر دیتے ہیں یا پھر کوئی کورس کرنے کے لیے تیار کرتا ہوں یا پھر......" کروٹ بدلتے ہوئے وہ سوچتے رہے۔

"کیا بات ہے نیند نہیں آ رہی۔" فرحت آرا نے ان کی بے چینی کو بھانپ لیا۔

"ہوں......"

"طبیعت تو ٹھیک ہے ناں...... پانی دوں؟" وہ اٹھنے لگیں۔

"نہیں، طلب نہیں ہے، تم سو جاؤ۔"

"اور آپ......؟"

"ہاں، میں بھی سونے لگا ہوں، بس یونہی بے چینی ہے۔"

"سو جائیں، فجر کے لیے آنکھ نہیں کھلے گی۔" انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

علی رضا کرمانی نے بھی آنکھیں بند کیں مگر بند آنکھوں کے پیچھے تنہا اداس، اکیلا درخت سے ٹیک لگائے حمزہ تھا۔

"اُف......" دھیرے دھیرے پیشانی ملنے لگے نیند آنکھوں سے دور تھی۔

☆☆☆

انہوں نے دریچے کا پردہ ہٹا کر دیکھا...... ہلکا ہلکا شور گلاس ونڈو سرکاتے سے بلند ہونے لگا۔ اسامہ اور حمزہ زور شور سے لڑ رہے تھے۔ ذرا سا آگے ہوئے سمجھ میں نہیں آیا۔ حمزہ کی آنکھیں سرخ تھیں، وہ اسامہ کو شعلہ بار انداز میں دیکھ رہا تھا۔ راحم کا ہاتھ حمزہ کے شانے پر تھا...... کتنا تھکا تھکا، اجڑا ہوا

دعا

کوئی ضبط دے نہ جلال دے
مجھے صرف اتنا کمال دے
مجھے اپنی راہ پہ ڈال دے
کہ زمانہ میری مثال دے
تیری رحمتوں کا نزول ہو
مجھے محنتوں کا صلہ ملے
مجھے مال و زر کی ہوس نہ ہو
مجھے صرف رزقِ حلال دے
میرے ذہن میں تیری فکر ہو
میری سانس میں ترا ذکر ہو
ترا خوف میری نجات ہو
سبھی خوف دل سے نکال دے
تیری بارگاہ میں اے خدا
میری روز و شب ہے یہی دعا
تو رحیم ہے
تو کریم ہے
مجھے مشکلوں سے نکال دے
الٰہی آمین

مرسلہ: نزہت جبیں، کراچی

پھر واپس آؤں گا

دسمبر جاتے ہوئے
جنوری سے کہہ گیا تھا
اپنے لوگوں سے کہنا
جانے والوں کے لیے دعائے خیر کریں
نئے رشتے، نئی چاہتیں استوار کریں
کیونکہ اگلے برس میں بھی
نئے ہم سفر نئے سال کے ساتھ
سب سے ملنے آؤں گا......

شاعرہ...... نجمہ ناز اصغر، کراچی

چہرہ تھا کچھ کمزور بھی لگا، شیو بڑھی ہوئی تھی۔ جینز اس کی وہی چھ دن پرانی تھی۔

''تو حمزہ نماز نہیں پڑھ رہا۔ اتنے دنوں سے وہی گندے، کپڑے پہنے ہوئے ہے۔'' وہ چونک گئے۔

''مائی گاڈ...'' انہوں نے اپنے سب پوتے پوتیوں کو نماز کی عادت پختہ کرائی تھی۔ ان کی نظریں ہٹیں دوسرے لمحے بوکھلا گئے۔ حمزہ کا تھپڑ اسامہ کے منہ پر تھا۔ اسامہ کا منہ گھوم گیا تھا۔ راحم اسے پکڑ رہا تھا۔ اسامہ گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حمزہ مٹھیاں بھینچے دوبارہ مارنے کے چکر میں تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

اسامہ پلٹا اور بھاگتے ہوئے گیٹ کراس کر گیا۔

''یہ تو نے بہت غلط کیا....'' راحم نے کہا۔

حمزہ نے اسے گھورا۔ پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا لان کراس کر گیا۔

ملال، ہراس، دکھ..... پروفیسر علی رضا گیلانی کے وجود میں سرایت کر گیا۔

معاملہ حد سے بڑھ گیا تھا۔ مزید خاموشی اختیار کرتے تو بگڑ سکتا تھا۔

''راحم.....'' وہیں کھڑے، کھڑے انہوں نے زور سے پکارا۔ راحم نے پلٹ کر دادو کے کمرے کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اِدھر آؤ کا اشارہ کیا اور پیچھے ہٹ کر اپنی چیئر پر بیٹھے۔ چشمہ اتار کر فائل پہ رکھا اور دھیرے، دھیرے اپنی پیشانی ملنے لگے۔

''جی دادو.....'' راحم ان کے کمرے میں آکر ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ انہوں نے چیئر گھما کر اسے دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔

''یہ کیا تھا.....؟ حمزہ اتنا ایموشنل.....''

''جی.....'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

''کیوں.....؟''

''پاگل ہو گیا ہے وہ۔'' سر جھٹکا۔ ''اسے باہر واہر بھجوا دیں پاگل ہو جائے گا پورا۔''

''بات کیا ہے، اسامہ کا اس سے کیا تعلق ہے؟''

اسامہ ہی تو فساد کی جڑ ہے نہ اسے اپنی یونیورسٹی لے جاتا ہے نہ اسے پریشے پسند آتی نہ یہ سارا کھڑاگ ہوتا۔''

''اس لڑکی میں ایسا کیا ہے؟''

''پتا نہیں.....'' راحم نے بیزاری سے کہا۔

''ہوں.....اس کا حل کیا ہو سکتا ہے۔''

''خود ہی جنونی ہو رہا ہے آپ کا پوتا.....لگتا ہی نہیں کہ یہ اتنا نفیس اور نائس حمزہ ہے۔ گھاس نہیں ڈال رہی اسے وہ.....اور یہ مرا جا رہا ہے اس کے پیچھے۔'' راحم نے ساری رام کتھا کہہ سنائی۔ ''پستول خرید لیا ہے..... مرنے مارنے کی دھمکی دے آیا ہے۔ بات اس کے منگیتر کو بھی پتا چل گئی ہے.... لوگ تو ویسے ہی سر پھرے ہوتے ہیں۔ کچھ کریں دادو اس کا.....''

''ہوں.....'' ان کی پیشانی کی لکیریں گہری ہو گئیں۔

''چند دن تو اسے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیں۔''

''میرا خیال ہے اسے باہر بھیج دیتے ہیں کہہ بھی رہا تھا مجھ سے آسٹریلیا زبیر کے پاس جانے کے لیے۔''

''بات کر کے دیکھ لیں۔'' بیڈ روم میں خاموشی تھی۔

''میں جاؤں.....؟''

''تم حمزہ کے ساتھ، ساتھ رہو، میں کچھ کرتا ہوں اس کے ہر عمل کی خبر دو مجھے۔''

''جی.....'' وہ کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں تک انہیں دیکھا اور کمرے سے نکل گیا۔

اور وہ اندر ہی اندر لائحہ عمل ترتیب دینے لگے۔ ان کی تربیت میں کیا جھول تھا جو حمزہ اتنا شدید ردِعمل ظاہر کر رہا تھا وہ تو ایسا تھا ہی نہیں..... حلیم مزاج، بزلہ سنج، شائستہ اور تہذیب یافتہ سب کمائی ہاتھ سے نکال

دی۔ اتنا بے صبرا......

کیسے دوسروں کی چیز ہتھیا سکتا تھا انہوں نے تو اُسے دینا سکھایا تھا لینا نہیں، چھیننا، جھپٹنا تو دور کی بات تھی تو کیا ساری عمر کی تپسیا رائگاں گئی۔ وہ اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے۔ حمزہ ان کی ٹینشن سمیٹتا تھا ان کی انگلیاں تھام کر چلتا تھا۔ اب ایک دم سے انہیں تھکا دیا تھا اچانک انہوں نے کوئی فیصلہ کیا اور کمرے سے نکلے اور فاصلہ طے کر کے حمزہ کے کمرے میں آ گئے۔ وہ بیڈ پر آڑھا ترچھا.... تکیے میں منہ دیے لیٹا تھا۔ انہیں دیکھ کر دکھ ہوا۔

''حمزہ......حمزہ......'' وہ جاگ رہا تھا سوتا بن گیا۔ علی رضا جانتے تھے وہ جاگ رہا ہے اس وقت سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے بھی آواز نیچی رکھی تھی۔ وہ سوتا بنا رہا۔

وہ پلٹ کر باہر آ گئے۔ رات کے کھانے پر وہ نظر نہیں آیا۔ اگلی صبح واک کر کے آئے تو اسے سیڑھیوں پر بیٹھا دیکھا۔

''نماز پڑھی......؟'' قریب آئے۔ وہ خاموش رہا۔

''ایکسر سائز کی؟'' خاموشی......

''ناشتا کیا......؟''

''نہیں......''

''آؤ......دونوں کرتے ہیں۔''

''آپ چلیں، میں آتا ہوں۔''

''حمزہ......اِدھر آؤ۔'' وہ لان میں رکھی چیئر پر بیٹھ گئے۔

''جی......'' وہ سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اداسی چہرے پر رقم تھی۔

''کیا بات ہے، کیا چاہیے تمہیں...... یہ کیسا احتجاج ہے؟'' وہ ان کی شکل دیکھنے لگا۔

''جب تک کہو گے نہیں تو پتا کیسے چلے گا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''تمہارا حلیہ، تمہارا انداز، تمہارا لہجہ...... اتنا شدت پسند کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ اتنے انتہا پسند تو تم کبھی نہیں تھے۔''

وہ سر جھکا کر ہتھیلیاں کھولنے بند کرنے لگا۔

''زندگی اتنی ارزاں تو نہیں ہے کہ ہم اسے یوں ضائع کر دیں اور جس کے لیے ضائع کریں اسے احساس تک نہ ہو۔''

وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''جو چیز ہماری نہیں ہوتی ہم اسے کیسے اپنا بنا سکتے تھے۔ چھین جھپٹ کر لینے اور پسند اور افہام و تفہیم سے ملنے میں کتنا فرق ہے۔'' حمزہ انہیں دیکھے گیا۔

''فقیری اور امیری کا...... فقیر بننے اور امیر ہونے میں کتنا فرق ہے؟ بولو!'' حمزہ انہیں دیکھتا رہ گیا۔

''جس کے پاس دولت ہے وہ امیر ہے جس کے پاس پیسہ نہیں ہے وہ فقیر ہے کیا؟'' وہ مسلسل خاموش رہا۔

''تم اس بات کا یقین کیسے کرو گے؟ جس کے پاس رشتے ہیں وہ امیر ہے، جس کے پاس ناتے نہیں وہ غریب......''

''محبتوں میں خود کفیل ہونا بھی امیری ہے۔''

''پلیز والد...... آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔''

''جو تمہیں سمجھانا چاہیے تھا میرے بچے۔''

''میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتا۔'' نفی میں سر ہلایا۔

''وہ کون اتنا خوش نصیب ہے جس نے چوبیس سال محبتوں کو جھٹلانا...... بھلانا...... اور نظر انداز کرنا سکھا دیا؟'' حمزہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''ایسا نہیں ہے، جو ہوں آپ کے سامنے ہوں۔''

''مگر ذہنی طور پر موجود نہیں ہو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' انہوں نے چند لمحوں تک اسے دیکھا اور سر جھٹک لیا۔

''تمہارے لیے خوشخبری ہے۔'' وہ خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''بتائیں......''

''تمہاری حسب منشا..... حسبِ دل.....؟''
''کیا؟''
''پوچھو.....'' وہ مسکرائے۔
اس نے گہری سانس لی۔ ''شاید نہ پوچھ سکوں۔''
''چلو پھر کچھ دیر بعد بتاتے ہیں۔''
''آپ یہاں بیٹھے ہیں ناشتا نہیں کیجیے گا۔'' اسی لمحے فرحت آرا آگئیں۔
''چلو.....تمہاری دادی نے سگنل دے دیا۔ باقی باتیں بعد میں۔'' وہ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
ان کا ارادہ، ڈائریکٹ نہیں ان ڈائریکٹ سمجھا تا تھا۔
دادو کے سمجھانے کا اس پر رتی بھر اثر نظر نہیں آرہا تھا۔ گھر میں دیگر کزنز سے مسلسل غصہ، گرمی جاری تھی۔ اب تو فرحت آرا بیگم کو بھی اس کے بدلتے رویے پر تشویش ہونے لگی تھی۔ رضا بانی ہر دفعہ راحم کو ہی قابو کر کے اس کی بابت تازہ ترین رپورٹ لیتے رہے تھے۔
''وہ جانتا بھی ہے سب کچھ کہ پریشے ذرا سا بھی انٹرسٹڈ نہیں ہے اس میں پھر بھی مسلسل اسی کی طرف دیکھ رہا ہے۔''
''بیٹا پھر بتاؤ یہ سب علم رکھنے کے باوجود حمزہ اتنا حساس اتنا شدت پسند کیوں ہو رہا ہے؟''
''پاگل کر دیا ہے عاشقی نے اسے۔ سمجھا، سمجھا کر تھک گیا ہوں، کوئی نقصان ہوا تو دادو ذمے دار آپ ہوں گے۔'' وہ بول بال کر جانے کے لیے نکلنے لگا۔
''راحم.....'' ان کی آواز دھیمی اور دکھی تھی۔
راحم کے قدم رک گئے۔ وہیں رک کر مڑ کر انہیں دیکھا۔
''جی.....''
''میں اس لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔'' ان کی آواز کمزور تھی۔ راحم نے انہیں دیکھا اور جی..... کہہ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''آدمی کی زندگی میں عقل کی نہیں تقدیر کی حکمرانی ہوتی ہے جس کے پاس مضبوط قوتِ ارادی ہے دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بنالیتا ہے۔ مگر دلوں کو فتح دلوں کی مرضی سے ہی کیا جاتا ہے۔'' وہ جو گھاس پر لیٹا دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے تارے گن رہا تھا، آنکھیں سرخ اور بال منتشر تھے۔ بے لاگ تبصرہ سن کر چونکا... دادو اس کے پاس بیٹھ رہے تھے۔
''آپ؟'' وہ اٹھنے لگا۔
''جب تم نہیں آؤ گے تو ہمیں کھوج رکھنا ہوگی ناں۔''
وہ اٹھ بیٹھا۔
''کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے..... کیا نہیں ہے تمہارے پاس جو لینا چاہتے ہو وہ اگر تقدیر نے ہی تمہاری قسمت میں رقم نہیں کیا تو کیا، کیا جائے۔'' حمزہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔
دادو، دکھی، اداس، ملول ہو گئے صرف اس کی چاہ سے۔ اس کا دل مٹھی میں آگیا۔
''محبتوں کی راہ میں کیا جانے والا ضبط بہت کڑا ہوتا ہے اور یہی وقتِ آزمائش ہوتا ہے میرے بچے۔ انسان سنگ دل بن جائے یا نرم رو، آزمائش سے نکلنے کے بعد پتا چلتا ہے اس نے کیا کھویا، کیا پایا۔'' حمزہ کا سر جھک گیا۔
''میں نے تمہاری شخصیت میں کوئی جھول نہیں رکھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں کوئی چیز نہیں ملتی تو ہم اپنی شخصیت کو گھن لگالیں۔ آج کل تم خود جانتے ہو تم کتنے منفی رویوں سے گزر رہے ہو، تمہارے سب اپنے تمہارے اس انداز اس لہجے سے نالاں و ناراض ہیں۔ لیک کے قصور کی سزا ہم پورے خاندان کو تو نہیں دیتے میرے بچے اور نہ ہی میں نے تمہیں خود غرضی سکھائی ہے کہ تم دوسروں کے حق پر ڈاکا

ڈال کر زبردستی چھین کر اپنے حق کی مہر لگاؤ...... یاد رکھو کسی کی جان لے کر ہم صرف گناہ گار ہوں گے۔ فتح یاب ہرگز نہیں......" حمزہ کا سر جھک گیا۔

"تمہیں اندازہ ہے تمہارے اس رویے سے تمہارے پیاروں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔" اِک اور ضرب لگائی۔

"دادو......" بے ساختہ ہی ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں کسی موڑ پر تمہیں جھکے ہوئے سر اور ندامت سے بھرے چہرے کے ساتھ نہیں دیکھنا چاہتا۔ حمزہ...... غصہ ہمیشہ ندامت پر ختم ہوتا ہے۔ پھر کیا فائدہ ایسی ندامت کا جس کا سدِباب نہ ہو سکے۔ اک لمحے کے لیے، جو کسی کو پچھاڑ کر اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر انسان فتح یاب ہو سکتا ہے بلکہ دلوں کو تسخیر کرنے میں فتح ہوتی ہے۔" حمزہ سر اٹھائے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اک دم سے اٹھا اور ان کے زانو پر سر رکھ کر رو دیا۔

"دادو...... میں کیا کروں...... خود پر اختیار نہیں رہا۔"

"خود پر اختیار ہی تو عقل و شعور کی دلیل ہے۔ بے اختیار تو پاگل ہو جاتے ہیں اور میں تمہیں محض دنیاوی محبت کے لیے، بے اختیار نہیں دیکھنا چاہتا۔"

وہ بھل بھل رو رہا تھا۔ اندر کا رکا ہوا طوفان کسی کندھے کا منتظر تھا۔ راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ پروفیسر علی رضا کرمانی اپنے اثاثے کو یوں بکھرتا ٹوٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ضربِ کلیم ضروری تھی۔

"ہمیں صرف ایسے راستے پر چلنا چاہیے جس میں عزت ہو، راہزن، رہبر نہیں بنتا جو رہبر نہیں بن سکتا اسے محرم کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ حمزہ! محبت سے پہلے عزت ضروری ہے۔ ہم محبت پر شب خون مارنے پر قادر نہیں ہیں اور تم اتنے نادان ہو گے یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

حمزہ رو رہا تھا۔ دادو اسے ترحمی نگاہوں سے

دیکھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو چاند سے اس کی زندگی منور کردیتے۔

☆☆☆

''بیٹے یہ میرے دادو ہیں..... تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں اسامہ نے بڑی سی چادر لپیٹے اس گلابی سی لڑکی کو دیکھا۔

''کیوں.....؟'' دھیمی سی آواز تھی۔

ان کا پوتا یوں ہی تو فریفتہ نہیں ہوا تھا۔ اسامہ لمحے بھر کو رکا۔

''حمزہ کے سلسلے میں۔''

پروفیسر علی رضا کرمانی اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ ایک سایہ سا ٹھہرا تھا اور گزر گیا۔

''چند منٹ.....''

''ہوں.....'' گہری سانس لے کر وہ چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ دادو بھی مدِ مقابل بیٹھ گئے۔ اسامہ چائے کا آرڈر دینے چلا گیا۔

''مجھے معلوم ہے آپ ایک باعزت فیملی سے تعلق رکھتی ہیں مگر حمزہ آپ کی محبت میں مبتلا ہے۔''

اس کا سر جھک گیا۔

''مجھے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ آپ..... آپ کی انوالومنٹ کتنی ہے۔ کیا آپ بھی.....؟''

''میں ڈاکٹر بن رہی ہوں، بڑی مشکل سے بابا نے پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی جو اُن کے اعتماد کو پامال کردے اور مجھ پر یقین کرنے کی سزا میری بہنوں کو ملے۔ ہم چھ بہنیں ہیں اور ہم سب پڑھنا چاہتی ہیں۔'' دھیرے، دھیرے اس کے ہونٹوں سے موتی جھڑ رہے تھے۔ گھنی سیاہ پلکیں رخساروں پر گری رہیں۔ چادر نے اس کے چہرے کے گرد ہالہ کیا ہوا تھا۔

''میری منگنی ہوگئی ہے، میرے منگیتر یہاں لاسٹ ائیر میں ہیں۔''

''ہوں..... میں نے پوچھا تھا کہ تمہاری رائے حمزہ.....''

''میری پلاننگ میرے بابا نے کردی ہے۔ پوری زندگی کے لیے ہمیں ترمیم کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ اب ان سے یونیورسٹی میں پڑھنے کا اجازت نامہ لے کر میں نے خود کو رہن رکھ دیا ہے۔ اب میں اپنی خواہش کرنے کی پابند نہیں رہی۔''

''کیا تم بھی حمزہ کو..... پسند کرتی ہو یا.....''

''میں نے ابھی کہا ناں.....'' وہ ذرا رکی۔

''حمزہ بہت اچھے ہیں، آپ نے بہت اچھی تربیت کی ہے ان کی مگر میری زندگی میں محبت کی گنجائش کسی صورت نہیں نکل سکتی۔ حمزہ شدت پسند ہوتے جارہے ہیں۔ میں خود اس سلسلے میں آپ کے پاس شکایت کرنے آنے والی تھی۔'' وہ لمحے بھر کو رکی..... نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

ان کا دل لرز گیا۔ سرخ آنکھیں شدتِ ضبط سے نم ہو کر حسن کی شدت کو لودے رہی تھیں۔

''انہیں سمجھائیں، کچھ چیزیں ہماری زندگی میں ایسی ہوتی ہیں۔ جنہیں ہم پسند تو کرتے ہیں مگر انہیں اپنے پاس رکھنے کا اختیار نہیں رکھتے اور مجھے اپنے باپ کا اونچا شملہ، اپنے وعدے کا احترام اور اپنی بہنوں کے خواب زیادہ عزیز ہیں۔ محبت تو مل ہی جاتی ہے مگر یقین، اعتماد، اعتبار روٹھ جائیں تو واپس نہیں آتے۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''پلیز.....!'' دھیرے سے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''انہیں سمجھائیں..... طاقت کا ناجائز استعمال مت کریں، میں اپنے گاؤں کی جہالت ختم کرنا چاہتی ہوں۔ قبائلی رسمیں، مایوسی اور بے یقینی ختم کر کے نئے دور کا آغاز کررہی ہوں۔''

''اس لیے تم میرے پوتے کی محبت کو قبول نہیں کررہیں۔'' پروفیسر علی رضا کرمانی نے ایک دم سے کہا..... اس چھوٹی سی لڑکی کے افکار اور خیالات نے

انہیں متاثر کیا تھا۔ وگرنہ آج تک وہ متاثر کرتے آئے تھے۔

''ایک طرف ایک شخص اور دوسری طرف ہزاروں افراد..... کس کا پلڑا بھاری ہے؟ فیصلہ آپ کیجیے۔''

دادو کا سر جھک گیا۔ فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ دو دریا کے دھارے بھی آپس میں محبت کرتے ہیں ساتھ ساتھ چلتے ہیں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں پر ملتے نہیں..... اس لڑکی کا عزم بلند اور قابلِ ستائش تھا۔ جبھی اک لحیم شحیم، اونچا لمبا، بانکا سجیلا گبرو جوان ان کی ٹیبل کے قریب آ کر کھڑا ہوا۔ اسامہ بھی چائے لے کر آ گیا تھا۔

''پریشے تم یہاں بیٹھی ہو۔ میں گھر جا رہا تھا سوچا تمہیں ہاسٹل چھوڑتا جاؤں۔''

''ہاں، میں آپ کو فون کرنے ہی والی تھی۔ یہ پروفیسر علی رضا کرمانی ہیں۔'' پریشے نے ان کی جانب اشارہ کیا۔ اسامہ نے چائے ٹیبل پر رکھی۔

''حمزہ کے گرینڈ پا.....''

''اور انکل یہ بخت اللہ میرے کزن اور فیانسی.....'' اس کا لہجہ اس بار با اعتماد تھا۔

بخت اللہ ان سے ہاتھ ملا رہا تھا اچانک گرفت ڈھیلی ہو گئی چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ ابرو تن گئے۔

''میں نے انہیں بات کرنے کے لیے بلوایا تھا..... بیٹھیں۔''

''یہ ہمارے دشمن.....''

''نہیں بخت اللہ ایسا نہیں ہے، یہ بہت اچھے ہیں۔ غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔''

''اس نے ہمیں بے عزت کیا ہے، ہماری عزت اچھالی ہے۔ اُسے سمجھائیں۔''

''ہاں..... میں نے اُسے سمجھایا ہے، ویسے بھی ہماری اقدار اور روایات میں بہت فرق ہے اور ضروری نہیں ہے کہ بچوں کا ہر فیصلہ درست ہو۔'' پروفیسر علی رضا کرمانی نے پُر وقار انداز میں کہا۔ بخت اللہ خاموش ہو گیا۔ ان کے درمیان کہنے سننے والی بات نہیں رہی تھی۔ پریشے سب کہہ چکی تھی۔ بخت اللہ کو سب ٹھیک ہے کا سگنل مل رہا تھا۔

اسامہ جلدی سے ویٹر کو بلوا کر گرم چائے منگوانے لگا۔

''ہم دوستی کا رشتہ تو استوار کر سکتے ہیں۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔

''کیوں نہیں..... میں آپ کو اپنے بابا سے ملواؤں گی۔'' بخت اللہ کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔

''کیوں نہیں، آپ کے بابا بھی آپ کی طرح ذہین ہوں گے۔'' پریشے سر جھکا کر مسکرا دی۔

کرمانی صاحب کو نیلگوں آنکھوں میں جھلکتا ساحل نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے گہری سانس لی۔

چاہے جانے کا عنصر دونوں جانب تھا اک نے اظہار کر دیا تھا دوسرا قربانی دے رہا تھا۔ زندگی جہدِ مسلسل کا نام ہے۔ اک سمجھ گیا تھا اک کو سمجھانا تھا..... خاندانی دشمنیاں وہ بھی نہیں نبھا سکتے تھے، حمزہ ان کے بیٹے کی واحد نشانی تھی۔

☆☆☆

''میں آسٹریلیا چلے جاؤ۔''

''کیوں؟'' کافی پیتے ہوئے اس نے دادو کو دیکھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی اسٹڈیز وہاں سے مکمل کرو۔'' حمزہ کا اداس و ملول چہرہ ان کا دل تڑپاتا تھا۔ وہ مگ کے کناروں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''سنو..... تم محبت فاتح عالم ہو، تم نے کسی کا دل جیت لیا ہے بس وہ تمہیں مل نہیں سکتی۔'' حمزہ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ دادو سنجیدہ تھے۔ ان کے عقب میں ونڈو کھلی تھی۔ گہرے بادل آسمان پر اتر رہے تھے۔

''اس کا عزم بلند اور حوصلہ مضبوط ہے۔ اس کے یقین میں دراڑ مت ڈالو۔ تمہارا مثبت عمل محبت کو امر کر دے گا اور منفی ردِ عمل میری عزت کو خاک میں ملا دے گا، فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔'' کافی کی بھاپ

ختم ہوگئی تھی۔ وہ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیوں کے درمیان مگ دبا تھا۔ ہتھیلیاں گرم ہوگئی تھیں۔
''محبت خیرات ہوتی ہے نہ زکوٰۃ ...... یہ دلوں کی میراث ہوتی ہے۔ صرف سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔''
دادو سمجھ رہے تھے اور ان کا طریقہ فلسفہ تدریسی انداز بیانیہ لہجہ اور کبھی کبھی استعارات کا استعمال اسے فلاح کے راستے پر لے آیا تھا۔
فلاح جو ایمان ہے، فلاح جو یقین ہے۔ پہلے تو وہ ایک طرف عشق میں مبتلا اس کے حصول میں پاگل ہو رہا تھا مگر اب..... حمزہ نے گہری سانس لی۔ اب بات دوسری تھی۔ محبت بالآخر اسی...... کی تھی۔ اس کی محبت کے لیے عزت ضروری تھی۔ اس کا جذبہ عمل مانتا تھا۔ وہ اپنے پیاروں کے لیے قربانی کی راہگزر پر چل پڑی تھی پچھلے برس اس کا بھی بنتا تھا۔
یکایک دل بھر آیا..... بادل گہرے ہوگئے۔ دھیرے سے کپ سائیڈ پر رکھا۔
''دادو..... میں ادھر ہی رہ کر اپنی اسٹڈی مکمل کروں گا اور ہائر اسٹڈیز کے لیے آسٹریلیا جاؤں گا۔ واپس آنے کے لیے.....'' وہ دھیرے سے کھڑا ہوگیا۔
دادو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔
''حمزہ میں نے تمہاری ہر خواہش پوری کی ہے بچے مگر اس خواہش کی تکمیل میرے اختیار میں نہیں..... مجھے معاف کردینا۔''
''دادو.....'' وہ دوزانو بیٹھا۔ ''نہیں دادو..... آپ نے مجھے مالا مال کردیا ہے۔ آپ نے کیا دیا ہے آپ نہیں جانتے۔ محبت اقرار ہوتی ہے بس مجھے اقرار چاہیے..... اس کا عزم، اس کا ولولہ بہت عظیم ہے اور میں اس کی عظمت کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا۔'' اس نے ان کے بوڑھے ہاتھ کا بوسہ دیا۔
''بس چند دن خود کو سنبھالنا ہے اسامہ سے معافی مانگنی ہے۔ کزنز کو منانا ہے..... اور.....''
''اور..... حوریہ کے متعلق سوچنا ہے۔'' دادو نے بات مکمل کی..... ''اپنے رویوں میں اعتدال پیدا کرنا ہے۔''
''جی.....'' وہ سر جھکا کر رہ گیا۔
''ہاں مگر ابھی نہیں۔'' وہ دھیرے سے کھڑا ہوگیا۔ (ابھی دل کو سمجھانا ہے، جذبوں کو منانا ہے) پروفیسر علی رضا کرمانی نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔
''بیسٹ آف لک جوان.....''
''جی.....'' وہ جھکا ان کے رخسار اور ماتھے پر پیار ... کر کے وہ بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔ دادو کی آنکھیں بھیگنے لگیں دل پر صبر و ضبط کے پہرے بٹھانا کتنا مشکل ہے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا۔ دھیرے سے اٹھ کر دریچے میں آکھڑے ہوئے۔ باہر لان میں بارش کی کن من شروع ہو رہی تھی۔ سرمئی بادل چھاگل لے کر بہت نیچے آگئے تھے۔ حمزہ سیڑھی سے لگ کر کھڑا منہ اٹھائے آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ کن من سے بھیگ رہا تھا اور..... اور وہ جانتے تھے اس کی آنکھوں میں صرف بارش کا پانی ہی نہیں جمع ہو رہا تھا۔ دل کے آنسو بھی شامل ہو کر گریبان بھگو رہے تھے۔
انہوں نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔ پچھلے ہفتے آخری ملاقات کا آخری منظر آنکھوں میں ٹھہر گیا تھا جب وہ اٹھ کر جا رہے تھے بخت اللہ، اسامہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کو انگلی کی پوروں اور پھر آنچل سے صاف کر رہی تھی۔
محبت..... اس کے دل میں بھی ٹھہر گئی تھی۔
محبت..... حمزہ کے دل میں بھی تڑپ رہی تھی۔
انہیں یقین تھا، اس بھیگے آسمان کے ساتھ برستے بادلوں کے سنگ وہ بھی اپنے دل کے راز کہہ رہی ہوگی۔
محبت جو آباد رکھتی ہے۔
محبت جو اداس رکھتی ہے۔

مختصر کہانی

سیما سراج



کہانی ادھوری رہتی ہے جب بھی پورا کرنے کی کوشش کرتی ہوں اماں کی آواز تسلسل توڑ دیتی ہے۔ اس قدر بھیگے، بھیگے موسم میں مہکتی ہوئی رومانی کہانی..... دریچے میں سے خوشگوار ہوا لفظوں کو تازگی بخشنے لگی۔ اتنے حسین برسات کے موسم میں، چھٹیوں میں اماں کو بھی مہمان داری کا شوق ہوا۔ پتا نہیں کیا عادت ہے۔ شہر میں کوئی بھی آئے دور پرے کا رشتے دار میزبانی کے لیے ہمارے اماں، ابا حاضر... ہمارا

گھر برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ابا نے اوپر کی منزل اسی لیے کرائے پر نہیں دی۔ جی ہاں ہمارا اوپر کا حصہ مہمانوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی نوکری کی تلاش میں آئے یا سیر سپاٹے کے لیے ہمارا گھر حاضر..... اور اب ابا کے کزن کی سالی حمیدہ بانو اپنے شوہر مشتاق میاں اور تین عدد بچیوں کے ساتھ موجود تھیں' ماں کی دوسری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''ربیعہ بیٹا شام ہوگئی ہے۔ چائے بنالو بلکہ پکوڑے بھی بنالو۔ اس موسم میں پکوڑوں کا اپنا ہی مزہ ہے۔ اے لاؤ صحن سے چیزیں سمیٹ لوں بادل آئے ہوئے ہیں۔ کالی گھٹا ہے، لگتا ہے آسمان کھل کر برسے گا۔'' حمیدہ خالہ کی بچیوں کے ساتھ اماں نے جلدی جلدی چیزیں سمیٹنی شروع کر دیں۔ حمیدہ خالہ کو اچانک یاد آ گیا۔ چھت پر کپڑے دھو کر پھیلائے ہیں۔ مشتاق انکل کو لے کر وہ چھت پر کپڑے سمیٹنے چلی گئیں۔

''اماں بیسن ختم ہوگیا ہے۔'' اس نے سوچا کہ خالی چائے بنا کر وہ کہانی پوری کرلے گی مگر اماں بھی خوب ہیں۔ دروازے پر کھڑے ہو کر محلے کے لڑکے سے فوراً نکڑ کی دکان سے بیسن منگوالیا۔ چائے سے فارغ ہو کر اس نے برتن دھوئے کہ اچانک پھوار پڑنے لگی۔

''ہائے کتنا مزہ آتا ہے، بارش میں بھیگنے کا، اماں صحن کی نالی بند کر دوں؟''

''اری کیوں' دیوانی ہوئی ہے کیا؟'' اماں نے چشمے سے آنکھیں گھمائیں۔

''بس اماں صحن میں پانی بھر جائے گا پھر کاغذوں کی کشتیاں بنا کر تیرائیں گے۔''

''اری کمبخت کا بچپن ہی نہ گیا۔'' پھوار تیز ہونے لگی۔ وہ صحن میں کھڑی بھیگتی رہی۔

''موسم خراب ہے۔'' اماں ڈانٹتی رہیں۔

''ارے چھوڑو بچی ہے۔'' حمیدہ خالہ انہیں سمجھاتی رہیں۔

''بارش میں تو ربیعہ ایسی دیوانی ہوتی ہے کہ ہوش ہی نہیں رہتا۔'' اس کے کپڑے بدن سے چپک چکے تھے۔ اچانک نظر اوپر اٹھی۔ مشتاق انکل چھت کی بالکونی پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''ہائے اللہ!'' شرمندگی سے دوڑ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ کہانی کے تمام لفظ بوچھار میں بھیگ چکے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد سب لوگ دیر تک جاگتے رہے۔ اب تو یہ روز کا معمول بن چکا تھا۔

''اللہ خیر کرے بارش کے بعد بجلی کا جانا ضروری ہے، سب کام سمیٹ لو۔'' سب نے اپنے اپنے بستر تیار کیے، وہ بھی اپنے کمرے میں آ گئی آج اس نے دروازہ بند نہیں کیا۔ بارش کے موسم میں چھم، چھم کی آواز اس کے کانوں میں رس گھولتی تھی۔ اس نے بھیگے ہوئے لفظوں کو پڑھنے کی کوشش کی۔ اچانک لائٹ چلی گئی۔ موسم ٹھنڈا لگا، گرمی کی شدت کم ہو چکی تھی۔ اگر کافی یا چائے ہوتی، ہائے یہ خواہشیں...... دل کی سلگتی ہوئی خواہشیں...... وہ دیر تک کہانی کے پلاٹ پر غور کرتی رہی۔ ہلکی ہلکی نیند کا سرور...... ابھی وہ مکمل طور پر نیند کی آغوش میں پہنچی بھی نہیں تھی کہ اچانک اسے اپنی سانسوں کا احساس ہوا۔ اب اپنے وجود پر بھاری بوجھ سا محسوس ہوا، بھوت یا چور..... خوف سے رکتی آواز گلے میں گھٹنے سی لگی۔ اچانک اس کی قوتِ مدافعت جاگ اٹھی۔ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش میں ایک ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا اور اس نے اپنے دانت کلائی پر گاڑ دیے۔

بوجھ اس کے جسم سے ہٹ گیا۔ اب وہ اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرنے لگی۔ ٹھنڈے موسم میں پسینے میں اس کا چہرہ تر ہو گیا۔ اور سانسوں کی رفتار بے قابو...... لائٹ آ چکی تھی۔ ٹیبل لیمپ روشن ہو گیا۔ چھم، چھم

کی رسیلی آواز اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر دروازہ بند کرلے۔ معلوم نہیں کب صبح ہوئی۔ بارش رک چکی تھی۔

''ربیعہ کیا بات ہے ابھی تک اٹھی نہیں۔'' اماں آواز دیتے ہوئے کمرے کے اندر آگئیں۔ ربیعہ نے خالی خالی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

''تمہیں تو تیز بخار ہے، اسی لیے منع کیا تھا کہ بارش میں مت بھیگا کرو۔ ٹھہرو میں گرم چائے بھیجتی ہوں۔'' اماں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ اماں کے جاتے ہی حمیدہ خالہ کمرے میں آواز لگاتی ہوئی آگئیں۔ مشتاق انکل کی چپل غائب تھی۔

''اللہ جانے رات اندھیرے میں کہاں گئی۔ اندھیرے میں کون پہن گیا۔ پورا گھر دیکھ لیا، تمہارے کمرے میں تو کوئی پہن کر نہیں آگیا۔ پورا گھر دیکھ لیا ہے، لو یہ پڑی ہیں۔'' حمیدہ خالہ نے آڑی ترچھی پڑی چپلیں اٹھائیں اور چل دیں۔

''مشتاق انکل کی چپل میرے کمرے میں......''

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اماں نے بتایا۔

''مشتاق میاں کے بھائی کے یہاں کچھ..... ایمرجنسی ہوگئی ہے، وہ فوراً فیملی کے ساتھ جارہے ہیں۔'' جاتے وقت ہمت کر کے وہ دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔

''ہائے رات معلوم نہیں کس کیڑے نے مشتاق میاں کی کلائی پر کاٹ لیا۔'' اماں بھی سرہانے آکر بیٹھ گئیں۔

اچانک بادل گرجے۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ برسات اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔ اماں آنچل سے اس کے آنسو پونچھتی رہیں اور صحن میں اس کے بھیگے بدن کے گرد بالکونی پر کھڑے مشتاق انکل کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

سالِ نو کی دعا

اے خدائے لم یزل
اے رب ذوالجلال
کیسا وقت آن پڑا ہے میرے سوہنے دیس پر
کیسے ظلمتوں کے بادل چھا گئے ہیں اس پاک دھرتی پر
میرے رب میرے وطن کا امن کیوں درہم برہم ہے
کیوں انسانی جان اتنی ارزاں ہے
اے رب دوجہاں
اس سالِ نو میں
میرے سوہنے دیس کو
دہشت گردی سے نجات دلا دے
عداوتوں کے نشاں مٹا دے
تعصب اور نفرتوں سے جان چھڑا دے
اے رب میرے وطن کو محفوظ رکھنا
دکھ کی ہر گھڑی سے
غم کے سائے مایوسی کے اندھیرے سے
اے خدا اے رحیم و کریم
ہمارے اس چمن کے لیے
اس کے امن کے لیے
اس سالِ نو کو ہی نہیں
آنے والے ہزار سالوں کو مبارک کردے
وہ جنہوں نے ایمان کا سودا کیا
چند سکوں کے عوض اپنا ضمیر بیچ کر
انہیں ہدایت عطا کر
میری اس دعا کو سندِ قبولیت عطا کر
اے ہمارے عظیم رہبر، اے خدائے بزرگ و برتر

حیا ترمذی، کاغان



مکمل ناول

محبتوں کے رنگ

اسما قادری

انسان پر اچانک قیامت کیسے ٹوٹتی ہے اس بات کا عاقب کو آج ہی پتا چلا تھا۔ وہ گم صم، سکتہ زدہ سا یوں حنا کے چہرے کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا جیسے ابھی اس کے گلاب کی پنکھڑیوں کے سے لب حرکت میں آئیں گے اور ہر طرف اس کی نقرئی ہنسی کی کھنکھناہٹ گونجنے لگے گی۔ وہ بچپن ہی سے بہت شوخ و شنگ تھی اور ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو کر کھلکھلانے لگتی...... عاقب کو اس کی ہنسی بہت اچھی لگتی تھی۔ حنا کی ہنسی میں اسے زندگی کا

نغمہ سنائی دیتا تھا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ زندگی کتنی حسین شے کا نام ہے۔ حنا کب سے اس کے دل میں بستی تھی اس سوال کے جواب میں اسے لمحہ بھر بھی سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بہت اطمینان سے بتا سکتا تھا کہ حنا کے دنیا میں آنکھ کھولنے کے پہلے لمحے سے وہ اسے چاہتا ہے۔ وہ اس سے چار سال چھوٹی چچا زاد کزن تھی۔ چچا اور عاقب کا خاندان ساتھ ساتھ بنے گھروں میں آباد تھا۔ دونوں گھروں کا لان مشترک تھا اور دل بھی ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اس لیے، دونوں طرف کے مکینوں کی ایک دوسرے کے گھروں میں بلا تکلف آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ حنا کی پیدائش کے بعد تو عاقب کا بیشتر وقت چچا کے گھر میں ہی گزرنے لگا تھا۔ نازک نقوش والی گلابی، گلابی سی حنا اس کے دل کو اتنی بھائی تھی کہ وہ ایک پل کے لیے بھی اس سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ بڑے اس کی دیوانگی پر ہنستے تھے لیکن اسے حنا کے سوا کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ اس نازک گڑیا سے اتنا پیار کرتا کہ خود سے دو سال چھوٹے بھائی ثاقب کو بھی اس کے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ ناسمجھ ہونے کی وجہ سے ثاقب حنا کو کبھی نوچ لیتا تھا یا بھینچ کر پیار کر لیتا تھا تو وہ رونے لگتی تھی اور اس کا رونا عاقب سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس جرم کی سزا میں بلا تکلف ثاقب کی پٹائی لگا دیتا اور بڑوں کی طرف سے ہونے والی ڈانٹ ڈپٹ کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ بچپن کے یہ دن ہولے، ہولے آگے بڑھتے انہیں لڑکپن اور پھر جوانی کی منزل تک لے آئے لیکن عاقب کی حنا سے والہانہ محبت میں کوئی فرق نہیں آیا حالانکہ حنا کے بعد اس کی چھوٹی بہن ثنا بھی دنیا میں آئی جو خوب صورتی اور نزاکت میں کسی طور حنا سے کم نہیں تھی لیکن عاقب کی توجہ کا مرکز حنا ہی تھی۔ جوان ہونے تک وہ حنا کو اپنی شریک حیات بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کے اس فیصلے سے کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ حنا گھر کی لڑکی تھی جس کے سگھڑ، تعلیم یافتہ اور خوش اطوار ہونے کی وجہ سے سب ہی اسے پسند کرتے تھے۔ عاقب کے والدین اور بھائی بہن نے دل و جان سے اس فیصلے کو قبول کیا اور یوں بغیر کسی ظالم سماج کے درمیان میں آئے حنا نہایت آسانی سے اس کی زندگی کا حصہ بن گئی۔ زندگی پہلے سے کئی گنا خوب صورت ہو گئی اور وہ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتا اس کے ایک، ایک لمحے سے لطف اٹھانے لگا۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی حنا نے اسے اپنے امید سے ہونے کی خبر سنائی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا اور کسی کانچ کی گڑیا کی طرح اس کا خیال رکھنے لگا۔ حنا اس کی اس دیوانگی پر ہنستی اور کہتی۔

''آپ بھی حد کر دیتے ہیں عاقب..... میں کوئی دنیا کی انوکھی عورت تھوڑی ہوں جو ماں بننے جا رہی ہے۔ ہر روز اتنی عورتیں ماں بنتی ہیں، آپ کی طرح کوئی انہیں ہتھیلی کا چھالا تھوڑی بنا لیتا ہے۔''

''دوسری عورتوں کے بارے میں، میں کیا جانوں.....؟ میں تو بس حنا عاقب کو جانتا ہوں جو میری جان ہے اور اپنے وجود میں میری پیار کی نشانی کو سینچ رہی ہے۔ میرا بس نہیں چلتا کہ تمہیں جادو کے زور سے ننھا سا کر دوں اور سینے کے اوپر والی جیب میں رکھ کر ہر جگہ ساتھ، ساتھ لے کر گھوموں۔'' وہ دیوانگی سے کہتے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیتا تو اس قدر چاہت پر حنا مسرور ہو جاتی۔

گھر میں بھی سب اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کھانے پینے، دواؤں اور ڈاکٹرز کے وزٹ ہر کام میں بڑی باقاعدگی تھی۔ شہر کے ایک بڑے اسپتال میں اس کا نام لکھوایا گیا تھا۔ آخر تک ساری رپورٹس بالکل ٹھیک تھیں اور سب کچھ نارمل جا رہا تھا لیکن آخری لمحات میں بالکل اچانک ہی نہ جانے کیا پیچیدگی ہوئی کہ بیٹے کی صورت نئی زندگی کو جنم دینے والی حنا اپنی زندگی کی بازی ہار گئی۔ عاقب تو دیوانہ ہو گیا۔ بپھر کر اسپتال انتظامیہ اور ڈاکٹرز پر چڑھ دوڑا۔ وہاں توڑ پھوڑ کی اور مقدمہ دائر کرنے کی دھمکیاں دیتا رہا لیکن اس سب کے باوجود بھی وہ حنا کو واپس تو نہیں لا سکتا تھا۔ گھر

والوں نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا اور اسپتال سے واپس لانے میں کامیاب ہوسکے۔ ڈیڈ باڈی کی اسپتال سے گھر منتقلی، عزیز و اقارب کو اطلاع دینے اور تجہیز و تکفین کے معاملات کس نے نمٹائے غم سے نیم جان عاقب کو خبر نہیں ہوسکی۔

دل جیسے ماننے کو ہی تیار نہیں تھا کہ ساری زندگی ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والی حنا یوں اچانک اس کا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ وہ اس کی میت کے قریب بیٹھا بے یقینی سے سفید کفن میں لپٹے اس کے وجود کو دیکھتا رہا تھا۔ حنا نے زندگی میں کبھی سفید لباس نہیں پہنا تھا۔ وہ اپنی شخصیت ہی کی طرح شوخ کھلتے ہوئے رنگ پہننا پسند کرتی تھی۔ اسے تو اپنے کالج یونیفارم میں بھی سرمئی قمیص کے ساتھ سفید شلوار اور دوپٹے کا استعمال پسند نہیں تھا اور کالج میں گزرنے والے دو سالوں میں اس نے بے دلی سے یہ یونیفارم پہنا تھا۔ البتہ یونیورسٹی جا کر وہ بہت خوش تھی اور ہر روز اپنی پسند کے رنگوں کے لباس میں تیار ہو کر جایا کرتی تھی۔ عاقب کے دل میں اس کے سفید کفن میں لپٹے وجود کو دیکھ کر ایک ہوک سی اٹھی۔ رنگوں سے محبت کرنے والی کو رنگ برتنے کے لیے اتنی کم مہلت ملی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ جو غضب کی جامہ زیب تھی آج اس کفن میں بھی خوب چمک رہی تھی۔ دیکھنے والے اس کا آخری دیدار کرتے تو کہے بنا نہ رہ پاتے کہ اس کے چہرے پر فرشتوں کی سی معصومیت ہے اور یوں لگتا ہے کہ وہ آنکھیں بند کیے سو رہی ہے۔ اس کے مرنے کا جیسے اپنے پرائے کسی کو یقین نہیں آرہا تھا تو پھر بھلا عاقب کو کیسے آتا۔ وہ تو اس کے چہرے پر یوں نظر جمائے بیٹھا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے آنکھیں کھول دے گی اور ہنس کر کہے گی۔

”کیا ہوا عاقب ڈر گئے؟ میں تو صرف آپ سے مذاق کررہی تھی۔“

”بھائی.....“ اسی وقت ثاقب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے پکارا تو وہ بے دھیانی کی کیفیت میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”مغرب کی نماز کا وقت ہورہا ہے۔ اب اجازت دیجیے کہ جنازہ اٹھایا جائے۔“ ثاقب کی اپنی آنکھیں سرخ ہورہی تھی اور وہ بہت ضبط سے اس سے مخاطب تھا لیکن عاقب کو تو اس کی بات کسی کوڑے کی طرح لگی اور اس نے یوں اسے زور سے دھکا دیا جیسے بچپن میں اسے حنا کے ارد گرد پا کر دے دیا کرتا تھا۔

اس کے دھکے سے ثاقب ذرا سا لڑکھڑایا ضرور لیکن خود کو سنبھال لیا۔ اب بچپن نہیں تھا کہ وہ بڑے بھائی کے دھکے سے گر جاتا اور حلق پھاڑ کر رونے لگتا۔ اب وہ جوان ہوگیا تھا اور جانتا تھا کہ بھائی کو جو چوٹ لگی ہے اس کے صدمے سے اسے سنبھالنے کے لیے اسے خود کو مضبوط کرنا ہوگا۔ اس نے ایک بار پھر عاقب کے شانے کو تھاما اور دلگیر لہجے میں بولا۔

”ہمت سے کام لیجیے بھائی۔ ہمیں حنا آپی کو رخصت کرنا ہی ہوگا۔ دیکھیں کتنے لوگ جمع ہیں۔ انہیں عصر کے وقت تدفین کی اطلاع دی گئی تھی اور اب مغرب کا وقت ہوا جارہا تھا۔ لوگوں کو اتنی تکلیف دینا اچھی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی میت کو جلد از جلد اس کی آخری آرام گاہ پہنچانے کا حکم ہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں اب مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ چھوٹا ہو کر بڑے بھائی کو سمجھا رہا تھا لیکن وہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر ثاقب کو دھکا دیا اور چلایا۔

”چلے جاؤ یہاں سے..... ان سب لوگوں سے بھی کہو کہ چلے جائیں۔ کسی کو ضرورت نہیں یہاں رکنے کی..... اپنی حنا کے پاس میں اکیلا ہی کافی ہوں۔“ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ہوش میں نہیں ہے۔ ایک تو جوان موت اس پر سے عاقب کی دگرگوں حالت اپنے تو اپنے، پرائے بھی سسکنے لگے۔ کئی کی تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ حنا کے والد جو جوان بیٹی کی اچانک موت پر صدمے سے نڈھال تھے خود پر کڑا جبر کر کے ثاقب کی مدد کے لیے آگے بڑھے اور عاقب کے قریب بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔ عالم دیوانگی میں بھی ان کی اس حرکت پر عاقب کو ایک جھٹکا سا لگا۔

''مجھ پر رحم کرو بیٹا..... میری بچی کو اس کی آخری آرام گاہ پہنچانے دو، اس کی کفن میں لپٹی لاش اگر کچھ دیر اور یہاں رکھی رہی تو میرا دل پھٹ جائے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ عاقب بھی ان کے گلے لگ گیا اور پہلی بار رو پڑا ورنہ اب تک تو بس دیوانگی ہی کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ چند منٹوں بعد کلمۂ شہادت کے ساتھ سسکیوں اور آہوں کے سنگ حنا ہمیشہ کے لیے اس گھر سے رخصت ہو رہی تھی جہاں کے مکین اس سے بے تحاشا محبت کرنے کے باوجود اسے اپنے پاس رکھنے پر قادر نہیں تھے۔

☆☆☆

''عاقب بھائی.....!'' دستک کے فوراً بعد سنائی دینے والی ثنا کی پکار نے عاقب کو دروازے کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔ وہ گلابی اور آسمانی امتزاج کے ہلکے سے کمبل میں لپٹے بچے کو بانہوں میں سنبھالے، دروازے پر استادہ تھی۔

''اندر آجاؤ ثنا..... وہاں کیوں کھڑی ہو؟'' اس نے بجھی ہوئی آواز میں ثنا سے کہا۔ اندر آتے ہوئے وہ دیکھ چکی تھی کہ عاقب کے سامنے اس کی اور حنا کی شادی کا بڑا سا البم رکھا ہوا ہے۔ دلہن بن کر حنا پر بہت روپ آیا تھا۔ اصل میں تو وہ تھی ہی بہت پیاری اور دلہن بن کر تو گویا سارے جہاں کا حسن اس کے وجود میں سما گیا تھا۔ دیکھنے والوں کی نظریں اس کے ملکوتی حسن پر ٹھہرتی ہی نہیں تھیں لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ حسین پری شادی کے محض سال بھر بعد ہی ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے خاک کی چادر اوڑھ کر سو جائے گی۔ آج اسے دنیا سے گئے پورے بارہ دن ہو گئے تھے لیکن گھر کا ہر فرد گویا بے یقینی کی سی کیفیت کا شکار تھا۔ عاقب تو لگتا تھا کہ کسی طور اس حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حنا کی تدفین کے بعد سے اس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی اور زیادہ تر وقت اپنے کمرے کی تنہائی میں گزارتا تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں سے ملاقات کے لیے بھی وہ صاف انکاری تھا اور یہ مرحلہ بھی گھر والے ہی نمٹا رہے تھے۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ حنا کی موت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس وقت بھی اسے شادی کے تصویری البم میں گم دیکھ کر ثنا کو اندازہ ہو گیا کہ ان تصویروں کی مدد سے وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں گھوم رہا ہے۔ جہاں یقیناً حنا اس کے سنگ تھی۔ اس صورتِ حال پر اس کا اپنا دل بوجھل ہونے لگا۔ قریب تھا کہ آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر بہہ نکلتے کہ اس کی گود میں موجود ننھے وجود کے رونے کی باریک سی آواز کمرے میں گونجی اور اس نے خود پر قابو پا لیا۔ بچے کے منہ میں فیڈر لگا کر وہ دوبارہ عاقب کی طرف متوجہ ہوئی۔

''عاقب بھائی۔'' اس نے ایک بار پھر عاقب کو پکارا جو اسے کمرے میں آنے کی اجازت دے کر فراموش کر چکا تھا۔

''ہوں۔'' اس کے پکارنے پر جیسے وہ کسی خیال سے باہر آیا۔

''میں آپ کے پاس ایک شکوہ کرنے آئی ہوں۔'' اس نے سوچے سمجھے انداز کے مطابق گفتگو کا آغاز کیا۔

''کیسا شکوہ؟'' عاقب نے اس سے پوچھا ضرور لیکن انداز ایسا تھا جیسے وجہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

''یہ شکوہ میں حنا آپی کی طرف سے کرنے آئی ہوں۔ وہ بیچاری خود تو آ کر آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ اگر ان کے پاس یہ اختیار ہوتا تو وہ ضرور آپ سے شکوہ کرتیں۔''

''شکوہ تو مجھے اس سے ہے جو مجھے یوں بیچ سفر میں تنہا چھوڑ گئی۔'' عاقب کے لہجے میں دنیا بھر کی اداسی تھی۔

''وہ صاحبِ اختیار نہ تھیں کہ آپ ان سے یہ شکوہ کر سکیں۔ کوئی بھی انسان دنیا میں نہ تو اپنی مرضی سے آتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے جانے پر قادر ہے لیکن آپ جس کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہیں اس پر شکوہ کرنے کے لیے ان سمیت ہم سب حق بجانب ہیں۔ اپنے غم میں کھو کر آپ کو احساس ہی نہیں رہا کہ آپ اپنے فرائض سے غفلت برت رہے ہیں۔ دنیا کے دیگر معاملات کے لیے میں آپ کو نہیں ٹوکوں گی کہ وقت کے ساتھ ساتھ آپ ان

کی طرف متوجہ ہو ہی جائیں گے لیکن اس بچے کے سلسلے میں کوتاہی کرکے آپ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ آپ کے اس رویے سے یقیناً آپی کی روح کو تکلیف ہوئی ہوگی کہ ان سے بے تحاشا محبت کا دعویٰ کرنے کے باوجود آپ نے اب تک ان کی نشانی کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ماں کی جدائی تو چلو قدرت کا فیصلہ تھی لیکن یہ تو اپنے جیتے جاگتے باپ سے بھی ابھی تک محروم ہے۔ اسے دیکھنا، پیار کرنا تو درکنار آپ نے تو ابھی تک اس معصوم کو کوئی نام بھی نہیں دیا ہے۔'' جذباتی لہجے میں بولتے، بولتے اس نے کمبل میں لپٹے بچے کو عاقب کی گود میں ڈال دیا۔ سرخ و سفید بچہ اپنی چمکتی آنکھوں سے ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ماں اور باپ دونوں ہی کے نقوش چرائے تھے لیکن آنکھیں بالکل حنا کی طرح تھیں اور جب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا تو عاقب کو بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا کہ حنا اس سے وہ سارے سوال کر رہی ہے جو ابھی ابھی ثنا نے اس سے کیے تھے۔ اس نے بے ساختہ ہی بچے کی آنکھیں چوم لیں کہ یہ آنکھیں اس کی حنا کی آنکھیں تھیں۔ اسے بچے کو یوں پیار کرتے دیکھ کر ثنا بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرا دی ورنہ اب تک اس کے دل میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں عاقب حنا کی موت کی وجہ اس بچے کو قرار دیتے ہوئے اسے ہی نہ ٹھکرا دے۔

''ہم اس کا نام آفاق رکھیں گے۔ حنا کو یہ نام پسند تھا اور اس نے پہلے ہی مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اگر ہمارے ہاں بیٹا ہوا تو ہم اس کا نام آفاق رکھیں گے۔''

''آفاق بہت اچھا نام ہے۔ میں سب کو بتاتی ہوں کہ ننھے میاں کا نام تجویز ہو گیا ہے۔'' سگی بہن کی موت کا غم ایسا نہیں تھا کہ ثنا کے دل سے اتنی جلدی محو ہو جاتا لیکن وہ بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خوش دلی سے مسکرائی اور بچے کو عاقب کی گود سے واپس لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

''اسے میرے پاس ہی رہنے دو۔'' عاقب نے اسے روک دیا۔

''اچھی بات ہے، آپ اسے سنبھالیں تب تک میں کچن میں دیکھ لیتی ہوں۔'' بچے میں دلچسپی لینا عاقب کا زندگی میں دلچسپی لینے کے مترادف تھا چنانچہ وہ دل میں قدرے اطمینان محسوس کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ پیچھے عاقب اپنے نومولود بیٹے سے کیا گفتگو کر رہا تھا اسے اس بات کا علم نہیں تھا لیکن اتنا وہ بھی جانتی تھی کہ اللہ جب انسان سے کچھ لیتا ہے تو بدلے میں ایسا کچھ ضرور دیتا ہے جو جینے کا سہارا بن سکے۔ آفاق کی صورت میں عاقب کو یہ سہارا مل گیا تھا بلکہ عاقب ہی کیا ان سب کو ہی اب حنا کی کمی اس کے بیٹے کی ذات سے پوری کرنی تھی۔

☆☆☆

''بھائی بالکل خاموش ہو گئے ہیں۔ کبھی، کبھی تو مجھے ان کی خاموشی سے ڈر لگنے لگتا ہے۔'' ثاقب کی بات سن کر ثنا کے چہرے کی اداسی گہری ہو گئی۔ وہ ننھے آفاق کو گود میں لیے نرمی سے اس کو تھپک رہی تھی۔ بچے نے کچھ دیر قبل دودھ پیا تھا اور اب خالہ کی محبت بھری آغوش میں سمٹا نیند کی وادی میں اتر رہا تھا۔

''فکر مند تو سب ہی ہیں۔ عاقب بھائی... آپی کو دیوانگی سے چاہتے تھے اس بات سے ہم سب ہی واقف ہیں۔ ابھی تو ہم میں سے کوئی آپی کی اچانک موت کا صدمہ قبول نہیں کر پا رہا ہے تو ہم عاقب بھائی سے اتنی جلدی سنبھل جانے کی امید کس طرح رکھ سکتے ہیں بس اللہ سے یہی دعا ہے کہ ان سمیت ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ امی ابو کی حالت کون سی اچھی ہے۔ ابو سارا وقت گم صم رہتے ہیں اور امی دن میں دسیوں بار رو پڑتی ہیں۔ آپی خود چلی گئی ہیں لیکن ہر سمت بکھری ان کی یادیں دل کو قرار ہی نہیں لینے دیتیں۔'' بولتے، بولتے ثنا کی اپنی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''پلیز ثنا! تم تو ہمت سے کام لو..... صدمہ بہت بڑا ہے لیکن ہمیں اسے سہنا تو ہوگا اور اپنے ساتھ، ساتھ دوسروں کی بھی ہمت بندھانی ہوگی۔ خاص طور پر تمہیں سب سے زیادہ ہمت کا مظاہرہ کرنا ہے کیونکہ تم ہی ہو جو بچا، بچی کا بھی خیال رکھ سکتی ہو اور آفاق کی

ذمے داریاں بھی سنبھال سکتی ہو۔ میں نے بھی عاقب بھائی کے ایک دوست کی مدد سے ان کو اس صدمے سے نکالنے کی کوشش شروع کردی ہے۔ میری درخواست پر آج ان کے دوست خود گھر آکر انہیں زبردستی آفس لے گئے ہیں۔ گھر سے باہر نکلیں گے اور روٹین کے کاموں میں مصروف ہوں گے تو ان کا ذہن بٹے گا۔" اسے حوصلہ دیتے ہوئے وہ اپنی کارگزاری بتانے لگا۔

"یہ تم نے اچھا کیا...... تلخ سہی لیکن حقیقت یہی ہے کہ جانے والا کتنا ہی عزیز ہو زندہ لوگ اپنی زندگی اس کی یاد میں تباہ نہیں کر سکتے۔ جانے والے کو بھول کر جینے کی کوئی نہ کوئی تدبیر کرنی پڑتی ہے۔" رونے سے اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے پڑ گئے تھے۔ اس کی اس اداس شکل کو دیکھ کر ثاقب کے دل کو شدید تکلیف ہو رہی تھی لیکن فی الحال وہ صبر اور ہمت کی تلقین کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"تم یونیورسٹی کب جوائن کر رہی ہو؟ کلاسز تو ہفتے بھر سے اسٹارٹ ہوگئی ہیں۔" اس وقت اسے صبر کی تاکید کرنا بھی مناسب معلوم نہیں ہوا تو یک دم ہی موضوع گفتگو بدل کر پوچھنے لگا۔

"میں یونیورسٹی جاؤں گی تو آفاق کو کون سنبھالے گا؟ تائی امی ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں، شمائلہ کی میڈیکل کی پڑھائی ہے اور امی تو اتنی بری طرح ڈھے گئی ہیں کہ انہیں خود دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ ان حالات میں، میں اتنے چھوٹے بچے کو چھوڑ کر کیسے کہیں جا سکتی ہوں؟" اس کی بات اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھی لیکن ثاقب تذبذب کا شکار ہوگیا۔ اسے علم تھا کہ ثنا کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کا کتنا شوق تھا۔ ماسٹرز اس کے بعد ایم فل، پی ایچ ڈی، لیکچرر شپ جانے اس نے کیا، کیا پروگرام بنا رکھے تھے۔ آفاق کی پرورش کے لیے وہ اپنے سارے خوابوں سے دست بردار ہو جائے یہ چیز اسے تکلیف دے رہی تھی کیونکہ جتنی اسے ثنا عزیز تھی اتنا ہی وہ اس کے خوابوں کو بھی عزیز رکھتا تھا۔

"آفاق کے لیے کسی گورنس کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ بچے کے کام کاج گورنس کر لیا کرے گی اور نگرانی امی اور چچی کی رہے گی۔ اس طرح بچہ بھی بے پروائی کا شکار نہیں ہوگا۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے تجویز پیش کی۔

"نہیں، ثاقب! میں آپی کی نشانی کو کسی غیر کے ہاتھوں میں نہیں دے سکتی۔ گورنس بے شک آفاق کی دیکھ بھال کر سکتی ہے لیکن اسے وہ محبت تو نہیں دے سکتی جو اسے مجھ سے ملے گی۔ کہتے ہیں خالہ بھی ماں جیسی ہی ہوتی ہے۔ یہ ننھی جان اپنی ماں کی محبت سے محروم ہوگیا ہے لیکن خالہ تو موجود ہے ناں اسے کم از کم میری محبت اور توجہ تو ملنی چاہیے۔" بچے کے ماتھے کو چومتے ہوئے اس نے جذباتی انداز میں جواب دیا۔

"میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہا تھا۔ اس طرح تو تمہاری ساری فیوچر پلاننگ ہی خراب ہو جائے گی۔" اس نے سمجھایا۔

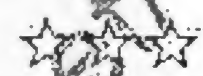
"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آفاق کے لیے میں خوشی سے یہ قربانی دے سکتی ہوں۔ ویسے بھی زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین سال کی بات ہے۔ جب یہ اسکول جانے لگے گا تو میں پھر سے اپنی ایجوکیشن اسٹارٹ کردوں گی۔" وہ جیسے سب سوچ چکی تھی۔ ثاقب کے پاس مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔

"اوکے ایز یو وش لیکن پلیز دوسروں کے ساتھ اپنا بھی خیال رکھا کرو۔ ان چند دنوں میں ہی تمہاری صحت پر بہت اثر پڑا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔" اس کے لہجے میں اس کے جذبوں کی آنچ تھی۔ اپنے لیے اس کے جذبات سے واقف ثنا نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلا دیا کہ جذبوں کے اس سفر میں وہ خود بھی اس کی ہم قدم تھی۔

"یہ سو گیا ہے اسے گود سے اتار کر بستر پر لٹا دو اور ذرا چائے بنا دو۔ میں چچا کے کمرے میں جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر ان سے گپ شپ کروں گا۔" نرم لہجے میں اس سے کہہ کر وہ شیخ افضل کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ثنا اس کی پشت کو محبت سے دیکھتی رہی

......موجودہ حالات میں ایک وہی تو تھا جو ان سب کی ڈھارس بندھاتا تھا اور گھر کے ہر فرد کو خصوصی توجہ دے رہا تھا۔ وہ جو اتنے بڑے صدمے کے بعد حوصلے کا مظاہرہ کر رہی تھی تو اس کے پیچھے بھی تو ثاقب کی دی ہوئی ہمت ہی تھی۔ اس نے ہی اسے یہ بات ذہن نشین کروائی تھی اور ہر روز کرواتا رہتا تھا کہ ان حالات میں ان دونوں کو ہی سب سے زیادہ ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ وہ ڈٹ گئی تھی۔

''تم نہ ہوتے تو یہ صدمہ سہنا بہت مشکل ہوتا ثاقب......'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی اور آفاق کو گود سے اتار کر اس کے کاٹ میں لٹا دیا۔ ثاقب کی فرمائش پر اسے اس کے لیے چائے بنانے جانا تھا۔



وقت کی خاصیت ہے کہ یہ ایک جگہ ٹھہرتا نہیں...... اچھا ہو یا برا ہر حال میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک ہی غم سے جڑے ان دونوں خاندانوں کے لیے بھی وقت نے آگے کا سفر جاری رکھا۔ اس سفر نے حنا کی جوان موت کا غم مٹایا تو بے شک نہیں لیکن ذہنی طور پر بالآخر سب نے اس حادثے کو قبول کر لیا اور زندگی کے ہنگاموں میں رفتہ رفتہ شامل ہوتے چلے گئے۔ آفاق کے ننھے وجود نے اس عمل میں سب سے زیادہ معاونت کی۔ وہ اب سات ماہ کا ہو چلا تھا اور گھٹنوں پر رینگنے لگا تھا۔ رینگنے والے بچوں کی اکثریت کی طرح اس کا بھی نچلا بیٹھنا مشکل تھا۔ سارا دن مصروفِ عمل رہنا اور گھر کے اس کونے میں موجود چیزوں تک پہنچ جاتا جہاں کسی کا گمان نہیں جاتا تھا۔ بلا کا ہنس مکھ اور شریر تھا۔ ثنا کے ساتھ ساتھ پورے گھر کو اس نے اپنے ساتھ مصروف کر لیا تھا۔ چلبلی فطرت کی وجہ سے اسے ہمہ وقت نظروں میں رکھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ گھر والوں کو اچھی خاصی مصروفیت مل گئی تھی۔ کبھی جوڑوں کے درد میں مبتلا اس کی دادی آسیہ خاتون کو اپنا درد ورد سب بھول کر اس کے پیچھے بھاگنا پڑتا تو کبھی جوان بیٹی کے غم سے نڈھال صبیحہ بیگم اس کی شرارتوں پر کھلکھلا کر ہنس دیتیں۔ عاقب جو حنا کے جانے کے بعد بے حد سنجیدہ اور کم گو ہو گیا تھا بیٹے کے ساتھ ہوتا تو اس سے اس کی زبان میں گفتگو کرتا اور مسکراتا نظر آتا۔ ثنا کی تو خیر اس میں جان ہی تھی۔ اس نے خالہ ہونے کا حق ادا کر ڈالا تھا۔ آفاق کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی وہ ذرا بیمار ہو جاتا تو رات بھر جاگ کر اس کا خیال کرتی۔ گھر کی بھی بہت سی ذمے داریاں اس نے سنبھال رکھی تھیں۔ اس وقت بھی وہ کچن میں کھڑی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ آفاق کو اس کے دادا اپنے ساتھ قریبی پارک تک لے گئے تھے اس لیے اس کی طرف سے بے فکری تھی۔ بڑے مگن سے انداز میں چکن چلی فرائی کے لیے تیاری میں مصروف تھی وہ کچھ لینے کے لیے پلٹی تو کسی سے ٹکرا گئی۔ اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔

''ریلیکس یار...... یہ میں ہوں۔'' ثاقب نے اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔

''بہت بدتمیز ہو، مجھے ڈرا دیا۔'' وہ خفا ہوئی۔

''غلطی مجھ سے زیادہ تمہاری ہے۔ اتنی مگن ہو کر کام کر رہی تھیں کہ میرے اتنے پاس آ کر کھڑے ہونے کو بھی محسوس نہیں کر سکیں۔'' ثاقب زور سے ہنسا اور اس کے خفا سے چہرے کو ذرا غور سے دیکھا۔ سادہ گھریلو حلیے میں بھی خفا سی وہ بہت پیاری لگی۔

''کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے۔''

وہ بے ساختہ ہی گنگنا اٹھا جس پر ثنا کے رخسار پر سرخی پھیل گئی۔ اپنے لیے ثاقب کے جذبے اس کے لیے انجان نہیں تھے کہ وہ اکثر ہی اس سے اظہار کرتا رہتا تھا البتہ پچھلے چھ سات ماہ میں گھر کی فضا اتنی سوگوار رہی تھی کہ ثاقب کی بھی ساری شوخی ہوا ہو گئی۔ آج بہت دنوں بعد وہ اس سے اس انداز میں مخاطب ہوا تھا۔

''اُف یہ گالوں کی سرخی...... دیکھو کہیں مجھ سے کوئی بھول نہ ہو جائے۔'' وہ ذرا سا اس کی طرف جھکا۔ شانے پہلے ہی تھام رکھے تھے۔ ثنا بری طرح نروس ہو گئی اور دونوں ہاتھوں سے اسے ہلکا سا دھکا دیا۔

"اف ظالم حسینہ......" وہ ذرا سا لڑکھڑایا اور مصنوعی خفگی سے دہائی دی۔ ثنا نے اپنے دھک دھک کرتے ہوئے دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا رخ موڑ لیا۔

"دکھالو نخرے...... آخر کار تو تمہیں میرا ہی بننا ہے۔" وہ ہنسا۔ آج بہت دنوں بعد اتنے موڈ میں تھا۔

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی تو تم خود کو قابو میں رکھو۔" ثنا روٹھتے ہوئے لہجے میں بولی لیکن یہ روٹھنا بھی اس مصنوعی سا تھا۔ ثاقب کی شوخ جسارت پر اب بھی اس کا دل بری طرح دھڑکے جا رہا تھا۔

"ذرا میری طرف دیکھ کر تو بات کرو۔" اس کی حالت سے واقف وہ چھیڑنے والے انداز میں بولا۔

"میں بزی ہوں۔ آپ فرمائیں کہ کس کام سے تشریف لائے تھے۔" اس نے ثاقب کی طرف پلٹنے کی غلطی نہیں کی کہ وہ جانتی تھی اس کا چہرہ سارے بھید کھول دے گا۔ اسی وقت لاؤنج کی طرف سے افضل صاحب کے کھنکھارنے کی آواز آئی اور ثاقب کو شرافت کی جون میں آنا پڑا۔

"میرا پروموشن ہو گیا ہے۔" اس نے خوش خبری سنائی۔

"واؤ زبردست...... پھر تو تمہاری طرف سے زبردست کی ٹریٹ ہونی چاہیے۔" وہ خوشی سے جگمگاتا چہرہ لیے اس کی طرف پلٹی۔

"میں بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہا ہوں بلکہ میرا پلان ہے کہ ہم سب مل کر کہیں پکنک کے لیے چلیں۔ میری طرف سے ٹریٹ بھی ہو جائے گی اور سب کو تھوڑا چینج بھی ملے گا۔" اس نے اپنا پروگرام بتایا تو ثنا نے اس کی تائید کی۔ واقعی گھر والوں کو جمود سے نکالنے کے لیے ایسی سرگرمی کی اشد ضرورت تھی اور یہ تو معاملہ بھی ثاقب کی خوشی کا تھا۔ جس کے سامنے فی الحال وہ ہر تلخ یاد کو فراموش کر دینا چاہتی تھی۔ ذرا سی دیر میں سارا ماحول بدل گیا اور گھر میں ہنگامہ سا جاگ اٹھا۔ دونوں گھروں کے لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے۔ سب کو ایک ساتھ خوش خبری سنانے کے بعد ثاقب نے اپنا پروگرام بھی سامنے رکھا۔ عاقب ابھی کچھ دیر قبل ہی آفس سے واپس آیا تھا۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ثنا کو خدشہ ہوا کہ کہیں وہ انکار نہ کر دے چنانچہ آفاق کو گود میں لیے جھٹ اس کے قریب پہنچ گئی۔ اور بچے کو اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

"دیکھیں عاقب بھائی، آفاق بھی کہہ رہا ہے کہ ڈیڈی مجھے بھی سی سائڈ جانا ہے، میں پورے سات ماہ کا ہو گیا ہوں اور کراچی میں رہ کر بھی اب تک سی سائڈ نہیں گیا۔" آفاق میاں خالہ کی تائید و تردید تو کیا کرتے باپ کو سامنے پا کر کھلکھلانے لگے اور اپنے ننھے ننھے ہاتھ یوں عاقب کے چہرے پر مارے جیسے کوئی مطالبہ کیا جا رہا ہو۔ اس کی اس معصومانہ ادا پر عاقب نے بے اختیار اسے گود میں لے کر اس کا رخسار چوم لیا اور محبت سے بولا۔

"اپنے بیٹے کا مطالبہ ہم کیسے رد کر سکتے ہیں۔ ضرور لے کر چلیں گے سمندر دکھانے...... اپنے چاچو کے پروموشن کی خوشی مناتے یہ ساحل پر نہ پہنچا تو پھر کون جائے گا۔" یوں ایک مشکل مرحلہ بہت آسانی سے طے ہو گیا اور سب مل کر طے کرنے لگے کہ پکنک کے لیے کون سا دن اور ساحل مناسب رہے گا۔ مسرور سی ثنا نے اس منظر پر ایک مسکراتی نگاہ ڈالی اور کچن کی طرف بڑھ گئی کہ سب کے لیے جلد از جلد کھانا لگا سکے۔ ہاتھ بٹانے کے لیے شمائلہ بھی اس کے ساتھ ہو لی۔ آج بہت دنوں بعد اس گھر کے مکینوں کے چہرے پر ایک ساتھ مسکراہٹ اتری تھی اور یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔

☆☆☆

"کیا ہے یار، کیا بوریت پھیلائی ہوئی ہے؟ سب کے سب یہاں ہٹ میں ہی جم کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پانی میں جا کر لہروں سے لطف نہ اٹھائیں تو سمندر پر آنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟" ثاقب کا انداز خاصا پُر احتجاج تھا وہ خود تو شاید سر تک ڈبکیاں لگا کر آ رہا تھا اس لیے خوب بھیگا ہوا تھا لیکن اسے باقی لوگوں کی ہٹ میں موجودگی پر شدید اعتراض تھا اس لیے ان کے پاس آ کر شور مچا رہا

تھا۔ اس کے علاوہ صرف ثنائلہ اور اس کی خالہ زاد بہن افشین جسے وہ کمپنی کے لیے ساتھ لے آئی تھی باہر موجود تھیں لیکن ایک دوسرے کی گہری سہیلیاں ہونے کی وجہ سے وہ آپس میں ہی مگن تھیں اور ثاقب ان کے ساتھ لطف اندوز نہیں ہوسکتا تھا۔

''مجھے تو تم معاف رکھو بیٹا...... جوڑوں کے درد نے اس قابل ہی کہاں چھوڑا ہے کہ پانی میں جا کر برداشت کرسکوں۔ میں تو یہاں کھڑکی سے ہی سمندر کو دیکھ کر خوش ہولوں گی۔'' آسیہ خاتون نے سب سے پہلے اس کی بات کا جواب دیا۔

''میں بھی ادھر بھابی بیگم کے ساتھ ہی ہوں۔ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے میں اچھا وقت گزر رہا ہے۔'' صبیحہ بیگم نے بھی فوری طور پر انکار کیا۔

''ہم دونوں بڈھے تھوڑی دیر میں باہر آجائیں گے بیٹا...... ذرا یہ بازی ختم ہوجائے۔'' شیخ فضل نے سامنے بچھی شطرنج کی بساط پر سے نظریں ہٹائے بغیر اسے ٹمٹایا۔

''اور تمہارا کیا مسئلہ ہے، تم بھی بتادو۔'' ثاقب نے بھنا کر ثنا سے پوچھا۔

''دیکھ نہیں رہے میں آفاق کو سیریلیک کھلا رہی ہوں۔'' وہ اس کے غصیلے انداز سے متاثر ہوئے بغیر بے نیازی سے بولی۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں بیٹا...... آفاق کو میں دیکھ لوں گی، تم باہر جاؤ...... اور انجوائے کرو۔ تمہیں تو سمندر اتنا اچھا لگتا ہے۔ اب آئی ہو تو دل بھر کے لطف اٹھاؤ۔'' صبیحہ بیگم نے اسے ٹوکا۔

''پہلے آفاق کو سیریلیک کھلادوں پھر جاتی ہوں۔'' ثنا کی توجہ اب بھی بچے پر ہی تھی۔

''تم سے کہا ہے ناں کہ ہم دیکھ لیں گے بچے کو...... ہم دادی، نانی کس لیے ہیں؟ ہم بھی تھوڑی بہت دیکھ بھال کرسکتے ہیں۔'' اس بار آسیہ خاتون نے ذرا بلند آواز سے اسے ڈپٹا۔ ان کی آواز پر ٹیرس پر کھڑا عاقب اندر آگیا۔

''آفاق کو میں سنبھال لوں گا۔ تم جاؤ جا کر انجوائے کرو۔'' سنجیدگی سے حتمی لہجے میں کہی اس کی بات کو رد کرنا ثنا کے بس میں نہیں تھا چنانچہ ناچار اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دیوانی ہوئی رہتی ہے بچے کے پیچھے...... ایسے تو سگی مائیں بھی خیال نہیں کرتیں جتنا یہ خالہ ہوکر کرتی ہے۔'' آسیہ خاتون نے اسے بے دلی سے باہر جاتے دیکھ کر تبصرہ کیا تو عاقب نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی نظروں سے بے خبر ثاقب کے ساتھ باہر نکل گئی۔

''اب اپنا موڈ تو ٹھیک کرلو۔ ان بگڑے زاویوں کے ساتھ میرے ساتھ چلو گی تو سمندر میں دھکا دے کر جاؤں گا۔'' ساتھ چلتے ثاقب نے اسے دھمکایا۔

''حد ہوتی ہے بے صبری کی۔ پانچ منٹ انتظار کرلیتے تو کوئی نقصان تو نہیں ہوجاتا۔ بس مجھے ذرا اطمینان رہتا کہ آفاق نے پیٹ بھر کر کھالیا ہے۔'' اس کا دماغ آفاق میں ہی اٹکا ہوا تھا۔

''تم اکیلی سگی رشتے دار نہیں ہو آفاق کی...... ...وں سے بھی اس کا خون کا رشتہ ہے۔'' ثاقب نے اسے چھیڑا۔

''میں نے کب انکار کیا ہے اس بات سے۔ میں تو اس اپنے دل کی تسلی کی بات کر رہی تھی۔'' وہ ذرا سا جھینپی۔

''اتنی دیوانگی اچھی نہیں ہوتی ثنا...... ٹھیک ہے تم آفاق کا خیال رکھو لیکن اتنی انتہا پسند مت بنو۔ تمہاری وجہ سے میں تو اس بیچارے چھوٹے سے بچے سے جیلس ہونے لگا ہوں۔ تمہارے پاس اس کے سوا کسی کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میری پروا... بھی نہیں رہی ہے۔'' وہ شکوے کرنے لگا۔

''آپ غلط انداز سے سوچ رہے ہیں ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

''ایسی ہی بات ہے ورنہ تمہیں خیال ہوتا کہ ہم یہاں میری خوشی کو سیلیبریٹ کرنے آئے ہیں اور تم مجھ

ہی کو نظر انداز کر رہی ہو۔" ثاقب کی خفگی برقرار تھی۔ ثنا کے دل کو دھکا سا لگا۔

"ایسی باتیں مت کریں ثاقب..... آپ جانتے ہیں کہ آپ میرے لیے کتنے اہم ہیں اور پھر میں آپ کی خوشی میں کتنی خوش ہوں..... آپ کہیں تو میں کان پکڑ کر آپ سے سوری کر لیتی ہوں۔" معصومانہ ادا سے کہتے ہوئے اس نے فوراً اپنے کان پکڑ لیے۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں سمندر میں کافی آگے تک چلے گئے تھے۔ یک دم ہی ایک زوردار لہر آئی اور ثنا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اسے ڈگمگاتے دیکھ کر ثاقب نے پھرتی سے اسے تھام لیا۔ ثنا اتنی بری طرح ڈگمگا گئی تھی کہ اسے سنبھلنے کے لیے ثاقب کو مضبوطی سے دونوں بازوؤں کا گھیرا بنانا پڑا تھا۔ لہر آ کر پلٹنے کے اس مختصر سے عرصے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سن سکتے تھے۔ اس کی اتنی قربت پا کر ثاقب مدہوش سا ہونے لگا۔ ثنا کی حالت بھی کچھ عجیب تھی لیکن بہرحال اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"چلیں، کنارے پر چلتے ہیں۔" ثنا آہستہ سے بولی۔ اس کے کہنے پر ثاقب کو کچھ ہوش آیا اور واپسی کے لیے پلٹا البتہ ثنا کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ ثاقب کا ہاتھ تھامنا ثنا کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ بچپن سے ہی ایک دوسرے کے قریب رہے تھے اور دونوں گھرانوں کے درمیان حد سے زیادہ بے تکلفی تھی۔ اس لیے کزنز کا ایک دوسرے کے برابر میں بیٹھ جانا، ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لینا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن آج پہلی بار ثنا کے دل کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس سے قبل وہ کبھی ثاقب کے اتنے زیادہ قریب نہیں آئی تھی اور شاید اس لیے کہ بھی کہ آج جس انداز سے، ثاقب نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا وہ ہمیشہ سے کچھ مختلف تھا۔ اس کی قربت کے مختصر سے لمحے میں وہ جن کیفیات سے گزرا تھا ابھی تک اس کے ٹرانس سے نکل نہیں سکا تھا اور اس کے جذبات کی ساری شدت، حدت بن کر اس کے ہاتھ میں سما گئی تھی۔

"مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ تم سے مزید دور رہنا اب مشکل لگنے لگا ہے۔" وہ ساحل کی ریت پر ایک دوسرے کے قریب آ کر بیٹھے تو ثاقب نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، اس کی بات سن کر ثنا کے رخساروں پر سرخی پھیل گئی لیکن ساتھ ہی آفاق کا خیال بھی آیا۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا اور وہ اسے بھرپور توجہ دینا چاہتی تھی۔ شادی ہو جانے کے بعد ظاہر ہے ثاقب اس سے زیادہ توجہ کا طلب گار ہوتا اور اس کی ذات دو حصوں میں بٹ کر رہ جاتی۔

"پڑھائی تو تم نے چھوڑ دی ہے تو اچھا ہے شادی کر کے پوری طرح گھر کو سنبھال لو۔ جلدی، جلدی دو چار بچے بھی دنیا میں لے آنا تو گھر میں خوب رونق ہو جائے گی اور سب لوگوں کا دل بہلا رہے گا۔" اس کی سوچوں سے بے خبر وہ شوخ لہجے میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ بے تحاشا شرم محسوس کرتی ثنا کی ہمت ہی نہیں ہو سکی کہ وہ اپنے کسی خیال کا اظہار کر سکتی۔ ثاقب اسے عزیز تھا اور آج کے اہم موقع پر وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے بلا حیل و حجت سب سنتی چلی گئی۔

☆☆☆

بریانی، دم پر لگانے کے بعد اس نے کچن پر ایک نظر دوڑائی۔ ہر شے اپنے درست ٹھکانے پر موجود تھی اور سارا کچن جگ مگ کر رہا تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا تاکہ نہا کر صاف ستھرے کپڑے پہن لے۔ آج چھٹی کا دن تھا اور اس کے والد شیخ افضل کی خواہش پر سب لوگ دوپہر کے کھانے کے لیے ان کے پورشن میں جمع تھے۔ پہلے بھی اکثر ایسا ہوا کرتا تھا کہ چھٹی کے دن یا سب ان کی طرف لنچ کرتے یا پھر تایا کی طرف اس طرح ہفتے میں ایک بار سب کو اکھٹے بیٹھنے اور ہنسنے بولنے کا موقع مل جاتا تھا۔ حنا کی وفات کے بعد اس معمول میں خلل پڑ گیا تھا اور کسی کو یہ روایت نبھانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا... لیکن کل رات بہت

عرصے بعد شیخ افضل نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سب لوگ اکٹھے ایک جگہ کھانا کھائیں۔ ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے، ثنا جی جان سے سرگرم ہوگئی۔ چکن کڑاہی، شامی کباب، بریانی، ٹرائفل اور رائتے وسلاد پر مشتمل کھانا اس نے بڑی محنت اور لگن سے تیار کیا۔ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے آج عاقب بھی گھر پر تھا اور آفاق اسی کے پاس تھا اس لیے اس نے قدرے بے فکری سے اپنے سارے کام نمٹا لیے تھے بس درمیان میں ایک دو بار جا کر آفاق کے کھانے کے لیے پہلے دلیہ اور بعد میں پڈنگ عاقب کو دے آئی تھی۔ اس نے آفاق کے کھانے پینے کا شیڈول بنا رکھا تھا اور اس پر سختی سے عمل کرتی تھی یہی وجہ تھی کہ آفاق کی صحت بہت اچھی تھی اور وہ اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں کچھ بڑا لگتا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے پہلے سے استری شدہ کپڑے الماری سے نکالے اور غسل خانے میں گھس گئی۔ کافی دیر کچن میں محنت کی تھی اس لیے خاصی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ گرمی کے احساس کو کم کرنے کے لیے، اس نے ٹھنڈے پانی سے قدرے طویل غسل لیا تھا چنانچہ کپڑے بدل کر باہر نکلی تو خود کو خاصا تر و تازہ محسوس کر رہی تھی۔ زیر لب کچھ گنگناتے ہوئے گیلے بالوں کو تولیے سے خشک کرتے ہوئے اس کے کانوں میں آفاق کے رونے کی آواز پڑی تو بے چین ہوگئی۔ جلدی سے تولیا ایک طرف ڈالا اور جلدی، جلدی بالوں میں برش کرنے لگی۔ آفاق کے رونے کی آواز مسلسل آرہی تھی اور یہ بھی واضح تھا کہ سب لوگ اسے بہلانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ کسی سے بھی خاموش نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے بالوں میں کیچر لگایا اور دوپٹا شانوں پر ڈال کر باہر نکلی۔ اس کا رخ لاؤنج کی طرف تھا جہاں سے مسلسل آفاق کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ اندر داخل ہو کر اس نے دیکھا کہ آفاق، عاقب کی گود میں ہے اس سمیت سب ہی اسے مختلف طریقوں سے بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

''لائیں اسے مجھے دے دیں۔'' وہ تیزی سے عاقب کے قریب پہنچی اور دونوں ہاتھ آگے پھیلائے۔ آفاق... جو اس کی آواز سن کر متوجہ ہو چکا تھا لپک کر اس کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سما گیا۔ وہ فوراً اسے اپنے سینے سے چمٹا کر ہولے، ہولے اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔ بچہ جو بہت دیر سے رو رہا تھا آہستہ، آہستہ پرسکون ہوتا چلا گیا۔

''لگتا ہے صاحب زادے خالہ صاحبہ کے لیے ہی رو رہے تھے۔'' تایا شیخ اکرام نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

''اصل میں آج صبح سے میں اسے گود میں لے ہی نہیں سکی، اس لیے تھوڑا ڈسٹرب ہوگیا ہے اور اب تو یہ ویسے بھی اس کے سونے کا ٹائم ہے اس لیے بھی اسے میری یاد زیادہ آرہی ہوگی۔'' اس نے دھیمی آواز میں بتایا اور آفاق کو گود سے لگائے لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

''بس پانچ منٹ میں اسے سلا کر آتی ہوں پھر کھانا لگا دوں گی۔''

''تم آرام سے ان حضرت کو سلاؤ کھانا میں لگا دیتی ہوں۔'' شمائلہ نے اسے اطمینان دلایا اور خود بھی اس کے پیچھے ہی لاؤنج سے نکل کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ثنا، آفاق کو اپنے کمرے میں سلا کر واپس آئی تو کھانا لگ چکا تھا۔

''ہاں بچ گئی تمہاری بریانی..... اگر تھوڑی دیر اور گزر جاتی تو اس کا ستیاناس ہو جاتا۔'' اسے دیکھ کر شمائلہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''اوہو..... میں تو بریانی کو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ دم پر رکھی تھی کہ نہانے کے بعد چولھا بند کر دوں گی لیکن آفاق کے رونے کی آواز سن کر خیال ہی نہیں رہا۔'' اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

''تم تو بالکل دیوانی ہو آفاق کے پیچھے۔'' شمائلہ نے ہنس کر تبصرہ کیا۔

''کیوں نہ ہو دیوانی..... آخر پہلے دن سے یہی تو اسے سنبھال رہی ہے۔'' آسیہ خاتون نے محبت بھرے لہجے میں اس کی حمایت کی..... اس دوران کھانے کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہلکی پھلکی گفتگو کے درمیان سب خوش ذائقہ کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ گاہے گاہے

تعریفوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ثنا کا دھیان کھانے سے زیادہ دوسروں کو کھلانے پر تھا۔ کچن سے ڈشوں میں گرما گرم کھانا لا لا کر میز پر رکھنے کی ذمے داری بھی اس نے سنبھال رکھی تھی۔ درمیان میں ایک دو بار اپنے کمرے میں جھانک کر آفاق کو بھی دیکھ آئی تھی...... وہ دوپہر کے وقت ڈٹ کر دو ڈھائی گھنٹے کی نیند لیتا تھا اس کے باوجود وہ اس اندیشے کے تحت کہ کہیں درمیان میں آنکھ کھل جانے پر بچہ اکیلے کمرے میں گھبرا نہ جائے بار بار اسے چیک کر رہی تھی۔ کھانے کا سلسلہ ختم ہوا تو اس نے اور شمائلہ نے مل کر ٹیبل سمیٹی...... پھر شمائلہ نے سبز چائے تیار کی...... عاقب اور ثاقب کھانے کے فوراً بعد وہاں سے جا چکے تھے۔ ثاقب کو اپنے کسی دوست سے ملاقات کے لیے جانا تھا جبکہ عاقب کا تو سب کو ہی معلوم تھا کہ وہ اتنی دیر محفل میں بیٹھ گیا یہی بڑی بات تھی۔ حنا کی وفات کے بعد سے وہ بہت زیادہ تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ بڑوں کی محفل میں اپنی موجودگی غیر ضروری سمجھتے ہوئے ثنا شمائلہ کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔ دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ شمائلہ اسے میڈیکل کالج اور اسپتال میں پیش آنے والے دلچسپ قصے سناتی رہی لیکن گپ شپ کا یہ سلسلہ زیادہ طویل نہیں ہو سکا۔ شمائلہ کی پڑھائی ٹف تھی اور اس کا زیادہ تر دھیان اسی طرف ہی رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ کسی اسائنمنٹ کی تیاری کا ذکر کرتے ہوئے جلد وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد ثنا کچھ دیر تو بستر پر نیم دراز ہو کر ایک کتاب کی ورق گردانی کرتی رہی پھر یہ خیال آنے پر کہ تایا ابو کو چائے کی خواہش نہ ہو رہی ہو کمرے سے باہر آ گئی۔ اصل میں اس کے تایا شیخ اکرم چائے کے بہت زیادہ شوقین تھے اور ہر ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد انہیں چائے یاد آنے لگتی تھی۔ چائے بنانے کے لیے کچن کا رخ کرنے سے قبل اس نے مناسب سمجھا کہ دیگر بزرگوں سے بھی اس بارے میں دریافت کر لے...... آفاق کی طرف سے اسے اطمینان تھا کہ فی الحال وہ کم سے کم آدھا گھنٹا تو ضرور ہی مزید سوئے گا۔ بزرگوں نے اپنی محفل لاؤنج سے ہٹ کر امی ابو کے بیڈ روم میں جما لی تھی۔ وہ مگن سے انداز میں بیڈ روم کے دروازے تک پہنچی اور ابھی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے آتی صبیحہ بیگم کی آواز پر بری طرح ٹھٹک گئی۔

''عاقب اور ثنا کی شادی...... بھلا یہ کیسے ہو سکے گا؟'' ان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بھی اتنی ہی حیران تھیں جتنی کہ وہ دروازے کے باہر کھڑی ہو رہی تھی۔

''یہ کوئی ناممکن بات تو نہیں صبیحہ...... میرا عاقب اتنی خصوصیات کا مالک ہے کہ ایک بچے کا باپ ہوتے ہوئے بھی کوئی آسانی سے اس رشتے کو رد نہیں کر سکتا۔ ثنا مجھے خود بھی عزیز ہے اور اگر عاقب میں کوئی کمی ہوتی تو میں خود ایسا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ سچ پوچھو تو میرے دل میں شروع سے یہ بات تھی کہ حنا کو عاقب اور ثنا کو ثاقب کی دلہن بناؤں گی لیکن بدلے ہوئے حالات نے مجھے ذرا مختلف انداز سے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حنا کے بعد ثنا ہی ہے جو عاقب اور آفاق کو سلیقے سے سنبھال سکتی ہے۔ عاقب کے لیے رشتے بے شک مجھے بہت مل جائیں گے لیکن ان میں سے کسی کے دل میں ثنا جیسے خلوص و محبت کی موجودگی کا امکان تو نہیں ہے ناں اس لیے میں ثنا کے لیے تمہارے آگے دامن پھیلا رہی ہوں۔'' آپا خاتون نے ہی یقیناً پہلے رشتے کی بات چھیڑی تھی اور اب وہی صبیحہ بیگم کی حیرت دور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''مجھے آپ کی کسی بات سے انکار نہیں بھابی لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ عاقب اپنی زندگی میں ثنا یا کسی دوسری لڑکی کی گنجائش بہت مشکل سے نکال پائے گا اور میں اپنی بچی کو کسی امتحان میں مبتلا کرنے سے ڈرتی ہوں۔'' صبیحہ بیگم نے کھل کر اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''میں مانتی ہوں کہ عاقب ابھی گہرے صدمے میں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مرد کی زندگی میں دوسری عورت کی گنجائش نکل ہی آتی ہے۔ ورنہ بزرگ کہتے نہیں ہیں کہ... بیوی کی موت تو کہنی کی چوٹ جیسی

ہوتی ہے۔ جب لگتی ہے تو شدید درد ہوتا ہے لیکن پھر جلد آدمی کو بھول جاتی ہے۔ عاقب بھی ثنا جیسا متبادل پا کر تبدیل ہو جائے گا لیکن تم یہ نہ سمجھو کہ میں اس خواہش کا اظہار اپنے بیٹے کی بھلائی کے لیے کر رہی ہوں۔ اس وقت میرے ذہن میں عاقب سے زیادہ آفاق کا خیال ہے۔ ثنا بالکل ماں کی طرح اس کا خیال رکھتی ہے اور دونوں کے درمیان اتنی گہری وابستگی ہے کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے جدا ہونا قبول نہیں کر سکتے اس لیے بہتر ہے کہ ہم ایک ایسا فیصلہ کر لیں جو سب کے حق میں بہتر ہو۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں بھابی لیکن پھر بھی میں سوچتی ہوں کہ کیا ہی بہتر ہو آپ اپنے سابقہ فیصلے کے مطابق ثنا کو ثاقب کی دلہن بنائیں۔ وہ چچی بن کر بھی تو آفاق کو بہتر پرورش کر سکتی ہے۔'' بیگم نے عین اپنی بیٹی کے دل کی بات کہی تھی۔ آسیہ خاتون کی گفتگو پر حق دق باہر کھڑی ثنا بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی تھی۔

''ہم نے اس بارے میں بھی غور کیا تھا بلکہ تمہارے بھائی صاحب کا بھی یہی خیال تھا لیکن میں ماں ہوں اور اپنی ہر اولاد کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ثاقب یوں تو بہت اچھا ہے لیکن کچھ معاملات میں وہ تھوڑا تنگ دل ہو جاتا ہے۔ اسے خود کو چھوڑ کر دوسروں کو توجہ دینا ناگوار گزرتا ہے شادی کے بعد یقیناً وہ اپنی بیوی کی بھرپور توجہ چاہے گا۔ اسے خود کو نظر انداز کر کے ثنا کا آفاق کو توجہ دینا پسند نہیں آئے گا اور بعد میں جب اس کے بچے ہو جائیں گے تو شاید وہ بالکل بھی یہ برداشت نہ کر سکے کہ اس کے بچوں کے وقت میں سے کسی اور کو بھی حصہ دیا جائے اس لیے میرے حساب سے تو یہ شادی کسی طور پر مناسب نہیں رہے گی۔'' آسیہ خاتون نے ایسی بات کہی تھی جس سے ثنا کو بھی اختلاف نہیں تھا۔ واقعی ثاقب اپنی ذات کے سلسلے میں خاصا پوزیسو تھا اور اب بھی کبھی کبھار اس سے اس بات پر الجھ پڑتا تھا کہ وہ آفاق میں اتنی گم رہتی ہے کہ اس کی طرف دھیان نہیں دیتی۔ شادی کے بعد تو

چراغ

خدا کرے کہ چمکتے رہیں اندھیرے میں
میرے چراغ، میرے دوستوں کے چہرے میں

مرسلہ: نزہت جبیں ضیا، کراچی

معرفت کی منزل

حضرت حسن بصریؒ نے ایک بار اپنے وعظ میں فرمایا۔

''لوگو! اللہ پاک کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہو، یہ دروازہ ضرور کھلتا ہے۔''

مجلس میں بیٹھی ایک ضعیفہ نے جب سنا تو فوراً اٹھ کر بولی۔

''اے حسن کیا اللہ کا دروازہ بند بھی ہوتا ہے؟''

حسن بصریؒ بڑھیا کی بات سن کر غش کر گئے۔

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

شاید یہ شکایت مزید بڑھ جاتی تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں اس موضوع پر سب سے پہلے عاقب اور ثنا سے بات کرنی چاہیے یہ ان دونوں کی زندگیوں کا معاملہ ہے اس لیے کوئی حتمی فیصلہ کرنے کا اختیار بھی انہیں ہی حاصل ہے۔ ان دونوں کی رائے لینے کے بعد ہی ہم اگلا کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے میرا آپ دونوں ماؤں کو مشورہ ہے کہ پہلے اپنی، اپنی اولاد سے بات کر لیں پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔'' خواتین کے درمیان جاری گفتگو میں اچانک ہی شیخ افضل نے کھنکھارتے ہوئے دخل دیا اور ایک معقول بات کہی تو وہ دونوں بھی ان کی تائید کرنے لگیں۔ ثنا بھی بے جان سی کیفیت میں اپنے کمرے کی طرف لوٹ گئی۔

آفاق ہنوز سو رہا تھا۔ اس کے پہلو میں ہی نیم دراز ہو کر وہ اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی کچھ دیر قبل سنی جانے والی گفتگو کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس گفتگو نے اس کا ذہن بری طرح الجھا دیا تھا اور وہ سمجھ

نہیں پارہی تھی کہ جب امی اس معاملے میں اس سے گفتگو کریں گی تو اس کا فیصلہ کیا ہوگا؟

☆☆☆

صبیحہ بیگم اس کا فیصلہ سن کر حیران رہ گئیں۔

''کیا تم واقعی عاقب کے رشتے کے لیے رضامند ہو؟'' انہوں نے کچھ بے یقینی کی سی کیفیت میں اس سے دریافت کیا۔ اصل میں انہوں نے کئی بار یہ بات محسوس کی تھی کہ بطور کزن ثاقب سے بے تکلفی کے علاوہ بھی ان دونوں کے درمیان کوئی خاص تعلق ہے۔ ثاقب انہیں ناپسند نہیں تھا اس لیے مستقبل میں ان کے درمیان کوئی نیا رشتہ بن جانے کا خیال انہیں برا نہیں لگا اور اسی اعتبار سے انہوں نے دونوں کے درمیان موجود بے حد تکلفی پر کبھی روک ٹوک بھی نہیں کی لیکن اب عاقب سے رشتے کے حوالے سے اس کا جواب ان کے لیے حیران کن تھا۔

''میں نے اس رشتے کے حوالے سے آپ لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی امی اور میں ان سب باتوں سے پوری طرح متفق ہوں جو تائی امی نے کہیں۔ آفاق کی بہتری کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یہی فیصلہ مناسب لگا ہے۔'' اس نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں انہیں جواب دیا تو ان پر واضح ہوگیا کہ وہ اس رشتے کے بارے میں سن کر حیران کیوں نہیں ہوئی اور فوری طور پر فیصلہ کیسے سنا دیا؟ درحقیقت وہ اس معاملے پر پہلے ہی اچھی طرح سوچ بچار کر چکی تھی۔

''تم ایک بار اچھی طرح غور کرلو بیٹا...... یہ تمہاری پوری زندگی کا معاملہ ہے اور میں نہیں چاہتی کہ تم اس بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے اپنے دل کی خوشی کے بجائے کسی اور بات کو اہمیت دو۔ میں تم سے کسی قسم کی قربانی نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہ اہم ترین فیصلہ کرتے ہوئے کسی اور سے زیادہ اپنے بارے میں سوچو...... آفاق کی پرورش کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے جس کے لیے تم اپنی زندگی اور خوشیوں کو داؤ پر لگاؤ۔'' وہ ماں تھیں اس لیے سب سے زیادہ اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لیے فکرمند تھیں۔

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے امی...... آپ تائی امی کو ہاں کردیں اس لیے کہ میرے لیے آفاق سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے اور پھر قربانی کی کیا بات ہے۔ عاقب بھائی میں کسی قسم کی کوئی کمی تو نہیں ہے۔ وہ ہر اعتبار سے بہترین ہیں جب ہی تو آپ نے انہیں اپنا داماد قبول کیا تھا اب دوبارہ بھی آپ ان کے لیے اس حیثیت سے منظوری دے سکتی ہیں۔'' اس نے اپنا حتمی فیصلہ سنایا تو وہ بے بس سی ہوگئیں اور یوں محسوس ہوا کہ انہوں نے اس کے اور ثاقب کے درمیان جس تعلق کو محسوس کیا تھا شاید وہ ان کا وہم تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا...... جیسی تمہاری مرضی...... میری تو بس اتنی خواہش ہے کہ تم خوش رہو۔'' وہ کچھ تھکے، تھکے سے انداز میں کہتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئیں۔ حنا کی وفات کے بعد سے یہ تھکن ان کے رگ و پے میں بس گئی تھی۔ ثنا نے آزردگی سے انہیں دیکھا وہ بھی تو اپنی جوانی میں دنیا چھوڑ دینے والی بہن سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کی اولاد کو ہر محرومی سے دور رکھنے کے لیے اتنا بڑا فیصلہ کر بیٹھی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے اس فیصلے سے حنا کی روح بھی خوش ہوگی چنانچہ اپنی خوشی کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

''پاری سی بلی بن کر دکھاؤ...... شام (سلام) کرو، تتا (تالی) بجاؤ۔'' وہ آفاق کو بیڈ پر اپنے سامنے بٹھائے اس کے ساتھ کھیل رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ایک، ایک ادا کو اپنے موبائل میں محفوظ کرتی جارہی تھی۔ اسی وقت اس کے کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھلا اور ثاقب نہایت خراب موڈ میں اندر داخل ہوا۔ اس کے اس موڈ کو دیکھتے ہوئے پل بھر کے لیے تو اس کا دل لرز کر رہ گیا لیکن پھر خود کو سنبھال لیا اور اس کے رویے پر ردِعمل ظاہر کرنے کے بجائے آفاق کی طرف مڑ کر اسے مخاطب کیا۔

"چاچو آئے ہیں، چاچو کو شام کرو۔" ننھے بچے نے کسی سدھائے ہوئے بندر کی طرح فوراً ماتھے پر دایاں ہاتھ رکھ کر سلام کا اشارہ دیا۔ اس کی یہ ادا بہت پیاری تھی لیکن غصے میں بھرے ثاقب کو کہاں کچھ نظر آتا اس نے بچے پر ایک نگاہِ غلط بھی نہیں ڈالی اور اس کے قریب پہنچ کر اس کے بازو کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنی طرف رخ کیا۔

"مجھے بتاؤ کہ امی جو کچھ کہہ رہی ہیں کیا وہ سچ ہے؟" اس کے لہجے میں بے یقینی اور غصہ دونوں تھے۔

"میرے خیال میں تائی امی کو جھوٹ بولنے کی عادت بالکل نہیں ہے، اب تم بتاؤ کہ تم کس بارے میں پوچھ رہے ہو؟" اس نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پُرسکون لہجے میں دریافت کیا۔ اس کے اس انداز پر ثاقب کو مزید پتنگے لگ گئے۔

"بھولی مت بنو...... میں تمہارے اور عاقب بھائی کے رشتے کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔" وہ جھنجلایا۔

"یہ بزرگوں کا فیصلہ ہے جس سے میں نے اختلاف مناسب نہیں سمجھا۔" اس نے اپنا بازو ثاقب کی گرفت سے، آزاد کروانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی توجہ خود پر سے ہٹنے کے باعث آفاق کا موڈ خراب ہونے لگا ہے اور اب وہ رونے کی تیاری پکڑ رہا ہے۔

"اس فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہیں وہ سارے خواب کیوں یاد نہیں آئے جو ہم نے اپنے مستقبل کے حوالے سے دیکھے تھے۔ یہ صرف تمہاری زندگی کا معاملہ تو نہیں تھا جو تم نے اتنی آسانی سے فیصلہ سنا دیا۔" ثاقب نے اس کا بازو اپنی گرفت سے آزاد نہیں کیا اور کڑی باز پرس کرنے لگا۔

"اب وقت بدل گیا ہے ثاقب...... ہمیں اپنی ذات کی خوشیوں سے زیادہ وقت کے تقاضوں پر دھیان دینا ہوگا۔" وہ جانتی تھی کہ ثاقب اس سے باز پرس ضرور کرے گا چنانچہ اب اسے دھیمے انداز میں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسری طرف آفاق کا منہ بسورنا اب باقاعدہ رونے میں تبدیل ہو گیا تھا اور اس کا رونا اسے بے چین کر رہا تھا...... وہ فوری طور پر اسے گود میں لے کر بہلانا چاہتی تھی لیکن ثاقب نے اسے بے بس کیا ہوا تھا۔

"دیکھو آفاق رو رہا ہے۔ مجھے اسے گود میں لینے دو۔" اس نے ایک بار پھر اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

"بچے روتے ہی رہتے ہیں۔ یہ بھی تھوڑی دیر رو لے گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا فی الحال تم مجھ سے بات کرو۔" ثاقب نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔

"فرق پڑے گا، تمہیں نہ سہی مجھے بہت فرق پڑے گا۔ آفاق میرے دل کا ٹکڑا ہے اور میں کسی صورت اس کا رونا برداشت نہیں کر سکتی۔" اس بار اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ اور تختی تھی۔ ثاقب کی اس کے بازو پر گرفت کمزور پڑنے لگی۔

"یعنی تم آفاق کو مجھ پر ترجیح دے رہی ہو؟" اس نے کچھ بے یقینی کے سے انداز میں ثنا سے دریافت کیا۔

"دل کے معاملے میں انسان مجبور ہوتا ہے ثاقب...... مجھے لگتا ہے کہ میرے لیے آفاق تم سے زیادہ اہم ہے اور میں اس کی خاطر کوئی بھی قربانی دے سکتی ہوں۔" ثنا نے اس کا ہاتھ نرمی سے اپنے بازو سے ہٹایا اور روتے ہوئے آفاق کو گود میں لے کر آرام سے بولی۔ اس بار ثاقب نے اس سے کچھ نہیں کہا اور ایک شکایت آمیز نظر اس کے چہرے پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"آئی ایم ویری سوری ثاقب......" ثنا زیرلب بڑبڑائی اور روتے ہوئے آفاق کو بہلانے میں مصروف ہو گئی لیکن اس کا امتحان محض یہاں تک ہی محدود نہیں تھا۔ اگلا دن اس کے لیے مزید آزمائشیں لے کر آیا۔ عاقب کے پیغام پر آفاق کو تیار کر کے تایا ابو کے پورشن میں بھیجتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں تھا کہ دوبارہ اس کی شکل دیکھنے کے لیے ترس جائے گی۔ آفاق کے اُدھر لے جائے جانے کے بعد اس نے تیزی سے اپنے کام نمٹائے اور پھر اس کے لیے سوجی کا

حلوا تیار کر کے انتظار کرنے لگی کہ کچھ دیر میں عاقب اسے چھوڑ جائے گا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آفس کے لیے تاخیر سے نکلنے کی صورت میں عاقب، آفاق کو اپنے پاس بلوا لیتا تھا اور پھر اسے یہاں چھوڑ کر خود آفس چلا جاتا تھا لیکن گھڑی کی سوئیوں نے گیارہ کا ہندسہ بھی کراس کر لیا تو اسے بے چینی ہونے لگی۔ وہ آفاق کے کھانے پینے میں وقت کا خاص خیال رکھتی تھی اور اب اس کے طے شدہ معمول سے کچھ وقت اوپر ہو چکا تھا۔ عاقب سے اپنے رشتے کا سلسلہ شروع ہو جانے کے باعث اسے تایا کے پورشن میں جاتے ہوئے بھی کچھ عجیب لگ رہا تھا اس لیے کچھ دیر انتظار کر لینا ہی مناسب سمجھا۔ پندرہ بیس منٹ مزید گزر گئے تو اس کی برداشت جواب دینے لگی اور آخر کار اس نے انٹر کام پر رابطے کا فیصلہ کیا۔ دوسری طرف سے عاقب نے ریسیور اٹھایا۔

''عاقب بھائی آفاق کو میرے پاس بلوا دیجیے ناں..... اس کے کھانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' آواز سن کر وہ دھیمے سے بولی۔

''آفاق کو امی نے ساگو دانہ کھلا دیا ہے، تمہیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عاقب نے اکھڑے لہجے میں اس کو جواب دیا تو پل بھر کے لیے وہ چپ سی ہو گئی۔ بات کرنے کا یہ انداز اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے، اگر وہ آپ کو تنگ کرے تو یہاں بھجوا دیجیے گا۔'' بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر اس نے عاقب سے یہ جملہ کہا لیکن وہ تو جانے کون سے انگارے چبائے بیٹھا تھا۔ آگ اگلنے والے انداز میں بولا۔

''میں نے تم سے کہا ہے ناں کہ آفاق کے لیے تمہیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ماں بے شک مر گئی ہے لیکن اس کا باپ ابھی زندہ ہے اور اتنی ہمت رکھتا ہے کہ کسی کے سہارے کے بغیر اپنے بیٹے کو پال سکے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اس کی خاطر خود کو ہلکان کرنے کے بجائے اپنی فکر کرو۔'' اسے کھری، کھری سنا کر عاقب نے انٹر کام کا ریسیور پٹخ دیا۔ اتنی تلخ گفتگو کو سن کر وہ پہلے تو گم صم سی ہو گئی پھر آہستہ، آہستہ یہ بات سمجھ آنے لگی کہ سارا فساد رشتے کے حوالے سے ہے۔ یقیناً تایا، تائی نے اس حوالے سے عاقب سے بھی بات کی تھی اور وہ جو حنا کا عاشق تھا اس بات کو سن کر بھڑک گیا تھا۔ دل میں خفت اور سبکی محسوس کرتی ہوئی وہ وہیں لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد ان کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ معمول کے مطابق تلاوت قرآن پاک کر رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے ان کے قریب جا بیٹھی۔ انہوں نے تلاوت مکمل کرنے کے بعد قرآن کو اس کی جگہ پر واپس رکھا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''کیا بات ہے اتنی چپ کیوں ہو، آفاق کہاں ہے؟'' انہوں نے اس سے اکھٹے دو سوال کر ڈالے۔

''عاقب بھائی نے شاید آج آفس سے چھٹی کی ہے۔ آفاق ان ہی کے پاس ہے۔'' اس نے ان کے دوسرے سوال کا جواب دیا لیکن اسی جواب میں پہلے سوال کا جواب بھی پوشیدہ تھا۔

''آفاق کے وجود نے عاقب کو سنبھلنے میں بہت مدد دی ہے ورنہ حنا کی موت پر اس کی جو حالت تھی اسے دیکھ کر مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ اپنا ذہنی توازن ہی نہ کھو بیٹھے۔'' اس کی الجھن سے بے خبر صبیحہ بیگم نے تبصرہ کیا اور پھر اپنے آنسو چھپانے کے لیے جلدی، جلدی پلکیں جھپکنے لگیں۔ مرحومہ بیٹی کا ذکر ہمیشہ ہی انہیں ملول کر دیتا تھا۔

''کھانا کیا بناؤں امی؟'' اس نے یہ معمول کا سوال کر کے انہیں سنبھلنے میں مدد دی۔

''تمہارے ابو تو دوپہر کے کھانے پر ہوں گے نہیں اس لیے ابھی کچھ ہلکا پھلکا بنا لو پھر رات کے لیے پالک پنیر اور چکن کی کوئی ڈش بنا لینا۔'' انہوں نے اسے جواب دیا تو وہ ان کے کمرے سے باہر آ گئی۔ کچن میں پہنچ کر بھی اس کے ہاتھ بے دلی سے چلتے

رہے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ کھچڑی تیار کرنے کے ساتھ، ساتھ اس نے رات کے کھانے کا بھی اہتمام شروع کر دیا تھا۔ صبیحہ بیگم کی بتائی گئی دونوں نمکین ڈشز کے ساتھ، ساتھ اس نے یونہی ٹرائفل بھی تیار کر ڈالا پھر بھی وقت تھا کہ لگتا تھا گزر ہی نہیں رہا ہو۔ آفاق کی غیر موجودگی نے اس کے اندر عجیب خالی پن کا احساس پیدا کر دیا تھا اور دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ایک بار پھر انٹر کام کا سہارا لیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تائی امی نے ریسیور اٹھایا۔ ان کی ہیلو کے ساتھ ہی اسے آفاق کے رونے کی بھی آواز سنائی دی۔

''آفاق کیوں رو رہا ہے تائی امی؟'' اس نے خود ہی تڑپ کر سوال کیا۔

''بس بیٹا ضد میں آیا ہوا ہے۔'' انہوں نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''میں ابھی اسے لینے آتی ہوں۔'' آفاق کے رونے کی آواز سن کر وہ عاقب کے رویئے کو فراموش کر گئی۔

''رہنے دو بیٹا..... اس وقت آفاق کا باپ اس سے بھی زیادہ ضد میں آیا ہوا ہے۔ اسے یہ خوش فہمی ہوگئی ہے کہ وہ اپنے بچے کو اکیلا پال سکتا ہے۔'' وہ تھوڑی جھنجلائی ہوئی بھی لگ رہی تھیں۔ ان کا جواب سن کر ثنا کو بھی چپ لگ گئی۔ عاقب کا یہ رویہ اس سے رشتے کا سلسلہ شروع ہونے کا ردعمل تھا۔ وہ واقعی حنا سے بے تحاشا محبت کرتا تھا اور اپنی زندگی میں اس کے سوا کسی کو جگہ دینے کے لیے راضی نہیں تھا۔ وہ خود بھی کب حنا کی جگہ لینا چاہتی تھی لیکن حنا کے بیٹے کی محبت میں اس رشتے کے لیے راضی ہوگئی تھی۔ اب بھی اسے عاقب کے رویئے سے زیادہ آفاق کی فکر تھی۔ وہ اس کا عادی تھا اور ڈیڑھ، دو گھنٹے سے زیادہ اس کے بغیر نہیں رہ پاتا تھا۔ خود اس کا اپنا بھی یہی حال تھا۔ رات تک کا وقت اس نے بڑی بے کلی میں گزارا۔

''آفاق کہاں ہے بیٹا، آج نظر نہیں آیا۔'' رات کے کھانے پر شیخ افضل نے اس سے دریافت کیا۔

''عاقب نے آج آفس کی چھٹی کی تھی اس لیے آفاق کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔'' اس سے قبل صبیحہ بیگم نے ان کے سوال کا جواب دے کر انہیں مطمئن کر دیا۔ ثنا نے والدین کا ساتھ دینے کے لیے بے دلی سے بس ذرا سا کھانا کھایا اور کچن سمیٹ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آفاق کی غیر موجودگی میں اسے اپنا کمرا بے حد سونا لگ رہا تھا۔ خود کو بہلانے کے لیے اس نے کتابوں کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن بے سود تھا اپنی بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ عین اسی وقت صبیحہ بیگم اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ انہیں دیکھ کر اس نے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کی لیکن وہ دیکھ چکی تھیں۔

''آفاق کے لیے رو رہی ہو؟'' انہوں نے سنجیدگی سے دریافت کیا تو اس کے آنسو مزید روانی سے بہنے لگے۔

''میری بھابی سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے عاقب کے رویئے کے بارے میں بتایا ہے اور اس کے رویئے کو دیکھتے ہوئے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی ہوں۔'' ان کا انداز سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان کی یہ بے پناہ سنجیدگی دیکھ کر وہ اپنا رونا بھول گئی اور غور سے ان کی بات سننے لگی۔

''عاقب کی حنا سے محبت کو دیکھتے ہوئے میں پہلے ہی تمہارا رشتہ اس کے ساتھ کرنے سے ہچکچا رہی تھی اور اب اس کے موجودہ رویئے نے تو مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ آفاق کی محبت اپنی جگہ لیکن اس کی خاطر میں تمہیں داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آفاق، عاقب کی اولاد ہے اور اس کی پرورش کے لیے وہ کوئی نہ کوئی بندوبست کر ہی لے گا، مجھے بھلا تمہارا مستقبل خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' انہوں نے گویا اپنی طرف سے حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔

''فی الحال میں نے تمہارے ابو کو موجودہ حالات کے بارے میں نہیں بتایا ہے لیکن جانتی ہوں کہ وہ بھی

بھی فیصلہ کریں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کے علم میں یہ بات آنے سے قبل تم اپنے آپ کو سنبھال لو۔" وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

"میں آفاق کی فکر سے خود کو آزاد نہیں کر سکتی امی..... یہ بات میں بھی سمجھتی ہوں اور آپ لوگ بھی کہ عاقب بھائی فی الحال غم تازہ ہونے کی وجہ سے شادی پر راضی نہیں ہیں لیکن کبھی نہ کبھی وہ شادی ضرور کریں گے۔ اس وقت آفاق کا کیا ہوگا کچھ سوچا ہے آپ نے..... سوتیلی مائیں تو بچوں سے ان کا باپ بھی چھین لیتی ہیں۔" اس نے انہیں حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے ان سب باتوں سے زیادہ تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔ تمہارے لیے میرے پاس ایک دو اچھے رشتے آئے ہوئے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ تم ان رشتوں پر غور کرو۔" صبیحہ بیگم نے رکھائی سے جواب دیا۔ ان کی اس بات سے اسے دھچکا سا لگا۔

اس نے تو آفاق کی خاطر اپنے بچپن کے ساتھی ثاقب کو انکار کر دیا تھا پھر بھلا کسی اور رشتے پر کیسے غور کر سکتی تھی۔

"آپ جانتی ہیں امی کہ میرا مسئلہ شادی نہیں، آفاق ہے۔ میں کسی صورت اس کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ آپ اس وقت تک میری شادی کا ارادہ ملتوی کر دیں جب تک آفاق سمجھدار نہیں ہو جاتا۔" اس نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا جسے سن کر صبیحہ بیگم نے اپنا سر تھام لیا۔ عمر نکل جانے کے بعد بھلا وہ اس کے لیے ڈھنگ کا رشتہ کہاں سے تلاش کرتیں لیکن وہ تو یہ سب سمجھنے کے لیے راضی ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

ثنا کی وہ رات بہت بے چینی میں گزری..... فجر تک وہ بستر پر کروٹیں ہی بدلتی رہی۔ فجر کی نماز پڑھ کر اس نے دعا مانگی تو تھوڑا بہت دل کو قرار آیا اور شاید جب ہی کچھ دیر کے لیے آنکھ بھی لگ گئی۔ مشکل سے ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی سوئی ہوگی کہ شمائلہ کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اسے آواز دے رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ گھبرا کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

"آفاق کو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ رات بھر تنگ کرتا رہا ہے۔ اب عاقب بھائی اسے اسپتال لے جا رہے ہیں۔" اس نے اطلاع دی تو ثنا کے ہوش اڑ گئے۔ دوپٹا شانے پر ڈال کر وہ پیروں میں چپل اڑستی ہوئی تایا کے پورشن کی طرف بھاگی۔ باہر ہی اسے عاقب اور تائی امی مل گئے۔ عاقب کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا جبکہ تائی امی روتے ہوئے آفاق کو گود میں اٹھائے نڈھال سی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے جھپٹ کر آفاق کو اپنی گود میں لیا۔ روتا ہوا بچہ اس کی بانہوں میں آتے ہی بری طرح اس سے چمٹ گیا۔ وہ نرمی سے اس کی پشت سہلانے لگی۔ اس کے ہاتھ آفاق کے جسم کی تپش کو بخوبی محسوس کر رہے تھے۔

"کب سے بخار ہو رہا ہے اسے؟" اس نے تائی امی سے دریافت کیا۔

"رات سے ہی چڑھا ہوا ہے۔ شمائلہ نے اپنی طرف سے دوا دی تھی لیکن فرق نہیں پڑا۔ اب عاقب اور میں اسپتال لے جا رہے ہیں۔" انہوں نے آہستہ سے جواب دیا اور آفاق کی طرف دیکھا جس کے رونے میں بتدریج کمی آتی جا رہی تھی اور دھیمی، دھیمی سسکیاں لیتے ہوئے وہ یوں ثنا کے شانے سے منہ رگڑ رہا تھا جیسے اس کی اب تک کی عدم موجودگی پر شکوہ کر رہا ہو۔

"امی جلدی کریں، دیر ہو رہی ہے۔" ان دونوں کو گفتگو میں مصروف دیکھ کر عاقب نے جھنجلائی ہوئی آواز میں آسیہ خاتون کو پکارا۔

"میں چلی جاتی ہوں آفاق کے ساتھ اسپتال۔" ثنا نے کہا اور کسی کے جواب کا انتظار کیے بغیر تائی امی کے لیے کھولے گئے فرنٹ ڈور سے گزر کر کار میں بیٹھ گئی۔ عاقب نے لمحے بھر کے لیے اسے گھورا پھر لب بھینچے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے ثنا کی نظر ثاقب پر پڑی۔ وہ اسے بڑی طنزیہ اور

جارحانہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے اس انداز کو نظر انداز کر کے وہ آفاق کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسپتال تک کا راستہ خاموشی سے گزرا۔ وہاں پہنچنے کے بعد بچے کو ٹریٹمنٹ دیا جانے لگا۔ بخار بہت تیز تھا۔ ڈاکٹر نے فیصلہ سنایا کہ فی الحال چھ گھنٹے تک وہ بچے کو انڈر آبزرویشن رکھیں گے اس کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ آیا اسے ایڈمٹ کرنے کی ضرورت ہے یا ریلیز کر دیا جائے۔ پہلے دو گھنٹوں میں ہی آفاق کی حالت کافی سنبھل گئی اور وہ پُرسکون ہو کر سو گیا۔ اسے پُرسکون دیکھ کر ثنا کے دل کو بھی قرار آیا اور آفاق کے بستر کے نزدیک رکھی ایک کرسی پر ٹک گئی۔ نظریں البتہ اب بھی آفاق پر ہی تھیں۔ عاقب جو ڈاکٹر سے بات کرنے اس کے کمرے تک گیا تھا اسے اس انداز میں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ مسلے ہوئے کپڑے، الجھے الجھے سے بال، بنا دھلا چہرہ اور رونے سے سرخ پڑی آنکھوں والی لڑکی دنیا بھر کا پیار آنکھوں میں سموئے اس کے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ بچے کی ماں نہیں ہے خالہ ہے۔ یہ تو بس ماں کا ہی روپ تھا۔ اسے اس ماں سے اپنا آپ ہارتا ہوا محسوس ہوا۔ بیٹے نے یوں بھی رات بھر میں ہلکان کر ڈالا تھا۔ مسلسل چھنا، چھنا پکارتا رہا تھا۔ اس کی زبان سے ثنا کا لفظ صحیح ادا نہ ہو پاتا تھا سو وہ اسے چھنا کہا کرتا تھا۔ کوشش کے باوجود اس نے خالہ یا آنی کہنا نہیں سیکھا تھا۔

”میری ڈاکٹر سے بات ہو گئی ہے، چند گھنٹے بعد آفاق کو چھٹی دے دی جائے گی۔“ اس نے بغیر مخاطب کیے ثنا کو یہ اطلاع دی تو وہ اپنی محویت سے نکل کر چونکی۔

”اسے آپ کی ضد نے بیمار کروایا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ میری دوری کی وجہ سے ہڑک کر بیمار ہوا ہے۔ آئندہ اگر آپ نے ایسی حماقت کی تو میں آپ کو قطعی معاف نہیں کروں گی۔“ اس نے خفگی کا اظہار کیا۔

”بہت چاہتی ہو تم آفاق کو؟“ عاقب نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”دنیا میں سب سے زیادہ.....“ اس نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

”آفاق کی خاطر کوئی بھی قربانی دے سکتی ہو؟“ وہ جانے کیا جاننا چاہتا تھا۔

”بالکل دے سکتی ہوں۔“ عاقب کے سوالوں کا مطلب سمجھے بغیر وہ پوری سچائی سے جواب دے رہی تھی۔

”تو پھر ٹھیک ہے، میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں لیکن صرف اس شرط پر کہ یہ شادی دنیا دکھاوے کے لیے محض ایک کاغذی شادی ہوگی۔ میں نہ تو تمہیں بیوی کے حقوق دوں گا اور نہ ہی تم کبھی ماں بن سکو گی۔ آفاق ہی ہماری واحد اولاد ہوگا تاکہ اسے ہماری بھرپور توجہ ملتی رہے اور تم اپنے بچوں میں گھر کر اسے نظر انداز نہ کر سکو۔“ عاقب نے اپنی شرط اس کے سامنے رکھی۔

”مجھے منظور ہے، آپ بے فکر رہیں کہ میں آپ سے بیویوں والے کسی حق کا مطالبہ کروں گی کیونکہ میں نے بھی یہ رشتہ صرف آفاق کی خاطر قبول کیا ہے ورنہ آپ کبھی میری چوائس نہیں ہو سکتے تھے۔“ اس موقع پر اس نے بھی مناسب سمجھا کہ عاقب پر واضح کر دے کہ اس شادی کی واحد وجہ آفاق ہے ورنہ وہ خود بھی اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ شاید عاقب کی شرط نے اس کی نسوانی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ جس کی تسلی کے لیے جوابی حملہ ضروری تھا۔

☆☆☆

گھر میں شادی کا ہنگامہ یکدم جاگ اٹھا تھا۔ اگر یہ صرف اس کی اور عاقب کی شادی کا معاملہ ہوتا تو شاید کسی ہنگامے کی گنجائش نہ نکلتی کہ عاقب کی طرف سے ایسی کوئی اجازت ملنے کا امکان نہیں تھا لیکن تائی امی نے ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہوئے ثاقب کی شادی کا سلسلہ بھی چھیڑ دیا۔ ان کے طرز عمل سے لگتا تھا کہ ایسا انہوں نے جان بوجھ کر کیا ہے کیونکہ عاقب کے ہر اعتراض پر ان کا یہی جواب ہوتا تھا کہ ایک ساتھ دو بہوئیں گھر میں لا رہی ہوں دونوں میں کوئی فرق کیسے کر سکتی ہوں۔ ثاقب کی دلہن اریبہ اور ثنا کے لیے

انہوں نے بالکل ایک معیار کی بری تیار کی۔ رسموں کی ادائیگی میں بھی کوئی فرق نہیں کیا۔
عاقب کو بھی کسی نہ کسی طرح شرکت کے لیے مجبور کرتی رہیں۔ ادھر شیخ افضل نے بھی صبیحہ بیگم کو ہدایت کردی تھی کہ ثنا کی شادی کا اہتمام بالکل عام حالات کے مطابق ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہاں بھی جملہ لوازمات موجود تھے۔ ثنا کی کزنز اور سہیلیاں خوب رونق لگائے رکھتیں۔ جہیز کا بھی پورا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس شادی میں اگر کوئی کمی تھی تو بس بیاہ دلہا دلہن کے چہروں پر وہ رونق اور چمک نہیں تھی جو کہ عموماً ہوتی ہے۔ صاف نظر آتا تھا کہ دونوں طرف سے سمجھوتا کیا جارہا ہے۔ ثاقب البتہ ساری تقریبات میں خوب چہکتا رہا تھا۔ اس کے انداز سے کہیں نہیں تھا کہ کبھی وہ ثنا کے یک دم راہ بدل لینے پر ہرٹ بھی ہوا تھا۔ کئی لوگوں نے مذاق بھی اڑایا کہ اتنا زیادہ خوش دولہا پہلی بار دیکھا ہے لیکن اس کی شوخیوں پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ ثاقب کے اس طرزِ عمل پر ثنا نے نہ جانے کیوں دل میں چبھن سی محسوس کی۔ اس کے لیے ذہنی طور پر یہ قبول کرنا مشکل ہورہا تھا کہ ثاقب اتنی جلدی اسے کھودینے کا صدمہ بھول کر کسی اور کی طرف متوجہ ہوجائے گا جبکہ خود اس کا تو یہ حال تھا کہ شادی کے نام پر ایک بے رنگ اور بے کیف زندگی قبول کرنے جارہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آنے والے وقت کے دامن میں اس کے لیے کوئی خوشی کوئی مسرت موجود نہیں ہے۔ شادی کی رات اس امر کی تصدیق بھی ہوگئی۔ تایا ابو کے پورشن میں اس کے لیے وہ کمرا مخصوص نہیں کیا گیا تھا جس میں عاقب اور حنا رہتے تھے۔ اس کمرے کو جوں کا توں چھوڑ کر برابر کے دوسرے کمرے میں اس کا بیڈ روم سیٹ کردیا گیا تھا۔ دونوں کمروں کے درمیان دروازہ موجود تھا۔ رات تنہائی ملتے ہی عاقب اس دروازے سے گزر کر اپنے سابقہ بیڈ روم میں چلے گئے تو اس نے جانا کہ اس کے لیے خاص یہی کمرا کیوں منتخب کیا گیا تھا۔
رات گھر میں اترنے والی دونوں دلہنوں کی صبح ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھی۔ تائی امی کے حکم پر بھاری کام دار جوڑا اور زیورات تو اس نے بھی زیب تن کیے تھے لیکن دلہناپے کا وہ روپ کہاں سے لاتی جو شریک سفر کی محبت اور توجہ کا حاصل ہوتا ہے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ خواتین کی نگاہوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی خود کو آفاق میں مگن کر چکی تھی لیکن اتنی خبر تو تھی کہ ایک ہی رات میں اریبہ کا حسن کیسے دوچند ہوگیا ہے۔ جھکی جھکی خمار آلود نگاہیں، لبوں پر چھایا دھیما سا تبسم، سہج سہج اٹھتے قدم سب اس کی گزری رات کا فسانہ کہہ رہے تھے۔ ناشتے کی میز پر وہ اور ثاقب ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ثاقب اپنے ہاتھ سے ناشتے کے لوازمات اسے پیش کررہا تھا۔ ساتھ ہی چپکے چپکے سرگوشیوں کا سلسلہ بھی جاری تھا جنہیں سن کر اریبہ کے رخسار شفق رنگ ہورہے تھے۔ بظاہر آفاق میں مصروف ثنا کو عجیب سا احساسِ زیاں ہوا۔ اگر وہ آفاق کی خاطر ثاقب کو رد نہ کرتی تو یہ ساری ناز برداریاں اس کے حصے میں آتیں لیکن اس نے تو خود اپنی مرضی سے اپنے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرلیا تھا جس نے رات بھر برابر والے کمرے میں اس سے بے خبر مرحوم بیوی کی یادوں کے چراغ جلائے تھے اور اب بھی اس کی طرف سے بے نیاز ناشتا نگلتا کر سب سے پہلے ٹیبل سے اٹھ چکا تھا۔ صورت حال کے لیے پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود اس کا دل اپنی اس ناقدری پر کڑھنے لگا۔ شاید عاقب کی بے رخی سے زیادہ ثاقب کی کسی اور پر توجہ کا ردِعمل تھا۔
”ثنا تم تو کچھ لو بیٹا..... مستقل آفاق کے ساتھ ہی لگی ہوئی ہو۔“ وہ جو بڑی بے دھیانی سے آفاق کو دلیہ کھلا رہی تھی آسیہ خاتون کی آواز پر چونکی۔
”دل نہیں چاہ رہا تائی امی..... سر میں درد سا ہورہا ہے۔“ اس نے انہیں جواب دیا تو احساس ہوا کہ واقعی سر میں شدید درد ہے۔
”اچھا تو پھر تم ایسا کرو اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ میں وہیں پر ٹیبلیٹ اور چائے وغیرہ بھجواتی

ہوں۔" جہاں تو یدہ آسیہ خاتون کو اندازہ تھا کہ عاقب نے اس لڑکی کی وہ پزیرائی نہیں کی ہوگی جس کی وہ حق دار تھی اس لیے اسے دنیا داری کے جھمیلے سے آزاد کر کے کمرے کی تنہائی میں پناہ لینے کی سہولت مہیا کر دی۔

ان کی اجازت ملتے ہی وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک قدم ہی آگے بڑھی ہوگی کہ احساس ہوا کہ بھاری دوپٹا کسی نے پکڑ رکھا ہے مڑ کر دیکھا تو آفاق کی مٹھی میں اپنا آنچل دبا نظر آیا۔ اس کی گرفت سے آنچل آزاد کروا کر اس نے دوبارہ قدم آگے بڑھانے چاہے تو وہ احتجاجاً منہ بسورنے لگا اور اپنے مخصوص انداز میں چھنا پکارا۔ اس پکار پر اس کے قدم رک گئے۔

"تم جاؤ آرام کرو بیٹا۔ اس شریر کو میں دیکھ لوں گی۔" آسیہ خاتون نے ایک بار پھر اس پر عنایت کی۔

اس بار وہ رکے بغیر تیزی سے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔ یہاں اسے عجیب وحشت سی ہو رہی تھی۔ یہ وحشت ہی تھی کہ آفاق کے رونے کی آواز پر بھی اس کے قدم نہ رک سکے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس کی نظر سب سے پہلے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں پڑی۔ پیازی رنگ کے بھاری سوٹ، زیورات اور میک اپ سے سجا اس کا وجود چمک رہا تھا لیکن اسے خود سے سخت بیزاری محسوس ہوئی۔ کیا فائدہ تھا اس روپ کا جسے کوئی سراہنے والا ہی نہیں تھا۔ اس نے نوچنے کے سے انداز میں سارے زیورات اتار کر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ڈالے۔ بھاری زرتار دوپٹا کھینچ کر بستر پر پھینکا اور پھر الماری سے ایک ہلکا پھلکا کاٹن کا سوٹ نکال کر غسل خانے میں گھس گئی۔ باہر نکلی تو ثنائلہ چائے کے ساتھ ہلکی پھلکی کھانے کی اشیا اور سر درد کی گولیوں کے ساتھ اس کی منتظر تھی۔ اس نے چائے کے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"پہلے تھوڑا سا کچھ کھالو پھر چائے پینا۔" ثنائلہ نے اسے ٹوکا۔

"نہیں، مجھ سے بالکل بھی کچھ نہیں کھایا جائے گا۔ بس چائے کافی ہے۔" اس نے کپ اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔ ثنائلہ کے پاس مزید اصرار کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

"تم یہ میڈیسن لے کر آرام کرلو۔ میں ذرا امی کی مدد کر رہی ہوں۔ گھر میں اچھے خاصے مہمان ہیں اور آفاق الگ تنگ کر رہا ہے۔" ثنائلہ بولتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ ثنا پر ایسی عجیب کیفیت طاری تھی کہ آفاق کے رونے کی اطلاع سن کر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ثنائلہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے بہ مشکل آدھی پیالی چائے پی اور ایک ساتھ دو گولیاں کھا کر بستر پر لیٹ گئی۔ اعصاب بری طرح کشیدہ ہو رہے تھے۔ بار بار ثاقب کی اریبہ پر اٹھتی والہانہ نظریں یاد آرہی تھیں اور دل میں کچوکے سے لگ رہے تھے۔ شاید اسے گمان تھا کہ شادی کر لینے کے باوجود ثاقب اسے گنوانے کے دکھ سے نہیں نکل سکے گا لیکن وہ تو ایک رات میں ہی یوں بدل گیا تھا جیسے ہمیشہ سے اریبہ کو ہی چاہتا رہا ہو۔ ادھر عاقب نے اپنے کہے پر حرف بہ حرف عمل کیا تھا۔ اسے رخصت کروا کر لانے کے بعد وہ بھول ہی گیا تھا کہ دنیا دکھاوے کے لیے ہی سہی وہ بھی اس کی توجہ کی حق دار ہے۔ دونوں بھائیوں کے ہاتھوں ہونے والی اس ناقدری پر اس کے اندر کی عورت بلبلا اٹھی تھی۔ اس تکلیف اور دکھن میں اسے یہ بھی یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے خود اپنے لیے اس سب کا انتخاب کیا ہے۔ آفاق سے دنیا میں سب سے زیادہ محبت کا دعویٰ بھی ذہن سے محو تھا اور تکیہ مسلسل اپنی ذات کے لیے آنسوؤں سے بھیگتا جارہا تھا۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اور شاید کچھ دوا نے بھی اثر دکھایا تھا کہ روتے، روتے ہی آنکھ لگ گئی۔ کتنی دیر تک سوتی رہی کچھ اندازہ نہیں ہوا ہڑبڑا کر اس وقت جاگی جب کسی نے زور سے اس کا شانہ ہلایا۔ عاقب اس کے سامنے کھڑے اسے غصے سے گھور رہے تھے۔ ایک پل کے لیے تو اسے صورت حال سمجھ ہی نہیں آرہی تھی۔

"بہت خوب..... تو آپ آفاق کی خاطر اس گھر میں آئی ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ گھنٹوں سے

رو رہا ہے اور محترمہ دنیا جہان سے بے خبر یہاں مزے کی نیند سو رہی ہیں۔'' اس کے حواس مکمل طور پر بحال ہونے سے قبل عاقب نے طنز کا تیر چلایا۔ وہ بوکھلا کر بستر سے نیچے اتری۔

''میرے سر میں شدید درد تھا اس لیے ثنا ئلہ نے دوا کھلا کر سلا دیا تھا۔'' باہر نکلنے سے قبل وضاحت بھی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''یہی تو فرق ہوتا ہے سگی اور سوتیلی ماں میں۔ سگی ماں ہوتی تو کبھی اپنے بچے کو دوسروں کے حوالے کر کے یوں معمولی سے سر درد پر بستر نہ سنبھال لیتی۔'' انہوں نے نہایت بے دردی سے اسے سوتیلی کا خطاب دے ڈالا تو اسے شدید احساس زیاں ہوا۔ کیا حاصل تھا اس ساری قربانی کا۔ وہ ''سگی خالہ'' سے ''سوتیلی ماں'' کے درجے پر فائز کر دی گئی تھی۔ اندر ہی اندر بری طرح کڑھتی وہ کمرے سے باہر نکلی۔ آوازوں نے اس کی رہنمائی کی کہ آفاق لاؤنج میں ہے۔ وہ واقعی وہیں تھا۔ کارپٹ پر اس کے کھلونوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور ثنا ئلہ قریب بیٹھی اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ثاقب بھی وہیں ایک صوفے پر آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔

''آپ اسے کہیں باہر ہی لے جائیں... ثاقب بھائی، شاید باہر جا کر بہل جائے۔ مجھ سے تو کسی طرح قابو میں نہیں آ رہا۔'' دروازے پر اس کی موجودگی سے بے خبر ثنا ئلہ نے بے بسی سے ثاقب کو پکارا۔

''نہ بابا..... میں ایسے کسی موڈ میں نہیں ہوں۔ تم اس کے والد اور والدہ کو زحمت دو۔'' ثاقب نے عجیب چبھتے ہوئے سے لہجے میں جواب دیا۔

''ثنا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ میڈیسن لے کر سو رہی ہے۔ اور عاقب بھائی بھی اتنی دیر سے اسے بہلا، بہلا کر تھک گئے ہیں۔ امی کے ساتھ خواتین محفل جما کر بیٹھی ہوئی ہیں اور اکیلی میری جان پھنس گئی ہے۔'' ثنا ئلہ سخت بیزار ہو رہی تھی۔ وہ شروع ہی سے بس اپنی پڑھائی میں مگن رہنے والی لڑکی تھی جو اس قسم کی ذمے داریوں سے گھبراتی تھی۔ اب بھی اس کے لیے آفاق کو سنبھالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا تھا۔

''تم جاؤ ثنا ئلہ، میں دیکھ لوں گی آفاق کو۔'' آخر کار اس نے وہاں اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

''اوہ تھینک گاڈ تم اٹھ گئیں ثنا..... اس آفت کو تو تم ہی قابو کر سکتی ہو۔ میرے تو سارے کل پرزے ہل کر رہ گئے ہیں۔'' اسے سامنے پا کر ثنا ئلہ کھل اٹھی۔

''تم ذرا اسے دیکھو، میں کچن کی خبر لیتی ہوں۔ دیکھوں کنیز صاحبہ نے دوپہر کے کھانے میں کیا تیر مارا ہے۔'' ثنا ئلہ نے اس عورت کا ذکر کیا جسے حنا کی وفات کے بعد کچن کے کاموں کے لیے رکھا گیا تھا کیونکہ تائی جی کی بیماری اور ثنا ئلہ کی تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے کچن کا کاروبار جاری رہنا مشکل ہو گیا تھا۔

''کیا پک رہا ہے کھانے میں؟'' اس نے دریافت کیا۔ صبح ناشتا نہیں کیا تھا اور رات بھی دو چار لقمے ہی لیے تھے اس لیے اب کچھ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

''آلو گوشت اور دال چاول بنوائے ہیں۔ رات تو ویسے میں خاصا ہیوی کھانا ہوگا ہی اس لیے اس وقت سادہ کھانا بنوایا ہے۔ اگر کہو تو تمہارے لیے کچھ کھانے کو بھجوا دوں۔ لنچ تک سہارا ہو جائے گا۔'' ثنا ئلہ نے اسے جواب دینے کے ساتھ دریافت بھی کیا۔

''نہیں بس اب سب کے ساتھ کھانا ہی کھاؤں گی۔ تم آفاق کے لیے کچھ بھجوا دو۔ اس کے کھانے کا ٹائم ہے۔'' اسے قریب پا کر آفاق جس طرح پرسکون ہوا تھا اور والہانہ پن سے اس سے چمٹا تھا۔ اس چیز نے اس کے کھنچے ہوئے اعصاب کو خاصا ریلیکس کیا تھا اور وہ خود کو اس قابل پا رہی تھی کہ اپنی ذات کے علاوہ بھی کچھ محسوس کر سکے۔ شاید دوا اور نیند نے اچھے اثرات مرتب کیے تھے۔

''ٹھیک ہے میں اس کے لیے کھچڑی بھجواتی ہوں۔ امی نے اپنے ہاتھ سے تیار کی تھی لیکن نواب صاحب تمہارے سوا کسی کے ہاتھ سے کھانے کے لیے راضی ہی نہیں ہوئے۔'' ثنا ئلہ بولتی ہوئی باہر نکل گئی تو

وہ پوری طرح آفاق کی طرف متوجہ ہوگئی اور اس سے اس کی ہی زبان میں باتیں کرنے لگی۔ یک دم ہی اسے ثاقب کی آواز نے چونکا دیا۔

”کدھر مصروف ہو یار، میرا کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ کب سے انتظار کررہا ہوں کہ محترمہ میری طرف بھی دھیان دیں گی۔“ وہی مخصوص شکوہ تھا جو وہ اکثر اس سے کیا کرتا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اپنا سر گھما کر اس کی سمت دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور موبائل پر بات کررہا تھا۔

”دو گھنٹے کوئی کم نہیں ہوتے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ دو صدیاں گزر گئی ہوں، پتا نہیں کس نے یہ فضول رسم ایجاد کی ہے کہ بیچارہ دولھا پیچھے تنہا رہ جائے دلہن کو شادی کے دوسرے دن میکے ضرور لے کر جانا ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے میں کوئی شام وام تک انتظار کرنے والا نہیں ہوں۔ بس ابھی لنچ کے بعد تمہیں لینے آرہا ہوں۔“ اس کی وہاں موجودگی سے بے نیاز وہ لہجے میں تمام تر بے قراریاں سموئے یقیناً اریبہ سے گفتگو میں مصروف تھا۔

”ہنس لو، ہنس لو میری بے تابی پر...... جب میرے ہاتھ آؤ گی تو پھر مزہ چکھاؤں گا۔“ دوسری طرف یقیناً اس کی بے قراری پر اریبہ ناز سے ہنسی ہوگی جو وہ اسے یہ پیار بھری دھمکی دے رہا تھا۔

ثنا کا ٹھہر جانے والا دل پھر بے چین ہونے لگا۔ اس کے میکے والوں نے تو ایسی کوئی رسم نہیں نبھائی تھی حالانکہ حنا اس دفعہ پڑوس میں ہونے کے باوجود اسے باقاعدہ اہتمام سے میکے لے جایا گیا تھا اور عاقب کی جان بوجھ کر وہاں انٹری پر پابندی لگادی گئی تھی۔ تب عاقب کیسے تڑپ، تڑپ کر کبھی فون اور کبھی انٹرکام کے ذریعے حنا سے بار، بار رابطہ کرتے رہے تھے اور خود اس کے ساتھ کیا ہورہا تھا۔ کیا ایک وہ ماجو سے بیٹی بیاہنے کے بعد امی نے ایسی کسی رسم کو غیر ضروری سمجھ لیا تھا؟ اس کے اندر شکوہ مچلا اور بازو پر عاقب کے ہاتھ کا سخت سرد لمس جاگ اٹھا۔ حنا کو پھولوں کی طرح رکھنے والے نے کس بے دردی سے اسے نیند سے جگایا تھا۔ ثاقب کی آواز سرگوشیوں میں ڈھل گئی تھی اور اس کے لیے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہوا جارہا تھا۔

”ثنا اٹھ گئیں بیٹا...... اب کیسی طبیعت ہے؟“ عین اسی لمحے تائی امی آفاق کے لیے کھچڑی لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔ شاید انہیں شمائلہ نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور ایک نظر ثاقب کو دیکھا جو موبائل کان سے لگائے دھیمی آواز میں بولتا کمرے سے جارہا تھا۔ ظاہر ہے تائی کے سامنے تو وہ اپنی عاشقانہ گفتگو جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ تائی امی کے ہاتھ سے کھچڑی کا پیالہ لے کر غائب دماغی کی کیفیت میں آفاق کو کھلانے لگی۔

”صبیحہ دو تین بار تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہیں۔ رسم کے مطابق تمہارے ماموں اور خالہ کی بیٹیوں کو تمہیں لینے یہاں آنا تھا لیکن میں نے روک دیا کہ خواہ مخواہ بچی کی نیند خراب ہوگی۔ آفاق کو کھچڑی کھلانے کے بعد تم تیار ہوجاؤ۔ میں صبیحہ کو اطلاع کرتی ہوں کہ وہ بچوں کو بھجوادیں۔ یہاں سے کھانا کھانے کے بعد تم لوگ چلی جانا۔“ تائی امی کی اطلاع پر اسے اپنی غلط فہمی پر افسوس ہوا۔ قنوطیت کے عالم میں اس نے اپنی سگی ماں کی محبت پر شک کیا تھا حالانکہ انہوں نے تو اس کی شادی میں کہیں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ یہاں تک کہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والی بیٹی کے غم کو بھی دل میں ہی چھپا کر رخصت ہونے والی بیٹی کی ناز برداریاں کرتی رہی تھیں۔

”چھوڑیں تائی امی، کیا فضول رسمیں نبھانا، یہ دیوار سے دیوار تو ملی ہوئی ہے۔ میں کسی بھی وقت جا کر امی سے مل لوں گی۔“ اس نے کچھ جھینپ کر انہیں جواب دیا۔

”نہیں بیٹا...... بے شک دیوار سے دیوار ملی ہے اور دن رات کا آنا جانا ہے لیکن کچھ مواقع خاص ہوتے ہیں اور ان کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ تمہاری ماں کو تمہاری صورت دیکھنے کی بے چینی ہوگی، تم رسم کے مطابق بہنوں کے ساتھ گھر ضرور جاؤ، دو چار گھنٹے بعد

ہم لوگ لینے آجائیں گے۔ ویسے بھی رات کی تقریب کی تیاری کے لیے تمہیں اور اریبہ کو شام ساڑھے چھ بجے تک بیوٹی پارلر پہنچنا ہے۔'' تائی امی نے اسے رسان سے سمجھایا تو اس نے سر جھکا دیا۔ آفاق کو کھچڑی کھلانے کے بعد اسے گود میں اٹھائے وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ راستے میں ثاقب کا کمرا بھی پڑتا تھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کھلے دروازے سے جس طرح خوشبو کی لپٹیں باہر آرہی تھیں اس سے ظاہر تھا کہ نئی دلہن کی استقبال کے لیے رات اس کمرے کو پھولوں اور خوشبوؤں سے آراستہ کیا گیا تھا جبکہ اس کے کمرے میں تو ایسا کوئی اہتمام تھا ہی نہیں۔ اسے رات سرگوشیوں میں کیے گئے مہمان خواتین کے اعتراضات یاد آئے جن کے جواب میں تائی امی نے نہایت بے بسی سے بتایا تھا کہ یہ تفریق ان کی جانب سے نہیں برتی گئی بلکہ ثاقب نے اپنے دوستوں کے ساتھ بڑھ بڑھ کر خود اپنا کمرا سجوایا ہے جبکہ عاقب ان کے اصرار کے باوجود بھی اس امر کے لیے راضی نہیں ہوئے تھے۔ کھلے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دزدیدہ نظروں سے اندر کا جائزہ لیا۔ ثاقب بستر پر نیم دراز اب بھی موبائل پر مصروف تھا۔ سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتی وہ آگے بڑھ گئی۔ اسے اپنے اندازے سے زیادہ سخت امتحان سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

☆☆☆

''تم سہیل بھائی کے گھر دعوت میں جارہے ہو یا نہیں؟'' وہ جو تائی امی کے کمرے میں سوئے ہوئے آفاق کو دیکھنے جارہی تھی، ان کی آواز سن کر دروازے کے باہر ہی رک گئی۔

''نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے کچھ کام ہے۔'' جواب میں عاقب کی سنجیدہ آواز سنائی دی۔

''تمہارے کام تو لگتا ہے کبھی ختم ہی نہیں ہوں گے۔ خاندان میں اتنی دعوتیں ہوئیں تم کسی ایک میں بھی نہیں گئے جبکہ ثاقب ہر جگہ پورے جوش و خروش سے جاتا ہے۔ تمہیں ثنا کے جذبات کا ذرا خیال نہیں ہے کہ اس طرح ہر جگہ اکیلے جاتے ہوئے اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ آخر وہ بھی نئی نویلی دلہن ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ ناز نخرے اٹھانا تو دور کی بات تم اس سے اخلاق سے بھی پیش نہیں آرہے ہو جبکہ ثاقب نے اریبہ کو ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا ہے۔ رویوں کا یہ تضاد ثنا بھی محسوس کرتی ہوگی۔ اچھے بھلے سمجھدار انسان ہو کر کسی کا اس طرح دل دکھانا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔'' انہوں نے ایک ہی سانس میں عاقب کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے ڈالی۔

''پلیز امی..... آپ مجھ سے ایسی باتیں مت کریں۔ نہ ہی یہ توقع رکھیں کہ میں اور ثاقب ایک جیسے رویوں کا مظاہرہ کریں گے۔ ثاقب نے شادی اپنی خوشی اور رضا سے کی ہے جبکہ میں نے صرف آفاق کی خاطر آپ لوگوں کے زور دینے پر یہ رشتہ قبول کیا ہے ورنہ حنا کے بعد میرے دل اور زندگی میں کسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں اپنے سارے جذبوں کو برت چکا ہوں اور شادی سے پہلے یہ بات میں نے ثنا سمیت آپ سب کو بہت اچھی طرح سمجھا دی تھی پھر اب کسی شکوے کی گنجائش کہاں نکلتی ہے آپ کے پاس۔'' عاقب کی آواز کسی تیز دھار آلے کی طرح اس کے دل کو زخمی کر رہی تھی۔ اپنی وہاں آمد کے مقصد کو بھول کر وہ تیزی سے واپس پلٹی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ یہ ٹھیک تھا کہ شادی سے پہلے عاقب نے اس پر صورتِ حال کو واضح کر دیا تھا لیکن کسی رشتے کے قائم ہونے سے پہلے اور بعد میں انسان کے سوچنے کا انداز خود بخود بدل جاتا ہے۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ آفاق کی خاطر قربانی دے سکتی ہے لیکن اب فطری تقاضے اس کی ہستی کو درہم برہم کر رہے تھے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دکھ محسوس کر رہی تھی۔ احساس کی یہ شدت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ اس کے سامنے ثاقب اور اریبہ بھی موجود تھے اور کئی بار خود بخود یہ سوچ اس کے ذہن میں جنم لیتی تھی کہ اگر اس نے جذباتیت سے کام نہ لیا

ہوتا تو آج ثاقب کے ان سارے جذبوں کی شدت اس کے لیے ہوتی۔ کمرے میں واپس آکر کچھ دیر تو یونہی سن سی بیٹھی رہی پھر درمیانی دروازہ کھول کر حنا کے بیڈروم میں پہنچ گئی۔ حنا اس دنیا سے چلی گئی تھی لیکن اس بیڈروم میں قدم رکھتے ہی یوں لگتا تھا... جیسے وہ آس پاس ہی کہیں موجود ہو۔ کارنس، سائیڈ ٹیبل اور والز ہر جگہ اس کے مختلف پوز سجے ہوئے تھے۔ وہ دلہن کے پوز میں اس کی ایک بڑی سی تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ملتے جلتے نقوش اور روپ رنگ کی مالک ہونے کے باوجود قسمت کے اعتبار سے وہ دونوں ایک دوسرے سے کتنی مختلف تھیں۔

''میں نے تو تمہاری خواہش میں اس رشتے کو قبول کیا تھا آپی کہ تمہارا بیٹا میری محبت کی پناہوں میں رہے گا اور سوتیلی ماں کے عذاب سے بچ جائے گا لیکن یہاں تو میری اپنی ہستی طوفانوں کی زد میں آ گئی ہے۔'' وہ بے اختیار ہی بہن کی تصویر سے اپنا غم بانٹنے لگی۔ اسے اس کمرے میں کتنی دیر گزری یہ اندازہ تو نہ ہوا لیکن دروازہ کھلنے کی آواز پر چونک کر مڑی۔ وہ ثاقب تھا جو پہلے تو اسے وہاں دیکھ کر حیران ہوا اور پھر اس کے چہرے پر برہمی کے آثار نظر آنے لگے۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' سرد سے لہجے میں سوال ہوا۔

''بس یونہی.....'' اس کے لہجے کی سختی نے ثنا کو ڈھنگ سے کچھ بولنے ہی نہیں دیا۔

''میں یہاں اپنے سوا کسی کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا..... امید ہے تم آئندہ اس بات کا دھیان رکھو گی۔'' سختی سے بولتے ہوئے اس نے انگلی کے اشارے سے ثنا کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ احساسِ توہین سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور پھر ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ اپنے بیڈروم میں واپس آکر وہ بے آواز آنسوؤں سے بے تحاشا روئی لیکن یہاں کون تھا جو اس کی اشک شوئی کرتا۔ رو، رو کر آخر اسے خود ہی چپ ہونا پڑا۔ البتہ طبیعت بھی ست سی تھی اس لیے کمرے سے باہر نہیں نکلی اور یونہی بستر پر لیٹی رہی حالانکہ اندازہ تھا کہ آفاق اب تک جاگ گیا ہوگا۔ تائی امی نے بھی شاید اسے ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے آفاق کو اپنے پاس ہی روکے رکھا تھا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل جانے کے باوجود بھی وہ بستر پر پڑی رہی۔ چونکی اس وقت جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔

''اندر آجائیں۔'' اس نے کسلمندی سے جواب دیا۔

''ثنا بھابی۔'' دروازہ کھلا اور اریبہ نے اسے آواز دی۔

''اللہ کتنا اندھیرا کیا ہوا ہے آپ نے؟'' بولتے ہوئے اس نے لائٹ آن کر دی۔ روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

''کیا بات ہے بھابی، آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔'' فیروزی رنگ کے بھاری کام دار جوڑے اور زیورات میں تک سک سے تیار کھڑی وہ اس سے دریافت کر رہی تھی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اریبہ..... سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔'' اریبہ کے نکھرے، نکھرے وجود سے نظریں چراتے ہوئے اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

''ارے تو آپ کسی کو بتائیں تو سہی..... آنٹی تو یہی سمجھ رہی ہیں کہ آپ دعوت میں جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ اس لیے آفاق کو بھی انہوں نے اپنے پاس روکا ہوا ہے بلکہ اب تو انکل اسے باہر گھمانے لے گئے ہیں کہ وہ کسی طرح بہل ہی نہیں رہا تھا۔'' اریبہ نے اطلاع دی۔

''اچھا میں دیکھتی ہوں اسے۔'' رونے کی وجہ سے اس کا سر بھاری ہو رہا تھا اس لیے بستر سے اٹھتے ہی معمولی سے چکر آ گئے۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

''آپ کی تو لگتا ہے کہ زیادہ طبیعت خراب ہے۔ بہتر ہوگا کہ ثاقب بھائی کے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس چلی جائیں۔ ویسے مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ دعوت میں نہیں چل رہیں۔ اب یہ آخری دعوت تو تھی۔ اس کے بعد تو ثاقب نے کہیں بھی

جانے سے انکار کر دیا ہے۔ پرسوں صبح ہم ہنی مون پر نکلنے والے ہیں ناں تو کل کا سارا دن گھر پر رہ کر بچی کچی پیکنگ کرنے کے بعد ریسٹ کریں گے۔''

قدرے کم عمر اریبہ خاصی باتونی تھی۔ اس کی کیفیات سے بے خبر ایک سانس میں بولتی ہی چلی گئی۔

''اچھا چلیں فی الحال میں آنٹی کو آپ کے پاس بھیجتی ہوں۔ ثاقب آوازیں دے رہے ہیں۔ پوچھوں کیا مسئلہ ہے۔'' وہ بڑی مگن سی بولتی ہوئی باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں آسیہ خاتون اس کے کمرے میں موجود تھیں۔

''کیا بات ہے بیٹا..... کیا ہوا طبیعت کو؟'' انہوں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں تائی امی! بس ذرا سا سر میں درد ہو گیا تھا۔ میں نے ٹیبلیٹ لے لی ہے۔ دو چار گھنٹے کی نیند لے لوں گی تو صحیح ہو جائے گا۔'' اس نے دھیمے لہجے انداز میں انہیں جواب دیا۔ ان کے حلیے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی دعوت میں جانے کے لیے تیار ہیں اور یقیناً اس سے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کرتیں۔

''یہ تو بڑے غلط وقت پر درد ہو گیا تمہارے سر میں..... آج کی دعوت تو خاصی اہم تھی۔''

''سوری تائی امی لیکن مجبوری ہے ناں..... اگر طبیعت ٹھیک ہوتی تو میں ضرور چلتی۔'' اس نے معذرت طلب لہجے میں جواب دیا۔

''پھر ایسا ہے کہ میں بھی نہیں جاتی ہوں تم عاقب کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلی جانا... میں آفاق کو سنبھال لوں گی۔'' انہوں نے فوراً ہی پروگرام میں تبدیلی کر لی۔

''ارے نہیں تائی امی آپ جائیں۔ میں نے کہا ہے ناں کہ ریسٹ کروں گی تو طبیعت سنبھل جائے گی۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آفاق کو بھی آپ میرے پاس چھوڑ دیں۔ میں اسے دیکھ لوں گی۔'' اسے اچھا نہیں لگا کہ وہ تیار ہونے کے بعد دعوت میں شریک نہیں ہوں۔

''آفاق کی موجودگی میں تم کیسے ریسٹ کروگی بیٹا..... وہ تمہیں چین سے تھوڑی بیٹھنے دے گا۔'' وہ تذبذب کا شکار تھیں۔

''اچھا میں ایسا کرتی ہوں کہ امی کی طرف چلی جاتی ہوں۔ اس طرح میں ریسٹ بھی کرلوں گی اور آفاق کی دیکھ بھال بھی ہو جائے گی۔'' اس نے تجویز پیش کی جسے تھوڑی سی ردوکد کے بعد آسیہ خاتون نے قبول کرلیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ آفاق کو گود میں لیے اپنے میکے والے پورشن کی طرف جارہی تھی تو عین اسی وقت دیگر افراد دعوت میں جانے کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ اسے صاف محسوس ہوا کہ ثاقب کے پہلو میں چلتی اریبہ کے مقابلے میں اس کا وجود بہت تھکا ہوا شکستہ لگ رہا ہے اور ثاقب نے اس کی شکستگی کو دیکھ کر اسے بے حد طنزیہ مسکراہٹ سے نوازنے کے بعد بطور خاص اریبہ کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس لمحے کی اذیت کو اپنے اندر اتارتی وہ تیز قدموں سے درمیانی فاصلہ طے کر گئی کہ شکستہ دل یہ سب سہنے کی تاب نہیں لا رہا تھا۔

☆☆☆

''بھابی!'' آفاق کو سلانے کے بعد وہ اس کے ساتھ ہی لیٹی تھی تب اریبہ دروازے پر دستک دے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''آجاؤ اریبہ.....'' اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس کے لیے بیڈ پر جگہ بنائی۔ وہ اور ثاقب کل ہی ہنی مون سے واپس آئے تھے اور پندرہ دن کے اس ٹرپ میں اریبہ بے تحاشا نکھر گئی تھی۔ خوشی اور آسودگی اس کے انگ انگ سے چھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں آپ کو یہ تصویریں دکھانے لائی تھی۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا البم ثنا کی طرف بڑھایا۔

''ذرا پرسنل سی تصویریں ہیں تو ثاقب نے کہا سب کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے بس آپ کے لیے اجازت دی ہے۔'' اس نے البم کھولا ہی تھا کہ اریبہ

نے ذرا شرماتے ہوئے انداز میں بتایا۔ ثنا کا دل قطعی نہیں چاہ رہا تھا... پھر بھی وہ اس کی خوشی کے لیے تصویریں دیکھنے لگی۔ خاصی رومینٹک اور بے باک سے پوز والی تصویریں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی فلمی جوڑے کی تصویریں ہوں۔ ہر تصویر میں ثاقب کے فدویانہ اور والہانہ جذبات نمایاں تھے۔ اس کے تصویریں دیکھنے کے دوران اریبہ ساتھ، ساتھ بتاتی رہی کہ کون سی تصویر کس مقام پر لی گئی ہے۔

''کیسی ہیں؟'' اس کے البم بند کرنے کے بعد اریبہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بہت اچھی ہیں لیکن ذرا احتیاط سے رکھنا، اتنی پرسنل چیز پر کسی کی نظر نہیں پڑنی چاہیے۔'' اس نے دبے لفظوں میں اریبہ کو سمجھایا۔

''جی وہ تو میں نے صرف آپ کو دکھائی ہیں۔ ورنہ یہ تو میں نے اور ثاقب نے بس اپنے لیے کھنچوائی ہیں کہ جب بھی ان دنوں کی یاد تازہ کرنے کا دل چاہے گا تو دیکھ لیا کریں گے۔'' اس نے شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ وہ طبیعت کی سادہ اور صاف لڑکی تھی۔ وہ بے شک بولتی بہت تھی لیکن مزاج میں چالاکی یا طراری نہیں تھی پھر بھی ثنا کو اس کے لیے اپنے دل میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اپنی ویران زندگی کے مقابلے میں اسے اریبہ کی خوش اور مطمئن زندگی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ شادی کر کے اسے کیا ملا تھا۔ بس وہ ایک گھر سے اٹھ کر دوسرے گھر میں آ گئی تھی جہاں ایک طرف شوہر کے نام پر عاقب جیسا بے نیاز بندہ تھا تو دوسری طرف منہ دکھائی میں ملے آفاق کی ذمے داریاں..... ثاقب اور اریبہ کے ہنی مون پر چلے جانے کے بعد اس نے گھر کی دیگر ذمے داریاں بھی سنبھالنی شروع کر دی تھیں اور اپنے روز و شب کو دیکھتے ہوئے اسے کسی طور یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ وہ بھی نئی نویلی دلہن ہے، جبکہ اریبہ کے انگ، انگ سے سرمستی چھلکتی تھی۔ گھریلو امور میں اس نے ثنا کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو تب بھی بہانے، بہانے سے اس کی بے سکونی کا سبب بنتی رہی۔ کچن میں اس کا ہاتھ بٹا رہی ہوتی تو ثاقب بہانے بہانے سے کئی بار اسے کال کر ڈالتا۔ ایس ایم ایس کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ اپنی کالز اور ایس ایم ایس میں جانے وہ کیا الفاظ استعمال کرتا تھا کہ اریبہ کے چہرے پر گلال سا بکھر جاتا۔ ان رنگوں کو دیکھ کر ثنا کو اپنی بے رنگ زندگی کا مزید احساس ہوتا۔ اس کے لیے حالات اس وقت مزید صبر آزما ہو گئے جب اریبہ کے امید سے ہونے کی خبر ملی۔ اس خبر کے ساتھ ہی ثاقب نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا لیا۔ کسی کانچ کی گڑیا کی طرح اس کی حفاظت کرتا۔ سارے کام کاج چھڑوا کر بالکل بستر پر بٹھا دیا تھا اسے۔ اس کے اس رویے پر جہاں آسیہ خاتون جز بز ہوتیں وہیں اریبہ بھی شرمساری رہتی لیکن ثاقب کی سخت ہدایت کے آگے مجبور تھی۔ سخت اعصابی دباؤ کے ساتھ آفاق اور گھر کی ذمے داریاں نبھاتی ثنا بیزاری اور چڑچڑے پن کا شکار ہونے لگی۔ ان دونوں کے گھر سنبھالنے کے بعد آسیہ خاتون نے کچن کے کام کرنے والی ملازمہ کو ہٹا دیا تھا اصولاً دو، دو بہوؤں کے ہوتے ہوئے ملازمہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ان کا گھرانا ایک روایتی گھرانا تھا۔ جہاں اشد ضرورت کے علاوہ کچن کو گھر کی عورت کے سوا کسی کے ہاتھ میں دینا پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ ثنا خود اس ماحول کی پروردہ تھی لیکن اب اس کے دل میں سب کے خلاف شکوے پیدا ہونے لگے تھے۔ کبھی اریبہ سے جلن ہوتی تو کبھی تائی امی کی بیماری پر غصہ آتا اور تو اور شمائلہ کی پڑھائی کی مصروفیت بھی آنکھوں میں کھٹکنے لگی تھی۔ ستم یہ تھا کہ وہ کسی کے سامنے اپنی بھڑاس نکال بھی نہیں سکتی تھی۔ ماں سے کچھ کہنے کا سوال نہیں تھا کہ ایک طرف تو ان کے پہلے سے دکھی دل کا خیال زبان پکڑتا تھا تو دوسری طرف اس شادی کے لیے ان کی مخالفت بھی یاد تھی سو وہ اپنی ہی آگ میں جلتی رہی۔ پھر ردِعمل کے طور پر اظہار کی راہ بھی ملی تو آفاق کی ننھی جان کی صورت..... لاشعوری طور پر بھی وہ اس کی ذمے داریوں کو نبھانے میں کوتاہی برتنے لگی۔ نتیجتاً

بچے کے مزاج اور صحت پر بھی اثر پڑنے لگا۔ نہ وہ پہلے جیسا خوش مزاج رہا اور نہ ہی صحت مند۔۔۔۔ اس روز بھی وہ رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی، مغرب کے بعد کھانے کے عادی آفاق کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا اور دادا، دادی اسے سنبھالنے میں ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ سالن وہ تیار کر چکی تھی اور اب روٹیاں پکا رہی تھی۔ شمائلہ بھی اس کے ساتھ کچن میں کھڑی سلاد تیار کر رہی تھی۔ سلاد کی تیاری کے بعد اس نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا بھی لگانا شروع کر دیا۔ ثنا آخری روٹی کو ہاٹ پاٹ میں رکھ کر ہاٹ پاٹ ڈائننگ ٹیبل پر پہنچانے گئی تو تایا جان نے اسے مخاطب کیا۔

''ارے بھئی ثنا بیٹا، یہ آفاق کو تو دیکھو گھنٹا بھر ہو گیا ہے کسی طور بہل ہی نہیں رہا ہے۔ کہیں اسے بھوک تو نہیں لگ رہی؟'' وہ ابھی تک ڈائننگ ٹیبل پر نہیں آئے تھے اور آفاق کو لے کر ٹہل رہے تھے۔

''لائیں مجھے دیں، بھوک ہی لگ رہی ہو گی اسے۔'' ثنا نے بچے کو ان کی گود سے لیتے ہوئے قدرے بیزاری سے کہا۔ اسی وقت کچھ دیر قبل آفس سے لوٹنے والا عاقب ڈائننگ روم میں پہنچا۔ ثنا نے آفاق کو گود میں لیا اور وہیں سب کے درمیان بیٹھ کر اسے روٹی کے چھوٹے، چھوٹے ٹکڑے سالن سے لگا کر کھلانے لگی۔ بھوکے بچے نے تین چار نوالے تو بے تابی سے نگل لیے، لیکن پھر مرچوں کی وجہ سے رونے لگا۔ بعض گھروں میں آفاق کی عمر کے بچے گھر میں پکا ہوا عام روٹی سالن بھی آرام سے کھا لیتے ہیں لیکن اس کے لیے چونکہ ثنا ہمیشہ خصوصی کھانا تیار کرتی رہی تھی اس لیے وہ عادی نہیں تھا۔ مرچیں لگنے پر ثنا نے اس کے منہ سے پانی کا گلاس لگایا تو وہ غٹاغٹ کئی گھونٹ پی گیا۔ ثنا نے دوبارہ اسے سالن روٹی لگا کر کھلانے کی کوشش کی تو منہ پھیر گیا اور ایک بار پھر اونچے سُروں میں رونے لگا۔

''تم اسے کیا کھلا رہی ہو؟'' اتنی دیر سے تماشا دیکھتے عاقب کا ضبط جواب دے گیا اور اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

''وہی جو سب کھا رہے ہیں۔'' ثنا نے اس کے غصے سے بے نیازی برتنے کی کوشش کی۔

''تمہارے اندر عقل نام کی کوئی شے ہے یا نہیں۔۔۔۔ یہ اتنا سا بچہ یہ کھانا کیسے کھا سکتا ہے۔ ایک تو تم اسے لیٹ کھانا کھلا رہی ہو اوپر سے کھانا بھی ایسا کہ بچہ کھا ہی نہیں سکتا۔'' عاقب کا مزاج مزید برہم ہوا۔ اپنی مصروفیت کے باوجود اسے خوب علم تھا کہ آفاق کے کھانے پینے کے کیا اوقات ہیں اور وہ کیسی غذا لیتا ہے۔

''مجھے اس کے لیے الگ سے کچھ پکانے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ کچن میں اتنا کام تھا، میں اکیلی کیا، کیا کرتی۔'' اس نے بلامروت اپنی کوتاہی کی وجہ بیان کر دی۔

''بھاڑ میں جائیں سارے کام۔۔۔۔ میں تمہیں وارن کرتا ہوں کہ آئندہ آفاق کے سلسلے میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ تم آفاق کی خاطر یہاں ہو اور اس سے کسی قسم کی بے پروائی میں قطعی برداشت نہیں کروں گا۔'' عاقب بلند آواز میں دہاڑا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے سب افراد اس صورتِ حال پر سٹپٹا گئے۔ خواتین شرمندہ تھیں کہ ثنا کی توجیہہ کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ آج کل وہ اکیلی ہی کچن کا کام سنبھال رہی تھی جبکہ عاقب کا یہ انداز بھی سب کے لیے حیران کن تھا۔ وہ کب اتنی بلند آواز اور غصے میں بولنے کا عادی تھا اور اس وقت تو اس نے سب کے سامنے ثنا کو شرمندہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کے اس رویے نے لاڈ پیار میں پلی ثنا کو پتنگا کر دیا تھا۔

''شمائلہ جاؤ ایک پیالے میں دودھ ڈال کر لاؤ، آفاق کو دودھ میں روٹی چور کر کھلا دیں گے۔'' آخر آسیہ خاتون نے ہی اپنے بڑے ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ شمائلہ فوراً اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت ثنا نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور آفاق کو تائی امی کے حوالے کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ یہاں وہ دل بھر کر اپنی بے عزتی پر رو سکتی تھی لیکن یہ حسرت بھی پوری نہیں ہو سکی کچھ دیر میں عاقب بھی وہاں پہنچ گیا۔

''یہ کس غم میں ٹسوے بہائے جا رہے ہیں۔''

تمہیں تو بہت دعویٰ تھا ناں آفاق سے محبت کا پھر اس کے سلسلے میں یہ کوتاہی کیسی.....؟ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری زندگی میں تمہاری کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے صرف آفاق کی خاطر اپنے گلے میں یہ طوق ڈالا ہے اور اگر تم نے اس کے معاملات میں کوتاہی کی تو مجھے یہ طوق اتار کر پھینکنے میں دیر نہیں لگے گی۔'' وہ بے نقط سنا کر وہاں سے چلا گیا۔ سکتہ زدہ سی ثنا اپنی جگہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ کوئی گھنٹے بھر بعد آسیہ خاتون سوتے ہوئے آفاق کو گود میں لیے اس کے کمرے میں آ گئیں۔

''تم پریشان مت ہو، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل سے کنیز کو کچن کے کاموں کے لیے دوبارہ بلوا لوں گی۔ تم بس آفاق کو دیکھا کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ اس مسئلے کی وجہ سے تمہارے اور عاقب کے درمیان اختلافات پیدا ہوں۔ میرا بیٹا دل کا برا نہیں ہے لیکن اس کا ذہن ابھی تک حالات کو پوری طرح قبول نہیں کر رہا ہے۔ تم اس کی بیوی ہو کوشش کرو تو اس کو اس کیفیت سے نکال سکتی ہو۔ مرد فطرتاً محبت اور توجہ کا طالب ہوتا ہے۔ تم اسے توجہ دو گی تو آہستہ آہستہ وہ تمہارا ہو جائے گا۔'' آفاق کو اس کے بیڈ پر لٹانے کے بعد وہ اسے ڈھیروں نصیحتیں کرتی رہیں۔ بے حس سی بیٹھی ثنا نے ان کی کوئی نصیحت ڈھنگ سے نہ سنی۔ آخر کار وہ خود ہی تھک ہار کر باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک ایک ہی زاویے سے ساکت بیٹھی رہی۔ نظریں پہلو میں سوئے ننھے آفاق پر ٹکی تھیں۔ مرحومہ بہن کی یہ نشانی اسے دل و جان سے عزیز تھی لیکن اس وقت دل کی یہ حالت تھی کہ اس کے معصوم سے وجود کے لیے بھی کوئی جذبہ محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ ایک طرح کا پچھتاوا سا تھا کہ کیوں آفاق کی خاطر اتنی بڑی قربانی دے ڈالی۔ دل میں ابھرتے اس پچھتاوے نے آہستہ آہستہ اسے یوں اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا اور پھر اس گھٹن نے اس کے لیے کمرے میں ٹھہرنا مشکل کر دیا۔ تازہ ہوا کی خواہش میں وہ بے تابانہ کمرے سے باہر نکل گئی اور پھر بغیر ادھر ادھر دیکھے سیدھی لان میں پہنچ گئی۔ لان چیئر پر بیٹھ کر اس نے چند گہری، گہری سانسیں لیں پھر جانے کیا ہوا کہ پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔

''کیا بات ہے ثنا..... کیوں رو رہی ہو؟'' یک دم ہی کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور پھر اسے ثاقب کی آواز سنائی دی۔ اس نے تڑپ کر اس کی سمت دیکھا اور پھر کچھ اور شدت سے رونے لگی۔

''پلیز مت رو تمہارے آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔'' انگلیوں سے اس کے بھیگے رخسار صاف کرتے ثاقب نے التجا کی۔

''میں بہت تھک گئی ہوں ثاقب، تمہارے بھائی نے تو مجھے میری برداشت سے بڑھ کر کڑے امتحان میں مبتلا کر دیا ہے۔'' اس نے تڑپ کر ثاقب سے حال دل بیان کیا۔

''تم نے خود اپنی مرضی سے اس کھائی میں چھلانگ لگائی ہے، کتنا سمجھایا تھا میں نے تمہیں لیکن تم نے میری ایک نہ سنی..... نہ میرے دل کا کچھ خیال کیا نہ اپنے بارے میں کچھ سوچا۔'' جواب میں اس نے شکوہ کیا۔

''تمہیں کیا فرق پڑا میرے اس فیصلے سے۔ تم تو اپنی زندگی میں مگن ہو۔ چند دن میں اریبہ کے ایسے گرویدہ ہو گئے ہو جیسے وہ تمہاری محبت ہو اور تم نے ہمیشہ اسی کے ساتھ کی خواہش کی ہو۔'' اس طعنے میں اس کے اندر کی ساری جلن اور کڑھن سمٹ آئی تھی۔ اصل میں تو اسے سب سے زیادہ تکلیف ہی اس بات کی تھی کہ اس سے محبت کا دعویٰ رکھنے والا ثاقب چند دن میں ہی اریبہ کا دم بھرنے لگا ہے۔

''غلط فہمی ہے تم کو، میں اریبہ کے ساتھ مگن نہیں ہوا ہوں، نہ ہی میرے دل میں اس کے لیے کوئی خاص جگہ ہے۔''

''ہونہہ..... دل میں جگہ نہ ہونے پر یہ حال ہے کہ تمہارے چوبیس گھنٹے اس کے ناز نخرے اور چونچلے اٹھاتے ہوئے گزرتے ہیں جو محبت کا دعویٰ ہوتا تو جانے کیا تماشا کرتے تم۔'' گفتگو کے دوران رونے کا سلسلہ تو تھم چکا تھا لیکن اندر کی جلن باقی تھی سو تڑخ کر

ثاقب کو طعنہ دیا۔

''وہ سب تو ردِعمل ہے اس تکلیف کا جو میں تمہیں عاقب بھائی کی بیوی کی حیثیت سے اپنے گھر میں دیکھ کر محسوس کرتا ہوں۔ میرے دل کی تکلیف نے ہی مجھے ایسا رویہ اپنانے پر مجبور کیا کہ تم بھی جلو اور وہ درد محسوس کرو جو مجھے ہوتا ہے۔'' اس نے مزے سے اپنے رویے کی توجیہہ پیش کردی۔

''بہت ظالم ہو تم!''

''تم سے تو کم ہی ہوں تم نے جتنا بڑا ظلم مجھ پر کیا ہے اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔'' ثاقب کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔

''پہلے نہیں تھا اندازہ لیکن اب ہونے لگا ہے۔ میرے جذباتی فیصلے نے ہم دونوں کی زندگیوں کو جہنم بنادیا ہے۔'' اس کے لہجے میں پچھتاوا ہی پچھتاوا تھا۔ غمِ مشترک میں مبتلا ان دونوں کے کئی گھنٹے یونہی ایک دوسرے کا درد بانٹتے گزر گئے انہیں اندازہ ہی نہیں ہوا۔ ثاقب کو ہی خیال آیا کہ بہت زیادہ وقت گزر گیا ہے۔

اب اندر جانا چاہیے۔ ناچار ثنا کو بھی اٹھنا پڑا کمرے میں واپس آئی تو آفاق اٹھ چکا تھا اور بالکل بستر کے کنارے پر کھڑا رو رہا تھا۔ اصل میں اسے درمیان میں اٹھ کر دودھ پینے کی عادت تھی۔ اب بھی وہ حسبِ عادت جاگا تھا اور ثنا کو قریب نہ پاکر... گھبرا گیا تھا اس لیے رونے کے ساتھ بستر سے اترنے کی کوشش بھی کررہا تھا۔ اس سے قبل کہ ثنا آگے بڑھ کر اسے تھامتی اس کا توازن بگڑا اور بیڈ سے نیچے گر گیا۔ نیچے قالین بچھا تھا اس کے باوجود اونچے بستر سے گرنے پر چوٹ تو بہرحال لگی اور پہلے سے روتے بچے کے سُر مزید بلند ہوگئے۔ ثنا نے لپک کر اسے اپنی بانہوں میں اٹھایا اسی وقت درمیانی دروازہ کھول کر عاقب اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ثنا آفاق کو نیچے سے اٹھا رہی تھی۔

''کیسے نیچے گرا یہ......؟'' آفاق کو جھپٹ کر اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے عاقب نے سختی سے پوچھا۔

''جی...... سوتے میں بستر سے لڑھک گیا ہے۔'' وہ جانتی تھی کہ یہ واقعہ اس کی عدم موجودگی کے باعث پیش آیا ہے اس لیے مجرمانہ شرمساری سے بہانہ گھڑا۔

''بچہ بستر سے گر گیا اور تم غفلت کی نیند سوئی رہیں۔ بہت خوب، کہاں تو بے پناہ محبت کے دعوے ہیں اور کہاں یہ حال ہے کہ محترمہ گدھے گھوڑے سب بیچ کر سوئی ہیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بچوں کی ماؤں کی تو نیند میں بھی ایک آنکھ کھلی ہی رہتی ہے لیکن ماں ہو تب ناں......'' عاقب نے طنز اور تحقیر کے تیر چلائے تو اس کے دل میں پیدا ہونے والا معمولی سا احساسِ ندامت بھی ماند پڑ گیا اور سپاٹ سا چہرہ لیے بستر کے کنارے پر ٹک گئی۔ عاقب روتے ہوئے آفاق کو گود میں اٹھائے واپس اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ثنا بہت دیر تک اس کے کمرے سے آفاق کے رونے کی آواز سنتی رہی پھر کان لپیٹ کر بستر پر دراز ہوگئی حالانکہ اسے معلوم تھا کہ عاقب کی نسبت وہ آفاق کو جلدی اور آسانی سے بہلا سکتی تھی لیکن عاقب کے تحقیر آمیز رویے کے ردِعمل میں اس بے حسی کا مظاہرہ کرنے میں وہ خود کو حق بجانب سمجھ رہی تھی۔

☆☆☆

''تم بھی کچن میں ثنا کا تھوڑا ہاتھ بٹا دیا کرو۔ صبح، صبح کتنی مصروفیت ہوتی ہے اور وہ بیچاری اکیلی لگی رہتی ہے۔'' سارا گھر ناشتے کی میز پر جمع تھا جب ثاقب نے ڈبل روٹی پر جیم لگاتی اریبہ کو ٹوکا۔ اس کے اس جملے نے اریبہ سمیت سب کو حیران کردیا کہ سب ہی واقف تھے ثاقب اپنی چہیتی بیوی کو آج کل فل ٹائم آرام کروانے کے موڈ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس وقت کا ٹوکنا سب کے لیے ہی تعجب خیز تھا ماسوائے ثنا کے جو ٹیبل پر چائے کی کیتلی رکھتے ہوئے بہ مشکل ہی اپنی مسکراہٹ ضبط کرسکی تھی۔ کل رات کے قول و قرار کے بعد یہی ہونا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اریبہ کی حکمرانی کے دن گنے جاچکے ہیں اور ثاقب جو ہمیشہ سے اس سے محبت کرتا ہے ایک بار پھر اس کی طرف پلٹ چکا ہے۔

''میں نے سوچا ہے کہ کنیز کو واپس بلوالوں۔ اریبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور ثنا کے لیے آفاق کی ذمے داری کے ساتھ اکیلے کچن سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ کنیز کو دوبارہ بلوا لیا جائے۔'' کچھ پل کے لیے چھا جانے والے سکوت کو آسیہ خاتون کی آواز نے توڑا۔

''آپ جو مناسب سمجھتی ہیں کریں لیکن ظاہر ہے ناشتے کے وقت تو کنیز یہاں موجود نہیں ہوگی۔ اس لیے میں اریبہ سے کہہ رہا ہوں کہ ثنا کا ہاتھ بٹا دیا کرے۔ صبح صبح آفاق بھی اسے بہت تنگ کرتا ہے۔ یہ اکیلی کیا، کیا دیکھ سکتی ہے۔'' ثاقب نے کھل کر ثنا کی حمایت کی اور سب کو آفاق کی طرف متوجہ کیا جو عاقب کی پورج کھلانے کی ہر کوشش کو ناکام بنائے ثنا کے پاس جانے کے لیے لپک رہا تھا۔

''یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ آفاق، ثنا کے علاوہ کسی کے قابو میں نہیں آتا ہے۔'' اس بار آسیہ خاتون کو بھی ان کی تائید کرنی پڑی۔

''آپ آفاق کو دیکھیں ثنا بھابی، میں کچن دیکھ لیتی ہوں۔'' فضا یکسر بدلی ہوئی پا کر اریبہ ہڑبڑا کر اٹھی اور سلائس جوں کا توں، چھوڑ کر کچن کی طرف لپکی۔ ثنا نے فتح کے احساس سے سرشار ایک کرسی سنبھال لی اور آفاق کو اپنی گود میں لے لیا۔

''تمہیں اس طرح سب کے درمیان اریبہ کو نہیں ٹوکنا چاہیے تھا۔ بیچاری شرمندہ ہو گئی ہے۔'' عاقب نے چھوٹے بھائی کو غلطی کا احساس دلایا۔

''میں نے اسے صرف ایک صحیح بات کا احساس دلایا ہے کسی طرح کی بے عزتی نہیں کی۔ بے عزتی وہ ہوتی ہے جو کل آپ نے ثنا کی کی تھی۔'' عاقب کو اطمینان سے جواب دیتے ثاقب نے ثنا کا ڈھیروں خون بڑھا دیا جبکہ عاقب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''تم ثنا اور اریبہ والے معاملے کو آپس میں ملانے کی کوشش مت کرو..... میں نے ثنا کو گھر کے کام کاج پر نہیں ٹوکا تھا۔ میں نے اسے آفاق کے ساتھ بے پروائی برتنے پر سرزنش کی تھی۔'' عاقب کا موڈ بے حد خراب ہو گیا تھا۔

''بات ایک ہی ہے، گھر کے کاموں میں الجھنے کی وجہ سے ہی ثنا سے کوتاہی ہوئی تھی۔'' وہ اب بھی ثنا کی سائڈ لے رہا تھا۔

''بند کرو اس فضول بحث کو۔ تمہاری امی ایک حل پہلے ہی پیش کر چکی ہیں اس لیے کسی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔'' پہلے تو سب حیرت زدہ بیٹھے اس صورتِ حال کو دیکھ رہے تھے لیکن آخر کار شیخ اکرم کی برداشت جواب دے گئی اور انہوں نے دونوں بیٹوں کو بلند آواز میں ڈپٹا۔ ان کی آواز بلند ہوتے ہی کسی کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی البتہ اس روز کے بعد گھر کے ماحول میں خود بخود تبدیلی آتی چلی گئی۔

ثاقب جو اریبہ کے پیروں تلے اپنی ہتھیلیاں بچھاتا تھا اب اکثر و بیشتر اسے چھوٹی، چھوٹی باتوں پر روک ٹوک کرنے لگا۔ اریبہ کے ساتھ روز بہ روز بدلتے اس رویے کے ساتھ اس کی ثنا سے دوستی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شادی سے قبل بھی ان دونوں میں بہت دوستی تھی اس لیے کچھ وقفے کے بعد دوبارہ شروع ہو جانے والی یہ دوستی گھر کے دیگر افراد کے لیے تعجب کا باعث نہیں تھی۔ سب نے یہی سمجھا تھا کہ ثاقب پر سے نئی، نئی شادی کا خمار اتر چکا ہے اس لیے اسے بیوی کے علاوہ دیگر افراد بھی نظر آنے لگے ہیں۔ البتہ بہ حیثیت بیوی اریبہ کے احساسات مختلف تھے۔ وہ اپنے شوہر اور ثنا کے درمیان جس تعلق کو محسوس کر رہی تھی اسے زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔ یوں بھی وہ فطرتاً صلح جو لڑکی تھی اس لیے بھی اس صورتِ حال پر مہر بہ لب تھی اور روز، روز کے تماشے دیکھ رہی تھی۔ اس روز بھی ثاقب خلافِ معمول شام میں ذرا جلدی گھر آ گیا تھا۔

''آج امی کے گھر چلیں؟'' اریبہ نے اسے چائے کے ساتھ اسنیکس وغیرہ دیے پھر اس کا موڈ خوشگوار پا کر فرمائش کی۔ اسے اپنی امی کے گھر گئے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔

''سوری...... میرا تو آج کوئی اور پروگرام ہے۔'' ثاقب نے صاف انکار کر دیا پھر الماری میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ثنا اندر آ گئی۔

''آئیں بھابی بیٹھیے......'' اریبہ نے اخلاق سے اسے پیشکش کی۔

''نہیں، میں بیٹھنے نہیں تم سے یہ کہنے آئی تھی کہ ذرا کچن دیکھ لو۔ کنیز کی بیٹی کی طبیعت خراب ہے اس لیے آج وہ جلدی چھٹی لے کر چلی گئی ہے۔ مجھے خود بھی کہیں جانا ہے ورنہ میں دیکھ لیتی۔'' مسکراتے لبوں سے اس سے یہ سب کہتی ثنا کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔

''ٹھیک ہے، میں دیکھ لیتی ہوں۔'' اریبہ نے فرمانبرداری سے جواب دیا اور ثنا کے پیچھے ہی بیڈ روم سے نکل گئی۔ آسیہ خاتون سے رات کے کھانے کے بارے میں مشورہ کرنے کے بعد چکن قورمہ اور ساتھ ہی کوئی سبزی بنانا طے ہو گیا تو وہ کچن میں جا کر اس سے میں مصروف ہو گئی۔ گھنٹا بھر کے اندر اس نے خاصا کام نمٹا لیا لیکن یک دم ہی بی پی لو محسوس ہونے لگا تو وہیں کچن ٹیبل پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا بھابی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' شمائلہ جو فریج سے کچھ نکالنے آئی تھی اسے سر تھام کر بیٹھے دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگی۔

''بس ذرا چکر سا آ گیا تھا۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''اوہو بی پی لو ہو گیا ہوگا۔ لائیں میں آپ کو اسکوائش بنا کر دیتی ہوں۔'' شمائلہ نے جھٹ پٹ اسکوائش کا گلاس تیار کر کے اسے پیش کیا۔ اسکوائش پی کر اس کے حواس ذرا بحال ہوئے ہی تھے کہ کچن کے دروازے پر ثاقب اور ثنا نمودار ہوئے۔ دونوں نک سک سے تیار تھے اور بدن پر چھڑکی خوشبوؤں کی لپٹیں یہاں تک آ رہی تھیں۔

''اریبہ پلیز تم کچھ دیر آفاق کو دیکھ لینا ابھی تو وہ تائی امی کے پاس ہے لیکن تم خیال سے اسے وقت پر کھانا کھلا دینا میں اور ثاقب تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہے ہیں۔'' ثنا نے میٹھے لہجے میں اس ایک اور ذمے داری سونپی اور پھر وہ دونوں اس کا جواب سنے بغیر روانہ بھی ہو گئے۔

''آج ثنا کا برتھ ڈے ہے۔ برتھ ڈے پر ثاقب بھائی ہمیشہ اسے ڈنر کروانے باہر لے جاتے ہیں۔'' شمائلہ نے اس کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیا تھا کہ وہ ان دونوں کے باہر جانے کی وجہ سے ناواقف ہے اس لیے اسے اطلاع دی۔

''اب تو عاقب بھائی کو چاہیے تھا کہ ثنا بھابی کو ڈنر پر لے جاتے۔'' وہ دبے لہجے میں بول ہی پڑی۔

''عاقب بھائی اپنی ذات کے حصار سے نکلیں گے تو انہیں ایسی باتوں کا خیال آئے گا نا...... اچھا ہے ثاقب بھائی نے اپنی سابقہ روایات کو قائم رکھا ورنہ ثنا کا دل بہت دکھتا۔'' ثنا سے شمائلہ کا خون کا رشتہ تھا سو قدرتی طور پر اس کی طرف جھکاؤ زیادہ تھا۔ پھر وہ تھی بھی اپنی پڑھائی میں مگن رہنے والی بچہ، کچھ بے خبر سی لڑکی اس لیے ان نزاکتوں کو محسوس نہیں کرتی تھی چنانچہ اریبہ کی بے چینی کو محسوس کیے بغیر آرام سے بولی۔ اب اریبہ کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی سو خود کو بے پروا ظاہر کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور فریج میں گوندھ کر رکھے آٹے کا باؤل نکالا۔

''آپ رہنے دیں تھوڑی دیر میں، میں پکا دوں گی۔ آپ ریسٹ کریں۔'' اس کی طبیعت کے پیش نظر شمائلہ نے ہمدردی سے پیشکش کی۔

''تم بھی تو اپنے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی ہو نا......'' خواہش ہونے کے باوجود اریبہ کو اس کی پیشکش قبول کرنے میں جھجک محسوس ہوئی۔

''کوئی مسئلہ نہیں...... میں کسی طرح آدھا گھنٹا نکال ہی لوں گی۔ ابھی تو کھانے میں کچھ وقت ہے اتنی دیر میں، میں اپنا تھوڑا کام اور نمٹا کر کچن میں آتی ہوں۔'' شمائلہ نے اس کے ہاتھ سے باؤل لے کر واپس فریج میں رکھا اور خود کچن سے نکل گئی۔ اریبہ بھی

اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی لیکن بروقت خیال آگیا کہ آفاق کے لیے کھانے کے لیے کچھ تیار کرنا ہے چنانچہ پوری تندہی سے اس کام میں جت گئی۔ وہ دیکھ ہی چکی تھی کہ آفاق کے سلسلے میں کوئی کوتاہی ہونے پر عاقب کا موڈ کتنا خراب ہو جاتا تھا۔ اسے تو ثنا پر حیرت ہو رہی تھی کہ شوہر کے مزاج سے واقف ہونے کے باوجود وہ کتنے مزے سے آفاق کو چھوڑ کر خود اپنا برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے چلی گئی تھی۔ ان ہی سوچوں میں گھرے اس نے آفاق کے لیے کھانا تیار کیا اور پھر باؤل میں نکال کر آسیہ خاتون کے کمرے میں لے گئی۔

''آنٹی یہ آفاق کا کھانا۔'' اس کا ارادہ تھا کہ آفاق کو کھلانے کی ذمے داری آسیہ خاتون کو سونپ کر خود کچھ دیر کے لیے آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی جائے گی۔

''جیتی رہو بیٹا۔'' آسیہ خاتون اسے دیکھ کر خوش ہوگئیں البتہ اریبہ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ نڈھال سی ہیں۔

''کیا بات ہے آنٹی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اسے اخلاقاً پوچھنا پڑا۔

''جوڑوں میں بہت درد ہو رہا ہے اور لگتا ہے کہ بی پی بھی بڑھ گیا ہے اس حال میں اس شریر کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔'' انہوں نے آفاق کی طرف اشارہ کیا جس نے ان کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھی ساری اشیا تتر بتر کر دی تھیں۔

''ایسا کرو بیٹا تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور خود ہی کھانا کھلا دو۔ میری تو ہمت ہی نہیں ہو رہی۔ گولی کھا کر تھوڑی دیر لیٹ جاتی ہوں شاید کچھ بہتری آجائے۔'' انہیں اریبہ کی صورت میں اپنی مشکل کا ایک حل نظر آیا تو جھٹ اس سے کہہ ڈالا۔ اریبہ کے لیے ساس کو انکار کرنا ممکن نہیں تھا چنانچہ چاروناچار عمل کرنا پڑا۔ آفاق اب چلنا سیکھ چکا تھا اس لیے اسے سنبھالنا واقعی بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اسے کھانا کھلانے میں اریبہ کو دانتوں پسینہ آگیا۔ ایک تو وہ ثنا کے علاوہ مشکل سے ہی کسی سے کھانے پینے کے لیے راضی ہوتا تھا پھر نیا نیا چلنا سیکھنے والے بچوں کا چلبلا پن اپنی جگہ تھا۔ اتفاق سے اس روز عاقب کا بھی فون آگیا کہ اسے کسی آفیشل ڈنر پر جانا ہے اس لیے دیر سے گھر آئے گا۔ یوں بیچاری اریبہ کی شامت آگئی۔ اس نے کھانا بھی بہت مشکل سے کھایا اور وہ بھی اس صورت کہ شیخ اکرم پوتے کو باہر لے گئے۔ اریبہ جلدی جلدی چند لقمے حلق سے اتار کر کچن سمیٹنے لگی۔ ثنا اپنے ٹیسٹ کی تیاری کی وجہ سے اس کی مزید مدد کرنے سے قاصر تھی جبکہ آسیہ بیگم دوا کھا کر سو گئی تھیں تو کھانے کے لیے بھی نہیں آئی تھیں۔ اس نے تیزی سے کچن سمیٹا اور پھر سبزی اور چپاتی پر مشتمل ان کا کھانا ان کے کمرے میں پہنچایا۔ اتنی دیر میں شیخ اکرم واپس آچکے تھے۔

''لگتا ہے اسے نیند آرہی ہے۔ ایسا کرو کہ اسے فیڈر دے کر سلا دو۔'' انہوں نے آفاق کو اس کے حوالے کر دیا۔ وہ آفاق کو گود میں لیے اپنے بیڈ روم میں آگئی اسے فیڈر دیا لیکن وہ کچھ خراب موڈ میں تھا اور نیند آنے کے باوجود سونے کے لیے راضی نہیں تھا۔ شاید ثنا اور اپنے بستر کو مس کر رہا تھا۔ اس کے اس خراب موڈ کو جھیلتے اریبہ ہلکان ہونے لگی۔ ایک طرف تو اس خیال سے ہی بے چینی سی ہو رہی تھی کہ اس کا شوہر اسے نظر انداز کر کے کسی دوسری عورت کا برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے میں مصروف ہے تو دوسری طرف اپنی خرابی طبیعت کے ساتھ ثنا کی ذمے داری کا بوجھ خود پر پڑنے سے بھی مزاج چڑچڑا ہو رہا تھا۔ اس کی ان کیفیات کے برعکس وہ دونوں کافی دیر سے گھر واپس آئے تو بہت خوش اور ہشاش بشاش تھے۔ اریبہ کا دل چاہا کہ بہت چیخ، چیخ کر عاقب سے لڑے لیکن مصلحتاً چپ سادھ لی۔ اِدھر عاقب کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ جس لڑکی کے دل میں اس نے اپنے رویے سے محبت کے دیپ جلائے تھے اور جو اس کی بیوی ہونے کے ناتے اس پر بے حد حق رکھتی ہے اس کی طرف سے کروٹ لیے ساری رات چپکے، چپکے آنسوؤں سے اپنا تکیہ بھگوتی رہی ہے۔

☆☆☆

ثنا بہت خوش تھی، کافی دنوں بعد اس کی زندگی میں

ایسی شام آئی تھی جسے اس نے دل بھر کر انجوائے کیا تھا۔ ثاقب نے پہلے اسے زبردست شاپنگ کروائی تھی اور پھر وہ کینڈل لائٹ ڈنر کے لیے شہر کے ایک بڑے ہوٹل گئے تھے۔ ڈنر کے بعد ثاقب نے اسے بہت خوب صورت انداز میں وش کرتے ہوئے سالگرہ کے خصوصی تحفے کے طور پر ایک جڑاؤ انگوٹھی پہنائی تھی۔ شادی سے پہلے بھی وہ اس کی سالگرہ کا دن کچھ اسی طرح منایا کرتے تھے لیکن جتنی سرشاری ثنا نے آج محسوس کی تھی اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کا عالم اس سوکھی زمین کا سا تھا جو بہت دنوں سے بارش کے لیے ترس رہی ہو۔ وہ جو محبت اور توجہ کی عادی تھی عاقب کی بے رخی سے بالکل مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اصل میں اس شادی کا فیصلہ لیتے وقت اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ بدلتے رشتوں کے ساتھ انسان کے احساسات بھی بدل جاتے ہیں اور وہ بہت سے فطری تقاضوں کا اسیر ہو کر نفسیاتی مسائل میں الجھ جاتا ہے۔ ثاقب اور اریبہ کی خوش باش زندگی کے اظہار نے اس گرہوں کو اور بھی مضبوط کر دیا تھا جب ہی ثاقب کی طرف سے پہلی بار بڑھائے جانے والے ہاتھ کو اس نے فوراً تھام لیا۔ وقتی خوشیوں کے اس حصول نے احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ شرعی اور معاشرتی قوانین کی دھجیاں اڑا رہی ہے اور اریبہ کے حقوق پر ڈاکا ڈالتے ہوئے ایک غاصب کا کردار ادا کر رہی ہے۔ بدلے ہوئے حالات کے باوجود وہ ثاقب سے تجدیدِ تعلق پر خوش تھی اور اس خوشی نے اس کے چہرے کو نکھار ڈالا تھا۔ انگلی میں پہنی خوب صورت انگوٹھی کو سرشاری سے چھو، چھو کر دیکھتی وہ کب نیند کی وادی میں اتری اسے خبر ہی نہیں ہو سکی۔ عاقب خلافِ معمول بہت تاخیر سے گھر آیا اور حسبِ عادت سوتے ہوئے بیٹے کو پیار کرنے کے لیے اس پر جھکا تو بلا ارادہ ہی اس کے ساتھ سوئی ثنا پر نظر پڑی۔ وہ کپڑے تبدیل کیے بغیر ایسے ہی سو گئی تھی اور اس کا سجا سنورا روپ خاصا متوجہ کرنے والا تھا۔ پل بھر کے لیے تو عاقب کو یہ گمان ہوا جیسے وہ حنا ہو، بے اختیار ہی اس نے اسے چھونے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے لیکن پھر فوراً ہی یاد آ گیا کہ حنا ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر جا چکی ہے۔ حنا کا خیال اس کے لیے اتنا طاقتور ہوتا تھا کہ وہ ثنا کی طرف دیکھ ہی نہیں پاتا تھا لیکن آج پہلی بار ایسا ہوا کہ وہ فوری طور پر اپنی نظروں کو واپس نہ موڑ سکا کیونکہ اس کی نگاہ میں اس کا خوب صورت سراپا سما گیا تھا تبھی اسے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ لڑکی اس کی بیوی ہے جس پر وہ نہ صرف شرعاً اور قانوناً حق رکھتا ہے بلکہ خود اس کی ذات پر بھی اس لڑکی کے کچھ حقوق ہیں۔ ان حقوق کی ادائیگی نہ کر کے وہ اس کے ساتھ ظلم کر رہا تھا۔

''لیکن میں نے اسے پہلے بتا دیا تھا کہ میری زندگی میں حنا کے بعد کسی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ زندگی خود اس کا اپنا انتخاب ہے اس نے آفاق کی خاطر اس رشتے کو قبول کیا ہے۔'' اپنے سابقہ بیڈروم میں واپس آنے کے بعد بھی وہ اپنے آپ سے الجھ رہا۔

''بہت خوب مسٹر عاقب! وہ تمہارے بیٹے کی محبت میں اتنی بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئی اور جواب میں تم نے اسے کیا دیا...... بے رنگ و بے کیف زندگی اور اس پر بھی تم اپنے بیٹے کے سلسلے میں ہونے والی کوتاہی پر یوں اس سے حساب لیتے ہو گویا وہ تمہاری زر خرید لونڈی ہو۔'' آج پہلی بار وہ اپنے دکھی دل سے ہٹ کر ضمیر کی آواز سن رہا تھا۔

''میں یہ زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ نہ تو اپنی زندگی میں کسی کو حنا کی جگہ دے سکتا ہوں اور نہ ہی اس کی نشانی کے ساتھ بے پروائی برداشت کر سکتا ہوں۔'' وہ خود اپنے ضمیر کے سامنے وکیلِ صفائی کا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم جھوٹ کہتے ہو۔ ثنا کو نکاح کے بندھن میں باندھنے کے بعد تم اسے حنا کی جگہ دے چکے ہو اب ضد میں تسلیم نہ کرو تو یہ دوسری بات ہے۔'' اسے دو بدو جواب ملا اسی وقت اس کی نظریں حنا کی تصویر سے جا ملیں۔ وہ اسے کچھ خفا سی لگی۔

''سب کہتے ہیں کہ تم چلی گئی ہو لیکن میرے دل

میں تو پوری آب و تاب سے بس رہی ہو۔'' وہ اس سے مخاطب ہوا۔

''جنہیں دل میں بسایا جائے ان کا دل یوں نہیں دُکھاتے عاقب۔'' بے جان تصویر بول اٹھی۔

''کیا مطلب ...... ؟ بھلا میں نے تمہارا دل کب دکھایا ہے ؟'' وہ حیران ہوا۔

''میری لاڈلی بہن کی زندگی کو بنجر بنا کر تم مجھے کون سی خوشی دے رہے ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ مجھے ثنا سے کتنی محبت ہے۔ میں کتنی خواہش کیا کرتی تھی کہ اسے بھی میری طرح تمہارے جیسا چاہنے والا شوہر ملے اور میری خواہش یوں پوری ہوئی کہ اسے تم ہی مل گئے۔ تم جو میرے لیے ایک آئیڈیل شوہر تھے، کیا میری بہن کے لیے بھی یہ کردار ادا نہیں کر سکتے ؟'' بے جان تصویریں بول نہیں سکتیں لیکن عاقب کا ضمیر اور اچانک جاگ اٹھنے والے جذبات نے مل کر بے جان تصویر کو زبان دے دی تھی۔ اپنے آپ سے جاری اس گفتگو میں رات کیسے بیتی اسے پتا بھی نہیں چلا۔ دوسرے کمرے سے آفاق کے رونے کی آواز آئی تو وہ چونکا۔ صبح ہو گئی تھی۔ درمیانی دروازہ پار کر کے وہ دوسرے بیڈروم میں پہنچا۔ ثنا نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم سو جاؤ، میں اس کا فیڈر تیار کر کے دے دیتا ہوں۔'' نہایت نرمی سے کہتے ہوئے اس نے آفاق کو گود میں اٹھا لیا۔ لہجے کی اس تبدیلی پر حیران ثنا اپنی جگہ پر بیٹھی رہ گئی۔ اس کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے عاقب نے آفاق کو فیڈر تیار کر کے دیا۔ دودھ پینے کے بعد وہ دوبارہ سو گیا تو عاقب نماز کی ادائیگی کے لیے روانہ ہو گیا۔ نماز کے بعد بھی وہ کافی دیر سے گھر لوٹا۔ حسبِ معمول ناشتے کی میز لگ چکی تھی اور ثنا اور اریبہ ناشتے کا سامان میز پر پہنچا رہی تھیں۔ دونوں ہی کچھ چپ، چپ سی تھیں۔ عاقب ان کے درمیان پیدا ہونے والی رقابت کے احساس سے ناواقف تھا اور یہی سمجھ رہا تھا کہ دیورانی اور جیٹھانی کی روایتی چپقلش کا اثر ہے جس کے پیدا کرنے میں اس نے اور ثاقب دونوں نے کچھ نہ کچھ کردار ادا کیا ہے۔

''ثنا پلیز مجھے صرف جوس دے دو۔ میں کچھ اور نہیں لوں گا۔'' شادی کے بعد یہ پہلی بار تھا کہ اس نے ثنا کو اتنی بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے اس سے کوئی فرمائش کی ہو۔ صبح ہی کی طرح وہ ایک بار پھر حیران رہ گئی۔ ثاقب نے بھی کچھ چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا لیکن عاقب کسی کی بھی طرف متوجہ ہونے کے بجائے آفاق سے مخاطب تھا۔

''میرے بیٹے نے ناشتا کر لیا؟ ممانے کیا بنایا ہے بیٹے کے لیے؟ کسٹرڈ، لاؤ میں کھلاتا ہوں اپنے بیٹے کو۔'' اس نے میز پر رکھا کسٹرڈ کا باؤل اپنی طرف سرکا کر آفاق کو چمچ کی مدد سے کھلانا شروع کر دیا۔ یہ بھی آج پہلی بار ہوا تھا کہ ثنا کے لیے مما کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ آفاق اسے چھنا کہتا تھا تو سب بھی یہی لفظ ادا کرنے لگے تھے لیکن عاقب کی بات سے پہلی بار سب کو احساس ہوا کہ اب آفاق کو ثنا کو مما کہنا ہی مناسب ہے کیونکہ وہ اس کی ماں کے منصب پر فائز ہو چکی ہے۔

''میری اسکائی بلیو شرٹ اور اس کے ساتھ میچنگ ٹائی وغیرہ نکال کر رکھ دو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو چکے تو عاقب نے ایک بار پھر شوہرانہ استحقاق کے ساتھ ثنا سے فرمائش کی۔

''ابھی میں میز صاف کر رہی ہوں۔'' صبح سے اس کے بدلے بدلے تیور محسوس کرتی ثنا نے کچھ جز بز ہو کر جواب دیا۔ سب کی موجودگی میں صاف انکار تو نہیں کر سکتی تھی۔

''نو پرابلم ...... آج میں ذرا لیٹ آفس جاؤں گا، تم اپنے کام سے فارغ ہو کر اطمینان سے کپڑے نکال دینا۔'' عاقب نے سابقہ انداز میں جواب دیا اور آفاق کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کی گود میں بیٹھا ہونے کے باوجود دادا کے ساتھ چہلیں کر رہا تھا۔

''یہ کام میں نمٹا لوں گی بھابی ...... آپ جا کر عاقب بھائی کا ڈریس نکال دیں۔ میں نے تو رات ہی

عاقب کے کپڑے تیار کردیے تھے۔" نہایت فراخ دلی سے اسے پیشکش کرتی اریبہ نے آخر میں ایک طرح سے اس پر اس کی نااہلی بھی جتادی تھی۔ ثنا تلملاتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ کسی سے کیا کہتی کہ عاقب نے اسے اپنی زندگی میں اتنی جگہ ہی نہیں دی تھی کہ وہ اس کی وارڈ روب میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت کرپاتی۔ وہ تو ایسے میاں بیوی تھے جو بس ایک دروازے سے بیڈروم میں داخل ہوتے تھے، اور اس کے بعد دوسرا فریق اپنی یادوں کی دنیا میں جاکر بس جاتا تھا۔ بہت عجیب سے احساسات کے ساتھ اس نے عاقب کے حکم کی تعمیل کی۔ عاقب تیار ہوکر روانہ ہوا تو خلافِ معمول مزاج خوشگوار محسوس ہورہا تھا۔ گاڑی باہر نکالتے ہی اسے اپنے چچا شیخ افضل نظر آگئے۔ گاڑی کا بونٹ اٹھائے وہ کچھ پریشان سے لگ رہے تھے۔

"خیریت چچا جان، کیا گاڑی گڑبڑ کررہی ہے؟" اس نے ان سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا، پتا نہیں کیا مسئلہ ہے، اسٹارٹ ہی نہیں ہورہی اور آدھے گھنٹے میں مجھے ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے آفس پہنچنا ہے۔" انہوں نے پریشانی سے بتایا۔

"کوئی مسئلہ نہیں آپ اِدھر آجائیں، میں آپ کو ڈراپ کردوں گا۔" اس نے پیشکش کی جو انہوں نے قبول کرلی۔

"ثنا کیسی ہے؟ دو دن سے اس نے ہماری طرف والے پورشن میں چکر نہیں لگایا۔" گاڑی آگے بڑھی تو انہوں نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"ٹھیک ہے، اصل میں بیچاری آفاق اور گھر کی ذمے داریوں میں بہت زیادہ مصروف ہوگئی ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ آپ یاد کررہے ہیں۔" عاقب نے کچھ شرمساری سے جواب دیا۔ اسے ثنا کی قربانیوں کا احساس ہورہا تھا۔ اس کے گھر اور بچے کو سنبھالنے میں وہ اتنی بری طرح مصروف ہوگئی تھی کہ دیوار کے اُس طرف موجود اپنے والدین سے ملاقات کے لیے بھی نہیں جاپاتی تھی اور جواب میں وہ اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کررہا تھا۔

"تم شرمندہ مت ہو، شادی شدہ زندگی میں آکر لڑکیاں اسی طرح مصروف ہوجاتی ہیں۔ میں نے تو یونہی برسبیل تذکرہ تم سے اس کے بارے میں پوچھ لیا تھا۔" شیخ افضل نے اس کی شرمندگی کو محسوس کرکے نرمی سے تسلی دی اور مزید بولے۔ "میں اور صبیحہ تو خوش نصیب ہیں کہ بیٹی نظروں سے اتنے قریب بیاہی گئی ہے کہ جب دل چاہے اس کی صورت دیکھ سکتے ہیں ورنہ لوگوں کی بیٹیاں تو سات سمندر پار بھی بیاہی جاتی ہیں اور والدین برسوں ان سے ملاقات کے لیے ترستے ہیں۔ ہمیں ثنا کی طرف سے بڑا اطمینان ہے کہ وہ اپنوں کے درمیان ہے اور تم جیسا ذمے دار لڑکا اس کا شوہر ہے۔ سچ یہ ہے کہ تمہاری اور اس کی شادی حالات کے اعتبار سے ایک بہترین فیصلہ تھا۔ اب ہم بیٹی کے ساتھ، ساتھ نواسے کی طرف سے بھی مطمئن ہیں کہ وہ ویسی ہی محبت کے سائے میں پلے گا جیسی محبت اسے اس کی اپنی ماں دیتی۔" شیخ افضل بولتے جارہے تھے اور عاقب کی شرمندگی بڑھتی جارہی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ قدرت کے اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکاری رہا تھا جس کی تائید اس کے سب محبت کرنے والوں کی طرف سے مسلسل ہوتی آرہی تھی۔ بہر حال ابھی بہت دیر نہیں ہوئی تھی اور غلطیوں کا ازالہ کیا جاسکتا تھا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا اور ہموار سڑک پر سبک رفتاری سے گاڑی چلاتا رہا۔

☆☆☆

"اور کہہ دیجیے ایمان والیوں کو نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں اور تھامتی رہیں اپنے ستر کو اور نہ دکھلائیں اپنا سنگار مگر جو کھلی چیز ہے اس میں سے اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبان پر اور نہ کھولیں اپنا سنگار مگر اپنے خاوند کے آگے یا اپنے باپ کے یا اپنے خاوند کے باپ کے یا اپنے بیٹے کے یا اپنے خاوند کے بیٹے یا اپنے بھائی کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنی

عورتوں کے یا اپنے ہاتھ کے مال کے یا کاروبار کرنے والوں کے جو مرد کہ کچھ غرض نہیں رکھتے یا لڑکوں کے جنھوں نے ابھی نہیں پہچانا عورتوں کے بھید کو اور نہ ماریں زمین پر اپنے پاؤں کو کہ جانا جائے جو چھپاتی ہیں اپنا سنگھار اور توبہ کرو اللہ کے آگے سب مل کر اے ایمان والو تا کہ تم بھلائی پاؤ۔“

سورۂ نور...... آیت ۳۱

ترجمہ: شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ

عاقب کے رویے میں آنے والی تبدیلی نے ثنا کو چونکا دیا تھا۔ کہنے کو بہت عام سی اور معمولی سی باتیں تھیں لیکن بطور عورت اس کی حسیات چونک اٹھی تھیں۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ تبدیلی رویے میں ہی نہیں دیکھنے کے انداز میں بھی آئی تھی۔ پہلی بار اس نے عاقب کی ویران آنکھوں میں اپنے لیے جذبوں کے رنگ دیکھے تھے اور یہ سب اتنے عجیب وقت پر ہوا تھا کہ اس کا ذہن ڈھنگ سے کام نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اپنے طور پر عاقب سے تجدید تعلق کر کے اپنے طور پر اپنی ویران زندگی میں رنگ بھرنے کا بندوبست کر چکی تھی ایسے میں عاقب کے اندر در آنے والی تبدیلی نے اسے کچھ حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس کی روانگی کے بعد وہ الجھی، الجھی سی اپنے روٹین کے کام انجام دے رہی تھی۔ اریبہ بھی آس پاس ہی موجود تھی۔ صبح صبح اس کی کسی سہیلی کا ڈرائیور اسے کوئی سی ڈی دے کر گیا تھا اور اس نے سی ڈی لاؤنج میں ہی رکھے پلیئر پر لگا دی تھی ان کے گھر میں بلند آواز میں ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر وغیرہ جیسی چیزیں چلانے کا رواج نہیں تھا لیکن اریبہ نے جو سی ڈی لگائی تھی اس پر سورۂ نور کی تلاوت مع ترجمہ اور تشریح چل رہی تھی اس لیے کسی کے ٹوکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آفاق کے آگے کھلونوں کا ڈھیر لگائے اسے بہلانے میں مصروف ثنا بھی قدرے بے دھیانی سے تلاوت و ترجمہ مع تفسیر سنتی جا رہی تھی۔ بہ حیثیت مسلمان اس کے لیے سورۂ نور کا موضوع کوئی نیا نہیں تھا۔ وہ اس سورہ میں بیان کیے گئے مسائل...

اقوالِ زریں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا:

☆ سب سے بڑی بہادری صبر کرنا ہے۔
☆ سب سے بڑی بلا نا امیدی ہے۔
☆ سب سے بڑی تفریح مصروفیت ہے۔
☆ سب سے بڑا استاد تجربہ ہے۔
☆ سب سے بڑا فائدہ نیک و صالح اولاد ہے۔
☆ سب سے بڑا تحفہ درگزر کرنا ہے۔
☆ سب سے بڑا سرمایہ خود اعتمادی ہے۔
☆ سب سے بڑا راز موت ہے۔
☆ اور سب سے بڑی دولت اچھا اور مخلص دوست ہے۔

مرسلہ: ماہ نور قیصر، راول پنڈی

سے بھی واقف تھی اور عورتوں کو دیے جانے والے پردے کے احکامات سے بھی لیکن اکتیسویں آیت کے ترجمے نے خود بخود اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

”میری پیاری مسلمان بہنو...! اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان افراد کی پوری لسٹ دے دی ہے جو عورت کے لیے محرم ہیں اور جن کے سامنے اس کا آزادانہ آنا جانا جائز قرار دیا گیا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں کچھ ایسی روایات نے جگہ بنالی ہے کہ مسلمان خواتین کے حکم کی صریح نافرمانی کرتے ہوئے ان حضرات سے بھی میل جول اور ربط رکھتی ہیں جو اُن کے لیے قطعی نامحرم ہیں۔ بالکل غیر اور انجان مردوں سے ہٹ کر ان افراد میں کچھ قریبی رشتے بھی آتے ہیں جیسے چچا زاد، ماموں زاد، خالہ زاد اور پھپھی زاد بھائی، دیور اور جیٹھ وغیرہ...... ہمارے ہاں خاندانی نظام کچھ اس طور چلائے جا رہے ہیں کہ خواتین کے لیے چاہتے ہوئے بھی ان افراد سے پردہ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ خصوصاً مشترکہ خاندانی نظام میں تو یہ کام

بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس برائی کو سب نے مجبوری سمجھتے ہوئے ہیں بلکہ ہنسی، خوشی قبول کرلیا ہے۔ خواتین ان نامحرم افراد کے سامنے محتاط رویوں کا اظہار تک کرنا بھول جاتی ہیں اور انہیں یہ خیال تک نہیں رہتا کہ اپنی اوڑھنیوں کو حکم کے مطابق ڈھنگ سے پھیلا کر اوڑھ لیں۔ بعض گھرانوں میں تو ایسی بے تکلفی دیکھنے میں آتی ہے کہ کزنز کے درمیان زبانی ہنسی مذاق کے علاوہ ہاتھ یا کندھوں پر ہاتھ مار کر بات کرنا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ خواتین اپنے نامحرم کزنز کے ساتھ گھر سے باہر گھومنے تک چلی جاتی ہیں۔ الٹرا ماڈ گھرانوں میں تو یہ تعلق و بے تکلفی کزنز کی حد سے نکل کر کلاس فیلوز اور دیگر اقارب تک بھی پہنچ جاتی ہے اور یہی آزادی آگے چل کر معاشرے میں خرابیوں کو پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ ذرا سوچیے جہاں عورت کو زمین پر زور سے پیر مارنے سے بھی روکا جا رہا ہو کہ کہیں اس کا پوشیدہ سنگار (پازیب وغیرہ) نامحرموں پر ظاہر نہ ہو جائے وہاں ایسی آزادی کی بھلا کیا گنجائش نکلتی ہے۔ اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے جب ہم ایسی گنجائش نکالتے ہیں تو پھر سزا بھی بھگتنی پڑتی ہے۔ یہ جو آئے دن ہم ٹی وی چینلز اور اخبارات میں رشتوں کی پامالی کی بھیانک خبریں دیکھتے اور پڑھتے رہتے ہیں یہ ہمارے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ خرابیاں ہیں۔ حدود کو توڑا جائے گا تو نتائج تو بھگتنے ہی پڑیں گے۔ اس لیے میری پیاری بہنو! اگر اپنے گھروں اور معاشرے کو تباہی سے بچانا چاہتی ہو تو نظروں کو نیچے رکھنے والی اور اپنی عزتوں کی حفاظت کرنے والی مومنات میں سے ہو جاؤ۔"

خطیبہ آیات کی تشریح میں اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں لیکن ثنا تو اندر تک سن ہو چکی تھی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ بظاہر بے نیازی سے سبزی بناتی اریبہ نے یہ سی ڈی یہاں کیوں لگائی ہے۔ وہ اس کی اور ثاقب کی چوری پکڑ چکی تھی اور بجائے اس کے کہ اس بات پر کوئی ہنگامہ کرتی بہت خاموشی سے اسے احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔ اریبہ کے اس طرز عمل نے ثنا کو شرم سے پانی، پانی کر دیا تھا اور عرق آلود پیشانی لیے وہ زیادہ دیر تک وہاں بیٹھے رہنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔

"کنیز یہ میٹھی توڑ دی ہے لے جاؤ۔" اریبہ نے بظاہر اس کی حالت کی طرف سے دانستہ بے نیازی برتتے ہوئے کچن میں کام کرتی کنیز کو آواز دی تو اسے اپنے دل میں بہت آسودگی محسوس ہوئی۔ ثاقب اور ثنا کے درمیان پلتے تعلق نے اسے بہت ڈسٹرب کر دیا تھا۔ رات بھر روتے رہنے کے بعد اسے کچھ نہیں سوجھا تو فجر کے بعد اپنی ایک قریبی سہیلی کو فون کر کے ساری بات کہہ ڈالی۔ اس طرح وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے ساتھ، ساتھ کسی اچھے مشورے کی طلب گار بھی تھی۔ اس کی یہ سہیلی دینی تعلیم دینے والے ایک اچھے ادارے کی طالبہ بھی اور بہت خوش اطوار لڑکی سمجھی جاتی تھی۔ اس نے بہت تسلی سے اریبہ کی ساری بات سنی اور اس سے ثنا کے متعلق کچھ سوالات کیے۔ ان سوالات کے جوابات سننے کے بعد اس نے کہا۔

"میں تمہیں کچھ دیر میں ایک سی ڈی بھجواتی ہوں۔ اس سی ڈی کو کسی ایسے مقام پر چلانا جہاں تمہاری جیٹھانی بھی اسے سن سکے۔ تم سے ان کے بارے میں جاننے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بنیادی طور پر کوئی بری خاتون نہیں ہیں اور کچھ وجوہات کی بنا پر ان کے قدم ذرا بہک گئے ہیں۔ ایسے لوگوں تک اگر بروقت اللہ کا پیغام پہنچایا جائے تو ان کے سنبھلنے کا بہت امکان ہوتا ہے۔ ہاں اگر اللہ نے دل پر مہر لگا دی ہو تو پھر میں اور تم کیا کر سکتے ہیں۔" اس کی سہیلی نے بہت رسان سے مسئلے کا حل پیش کیا تھا۔

"ٹھیک ہے بھجوا دو سی ڈی، دیکھتے ہیں کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں!" اریبہ زیادہ پرامید نہیں تھی۔

"اتنی مایوسی کا اظہار مت کرو۔ اللہ کا کلام سب سے زیادہ بہتر ہدایت دینے والا ہے۔ اللہ پر بھروسا کرنے کے بجائے اگر تم نے نادانی میں کسی قسم کا شور اور ہنگامہ کیا تو یہ خود تمہارے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

الزام لگاؤ گی تو تمہیں ثبوت بھی دینے ہوں گے اور تمہارے پاس اپنے احساسات کے سوا کوئی ثبوت نہیں...... احساس کو دلیل کے طور پر دوسروں سے نہیں منوایا جاسکتا۔ وہ دونوں دیور، بھابی ہونے کے علاوہ آپس میں کزنز بھی ہیں اور گھر والوں کے رویّے سے ظاہر ہے کہ ان کے درمیان یہ بے تکلفی کوئی نئی بات نہیں...... اس لیے اگر تم کوئی بات اٹھاتی ہو تو یاد رکھنا کہ اپنی جیٹھانی سے زیادہ تم خود لعن طعن کا شکار ہوگی۔ تمہیں تنگ نظر و تنگ دل قرار دیا جائے گا اور اچھے بھلے گھر کا سکون برباد ہوگا اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اس معاملے کو بہت سکون اور ٹھنڈے دل سے حل کرنے کی کوشش کرو۔" اس کی ذہین سہیلی نے اس کی نا امیدی فوراً بھانپ لی تھی۔ چنانچہ دھیمے لہجے میں اسے تنبیہ کی۔ سہیلی کی باتیں اریبہ کو سمجھ آگئیں اور پھر اس نے جب موقع دیکھتے ہوئے ثنا کی موجودگی میں سی ڈی لگادی [illegible] اس کی توقعات کے خلاف بہت زبردست تھا۔ اس نے اس کے چہرے پر وہ تاثر دیکھ لیا تھا جسے ندامت کے سوا کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اسے فوراً احساس ہوگیا کہ اللہ کے کلام نے ہدایت دینے کا کام انجام دے دیا ہے اور اس کی ازدواجی زندگی منجدھار میں سے نکلنے کو ہے۔

☆☆☆

تیز سرخ لپ اسٹک اپنے بھرے بھرے ہونٹوں پر لگانے کے بعد اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا بلاشبہ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ یہاں تک کہ بہت شدت سے رونے کی وجہ سے متورم ہو جانے والی آنکھیں بھی آئی لائنر لگانے کے بعد خوب صورت لگنے لگی تھیں۔ اپنی تیاری کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ بیڈ پر بیٹھ کر اپنا کھلونا پیانو بجانے کی کوشش میں مصروف آفاق کی طرف متوجہ ہوئی۔

"چلو بیٹا جی اب تمہیں بھی تیار کر دیں لیکن دیکھو پپا کے آنے تک اپنے کپڑے گندے بالکل نہیں کرنے ہیں ورنہ گھر پر ہی دادی کے پاس رکنا پڑے گا۔" بہت دنوں بعد اس کے لہجے میں آفاق کے لیے وہی محبت تھی جو اپنی الجھنوں میں الجھ کر کہیں گم سی ہوگئی تھی اور اس کی جگہ بیزاری نے لے لی تھی۔

"چھنا مما......" وہ اس کی بات سمجھا یا نہیں لیکن محبت کو محسوس کرنے کی جبلی حس نے اسے سمجھا دیا کہ آج اس کے پاس اس کی پرانی محبت کرنے والی چھنا لوٹ آئی ہے۔ خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے۔ ثنا اسے گود میں لینے کے لیے جھکی ہی تھی کہ کمرے کا دروازہ اچانک کھلا اور ثاقب اندر داخل ہوا۔ وہ اس وقت دوپٹا نہیں اوڑھے ہوئے تھی۔ ثاقب کے اس طرح اندر آنے پر تیزی سے پلٹی اور جانماز کے ساتھ سائڈ ٹیبل پر تہہ کر کے رکھی چادر جھپٹ کر اٹھانے کے ساتھ اپنے گرد لپیٹ لی۔ اس کے اس طرزِ عمل پر ثاقب حیران رہ گیا۔

"تمہیں اندر آنے سے پہلے دروازہ ناک کرنا چاہیے تھا۔" ابھی وہ اپنی پہلی حیرت سے نہیں سنبھلا تھا کہ ثنا کے جملے نے مزید حیران کر دیا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ آج وہ کس موڈ میں ہے۔

"سوری...... میں تم سے یہ کہنے آیا تھا کہ ایکسپو میں لان کی ایگزی بیشن لگی ہے چلو وہاں چلتے ہیں۔" ثنا کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر تھا کہ وہ اسے اس کے اس نئے رویّے پر ٹوکنے کے بجائے سٹپٹا کر وضاحت کرنے لگا۔

"تم اریبہ کو لے جاؤ۔ عاقب کا فون آیا تھا کہ میں اور آفاق تیار رہیں وہ ہمیں ڈراپ کرتے چلے جائیں گے۔" اس کی طرف سے رخ پھیرے اس نے رکھائی سے جواب دیا تو ثاقب ہونٹ بھینچتا ہوا باہر نکل گیا کچھ نہ سمجھ آنے کے باوجود اتنا تو وہ سمجھ چکا تھا کہ کایا پلٹ چکی ہے۔

"میں نے تمہیں تمہارا ثاقب واپس لوٹا دیا ہے اریبہ...... امید ہے اپنی سمجھداری اور محبت سے کام لے کر تم اسے دوبارہ اپنا بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔" ثاقب کے باہر نکل جانے کے بعد وہ زیرلب بڑبڑائی اور آفاق کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس نے سرخ اور فان کے امتزاج کا سوٹ پہنا تھا اور اسی مناسبت سے آفاق کے کپڑے بھی منتخب کیے تھے۔ ان کپڑوں کے ساتھ میچنگ

جوتے وغیرہ پہننے کے بعد وہ اور بھی پیارا لگنے لگا۔ ثنا نے چٹاچٹ اس کے رخسار پر کئی بوسے لے ڈالے۔

''کیا بات ہے بھئی ماں بیٹے کی..... آپس میں ایسے لاڈ ہو رہے ہیں کہ ہمارے آنے کی بھی خبر نہیں ہے۔'' عاقب جو اس نظارے کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا اور شرمندہ بھی کہ آفاق سے اتنی محبت کرنے والی لڑکی کو بے جا تنقید و تضحیک کا نشانہ بناتا رہا۔ شوخ لہجے میں بول کر اپنی آمد کا احساس دلانے لگا۔

''سوری، پتا نہیں چلا کہ آپ آگئے ہیں۔'' ثنا نے نظریں جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔ عاقب کی آنکھوں میں آج جو جذبے نظر آرہے تھے وہ اس کے لیے نئے تھے، اس لیے تھوڑی سی نروس ہو رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں.... یہ اچھا ہوا کہ تم لوگ تیار ہوگئے۔ میں بس ابھی پانچ منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔'' نرمی سے بولتا ہوا عاقب آگے بڑھ گیا۔ اس کے سابقہ بیڈروم میں اس کا سیاہ ڈنر سوٹ تیار رکھا تھا۔ سوٹ اٹھاتے ہوئے اس نے ایک نظر حنا کی تصویروں پر ڈالی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ تم میرے دل میں ہمیشہ بسی رہوگی لیکن اس محبت کے نام پر اب میں ثنا کو مزید ذہنی اذیت دینے کی غلطی جاری نہیں رکھ سکتا۔ تمہاری یادوں کو اپنے دل میں چھپا کر اب مجھے اس کے حقوق ادا کرنے ہی ہوں گے۔'' آہستہ سے کہہ کر وہ واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ حنا کی ان تصویروں اور دیگر چیزوں کو کل ہی الماری میں بند کر کے رکھ دے گا کہ یادوں کا یہ خزانہ صرف اس کی ملکیت تھا اور ضروری نہیں تھا کہ وہ اس سے کسی اور کی اذیت کا سامان کرتا۔ تیار ہو کر وہ ثنا والے بیڈروم میں واپس آیا تو وہ اپنے گرد ایک بڑی سی چادر لپیٹے کھڑی تھی۔

''خیریت یہ اتنی بڑی تبدیلی؟'' وہ حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''آج تو ہے ہی تبدیلیوں کا دن۔'' ثنا نے لطیف سے انداز میں خود پر سے توجہ ہٹا کر اس کے رویّے کی تبدیلی کی طرف توجہ دلائی۔

''ہاں یہ تو ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ساری مثبت تبدیلیاں آرہی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں تمہیں دیکھ رہا تھا تو تم مجھے اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ میرے دل میں خود بخود یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ تمہیں ساری دنیا کی نظروں سے چھپالوں۔'' عاقب کے اس بے ساختہ اظہار پر اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی اور یوں اچانک چادر اوڑھنے پر اس کی طرف سے اعتراض کا جو ڈر تھا وہ خود بخود ہی دور ہوگیا۔ سچ ہے کہ جب انسان اللہ کی طرف ایک قدم بڑھاتا ہے تو وہ خود اس کی طرف دس قدم بڑھ کر آتا ہے۔ مشکلیں خود ہی حل ہوتی جاتی ہیں۔ عاقب کے ساتھ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اس کے دل میں جو ایک اطمینان اور احساسِ تحفظ تھا وہ اس سے قبل کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔

''سوری ثنا..... میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا اور مسلسل تمہاری انسلٹ کرتا رہا لیکن کل رات مجھے خود بخود ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور میں نے اپنے دل میں عہد کیا کہ میں خود کو بدل کر تمہیں وہ ساری خوشیاں دینے کی کوشش کروں گا جو تمہارا حق ہے اور جن پر میں اختیار رکھتا ہوں۔'' ڈنر کا آرڈر دینے کے بعد عاقب نے اس کا ہاتھ تھام کر یہ چند جملے کہے تو وہ ششدر رہ گئی اور اسے احساس ہوا کہ اللہ کتنا مہربان ہے۔ وہ ایمان والی ہو کر راہ سے بھٹکنے لگی تھی تو ایک طرف اس نے اریبہ کے وسیلے اس کے بھٹکے ہوئے قدموں کو روکنے کا بندوبست کیا اور دوسری طرف اس کے شوہر کا دل بھی اس کی طرف موڑ دیا۔ اسے یقین تھا کہ عاقب کی محبت کی پناہوں میں اب اس کے قدم کبھی نہیں بھٹکیں گے کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ جب ایمان والیاں اپنی نظروں کو جھکائے اپنی عزت کی حفاظت کا عہد کرلیں تو کوئی ترغیب ان کے قدموں کو نہیں اکھاڑ سکتی۔ اسے خوشی تھی کہ وہ بروقت پلٹ آئی تھی اور ابھی اس کے لیے توبہ کے ساتھ ساتھ زندگی کی نعمتوں اور خوشیوں کے در بھی کھلے تھے۔



ذکر... قربِ الٰہی

تمام تعریف اللہ رب العزت کے لیے ہے کہ اس نے اپنی ذات کو ہمیں پہچنوایا اور حمد و شکر کا طریقہ سمجھایا اور اپنی عنایات سے علم و فضل کے دروازے ہمارے لیے کھول دیے۔ ہماری رہنمائی فرمائی۔ ایسی حمد جس کے ذریعے ہم اس کے شکر گزاروں میں شامل ہو جائیں اور اس کی خوشنودی اور بخشش کی طرف بڑھنے والوں میں سبقت لے جائیں۔ ایسی حمد جس کی بدولت ہمارے لیے برزخ کی سختیاں آسان ہو جائیں اور جو ہمارے لیے قیامت کی راہوں کو آسان کر دے...... اور حشر کے مجمع عام میں ہماری قدر و منزلت کو بلند کر دے۔ تمام تعریف اس اللہ کے لیے کہ جو معبودِ حقیقی ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے جو ذاتِ لم یزل ہے۔

''اے وہ! جس کی بزرگی و عظمت کے عجائب ختم ہونے والے نہیں۔ تو محمد ﷺ اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما...... اور اپنی رحمت میں ہمارا بھی حصہ قرار دے...... آمین۔'' آج کے اس مشینی دور میں کوئی گھر ایسا نہیں جہاں بدامنی اور بے چینی نہ پائی جاتی ہو۔ ہر سمت نفسا نفسی کا عالم ہر فرد نفسانی خواہشات کا شکار اور ہر طبقۂ انسانی مادہ پرستی کی اس دوڑ میں سبقت لے جانے کی فکر میں کوشاں ہے۔ ایسے میں آخر سکون اور اطمینان کہاں ملے گا؟ آئیں اللہ کے عظیم کلام قرآن کریم سے سوال کرتے ہیں کہ اے اللہ کے سچے اور پاکیزہ کلام! تو ہی ہماری رہنمائی فرما...... تو جواب ملتا ہے۔

ترجمہ ''یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو تسلی حاصل ہوتی ہے۔''

(پارہ 13 سورۂ رعد آیت 28)

گویا یہ بے چینی اور بے سکونی ذکرِ الٰہی سے غفلت کی وجہ سے ہے۔ اللہ کا ذکر دل کی غذا ہے اور دل اگر اپنی غذا نہ پائے تو بے چین ہو جاتا ہے تو ذکر اللہ ہی ایک ایسا اکسیر روحانی نسخہ ہے جو عام باطنی غلاظتوں اور آلودگیوں کو صاف کرنے کے لیے ریگ مال کا کام کرتا ہے۔ خود سرکارِ دو عالم ﷺ کا قولِ مبارک ہے کہ ''ہر شے کو چمکانے کے لیے روغن کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر تم دلوں کو نورِ ایمان سے بھرنا چاہو تو انہیں پہلے اللہ کے ذکر سے صیقل (صاف) کر لو کہ دلوں کی چمک اور رونق ذکرِ الٰہی ہے۔'' اسی طرح ایک اور فرمانِ مبارک ہے کہ شیطان شخص کے دل پر جم کر بیٹھ جاتا ہے مگر جب وہ شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے...... (صحیح بخاری) اس فرمانِ نبویؐ کے مطابق وہی لوگ شیطانی اثرات سے محفوظ رہتے ہیں جو کثرت سے ذکرِ الٰہی کرتے ہیں اور جو لوگ اس سعادت سے محروم ہیں ان کے دل بلاشبہ شیاطین کے گھر ہوتے ہیں۔

الغرض اللہ تعالیٰ کا ذکر بندگی کی اولین شرط بھی ہے اور محبت کی علامت بھی...... ذکر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں یاد کرنا...... بھولی ہوئی چیز کی یاد تازہ کرنا...... اسے بار بار ذہن میں لانا...... دینی اصطلاح میں ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔ یوں ذکر کی اصطلاح بہت وسیع ہے۔ نماز ذکر ہے، قرآن ذکر ہے، اللہ کو یاد کرنا ذکر ہے۔ اسمائے حسنٰی اور قرآنی کلمات کو دہرانا ذکر ہے۔

حضرت ثابت نباتیؒ فرماتے ہیں کہ ''مجھے معلوم ہے کہ میرا پروردگار مجھے کس وقت یاد کرتا ہے۔'' لوگ ان سے ڈر گئے اور پوچھا۔ کہ آپ کو کیسے پتا چلا...... فرمایا۔

''جب میں اسے یاد کرتا ہوں، وہ مجھے یاد کرتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے کہ......

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا کرو۔'' (سورۂ احزاب آیت 41)

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ......

ترجمہ: ''جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی اور لیٹے ہوئے بھی۔''

(سورۂ آل عمران آیت 191)

مزید ارشاد ہے کہ......

ترجمہ: ''اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔''

(سورۂ عنکبوت آیت 45)

اور ذکرِ الٰہی سے دور ہونے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے، کہ اس شخص کی معیشت تنگ کر دی جاتی ہے۔ ارشاد ربّ العزت ہے۔

ترجمہ: ''جس نے میری یاد سے روگردانی کی اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔''

(سورۂ طٰہٰ آیت 124)

ان تمام باتوں سے ہمیں ''ذکر'' کی اہمیت اور فضیلت کا احساس ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''ذکرِ الٰہی کو چھوڑ کر آدمی کا کوئی بھی عمل عذاب سے بچانے والا نہیں...... صحابہ اکرامؓ نے عرض کی...... یا رسول اللہ...... خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا بھی نہیں......؟ آپ نے فرمایا راہِ خدا میں جہاد بھی نہیں مگر اس صورت میں کہ اپنی تلوار سے اتنا مارے کہ ٹوٹ جائے پھر اس سے ضربیں لگائے کہ ٹوٹ جائے۔'' ایک اور جگہ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا۔

''جب تم جنت کے باغات کے پاس سے گزرو تو ان میں چرو......'' صحابہ اکرام نے سوال کیا...... یا رسول اللہ! جنت کے باغات کون سے ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔'' ذکر کے حلقے۔'' حضور اکرم ﷺ نے فرمایا...... اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ ''جب بندہ مجھ کو دل میں یاد کرتا ہے تو میں بس اس کو دل میں یاد کرتا ہوں یعنی میرے سوا کسی کو اس کی خبر نہیں ہوتی...... اور جب مجمع میں یاد کرتا ہے تو اس میں اس کو اس سے بہتر مجمع میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ مجھ سے قریب ہوتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور وہ اگر میری طرف آہستہ چلتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔'' حضور اکرمؐ کا ارشادِ مبارک ہے۔

''سات شخص ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ روزِ حشر اپنے سائے میں جگہ دے گا اس روز کہ جب سوائے اس کے سایہ کے اور کوئی سایہ نہیں ہوگا ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کو تنہائی میں یاد کیا ہو اور اس کے خوف سے رویا ہو۔''

☆☆☆

ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام جنگل میں ذکرِ الٰہی کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ انہیں خیال آیا کہ اس جنگل میں شاید میرے سوا کوئی اللہ کا ذکر نہ کرتا ہوگا۔ تب اللہ تعالیٰ نے درندوں اور پرندوں کو حکم دیا کہ ہمارے ذکر کی آواز بلند کرو تو اس قدر ذکرِ اللہ کا شور بلند ہوا کہ حضرت موسیٰ سجدے میں گر گئے۔ اور عرض کیا...... اے اللہ! کیا زمین کے نیچے بھی تیرا ذکر ہوتا ہے...... حکم ہوا اپنا عصا زمین پر مارو...... جب انہوں نے عصا مارا تو زمین شق ہوئی اور پانی جوش مارتا ہوا نظر آنے لگا حکم ہوا اس پر بھی عصا مارو آپ نے اس پر بھی عصا مارا تب ایک سیاہ پتھر نمودار ہوا پھر حکم ہوا کہ اس پر بھی عصا مارو...... آپ نے جب پتھر پر عصا مارا تو ایک سبز جانور نکلا جو اللہ کا ذکر کر رہا

تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا تیری پیدائش کو کتنا زمانہ گزرا..... اس نے کہا تین سو برس، آپ نے پھر پوچھا..... تیرا کام کیا ہے.....؟ اس نے کہا کہ اللہ کے ذکر سے بہتر کون سا کام ہے۔

''اے موسیٰ مجھے دن میں دو بار پانی دیا جاتا ہے مگر میں اس خوف سے نہیں پیتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پانی میں منہ ڈالوں اور موت کا فرشتہ آجائے.....'' یہ کہہ کر وہ اندر غائب ہوگیا..... اور پتھر پانی کے نیچے چلا گیا پھر زمین برابر ہوگئی۔

ایک بار حضرت داؤدؑ اپنے حجرے میں بیٹھے زبور شریف پڑھ رہے تھے کہ مٹی میں سے ایک سرخ کیڑا نکلا..... انہوں نے اپنے دل میں کہا..... کہ اس کیڑے کو اللہ تعالیٰ نے کس بات کے لیے بنایا ہے؟ اسی وقت اللہ نے کیڑے کو حکم دیا اور وہ کہنے لگا۔

''اے اللہ کے نبیؑ..... ! میرا دن ایسا ہے کہ اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ روز ایک ہزار بار یہ پڑھا کروں.....''

سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکۡبَر

اللہ پاک ہے اور اللہ کی حمد ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔'' اور میری ہر شب اس طرح گزرتی ہے کہ رات کو میرے اللہ نے میرے اندر یہ بات ڈال دی ہے کہ ہر رات کو ایک ہزار بار یہ درود شریف پڑھوں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَسَلِّمۡ

اللہ محمد نبی امی ﷺ پر رحمت فرما.....اور آپ کی آل و اصحاب پر سلامتی فرما۔

اب آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں تاکہ میں آپ سے استفادہ کروں..... ! حضرت داؤد علیہ السلام اس کیڑے کو حقیر جاننے پر شرمندہ ہوگئے.....اور اللہ سے ڈر کر توبہ کی اور اسی پر بھروسا کیا.....

☆☆☆

ذکر تین طرح کا ہوتا ہے۔

1۔ ذکر باللسان.....یعنی زبان سے ذکر کرنا.....مراد اللہ کی تسبیح، تقدیس، ثنا وغیرہ بیان کرنا ہے..... خطبہ..... توبہ.....استغفار، دعا وغیرہ بھی اس میں شامل ہے۔

2۔ذکر بالقلب.....دل میں اللہ کا ذکر.....اس کی نعمتوں کو یاد کرنا..... اس کی عظمت و کبریائی اور اس کے دلائلِ قدرت میں غور کرنا.....علما کا استنباط و مسائل، قرآن و حدیث سے مسائل اخذ کرنا.....اس میں غور کرنا بھی داخل ہے۔

3۔ذکر بالجوارح.....اس ذکر کا مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ کی عظمت و جلال پر غور کرے.....اس کی عظمت و سلطنت میں محو فکر ہو اللہ کی ذات و صفات پر جو نشانیاں قائم ہیں ان کو تلاش کرے اور اللہ کو یاد کرے مثلاً درندوں کی چیرہ دستی، قوت و ہیبت کو دیکھ کر اللہ کے قہر و غضب کو یاد کرے..... اولاد پر ماں کی شفقت دیکھ کر اللہ کی رحمت یاد کرے..... بلند و بالا پہاڑوں کو دیکھ کر اس کی عظمت و ہیبت کو یاد کرے۔

☆☆☆

حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جرجانیؒ کے پاس ستو دیکھے جن سے وہ اپنی بھوک مٹاتے تھے..... میں نے ان سے کہا کہ آپ کھانا اور دوسری اشیا کیوں نہیں کھاتے..... فرمایا..... میں نے روٹی وغیرہ چبانے اور یہ ستو کھا کر گزارہ کرنے میں 90 تسبیحات کا فرق پایا..... یعنی اس غذا کو استعمال کرنے کی بدولت میں 90 بار زیادہ اللہ کی پاکی بیان کرلیتا ہوں۔ لہٰذا چالیس سال سے میں نے روٹی نہیں چبائی.....سبحان اللہ!

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ''اللہ کا اس قدر کثرت سے ذکر کیا کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ کہنے لگیں۔'' حکایت ہے کہ ایک شخص رات کو ذکر اللہ میں مشغول تھا اور اس کی زبان پر اللہ، اللہ کا ورد

جاری تھا..... شیطان نے اس کو جھڑک کر کہا۔
اے شخص! کب تک اللہ، اللہ کی رٹ لگائے جائے گا اُدھر سے تو کوئی جواب نہیں ملتا اور تو ہے کہ مسلسل اسی کو پکارے جارہا ہے۔ شیطان کی بات سن کر اس شخص کا دل ٹوٹ گیا..... سر جھکا یا تو نیند آگئی۔ عالم خواب میں دیکھا کہ حضرت خضر تشریف لائے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ اے نیک بخت تو نے ذکر حق کیوں چھوڑ دیا.....؟ اس نے کہا کہ بارگاہِ الٰہی سے مجھے کوئی جواب نہیں ملتا..... اس لیے فکر مند ہوں کہ کہیں میرے ذکر اللہ کو رد ہی نہ کر دیا ہو.....
حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ مجھے بارگاہِ الٰہی سے حکم ہوا ہے کہ تیرے پاس جاؤں اور تجھ کو بتاؤں کہ تو جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے۔ وہی ہمارا جواب ہے..... تیرے دل میں جو سوز و گداز پیدا ہوتا ہے وہ ہمارا ہی تو پیدا کیا ہوا ہے..... اور یہ ہمارا ہی کام ہے کہ تجھ کو ذکرِ اللہ میں مشغول کر دیا ہے۔ تیرے ہر..... "یا اللہ" کہنے میں ہماری سو لبیک پوشیدہ ہیں۔ (بے شک اللہ کی دی ہوئی توفیق ہی ذکرِ الٰہی کا سبب ہے ورنہ بندۂ خاکی کی کیا حیثیت) اس حکایت میں ان لوگوں کے لیے درس ہے جو کہتے ہیں کہ ہمیں ذکر میں لذت نہیں آتی۔ ہماری دعا قبول نہیں ہوتی..... تو یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ جیسے مریض کا منہ کڑوا ہو جاتا ہے تو اس کو کوئی غذا اچھی نہیں لگتی..... اسی طرح ہم گناہوں کے مریض ہیں اور اسی وجہ سے ہمیں ذکر و عبادت میں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی..... تو جس طرح مریض دوا اور غذا کا استعمال نہیں چھوڑتا ہمیں بھی ذکر و عبادت کو ترک نہیں کرنا چاہیے..... جس پروردگار نے ہماری زبان کو اپنا ذکر کرنے کی توفیق بخشی ہے وہ ہمارے دلوں کو بھی یقیناً ذاکر بنا دے گا۔

☆☆☆

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ "ہر زندہ چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے..... اور ہر چیز کی تسبیح اس کے حسبِ حیثیت ہے۔"

حضرت سیدنا حسنؓ کا قول ہے کہ ذکر دو ہیں..... ایک اللہ کو تنہائی میں یاد کرنا جو عمدہ ہے اور اس کا بڑا اجر ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر ذکرِ الٰہی ہے کہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو یاد رکھے اور ان کاموں سے باز رہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔
حضور اکرم ﷺ نے فرمایا..... "جب کوئی جماعت ذکرِ الٰہی کے لیے اکٹھی ہوتی ہے تو فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ کی رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور اللہ اپنے مقربین میں انہیں یاد کرتا ہے۔" حضرت داؤدؑ نے بارگاہِ ربّ العزت میں عرض کی جب تو مجھے دیکھے کہ میں ذکرِ الٰہی کرنے والوں سے اٹھ کر غافلوں کے یہاں جارہا ہوں تو بے شک تو میرے پاؤں توڑ دینے یہ مجھ پر احسان ہوگا۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ نیک محفل مومن کے لیے دو لاکھ بری محفلوں کا کفارہ ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت "خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے" نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا..... یہ وہ شخص ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرے اور میرے اہلِ بیت سے محبت کرے جھوٹی محبت نہ ہو بلکہ سچی محبت ہو اور ہر مومن سے محبت کرے خواہ وہ حاضر ہو یا غائب خبردار ان کی محبت اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے پر ہو..... حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آسمان کے فرشتے اللہ کے ذکر کرنے والوں کے گھروں کو پہچانتے ہیں، ان کے گھر روشن ہوتے ہیں جیسے اہلِ زمین چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ ایک بازار میں گئے اور لوگوں سے فرمایا..... تم یہاں ہو اور مسجد میں حضور اکرم ﷺ کی میراث بانٹی جارہی ہے، لوگوں نے بازار کو ترک کر دیا اور مسجد میں گئے مگر وہاں انہوں نے کچھ بھی تقسیم ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تب لوگوں نے آپؓ سے پوچھا کہ ہم نے وہاں تو

کوئی میراث تقسیم ہوتے ہوئے نہیں دیکھی..... آپؒ نے پوچھا کہ وہاں لوگ کیا کررہے تھے؟ انہوں نے کہا کہ وہاں کچھ لوگ اللہ کا ذکر کررہے تھے اور کچھ قرآن مجید پڑھنے میں مشغول تھے..... آپؒ نے فرمایا..... یہی تو رسول ﷺ کی میراث ہے۔

☆☆☆

حضرت وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں۔ ''تعجب ہے ان لوگوں پر جو میت پر روتے ہیں جس کا جسم مردہ ہوچکا ہے اور اس پر نہیں روتے جس کا دل مردہ ہوچکا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد اور ذکر وعبادت کے لیے ہر جگہ رات کا ذکر بطورِ خاص فرمایا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

ترجمہ: ''اور اپنے رب کا نام صبح شام یاد کرو اور کچھ رات میں اسے سجدہ کرو اور بڑی رات تک اس کی پاکی بیان کرو.....''

(سورۂ دھر آیت 25-26)

ترجمہ: ''اور جو رات بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اور کھڑے ہو کر۔'' (سورۂ فرقان آیت 65)

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا..... تم پر لازم ہے کہ رات کو نماز (تہجد) پڑھو..... جو تمہارے رب کو راضی کرنے والی..... تمہارے گناہوں کا کفارہ بننے والی ہے اور تم سے پہلے کے نیک لوگوں کا طریقہ ہے۔ اور گناہوں سے روکنے والی بوجھ ہٹانے والی، شیطان کے مکر کو دور کرنے والی اور بدن سے بیماری دور کرنے والی ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے قیامِ لیل کو صالحین کا وصف قرار دیا ہے۔

☆☆☆

حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر میرا بندہ صبح اور اس کے بعد عصر کے بعد کچھ دیر کے لیے مجھے یاد کرے تو درمیانی وقت میں، میں ان کی ضروریات کا کفیل بن جاتا ہوں۔

حضرت رابعہ بصریؒ ابتدا میں کسی کی خدمت گزاری پر مامور تھیں..... تمام دن تابعداری میں گزر جاتا..... اور رات کو مالک کے سو جانے کے بعد ایک علیحدہ مکان میں جاکر مالکِ حقیقی اور اپنے خالق کی حضور میں گزارتیں اور تمام رات ذکر الٰہی، عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتیں..... کافی عرصہ گزر گیا ایک روز اتفاقاً آقا بیدار ہوگیا اس نے دیکھا کہ رابعہؒ وہاں موجود نہیں ہیں۔ تلاش کرتا ہوا باہر آیا تو دیکھا کہ خالی مکان سے گریہ وزاری کی آوازیں آرہی ہیں۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ حضرت رابعہ بصریؒ وہاں سجدے میں پڑی ہوئی اپنے رب کے حضور گریہ وزاری میں مشغول ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اے خالقِ کائنات تو خوب جانتا ہے کہ تیری یہ کنیز کا دل یہی چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت تیری ہی بندگی کرے مگر افسوس کیا کروں تمام دن دنیاوی آقا کی تابعداری سے فرصت نہیں ملتی..... البتہ رات کو اس کے سو جانے کے بعد تیرے حضور میں حاضر ہوتی ہوں..... مگر جانتی ہوں کہ بندگی کا حق ادا نہیں کرپاتی..... مگر تو سب کی سننے والا ہے اور تھوڑی عبادت کو بھی قبول فرمالیتا ہے۔ آقا نے جب رابعہ بصریؒ کے یہ الفاظ سنے تو وہ خوفِ الٰہی سے کانپ اٹھا۔ صبح ہونے کے ساتھ ہی اس نے نہایت تعظیم سے حضرت رابعہ بصریؒ کو بلایا اور معذرت کی اور کہا کہ میں بخوشی تمہیں آزاد کرتا ہوں..... حضرت رابعہ بصریؒ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور وہاں سے چل دیں۔

شہر سے باہر دریا کے کنارے ایک بوسیدہ مکان میں رہنا اختیار کیا وہاں وہ دن رات یادِ خدا میں مصروف رہتیں..... آپ کی اس قدر محنت و مشقت کو دیکھ کر ایک روز ایک شخص نے کہا کہ تم رات دن ذرا بھی آرام نہیں کرتیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ رب العزت غفور الرحیم ہے۔ اس نے انسان کو اس قدر دکھ تکلیف اٹھانے کو نہیں فرمایا..... یہ سن کر حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا..... بے شک یہ صحیح ہے

مگر کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میدانِ حشر میں ہر امت کے اعمال نامے اپنے اپنے نبیؐ کے روبرو کھولے جائیں گے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ جب میرا نامۂ اعمال کھلے تو بہت زیادہ نیک اعمال سے پُر ہو تو میرے آقا اور سردارِ انبیا ﷺ کو کمال جاہ و جلال حاصل ہو کہ اللہ اکبر جب امتِ محمد ﷺ کی ادنیٰ کنیز کے اس درجے کے نیک اعمال ہیں تو پھر اس امت کے ابرار علما و صلحا کی جماعتوں کے اعمال کا کیا حال ہوگا...... اور وہ کس درجے کے ہوں گے...... اللہ اکبر کیا عشقِ الٰہی ہے...... اللہ سب کو اپنا عشق عطا فرمائے، آمین۔

آپؒ ہمیشہ شب بیدار رہتی تھیں اور تمام رات میں کئی سو رکعت نفل ادا کیا کرتی تھیں۔ پھر فجر کی نماز ادا کر کے سستی رفع کرنے کے لیے تھوڑی دیر جانماز پر ہی بیٹھ جاتی تھیں اور اگر آنکھ لگ جاتی تو اچھل پڑتیں اور اپنے نفس کو بہت کچھ برا بھلا کہتیں کہ تو کب تک خوابِ غفلت میں رہے گا...... اے نفس......! کیا تجھے معلوم نہیں موت سر پر کھڑی ہے نہ معلوم کب وقت آجائے۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقرب لوگوں کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے اور سننے والوں کے دل بھی اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہوں...... اور یہ ان کا زادِ سفر بنے اور محبت و معرفت کی خوشبو ان تذکروں کے ذریعے دور تک پھیلتی جائے اور ہزاروں جانوں کو معطر کرتی جائے۔

الغرض انسان جب اپنے پروردگار اپنے خالق اپنے مالک اپنے محبوب ترین رب اللہ کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس ذکر کو اپنا وظیفہ بنالیتا ہے تو پھر یہی ذکر باعثِ اطمینان و سکون ہوجاتا ہے۔ اہلِ ذکر جب اللہ تعالیٰ کی یاد میں اپنا سفرِ محبت شروع کرتے ہیں تو سفر کا آغاز محبوب (اللہ) کے نام سے ہوتا ہے اور پھر یہ کثرتِ ذکر اسے مقامِ تبتل تک پہنچاتی ہے اور پھر جن خوش نصیبوں کو لذتِ دید کا کیف و سرور حاصل ہوتا ہے پھر وہ مقامِ فنائیت میں پہنچ کر حیاتِ جاوید حاصل کرلیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تمام اذکار کی توفیق عطا فرمائے...... اور اپنی محبت عطا فرما کر دنیا کے تفکرات سے آزاد کرے کہ یہی اصل عبادت اور روحِ بندگی ہے۔

☆☆☆

حرفِ آخر:

ان مضامین کو تحریر کرتے ہوئے ہمیشہ، ہمیشہ یک تکلیف دہ تشنگی باقی رہتی ہے کہ بہت کچھ باقی رہ گیا بہت کچھ لکھا جاسکتا تھا افسوس کہ حق ادا نہ ہوسکا۔ مضمون کی طوالت کا خوف بہت کچھ مختصر کرنے پر مجبور کردیتا ہے...... بہرحال اپنے اللہ رب العزت کے حضور دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں کہیں کوئی غلطی دانستہ یا نادانستہ ہوگئی ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، آمین۔

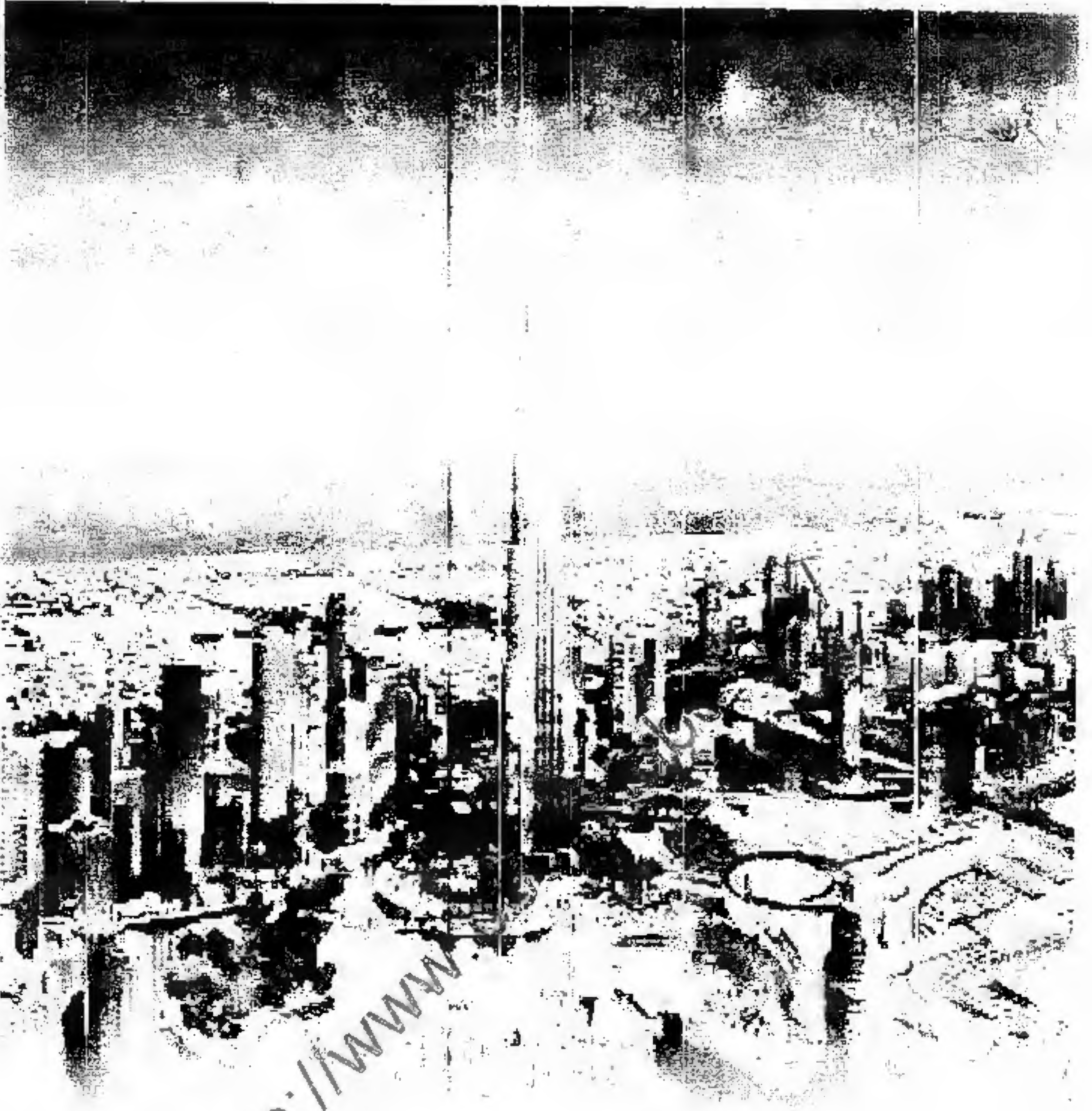
☆☆☆

اس مضمون کی تیاری میں، میں نے جن عظیم ہستیوں کی کتب سے استفادہ کیا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے...... ان پر اپنی خاص رحمتوں کا نزول فرماتا رہے، آمین یا اللہ...... اس ادارے کے تمام اراکین کو تمام تعاون کرنے والوں کو اور اس تحریر کے مطالعہ کرنے والوں کو بھی اس کے تمام علمی و عملی منافع عطا فرمائے...... اور اس کو ہمارے لیے سرمایۂ نجات اور توشۂ آخرت بنادے۔ (آمین)

ان عظیم ترین ہستیوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ حضرت امام محمد الغزالیؒ
2۔ مولانا مفتی جعفر حسین صاحب
3۔ مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب دہلوی
4۔ ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی صاحب
5۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب
6۔ مولانا ابو البلال محمد الیاس صاحب

☆☆☆



ہم دبئی کے ہو گئے

عظمیٰ آفاق سعید

جنت بھی جہنم بھی

کسی نے دبئی کے شیخ سے پوچھا۔ ”شیخ صاحب، ایک اسلامی ریاست میں آپ نے ہر طرح کی خرافات عام کررکھی ہیں۔ شراب، کباب، جوا، سٹہ، چھوکری، لاٹری کیا چیز ہے جو یہاں میسر نہیں۔ ایک اسلامی ملک میں کیا یہ سب کچھ معیوب نہیں؟“

شیخ صاحب مسکرائے اور پھر اپنے شاہی قہوے کی چسکی لیتے ہوئے گویا ہوئے۔

”اللہ نے آخرت میں دو چیزیں رکھی ہیں جنت اور جہنم، جو لوگ نیک عمل کریں گے وہ جنت میں

جائیں گے۔ ان پر انعامات و اکرامات کی بارشیں ہوں گی، سدا وہ خوش رہیں گے جبکہ جو بد عمل کریں گے شراب پئیں گے، جوا کھیلیں گے، زنا کریں گے، جھوٹ بولیں گے، کسی کا حق ماریں گے وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ کے لیے ڈالے جائیں گے اور عذاب ان کا مقدر بنے گا۔"

"بالکل ٹھیک، اس میں کیا شک ہے۔" درباری ان کی تمام باتوں سے اتفاق کر رہا تھا۔

"اسی طرح میں نے اپنے ملک میں جنت اور جہنم دونوں بنائے ہیں، چپے چپے پر ایک عالیشان مسجد، اپنے نمازیوں کے لیے تیار ہے۔ سننے والوں کے لیے پانچوں وقت کی اذانیں دی جا رہی ہیں جو نیک ہوگا، اسے یہاں عبادت گاہیں بھی نظر آئیں گی، اسلامی کتب خانے اور لائبریری بھی دکھائی دے گی۔ اسلامی اقدار بھی نظر آئیں گی اور اسلامی قوانین بھی جبکہ جو جہنمی ہوگا اسے صرف شراب، کباب، جوا خانہ اور اسی طرح کی خرافات دکھائی دیں گی۔"

تو یہ ہے ایک اسلامی ریاست کی حکومت، زمین پر جنت اور جہنم۔

ایک ملاقات رہے گی یاد

آفاق کے ایک دبئی میں رہائش پزیر کزن کو پتا چلا کہ ہم دبئی یاترا پر ہیں تو ہمیں اپنے گھر بلانے پر بضد ہو گئے۔ بہت مشکل سے انہیں منع کیا گیا۔

"بیچارے بہت محبت کے ہیں ورنہ کسی کو کیا پڑی ہے۔ آؤ بہت اچھا، نہ آؤ اس سے بھی اچھا....." میں نے آفاق سے کہا جو ابھی ابھی کوئی چوتھی بار ان کا فون رکھ چکے تھے۔

"ہاں کافی محبت کا ہے بھی میں نے اسے یہاں بلا لیا۔" آفاق مجھے اطلاع دے رہے تھے۔

"امبر کا گھر پتا ہے انہیں؟ کب آئیں گے؟ بیگم بھی ساتھ ہوں گی؟ امبر تو سب بچوں اور امی، ابو کو لے کر کچھ شاپنگ کرنے گئی ہے۔" میں نے ایک ہی سانس میں تمام سوالات جڑ دیے۔

"ہاں ہاں، ابھی آ رہا ہے اور امبر کا گھر اسے پتا ہے۔" آفاق بڑے نارمل انداز میں بتا رہے تھے۔

امبر کو فون کیا، تو اس نے دو گھنٹے تک آنے کا بتایا۔ جلدی، جلدی جگہ ٹھیک کی کہ کوئی آئے گا تو انسانوں والا گھر لگے۔ ہمارے اور امبر کے ملا کر آٹھ بچوں نے تو دھما چوکڑی مچا رکھی تھی۔ ابھی فریج کی رکھی چیزوں کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ مہمانوں کو کیا کھلایا پلایا جائے کہ بیل بج گئی۔

"ارے احمد آؤ، آؤ بڑی جلدی پہنچ گئے۔" آفاق اپنے کزن سے بغل گیر ہو رہے تھے۔

ان کی بیگم احمد صاحب سے جڑی بالکل ان کا بغل بچہ لگ رہی تھیں۔ جیسے کوئی ڈرا ہوا بچہ نامانوس ماحول میں آجائے اور اپنی ماں سے چمٹ جائے۔ یہی حال احمد صاحب کی "احمدن" کا بھی تھا۔

ان کے کزن شروع سے دبئی میں ہیں۔ شادی کو بیس سال ہو گئے تھے اس لیے میاں بیوی کی شکلیں کافی ملنے لگی تھیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بیس تیس سال کی شادی کے بعد میاں بیوی کی شکلیں اتنی ملنے لگتی ہیں کہ کیا کسی بھائی، بہن کی ملیں گی۔

ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب میں کچن کی طرف جانے لگی تو احمد صاحب بولے۔ "بھابی ہم کچھ نہیں کھائیں گے۔ ہمیں ابھی دعوت میں جانا ہے۔ بس آپ بیٹھ جائیں۔"

"نہیں میں کچھ نہیں کر رہی۔" میں بھی میزبانی کے تقاضے پورے کر رہی تھی۔

امبر کے فریزر سے شامی کباب نکالے، اب فرائی پین نہ ملے..... خیر بڑی مشکل سے ملا اس میں کباب تلنے کے لیے رکھے، ایک برنی سے بسکٹ ملے اسے پلیٹ میں سیٹ کیا..... ذرا غور کرنے پر دیکھا تو ان پر تھوڑی سی زیادہ نہیں کچھ چونٹیاں چل رہی تھیں خیر اسے جلدی، جلدی بھگائیں۔ گلاسوں میں کوک ڈالی، گلاس بڑے تھے اور کوک کم..... تو اس میں کمال مہارت سے ٹھنڈا پانی ملایا اور گلاس کو بھرا۔ فرائی پین نان اسٹک نہیں بلکہ اسٹک تھا۔ سارے کباب فرائی پین میں چپک

گئے۔ کس مصیبت سے ان کبابوں کو فرائی پین سے نجات دلائی یہ میں جانتی ہوں یا میرا خدا جانتا ہے۔ تلے چھ نفے جب پلیٹ میں رکھے تو نو ہوگئے۔ سارا تام جھام لے کر جب ان احمد صاحب اور ان کی بلی کے لیے لے جا کر حاضر ہوئی۔ تمسخرانہ لہجے میں بولے۔

''یہ سب آپ کھائیں گی؟ ہم نے تو آپ کو منع کر دیا تھا، پھر کیوں آپ لائیں.....''

''ارے ایسا تھوڑی ہوتا ہے۔ بیچیے تکلف نہ کریں۔ اپنا گھر سمجھیں۔'' دل میں خوف بھی تھا کہ کہیں انہوں نے کوک میں پانی ڈالتے تو نہیں دیکھ لیا۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔

''جب ہم نے آپ کو منع کیا تھا تو آپ یہ سب کیوں لائیں؟'' احمد صاحب کی وہی مرغے کی ایک ٹانگ تھی۔

''کیوں، آپ اپنے گھر میں آئے مہمان کو کچھ نہیں کھلاتے؟'' مجھے غصہ ہی تو آگیا تھا۔ حالانکہ دل میں سوچ رہی تھی کہ اگر یہ سب کھا گئے تو ان کی خیر نہیں۔

ان کی بیگم ان کی بھی استاد تھیں چونکہ میاں کچھ نہیں کھا رہے تھے اسی لیے بیگم بھی ایسے نفی میں سر ہلا رہی تھیں جیسے، ہم کلاس میں جب ہوم ورک کر کے نہیں جاتے تھے اس وقت پینڈولم کی طرح ہلاتے تھے۔

''اچھا کوک تو لیں.....''

''نہیں، ہم کوک نہیں پیتے۔'' دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

''بھائی کیا صرف آپ لوگ ہوا کھاتے ہیں، تبھی اتنے دبلے ہیں، کچھ کھایا کریں تاکہ آپ لوگوں کی جان بنے..... یہ نہ ہو کہ پاکستان آنے کے لیے ٹکٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑے۔ دونوں اڑتے ہوئے ہی آجائیں۔'' میں نے بھی چٹکی لی۔

دونوں ایسے ہی ہی کر کے ہنس رہے تھے جیسے مزہ آگیا ہو۔

ہم نے کہا ہنس کے ان کے لگا کس کے..... اسی لیے خواہ مخواہ..... ڈرٹی لکس دینے لگے..... تو اس میں ہماری کیا غلطی ہے بھئی..... محاوروں کو استعمال کرتے ہوئے اکثر لوگ ان کے معنی و مطالب بھول جاتے ہیں۔ سو ہم بھی بھول گئے۔ عجیب بے ہودہ سے کزن تھے۔ تمیز ہی نہیں کہ کسی کے گھر کیسے آتے ہیں، کیسے بیٹھتے ہیں، جو کچھ بھی دو ہم نہیں کھاتے، ہم نہیں کھاتے کا ریڈیو بجانا شروع کر دیتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے آفاق کو ان کے کزن کے کرتوت بتائے..... بلکہ اچھا خاصا جتایا..... کہ دیکھو..... دبئی میں رہنے کے باوجود بھی تمہارے کزن کو نہ تمیز چھو کر گئی اور نہ تہذیب.....

''بھئی اکیلا رہتا ہے، یہ ساری چیزیں فیملی میں رہنے کی وجہ سے ڈیولپ ہوتی ہیں۔'' آفاق کو اپنے کزن کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا..... اور میری بات کو بے حد لائٹ بھی لے رہے تھے..... اور اگر بالفرض ایسے کردار..... میری فیملی کے ہوتے..... تو شاید وہ مذاق اڑانے میں مجھ سے آگے ہوتے۔

''تعریف کتنی کر رہا تھا اپنی بیگم کی کہ میری بیگم ہی میری دوست ہیں۔ ظاہر ہے پردیس میں نہ کوئی جان نہ کوئی پہچان نہ دوست، نہ عزیز..... کسی کے گھر جانا نہیں..... اگر جاؤ تو کچھ کھانا نہیں تو کیسے بنیں گے دوست۔ دونوں میاں، بیوی اکیلے ہی کھوکھلے رہتے ہوں گے۔'' میں نے ان کی زندگی کا تجزیہ پیش کر دیا تھا اور آفاق پہلی مرتبہ کھلکھلا کر ہنسے..... اور مجھے دل میں ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔

''اتنی مصیبت سے میں نے ناشتا سیٹ کیا تھا۔ دو دفعہ تو میرا ہاتھ بھی جلا پھر بھی کسی نے کباب نہیں کھائے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ دونوں کچھ نہیں کھائیں گے تو میں کچھ نہ کرتی۔'' اب مجھے افسوس ہو رہا تھا۔

''چلو کوئی بات نہیں، ایسا بھی ہوتا ہے چلو اسی بہانے تمہیں کباب تلنے تو آگئے۔'' آفاق خوشی خوشی کہہ رہے تھے۔ مگر میں دل میں سوچ کر مسکرا رہی تھی کہ میاں جی بیچارے خواہ مخواہ ہی خوش ہو رہے ہیں..... انہیں کیا پتا..... یہ کباب کسی کے حلق سے بھی نہیں اتر سکتے..... پچھلی

سائڈ سے تو پورے جلے ہوئے ہیں اور میں امبر کے آنے سے پہلے...... یہاں کوک کے گلاس سنک میں بہا رہی تھیں وہیں دہ کباب بھی...... گاربیج میں ڈال رہی تھی کہ ایسے سکھڑاپے کہیں افشا تھوڑی نان کیے جاتے ہیں۔

ایک شام دبئی کے نام

رات میں سب کا پروگرام یہاں کے ایک اچھے سے ہوٹل میں ڈنر کرنے کا تھا۔ چونکہ یہاں پر ہر انٹرنیشنل برانڈ کی کافی شاپ، آئس کریم پارلر، برگرز کی چین چپے چپے پر موجود ہے جس کو دیکھ دیکھ کر ہمارے بچے ایسے ہمک رہے تھے جیسے انہیں کوئی کھوئی ہوئی چیزیں مل رہی ہوں۔ ان میں سب سے آگے اجیہ اور ایمان تھے۔

''امی باسکن روبنز کی آئس کریم کھانی ہے۔ یہاں پر تو آئس کریم کے شیک بھی ملتے ہیں۔ ہمارے پاکستان میں نہیں ملتے۔'' اجیہ معلومات دے رہی تھیں۔ پتا نہیں آج کل کے بچوں کو کیسی کیسی چیزیں پسند آنے لگی ہیں۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ہماری فیورٹ کھانے میں بروسٹ یا کباب پراٹھا...... (کراچی کی خاص ڈش) ہوتی تھی۔ مجھے آج کل کے کھانے بالکل اچھے نہیں آتے۔ ہم کہیں باہر ڈنر کرنے جا رہے ہوتے ہیں تو گاڑی میں وائنگ ہوتی ہے کہ کہاں جایا جائے؟ یا کیا کھایا جائے تو میرے بچے جھٹ بولتے ہیں۔

''امی کیا تو کباب پراٹھا کھاتا ہوگا۔''

ایک دفعہ پاکستان میں اجیہ صاحبہ مجھے زبردستی مشہورِ زمانہ کافی کی شاپ لے گئیں...... چونکہ ہمارے گھر سے کافی نزدیک ہے اور اجیہ کی دوست کی سالگرہ یہاں ہوئی تھی تو انہیں یہ ڈکان کافی پسند آئی کہ امی کو بھی دکھاؤں۔

''امی یہاں کی میکرونی، چکن اور کولڈ کافی ٹرائی کریں۔'' اجیہ میرے آگے چیزیں کرتے ہوئے بولی۔

جب میں نے تمام چیزیں دیکھیں تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے کیونکہ میکرونی میں کچھ پھٹا ہوا دودھ ڈالا ہوا تھا (مجھے لگ رہا تھا بعد میں پتا چلا کہ وہ پنیر تھا) چکن کچا سا تھا۔ جس کے ساتھ کچھ ہرا اندے آلو، کچھ ابلی ہوئی گاجریں ڈالی ہوئی تھیں۔ میں ایک نظر اجیہ اور دوسری نظر اس لذیذ کھانے کو دیکھ رہی تھی۔

''مجھے پتا چل گیا امی...... آپ کو بہت مزہ آگیا ہے۔'' اجیہ میری حالت سمجھ گئی تھی۔

''جتنے پیسے لگے، اتنے میں گھر میں چھ مرغیوں کا قورمہ بن جاتا۔'' واپسی پر میں اجیہ سے کہہ رہی تھی۔

''یہی تو آپ کی باتیں ہیں، جس کی وجہ سے آپ قورمہ اور بریانی سے نہیں نکل پا رہیں۔ ہر جگہ جا کر ٹرائی ضرور کرنا چاہیے۔ اگر ہم کسی جگہ جائیں گے نہیں تو پتا کیسے چلے گا کہ وہاں کیا چیز اچھی ہے یا کیا چیز بری۔'' اجیہ اپنے ابا کی بولی بول رہی تھی۔ خیر جناب بات ہو رہی تھی دبئی میں رات کے ڈنر کی، سب تیار ہو کر مطلوبہ ہوٹل تک پہنچے...... چونکہ پارکنگ یہاں ہمیشہ سے مسئلہ ہے۔ اسی لیے پارکنگ کے لیے کافی دور جانا پڑا اور وہاں جا کر پارکنگ ملی۔ ساتھ ساتھ ہی ایک گاڑی اور پارک ہوئی اور اس کے اندر سے ایک کافی تیار خاتون نمودار ہوئیں۔ کافی ہیوی سونے کا سیٹ، اس کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں، انگوٹھیاں، قیمتی موبائل تھامے اپنے میاں کے ساتھ وہ اسی ہوٹل کی طرف گامزن تھی جس کے ہم مسافر تھے۔

میں دل میں سوچ رہی تھی کہ اگر یہ خاتون کراچی میں اتنی تیار ہو کر اسی طرح روڈ پر ٹہلتی ہوئی اتنی ہی دور چلتا جو یہ ہوٹل ہے، جائے تو یا تو یہ اغوا ہو جائے، اغوا نہ ہو تو لٹ تو یہ ضرور جائے۔ اور یہاں یہ کتنی محفوظ ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی نہیں کہ کوئی آ کر اس سے یہ سارا زیور چھین لے گا۔ ساری بات قانون کی ہے۔ قانون یہاں اتنے سخت ہیں کہ کوئی انہیں توڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

قانون کی بات ہو رہی ہے تو ایک قصہ ہمارے ایک جاننے والے کا ہے۔ بچی کافی خوب صورت اور کراچی کے اچھے کالج کی پڑھی ہوئی تھی۔ لڑکے والے پاکستان کی کافی اثر و رسوخ رکھنے والی فیملی سے تھے۔ فیملی مگر دبئی میں رہائش پزیر تھی۔ خیر جناب بات بن گئی دونوں لڑکا لڑکی کی شادی ہوگئی۔ میاں بیوی میں۔

نا اتفاقی ہوئی۔ ناراضی زیادہ بڑھی...... ایک دن طلاق ہوگئی۔ لڑکی واپس پاکستان آگئی۔ ادھر لڑکے والوں کی بے عزتی کہ بہو بیگم نہ ٹک سکیں۔ لوگ طرح، طرح کی باتیں بنانے لگے۔ خوش قسمتی کہ لڑکی کا دوسرا رشتہ پھر ایک دبئی میں رہائش پزیر لڑکے کا آ گیا۔ لڑکی دوسری شادی کر کے واپس دبئی آ گئی اور یہیں رہائش پزیر ہے کیونکہ وہ کہتی ہے کہ اگر میں پاکستان میں ہوتی تو میرے سابقہ شوہر کی فیملی مجھے کب کا مروا دیتی۔ میں دبئی میں ہوں تو ان لوگوں کی ہمت نہیں ہے میرے قریب بھی پھٹکنے کی...... اوہ...... کہاں کی بات کہاں چلی گئی...... ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ بڑا اچھا ہوٹل تھا، کھانے سے پہلے جوس دیے جا رہے تھے۔ کھانا بوفے تھا کہ انھیں، جائیں دیکھیں اور کھائیں۔ گول گپے، گلاب جامن کے ساتھ، ساتھ حلیم اور نہاری بھی اس بوفے کا حصہ تھی۔ ہم ٹھہرے دیسی مزاج رکھنے والے کہ دیکھ کر ہی مزہ آ گیا۔

"چلیں بھئی، بنگالی ہوٹل سے مسالے والی چائے پی جائے۔" مسرت کھانے کے بعد بولنے لگے۔

"واقعی اس وقت دلِ اچھی سی چائے پینے کو چاہ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

اور گاڑی تمام افراد کو لاد کر ایک بنگالی ہوٹل پر رک گئی۔ یہ ہوٹل جو بظاہر اتنا اچھا نہیں تھا، بیٹھنے کے لیے بھی بینچوں ٹائپ کرسیاں تھیں مگر سروس ایسی لاجواب کہ ایک ویٹر کو بلا رہے تھے تو دو دوڑ کر آ رہے تھے۔ امبر کے شوہر کو کافی زبانیں آتی ہیں تو انہوں نے ویٹرز کو پتا نہیں بنگالی زبان میں کیا کہا کہ سارے ویٹرز ہم کو ایسے دیکھنے لگے کہ اگر آج نہیں دیکھا تو پھر کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔

"شاید انہیں کوئی ایکٹریس وغیرہ سمجھ رہے ہیں۔ تبھی تو اتنا متاثر ہو رہے ہیں اور ویسے بھی امی تو مجھے اداکارہ ریشم سے تو کبھی مائرہ خان سے ملاتی رہتی ہیں۔" میں نے اجیہ سے کہا۔

"پلیز امی بس کر دیں۔" اجیہ اتراہٹ سے کہہ رہی تھی...... جیسے اسے میری یہ بات سن کر کوفت ہو رہی ہو۔

"اور کیا میری بیٹی ہے ہی اتنی خوب صورت......" ساتھ میں بیٹھی امی نے تمام باتیں سن کر کہا...... اور اجیہ نے گہری سانس لے کر اپنی آنکھیں بند کر لیں......

"اپنی نانی سے گہری دوستی ہے مگر مجال ہے کہ ماں کی تعریف ہضم کر لے۔" تھوڑی ہی دیر میں مزے دار سی چائے آ گئی کہ جس کو پی کر ساری تھکن ختم ہو گئی۔

سامنے سے ایک ویٹر بھاگا، بھاگا ایک ڈائری اور پین لیے میری طرف بڑھ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ ضرور میرا آٹو گراف لینے آ رہا ہے۔ کیا لکھوں گی؟ یہ لکھ دوں گی جیتے رہو، جو کرو اچھا کرو۔

نہیں نہیں یہ صحیح نہیں ہے، مجھے کیا پتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک کیا اچھا ہے کیا برا ہے...... اس سے تو آٹو گراف کی حرمت پر فرق پڑے گا پھر ہمیشہ دوسروں کا بھلا ہو...... ارے نہیں اب تو لوگ پہلے اپنے بھلے کی سوچتے ہیں اچھا...... تو خوشیاں تمہارے گھر میں...... ایسی خوشی تو جوتی برابر ہوتی۔ اوہ تو پھر...... ہمیشہ خوش رہو...... ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔

میں نے اپنے دماغ میں آٹو گراف سیٹ کر لیا...... اور یہ بھی سوچ لیا کہ سائن بھی پھول کے انداز میں بناؤں گی...... دورانِ طالب علمی...... ایک شاعرہ سے آٹو گراف لیے تھے تو انہوں نے اپنے جناتی سے دستخط کے اطراف ایک عجیب سا پھول بنا دیا تھا اور وہ مجھے زیادہ اچھا لگا تھا اور انہیں ہمیشہ پھول والی کے نام سے یاد رکھا تھا۔ ابھی ذہن آٹو گراف سے متعلقہ سوچوں میں ہی مگن تھا کہ آواز آئی۔ "ایک سو دس درہم ہو گیا ہے۔ چائے کا اب ہمارے ہوٹل کا ٹیم ختم ہو گیا یا اے...... میڈم آپ لوگ کب بار جائے گا، جلدی کرو بھئی۔"

چھن سے جو ٹوٹے کوئی سپنا
جگ سونا سونا لاگے
کوئی رہے نہ جب اپنا

جگسب سونا سونا لاگے

یہ شاعری، ہمارے لیے ہی کیسی عظیم شاعر نے وقت سے پہلے کردی تھی۔ خیر دیر آئے درست آئے..... جی ہاں، وہ ویٹر..... ہم سے ہوٹل سے باہر جانے کا بھی کہہ رہا تھا اور یہ بات ایک سو دس در ہم سے بھی زیادہ مہنگی تھی اور غلط بھی تھی اور گندی بھی تھی..... اس لیے تو اب ایسے ہی گیت منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ گندی بات..... گندی بات..... کہ لوگوں کو بات کرنے کی اب تمیز ہی نہیں رہ گئی ہے۔

متحدہ عرب امارات

متحدہ عرب امارات ایک ملک کا نام ہے اور اس کے اندر آزاد ریاستیں ہیں جن کا بادشاہ الگ جن کا نظام حکومت الگ ..... کے مالی معاملات الگ..... میری طرح شاید کافی لوگوں کو پہلے یہ سمجھ نہ آتا ہو کہ متحدہ عرب امارات کیا چیز ہے تو آج میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ متحدہ عرب امارات کے اندر سات آزاد ریاستیں ہیں یعنی ملک کے ..... ملک آباد ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

دبئی
عجمان
شارجہ
فجیرہ
راس الخیمہ
ام القوین
ابوظہبی

ہر ریاست کا شیخ الگ ہے اس کی حکومت الگ ہے، اس کا ہوائی اڈا الگ ہے۔ دبئی چونکہ سب سے بڑا اور ترقی یافتہ ہے یہاں بڑے سے بڑے شاپنگ مالز، فیسٹول، دنیا بھر کے تفریحی مقامات بنائے گئے ہیں تو یہ زیادہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے۔ بڑے ہونے کی وجہ سے یہاں نوکری کے ذرائع بھی زیادہ ہیں۔ سمجھنے والے اس کو اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے کراچی کی الگ حکومت ہو اور حیدرآباد کی الگ.....

اتنا ہی راستہ دبئی اور عجمان کا بھی ہے۔ عجمان کے شیخ کو مسجد بنانے کا شوق ہے ہر چوراہے پر ایک شاندار مسجد ایمان والوں کا ایمان تازہ کرنے کے لیے اپنی..... پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی ہے۔ پہلے تو یہاں کے شیخ وغیرہ جاہل ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ کا بیٹا، بادشاہ بنتا ہے، اس لیے پہلے تو تعلیم وغیرہ پر بالکل زور نہیں دیا جاتا تھا۔ مگر اب جیسے، جیسے وقت تبدیل ہو رہا ہے۔ ان لوگوں میں بھی تعلیم کی اہمیت اجاگر ہو رہی ہے۔ اب ان کے بچے بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ عجمان کا شیخ ڈاکٹر ہے۔ شارجہ کافی چھوٹا ہے۔ دبئی سے دس منٹ پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد شارجہ آ جاتا ہے۔ روڈ وہی چل رہی ہے۔ پتا چلا کہ اب آپ شارجہ میں ہیں۔ حکومت کے پاس پیسہ اتنا ہے کہ کوئی کرائسس ہی موجود نہیں۔

یہاں کا صدر مقام کہہ لیں یا یوں کہا جائے کہ تمام شیخ جہاں رہتے ہیں وہ ریاست ہے ابوظہبی..... یہاں رہائش اختیار کرنا کافی مہنگا ہے۔

ہر ریاست کے پاس اپنا سسٹم ہے، دبئی کے ڈرائیور کو سواری لے کر عجمان آنے کی تو اجازت ہے مگر دبئی کا ڈرائیور واپسی پر خالی جائے گا کیونکہ اگر اس نے سواری بٹھالی تو عجمان والے کا حق مارا جائے گا۔ کسی کی ہمت ..... وہ اس قانون کو توڑ تو دے۔ اور اگر کسی شیر دل نے یہ کر لیا تو اسے اتنا زیادہ چالان کیا جائے گا کہ اس کی آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی۔

مردوں اور عورتوں کو دبئی میں نمایاں اہمیت حاصل ہے، ملازمتوں میں بھی مساوی حقوق رکھے گئے ہیں۔ اسلامی قیود میں رہتے ہوئے ایک عربی عورت آرام سے ملازمت کر سکتی ہے۔ گاڑی چلا سکتی ہے، دکان چلا سکتی ہے، حکومت کی پالیسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں کالی ٹیکسیاں مرد جبکہ گلابی ٹیکسیاں عورتیں چلاتی ہیں۔ وہ عورتیں جو اپنے گھر میں تنہا کمانے والی ہیں یا جو اسٹوڈنٹ ہیں یہ سہولت ان کے لیے رکھی گئی ہے۔

دبئی میں سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے کو گورنمنٹ کی طرف سے وظیفہ شروع کر دیا جاتا ہے اور اس کا یہ کام ہوتا ہے کہ آس پڑوس کے لوگوں پر نظر رکھو، کبھی یہاں کوئی غیر قانونی طور پر رہائش اختیار نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی گورنمنٹ کی نگاہ سے بچ جائے تو آتے جاتے ان محلے پڑوس کے لڑکوں کی نگاہوں سے نہیں بچ پاتا جن کا کام ہی آتے جاتے بلا نگر میں لوگوں کی آمد و رفت کا پتا رکھنا ہے۔ یہ بچے یہ سارے کام خفیہ طور پر انجام دیتے ہیں۔ جس کا انہیں انعام بھی دیا جاتا ہے۔ ایک سسٹم ہے اس ملک میں، سوچیں تو سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے ویسے ہی نکڑ، گلیوں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو باہر بیٹھے لڑکوں کو لوفر کہا جاتا ہے اور دبئی والے اپنے لوفروں پر بھروسا کر رہے ہیں تبھی تو ترقی کر رہے ہیں۔ جس دن ہم نے اپنے لوفروں پر بھروسا کرنا شروع کر دیا تو ہمارے بھی نام کا ڈنکا بجے گا ادھر تو سترہ، اٹھارہ سال کے لوفر ہیں جن کے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ ہمارے پاکستان میں تو کم و بیش پورا ملک ہی اس معیار پر پورا اترتا ہے جدھر دیکھو لوفروں کا جمگھٹا لگا ہے۔ ایک مانگو ہزار ملتے ہیں۔ بس کبھی غور نہیں کیا ہماری قوم نے۔

بچوں کی اسکول کی وینیں اتنی اچھی ہیں پوری کوسٹر جس میں آٹو میٹک دروازے ہیں جو صرف گاڑی رکنے پر کھولے جاتے ہیں پھر ایسا نہیں کہ بچہ اچھل کر بیٹھ جائے یا اچھل کر اتر جائے، ایک ہیلپر بس سے اتر کر بچے کا بیگ لیتا ہے، اسے اس کی سیٹ پر بٹھاتا ہے، تب کہیں جا کر بس چلتی ہے۔ ہمارے پاکستان کی طرح نہیں کہ وین، بس، ہارن بجاتی ہے دور سے اور بچے کو آتا دیکھ کر وین تھوڑی اسپیڈ... ہلکی کر لیتی ہے۔ بچہ چلتی بس میں کسی ہیرو کی طرح پہلے اپنا دس من وزنی بیگ چلتی بس میں پھینکتا ہے جس کو اندر بیٹھے بچے لپکنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اور اچانک وہ دونوں ہاتھوں سے بس کا ہینڈل پکڑ کر لٹک جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ لٹکتا ہے بس میں بیٹھے بچے ڈبل ہے ڈبل ہے کی صدائیں لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ بس، یہاں اسپیڈ اور تیز ہوتی اور بچہ اچھل کر سیٹ پر، ماں بھی مطمئن ہو کر گھر کا دروازہ اچھی طرح بند کر لیتی ہے کہ "آج تو محمود جلدی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ورنہ کل تو مسجد تک باہر لٹک کر گیا تھا۔" ماں ہے نا، فکر تو ہوتی ہے اپنے لختِ جگر کی۔ ماؤں کا پُرسکون ہونا، کتنا ضروری ہوتا ہے مگر ہر ماں کے سکون اور طمانیت کا لیول الگ، الگ ہوتا ہے۔

غریبوں کا دبئی

ابھی تک ہم نے دبئی کے مہنگے ترین پلازہ، مہنگے ترین شاپنگ سینٹرز اور مہنگے ترین علاقوں کا ذکر کیا تو کیا دبئی میں کم آمدنی رکھنے والے کے لیے کوئی جگہ نہیں.....؟ اس کا شاپنگ کرنے کا کوئی حق نہیں؟

نہیں بالکل نہیں..... ایسا بالکل نہیں ہے۔ اسے حق ہے رہنے کا، شاپنگ کرنے کا، گھومنے کا پھرنے کا۔

اب میں ذکر کروں گی ان دکانوں کا جو بہت سستی ہیں، جن سے کافی لوگ شاپنگ کرتے ہیں مگر بتاتے نہیں ہیں، وہ الگ بات ہے، ہر ایک کو ہر چیز کے بارے میں پتا ہونا چاہیے۔ پتا نہیں کیوں بہت سے لوگوں میں احساسِ برتری بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے یہ لے یہ یہاں سے لیا یا میں تو صرف وہاں سے شاپنگ کرتی ہوں، وغیرہ وغیرہ مجھے ایسی بناوٹی باتیں کافی مشکل سے ہضم ہوتی ہیں۔ شاید مجھ میں بناوٹ نہیں ہے، اسی لیے واقعی کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ احساسِ برتری بھی دراصل احساسِ کمتری کی ایک شکل ہے۔ میں سیدھی بات کرتی ہوں تو اسی لیے سیدھی باتیں ہی سننا پسند کرتی ہوں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی دبئی کی سستی دکانوں کی، تو وہ ہیں، پانچ درہم اور دس درہم کی دکانیں، جو یہاں پر جا بجا ہیں۔ ان دکانوں پر تمام اشیا کی قیمت صرف پانچ درہم یا دس درہم ہے۔ اس میں کپڑے، جوتے، گھر کی سجاوٹ کی چیزیں، گفٹ آئٹم، کچن کراکری، کچن میں استعمال ہونے والی اشیا، بیگز، کھلونے، لنچ باکس، پانی کی بوتلیں اور جانے کیا، کیا دستیاب ہے۔

میں تو بڑے شوق سے ان دکانوں پر گئی، امبر نے

ہی ان کے بارے میں بتایا تھا اور جب ہم وہاں گئے تو یہ دکان لوگوں سے بھری پڑی تھیں۔ زیادہ تر عربی عورتیں ان دکانوں سے خریداری میں مصروف تھیں۔

میں نے بھی یہاں سے ڈیکوریشن آئٹم لیے، کینڈل اسٹینڈ لیے جو کہ بالکل یونیک تھے۔ کسوئی صاحبہ نے باسکٹ میں، پونیاں، کلپ اور ڈولز بھر لی تھیں۔ جبکہ اجیہ اپنے موبائل کے کورز پسند کر رہی تھی۔ یہاں پر میک اپ وغیرہ بھی دستیاب تھا لیکن چونکہ اس کی قیمتیں بھی کافی کم تھیں تو شک گزرا کہیں یہ دو نمبر نہ ہو۔ اسی لیے میک اپ اور پرفیومز لینے سے یہاں اجتناب کیا گیا۔ لینے والے یہ سب بھی خرید رہے تھے اور دبئی سے آنے والے اکثر لوگ دوست واقارب کو ایسی ہی جگہوں سے گفٹ خرید کر دیتے ہیں۔ سب لوگوں کی بات نہیں کر رہی.... مگر زیادہ تر ایسا ہی کرتے ہیں اور اس مہنگائی میں یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں ہے۔ اچھے اور نفیس تحائف دینے والے تو اب خال، خال ہی نظر آتے ہیں۔

بات ہے رسوائی کی

امبر کی پڑوسن کو پتا چلا کہ اس کی بھابی اور بھائی کی فیملی آئی ہوئی ہے تو جھٹ ملنے چلی آئیں۔ کافی محبت کی خاتون تھیں اور بڑے تپاک سے ملیں۔ یوں بھی پردیس میں غیر ہی اپنے بن جاتے ہیں۔ دکھ سکھ میں جو ساتھ دے اور ساتھ کھڑا رہے وہ غیر کہاں رہا، وہ تو اپنا ہی بن گیا۔ پاکستان سے ہی تعلق ان پڑوسن کی اتنی ہی چھوٹی فیملی تھی جتنا چھوٹا ان کا قد تھا۔ یعنی میاں بیوی اور ایک بچہ اللہ، اللہ خیر صلا..... مگر ایک بات جو ان میں بڑی تھی وہ یہ کہ انگریزی بولنے کی غلط کوشش کر رہی تھیں مگر اللہ کی بندی کا حوصلہ اور جذبہ قابلِ دید تھا کہ انگریزی کا اٹ کا سٹ ہو رہا تھا مگر ان کا بولنا چپ نہیں ہو رہا تھا جیسے کہ آج صبح سے ہی میں اتنی ہاٹ ہو رہی ہوں کافی فیور ہے ناں مجھے، پورا فیس پنک اور ریڈ ہو رہا ہے۔ اتنا بچوں کو کیپ کوائٹ کروا رہی ہوں مگر آپ کے بچے بڑا نوائس کر رہے ہیں، جیسے جملوں کی بھرمار تھی ان کی گفتگو میں۔'' امی اداکارہ میرا کی کی

اردی کر دی انہوں نے، وطن یاد کرا دیا۔'' اجیہ مجھے چپکے سے کہہ رہی تھی۔ اور اس بہن کی یہ گفتگو مجھے اپنے شادی کے شروع کے دنوں میں لے گئی۔ چونکہ ہماری امی کے گھر کا ماحول خالص ادبی اور کتابی تھا۔ امی کی وجہ سے مجھے اردو جیسا مضمون جس سے لڑکیوں کی جان نکلا کرتی تھیں کبھی مشکل ہی نہیں لگا بلکہ لڑکیاں اردو میں مجھ سے مدد لیا کرتی تھیں جبکہ باقی سارے مضامین میں، میں ان سے۔ ہمارا حال تو یہ تھا کہ ششماہی میں کبھی پاس نہیں ہوئے اور سالانہ میں کبھی فیل نہیں ہوئے۔ کوئی پوچھتا تھا کہ انگریزی میں کتنے نمبر آئے؟ چونکہ میں ابو کی لاڈلی تھی تو ابو فوراً کہتے تھے کہ بھئی انگریزی ہماری بیٹی کو آتی نہیں اور حساب اسے پسند نہیں، اس لیے یہ اسباق ہماری بیٹی کے لیے بنے ہی نہیں ہیں۔ رٹا انتا زبردست لگایا کرتے تھے کہ بچپن کے یاد مضمون وزٹ تو اے زو ابھی تک یاد ہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ مضمون بھی وہی آجایا کرتے تھے جو رٹتے تھے ورنہ تو شاید آٹھویں نکالنا مشکل ہو جاتا۔ بس اللہ کا کرم اور ماں، باپ کی دعائیں کام آتی ہیں۔ شادی بھی عمر کے اٹھارویں سال میں ہی خیر و خوبی سے انجام پائی تھی سو اسی وجہ سے پڑھائی کے جھنجٹ سے بھی جلد ہی چھٹکارا مل گیا تھا۔ دو ڈھائی سال بعد جب اجیہ کو بڑی اسکول میں داخلہ دلوایا تو بھانت، بھانت کی عورتوں سے واسطہ پڑا۔ کوئی ڈاکٹر تو کوئی ایم اے پاس کوئی بی بی اے تو کوئی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرنے والی لیڈی..... نئے، نئے لوگ نئی، نئی باتیں......

خیر بھئی ڈھونڈ ڈھانڈ کر بظاہر سیدھی سادی لڑکی سے دوستی کر لی کہ اچھا یارانہ رہے گا۔ غضب خدا کا کہ وہ بھی ایم بی اے پاس نکلی۔ اب کیا، کیا جاسکتا تھا۔ چونکہ روز ملتے تھے تو باتیں بھی روز کی ہوتی تھیں، ایک دن میری اس دوست کا موڈ بہت آف تھا۔

''کیا ہوا فوزیہ بڑی اداس لگ رہی ہو؟'' اسے پریشان دیکھ کر میں نے کہا۔

''ارے بھئی وہی میری ساس اور کیا بات

ہوگی۔'' اس نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''کیا کر دیا؟ ساس صاحبہ نے......'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی میری ساس میرے شوہر کو ہر وقت pamper کرتی ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات ہے بھلا......'' اس نے افسوس سے کہا۔

اب یہاں میں نے تو سر پکڑ لیا، لفظ pamper تو صرف بچوں کی پیکنگ کے لیے سنا تھا جو میں اس وقت اپنے بچوں کو باندھتی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ انگریزی کا یہ لفظ بہت زیادہ لاڈ کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ انگریزی سے نفرت اور رٹے اس وقت مجھے رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔

''کیوں ہوتے ہیں آپ کے شوہر pamper؟'' میں نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بس ان کی عادت ہے، اصل میں شروع سے ہی انہیں پیمپر کیا گیا ہے۔ اب پرانی عادتیں اتنی جلدی تو نہیں چھوٹتی ہیں ناں......'' فوزیہ اپنی رو میں کہہ رہی تھی۔

''کب، کب pamper کرتی ہیں انہیں؟'' میری آنکھیں حیرت سے پھٹ رہی تھیں۔

''کب نہیں کرتیں، کوئی بھی ہمارے گھر آئے یا ہم کہیں جائیں، وہ وقت تو ضروری ہو جاتا ہے۔ pamper کے لیے، صبح آفس جاتے وقت pamper کرتی ہیں، آنے کے بعد کرتی ہیں۔''

''آفس سے آنے کے بعد بھی pamper کرتی ہیں۔ آپ کی ساس، حیرت ہے چھٹی کے دن تو نہیں کرتیں ہوں گی۔'' مجھے ان کی میاں کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔

''چھٹی کے دن تو صبح ہوتے ہی pamper کیا جاتا ہے انہیں۔'' فوزیہ غصے سے بول رہی تھی۔

''مگر ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔'' مجھے غصہ آ رہا تھا۔

''یہی تو، ابھی ہماری ساس کچھ دنوں کے لیے میری نند کے گھر رہنے گئی ہوئی تھیں۔ میرے میاں نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا۔ اصل میں انہیں عادت ہے اس سب کی .... اور یہ سب مجھ سے ہوتا نہیں ہے۔ بس فون پر فون کر کے ان کو بلوایا کہ جلدی آئیں۔ بہت یاد آ رہی ہیں۔ گئیں تو وہ پندرہ دنوں کے لیے تھیں، پانچ دنوں میں واپس آ گئیں اور پھر شروع۔''

''چلیں چھوٹ جائے گی عادت۔'' میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا......'' فوزیہ کا غصہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

بس بڑوں نے ہمیشہ یہی سمجھایا تھا کہ کم بولنا سو باتوں ہی باتوں میں مجھے pamper کے حوالے

حمدیہ کلام

تم آرزو کے دیے جلا کے
خدا سے اچھی امید رکھنا
خزاں کے موسم کی رخصتی پہ
بہارِ گل کی نوید لکھنا

وہ تیرا رب ہے
وہ تیرا اپنا
اسی کو دل کے قریب رکھنا
اسی سے کرتا ہوں دل کی باتیں
اٹھا کے ہاتھوں کو اس کے آگے
تو آنکھ میں کچھ نمی سی رکھنا

وہ تیرا رب ہے
وہ تیرا آقا
اسی سے راز و نیاز کرنا
اسی سے غم کی کہانی کہنا
رحیم ہے وہ کریم ہے وہ
جہاں میں سب سے عظیم ہے وہ
تو رب کو اپنے عزیز رکھنا
اسی کو اپنا حبیب رکھنا
وہی تجھے بھی سکون دے گا
قبول تمہاری دعا کرے گا

مرسلہ: عزیزہ غنی، پاک پتن

سے کچھ گڑ بڑ لگی کہ جو میں سوچ رہی ہوں وہ 'وہ' بات نہیں ہے۔ اس بات پر میں نے سکون کی سانس لی اور اللہ کا شکر بھی ادا کیا کہ میں نے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کردی تھی کہ اسے یہ پتا چلتا کہ خدا نخواستہ میری انگریزی کچھ کمزور ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا، کیا کچھ کمزور ہے؟ میری انگریزی...... پیاری آنٹی غزالہ نگار اور کزنز...... آپ تو انگریزی کی استاد ہیں...... اور مجھے میرے بچپن سے جانتی ہیں...... آپ کو کیا میری انگریزی کمزور لگی کبھی......!

گولڈ بازار کی بہار

دبئی گئے اور سونے کی خریداری نہیں کی تو کیا، کیا؟ یہی خیالات ہمیں دبئی کے گولڈ بازار کھینچ کر لے گئے۔ یہاں پر سونے کی خریداری کے لیے بالکل الگ بازار بنائے گئے ہیں جسے گولڈ سوق کہتے ہیں۔ یہاں سونے کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔

بھاری، بھاری زیورات سے لدی دکانیں سونے اور جواہرات سے پٹی پڑی تھیں۔ چونکہ عربی عورتیں سونا کافی شوق سے پہنتی ہیں۔ اسی لیے سونے کی ایسی، ایسی چیزیں بھی دیکھنے کو مل رہی تھیں جو کہ ہمارے پاکستان میں نظر نہیں آتیں۔

جیسے کمر کی سونے کی بیلٹ موٹی اتنی جتنا کتے کا پٹا ہوتا ہے، عربی دلہنیں شادی کے وقت پورے سر کا ٹوپی کی طرح کا زیور پہنتی ہیں جیسے سپہ سالار جنگ میں پہنتے تھے۔ اس نسل کے بھاری، بھاری زیورات ہمیں تو چونکہ ذرا ہلکے وزن میں کچھ چاہیے تھا جو کہ ذرا مشکل سے مل رہا تھا اور پھر جب اچھی اور بھاری چیز دیکھو تو کم پر مشکل سے ہی دل آتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی ترقی اور عروج میں اللہ کی رضا اور مرضی کے بعد ایمانداری ہے۔ یہ لوگ کسی بھی بات میں جھوٹ نہیں بولتے، مثال کے طور پر اس گولڈ سوق میں 21 قیراط سونے کے زیورات بھی تھے اور 18 قیراط سونے کے بھی، جیسے انہیں بتا کر بیچا جا رہا تھا۔ ہمیں تو 18 قیراط والے زیورات بھی اتنے ہی خالص لگ رہے تھے جتنے 21 والے۔ مگر چونکہ یہاں کے لوگ جھوٹ نہیں بولتے تو وہ یہ بات بھی بتا کر بیچ رہے تھے۔ جس کی وجہ سے ریٹ میں بھی فرق تھا۔

''آپ کو کیا لینا ہے امی؟'' میں نے امی سے کہا جو جیولر کو کچھ نکالنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

''ایک چین سوچ رہی ہوں، لے لوں کیا؟'' وہ مجھ سے مشورہ لے رہی تھیں۔

''بالکل لیں جو چیز اچھی لگ رہی ہے پسند آرہی ہے تو ضرور لیں...... ایک تو یہ خالص ہیں، دوسرے ایسے ڈیزائن پاکستان میں تو نہیں ملیں گے۔'' میں نے ان سے کہا۔

''یہ بھی لے لو تم، لگ رہا ہے کہ تمہارے لیے ہی بنا ہے، چوڑیاں تو دیکھو یہ والی......'' برابر کی کرسی پر ایک شوہر اپنی بیوی کو کبھی ہار تو کبھی بندے پہنا، پہنا کر دیکھ رہا تھا۔

''کتنا خوش ہو رہا ہے۔ اپنی بیوی کے لیے زیورات خرید کر، ایسا لگ رہا ہے کہ دکان والا اس کو پیسے الگ دے گا کہ بھائی آپ نے اپنی بیگم کے لیے یہ چیزیں خرید کر بڑا ثواب کا کام کیا ہے۔'' میں نے امی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی، ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، کتنی لکی عورت ہے ورنہ شوہر حضرات عام طور پر کہاں ان جھمیلوں میں شوق دکھاتے ہیں۔'' امی بھی حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔

اور میری نظریں آفاق کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ ذرا انہیں بھی تو دکھاؤں کہ شوہر کیسے اپنی بیویوں کو خوش رکھتے ہیں مگر ٹائم پر میاں بات سن لیں ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا، ہمیں دکان پر چھوڑ کر بچوں کو آئس کریم کھلانے جو آگے لے گئے تھے۔

''ایک آدمی اپنی بیوی کو اتنے زیورات دلا رہا تھا، بس دلاتا ہی چلا جا رہا تھا۔'' جب آفاق ہمیں لینے آئے تو میں نے انہیں بتایا۔

''کیوں بھئی، کیا بہت امیر تھا؟'' آفاق ہنستے

ہوئے کہہ رہے تھے۔

’’نہیں، اتنا تو نہیں لگ رہا تھا بس آپ جیسا ہی تھا مگر جو بیوی کہہ رہی تھی منع ہی نہیں کر رہا تھا۔‘‘ میں اپنے میاں کو چڑھانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

’’پھر تو یقیناً پاگل ہوگا، بعض دفعہ آدمی کو پتا نہیں چلتا مگر اس کا دماغ چل جاتا ہے۔‘‘ آفاق بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

’’اب میں نے اس کا میڈیکل سرٹیفکیٹ تو چیک نہیں کیا جیولرز کی دکان پر...... کہ بھائی آپ کہیں پاگل تو نہیں ہیں؟ حرکتیں تو پاگل جیسی معلوم ہو رہی ہیں، بھائی میرے، اتنی چیزیں پاگل اپنی بیویوں کو دلاتے ہیں۔ عقل مند صرف ایک چھوٹا سیٹ دلاتے ہیں کہ۔۔۔ یادگار رہے کہ دبئی آئے تھے بس، چلو شاباش سب واپس کرو، بڑی بات ہے ناں!‘‘ میں نے چڑ کر کہا کہ پیچھے کھڑے امی، ابو بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے۔

النصر کا جادو

دبئی میں رہائش پذیر آفاق کی ماموں زاد بہن شبانہ (جن کو سارا خاندان شمی باجی کہتا ہے) اور ان کے شوہر تنویر بھائی کو پتا چلا کہ ہم لوگ آئے ہوئے ہیں تو ایک رات کا ڈنر ان کی طرف فکس ہوگیا۔ شمی باجی امبر کی جیٹھانی ہیں۔ اس طرح ان سے دو رشتے داریاں ہوتی ہیں۔ دونوں میاں، بیوی کافی زندہ دل ہیں۔ خوش رہتے ہیں اور خوش رکھنا جانتے ہیں۔ ایک بڑے میڈیکل اسٹور کی چین کے مالک ہیں۔ کسی بھی تقریب میں دونوں ایک خاص گانے پر ضرور جھومتے ہیں۔ حالانکہ ماشاء اللہ شادی کو ستائیس، اٹھائیس سال ہونے والے ہیں اور وہ گانا ہے۔

اے میری زہرہ جبیں
تجھے معلوم نہیں
تو ابھی تک ہے حسیں
اور میں جواں
تجھ پر قربان
میری جان، میری جان

دونوں ہاتھوں میں رومال باندھ کر جب ڈانس کرتے ہیں تو ہر دیکھنے والا داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خاندان کی شادی کی تقاریب ان کے بغیر سونی لگتی ہیں۔ لوگ شادیوں کی تاریخ ان سے پوچھ کر رکھتے ہیں کہ اگر تنویر بھائی اور شمی باجی آئیں گے تو رکھی جائے گی۔

ان کا گھر ولا ہے، دبئی میں زیادہ تر لوگ فلیٹ میں رہتے ہیں، مکانوں میں بہت کم لوگ رہتے ہیں کیونکہ مہنگائی بہت ہے۔ مگر ان کا ون یونٹ بے حد کشادہ بنگلا ہے، جس کو یہاں ولا کہا جاتا ہے، قیمتی سے قیمتی چیزیں گھر میں موجود ہیں جو اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی ہیں۔ گھر کے باہر کتے کا بھی کمرا ہے جس کے اندر بھی اے سی لگا ہوا ہے۔ صفائی ستھرائی چونکہ وہ خود بھی بہت کرتی ہیں اور گھر میں موجود میڈ کو خاص احکام ہوں گے اس لیے گھر ایسا چندن سا ہوتا ہے جیسے ابھی نیا بنا سجا ہو۔

چونکہ ڈنر ایک ہوٹل میں رکھا گیا تھا اس لیے پہلے ان کے گھر گئے ہر دفعہ جب بھی دبئی آتے ہیں شمی باجی اور تنویر بھائی کے گھر کا چکر ضرور لگتا ہے اور ہر دفعہ گھر میں کوئی نہ کوئی نئی تبدیلی ضرور ہو جاتی ہے۔ کبھی پورے ڈرائنگ روم کی سیٹنگ چینج ہو جاتی ہے تو کبھی گھر کے پردے ہی الگ ہوتے ہیں۔

اس دفعہ انہوں نے اپنے گھر کو اینٹیک لک دے دیا ہے۔ ایک لکڑی کی دیوار بنائی ہے اطراف میں اس کی طرح کا فرنیچر رکھا گیا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی مغلیہ دور میں قدم رکھ دیا ہو۔ ہر شوپیس اپنی مثال آپ ہے، جس کو دیکھ کر صاحب خانہ کے ذوق شوق کا پتا چلتا ہے۔ خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بھی اتنی اینٹیک چیزیں ہیں بس قدر نہیں کی جیسے ہمارے صوفے چالیس سال پرانے ہیں، کھانے کی ٹیبل بھی عمر کی پچاس بہاریں تو ضرور دیکھ چکی ہوگی، پردے تو کبھی ہم بدلتے ہی نہیں۔ پردے بھی کوئی بدلنے کی چیز ہوتے ہیں۔ اللہ بھی تو ساتھ دیتا ہے۔ پردے کے رنگ بھی

اللہ کی طرف سے بدل گئے۔ ہم تو شاید کبھی نہ بدلتے۔ اصل میں ایک طرف دھوپ آتی ہے تو پردے کا رنگ بدل گیا۔ اب اتنا پیارا لگ رہا ہے لائٹ اور ڈارک براؤن بالکل یونیک، کہیں سے مل بھی نہیں سکتا۔ کپڑے بھی لگ بھگ اتنے ہی پرانے ہوں گے۔ اصل میں احتیاط بہت کرتے ہیں ناں...... جیسے سردیوں میں گرمی کے کپڑے فینائل کی گولیاں ڈال کر رکھ دیتے ہیں اور گرمیوں میں سردیوں کے، خراب ہو ہی نہیں سکتے۔ بس کپڑے پہن کر ایک گھنٹے تک، سر میں درد ہوتا ہے اور الٹی محسوس ہوتی ہے اور فینائل کی گولیاں تیز ہی اتنی ہوتی ہیں۔ اب اگر بڑی چچی تھوڑے دن پہلے ملنے آئیں اور گلے لگتے ہی گردن ڈال دی۔ پتا چلا بدبو دماغ میں چڑھ گئی تھی تو اس میں کوئی میری غلطی تھوڑی ہے۔ اب سلیقہ مند بننے کی کوئی قیمت تو ادا کرنی پڑتی ہے ناں...... خیر بات ہو رہی تھی شمی باجی کے ساتھ ڈنر پر جانے کی...... بچے سب گھر پر تھے۔ امی، ابو کا موڈ نہیں تھا اس لیے میں نے بھی ضد نہیں کی۔ امبر مسرت، میں آفاق، تنویر بھائی اور شمی باجی ہم چھ لوگ دبئی کے النصر ہوٹل ڈنر کرنے جا رہے تھے۔

''ہم یہاں بچوں کو نہیں لاتے، ہر جگہ بچوں کے لانے کی نہیں ہوتی۔'' شمی باجی کہہ رہی تھیں۔

یہ ایک انڈین ہوٹل تھا جو کہ پرانی انڈین فلموں کی ایک اداکارہ چلا رہی تھی۔ چونکہ اتنی نامی گرامی نہیں تھی اسی لیے نام پتا نہیں ہے مگر دیکھ کر مجھے اس کی شکل یاد آ گئی تھی۔ وہ ہی دروازے پر کھڑے ہو کر تمام مہمانوں کو ویل کم کر رہی تھی۔ یہاں پر اسٹیج پر لائیو میوزک بھی چل رہا تھا۔ لائٹ کا بہت اچھا انتظام تھا۔ کھانے کا آرڈر دیا گیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک بہت لذیذ ڈنر ہماری ٹیبل پر تھا۔ کھانا کھاتے، کھاتے اچانک پورے ہوٹل کی لائٹ آف ہو گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد اسٹیج کی طرف لائٹ آن ہونی شروع ہوئیں۔ پھر چار پانچ اسٹیج ڈانسر میوزک کی تھاپ پر رقص کرنا شروع ہو گئیں۔ نئے سے نئے انڈین گانوں پر ڈانس ہونا شروع ہو گیا۔ زندگی میں پہلی دفعہ زندہ لڑکیوں کو اپنے سامنے گھاگرا اور چولی میں ڈانس کرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اچھا ہوا کھانا پہلے کھا لیا ورنہ جو حالت تھی، اس وقت تو کھانا بھی نہ کھایا جاتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی انڈین فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو اور لائیو چل رہا ہو۔ کسی کلب میں ہیروئن ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ ڈانس کر رہی ہو، سامنے لوگ گول، گول ٹیبلوں پر بیٹھے ہوں اور ہیروئن آ، آ کر ٹیبل پر لیٹ رہی ہو۔

ایک نیا تجربہ...... ایک نیا دن...... ایک نیا ایڈونچر...... اسی کا نام ہے۔ دبئی کی زندگی، ابھی تک تو یہی سمجھ آ رہا تھا...... مجھے کبھی کسی ٹی وی یا فلم کی شوٹنگ دیکھنے کا شوق نہیں ہوا تھا...... مگر آج دیکھ کر...... ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جن کے شوق کا واقعی کوئی مول نہیں...... آہ......

☆☆☆

سچی میں......

امبر کا فلیٹ تیسرے فلور پر تھا۔ آنے جانے کے لیے ہر فلور پر دو لفٹس موجود تھیں۔ مگر مجھے سیڑھیوں سے اتر کر جانا پسند تھا اور میں اکثر سیڑھیوں سے نیچے جایا کرتی تھی تو مجھے یہ دیکھ کر واقعی تعجب ہوا کہ سیڑھیاں اترنے والوں میں صرف گوروں کی تعداد تھی...... جو سیڑھیوں پر چڑھنا اور اترنا دونوں پسند کرتے ہیں...... اور ایشیائی تو بے شک فرسٹ فلور پر بھی ہوں...... وہ سیڑھیوں کے بجائے لفٹ کا استعمال کرتے تھے...... یا شاید ہم ایشیائی آرام دہ زندگی گزارنا زیادہ پسند کرتے ہیں ذرا سا چڑھنا یا اترنا...... بھی تکلیف کے معنوں میں آتا ہے۔

ہاں تو میں ذکر کر رہی تھی سیڑھیاں اترنے کا......

شام کو میں جب اترتی...... تو نیچے کاؤنٹر پر ایک انڈین لڑکی کو دیکھتی...... جس کا تعلق شاید سیکیورٹی سے تھا......

وہ یونیفارم میں بھی نظر آتی تھی...... وہ اپنی آنکھوں کا ایسا دہشت ناک میک اپ کرتی کہ دور سے ہی پتا چل جاتا...... کہ وہ ڈراؤنی لڑکی...... وہاں کونے میں کھڑی ہوگی...... پہلے تو میں سمجھی کہ شاید اس کا یہ میک اپ اس

کی سیکورٹی کے حوالے سے ہے..... کہ اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے سب تھر،تھر کانپتے ہوئے گزریں .....مگر بعد میں امبر نے بتایا..... کہ یہاں بہت سی خواتین کو میک اپ میں لت پت رہنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔شاید یہاں کاسمیٹکس کا سامان ارزاں بھی مل جاتا ہے..... یا شاید..... بعض خواتین میک اپ نہ سیکھنے کے باوجود اپنے آپ کو ماہر ہی سمجھتی ہیں۔

میں نے دبئی کی سڑکوں پر بازاروں میں.....اور تفریح گاہوں پر..... زیادہ تر خواتین کو میک اپ میں ہی دیکھا..... کوئی پانچ فی صد ہوں گی جو میک اپ نہیں کرتی ہوں ان۔اس کی بھی کوئی خاص وجہ ہوگی۔یا تو کسی چیز سے الرجی ہوگئی ہوگی یا پھر کوئی سوگ کا پیریڈ چل رہا ہوگا۔اب کراچی جیسے شہر میں تو سیڈ میک اپ بھی کیا جاتا ہے کہ میں نے ایسی خواتین بھی دیکھی ہیں جو کسی کے چہلم اور سوئم میں بھی میک اپ کر کے ہی شریک ہوا کرتی ہیں..... اب کیا کہہ سکتے ہیں کہ میں تو اس کو خواتین کی ایسی مجبوری سمجھتی ہوں کہ جس کے بغیر ان کی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔آہ..... میری اپنی ذاتی کیا رائے ہے تو صرف اتنا ہی ہوں گی۔اگر کسی کو کوئی چیز نہیں آتی تو اسے وہ نہیں کرنا چاہیے..... خراب کرنے سے بہتر یہ ہے کہ انسان وہ نہ کرے۔جیسے مجھے آئی میک اپ نہیں کرنا آتا، نہیں آتا تو میں نہیں کرتی..... اپنی آنکھیں بڑی کرنے سے بہتر ہے کہ میں وہ چیز اپنی آنکھوں پر اپلائی نہیں کروں..... (اور واقعی میں بالکل نہیں کرتی ہوں)

شادی کے،شروع،شروع میں شوق ہوتا تھا کہ جو بھی میک اپ ہے سب لگاؤں بھلے لگانا آتا ہو یا نہیں آتا ہو۔ایک مرتبہ جب میک اپ میں لت پت ہو کر کمرے سے نکلی تو آفاق بولے۔”تمہیں دیکھ کر گھبراہٹ کیوں ہورہی ہے؟“

اب انہیں کیا بتاتی..... کہ آپ کو تو ابھی ہورہی ہے مجھے تو دو گھنٹے سے ہورہی ہے۔جب سے میک اپ کیا ہے۔وہ دن اور آج کا دن میں کم میک اپ کرتی ہوں اب جیسے یہاں دبئی میں ہر عورت کی یہ عادت ہے کہ سائڈ کے گال پر اپنا گال لگا کر ہوا میں پیار کرتے ہیں۔جیسے عربی آدمی بھی کرتے ہیں۔یعنی پیار بھی کرلیا اور کیا بھی نہیں..... یہ پیار منہ پر نہیں کیا جاتا بلکہ کان کے پاس منہ لا کر پیار کی آواز نکالی جاتی ہے۔(عجیب،عجیب طریقے ہیں)

اب یہی پیار ہماری ایک دور کی بھابی نے دیکھ لیا ہے، جیسے ہی کہیں تقریب میں ملتی ہیں ہاتھ ملا کر جھٹکے سے اپنی طرف کھینچتی ہیں پھر اپنا منہ اتنی زور سے منہ پر مارتی ہیں کہ سامنے والے کا برین ہیمبرج ہوتے، ہوتے رہ جاتا ہے۔اور یہی پیار وہ تقریب سے واپسی پر بھی کرتی ہیں اس لیے ان کا نام ہی ہم سب نے برین ہیمبرج رکھ دیا ہے۔

اُفوہ..... برین ہیمبرج نے آج آنے کو کہا ہے..... دوپٹا مفلر کی طرح لپیٹ لوں گی۔برین ہیمبرج کا فون آیا ہے، برین ہیمبرج بلا رہی ہیں۔

کل برین ہیمبرج کے گھر میلاد ہے.....وغیرہ وغیرہ..... دبئی کے اچھے گھروں میں بھی جانا ہوا اور تھوڑے اچھے گھروں میں بھی.....لوگ یہاں بڑے چھوٹے فلیٹوں میں بھی رہتے ہیں کہ جس میں ایک کمرا ہوتا ہے، باتھ روم بھی شیئر کرنا پڑتا ہے۔چولھا کمرے کے کارنر پر رکھا ہوتا ہے۔لوگ بڑی مشکل زندگی بھی گزار رہے ہیں۔امیر ملک ہر ایک کے لیے امیر نہیں ہے۔جیسے دنیا میں ہر چیز ہے مگر ہر ایک کے لیے نہیں ہے۔

آفاق کے آفس کے ایک دوست رحمان صاحب جو تھوڑے عرصے پہلے ہی یہاں شفٹ ہوئے ہیں ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔نئے گھر کی بات ہی الگ ہوتی ہے سو وہ بات ان کے گھر میں بھی تھی۔جب آدمی کوئی چیز بناتا ہے تو داد لینے کا بھی حق رکھتا ہے۔رحمان صاحب ہر چیز بڑی تفصیل سے بتا رہے تھے۔

”یہ دیکھیں بھابی یہ کچن ہے اور یہ ڈرٹی کچن ہے۔“ میں دل میں سوچ رہی تھی کہ انہیں ہمارے کچن کے بارے میں کیسے پتا چل گیا کہ ہمارا کچن ڈرٹی ہے۔ہم تو یہ بات چھپاتے ہیں اور جب کچن ڈرٹی ہوتا ہے تو

جھٹ اس کا دروازہ بند کر لیتے ہیں یہ کیسے فخر سے بتا رہے ہیں کہ ان کی بیوی پھوہڑ ہیں۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ بڑے سے کچن کا دروازہ ایک چھوٹے سے کچن کے اندر کھلتا ہے۔ سامنے والا امریکن کچن صرف سجاوٹ اور شو شا کے لیے ہے۔ اصل کھانا، پیاز، ٹماٹر اور آلو کے چھلکے اس چھوٹے کچن کے اندر موجود ہیں۔

''اصل میں کھانا پکاتے گندگی تو ہوتی ہی ہے۔ اسی لیے ایک ڈرٹی کچن بنایا ہے تاکہ ساری گندگی وہاں ہو سامنے کا کچن صاف ستھرا رہے۔'' رحمان صاحب بتا رہے تھے۔

''یہ تو بڑا اچھا بے وقوف بنایا آپ نے۔'' آفاق، رحمان صاحب سے مذاق کر رہے تھے۔

''یہ پاؤڈر واش روم ہے۔'' دوست ایک واش روم کا دروازہ کھول کر دکھا رہے تھے۔ ان کے واش روم میں تو صرف پاؤڈر ڈالا ہے بچوں نے؟ ہمارے تو بچے بالٹیں، تھیلیاں اور پتا نہیں کیا کیا ڈال دیتے ہیں۔ میں دل میں سوچ رہی تھی کہ سب بچے ایک سے ہی تو ہوتے ہیں۔

ذرا غور کرنے پر پتا چلا کہ پاؤڈر واش روم گھر کے شروع میں بنائے گئے واش روم کو کہتے ہیں جس میں صرف ہاتھ دھونے کا بیسن اور ٹوائلٹ ہوتا ہے۔ نہانے کی جگہ، ڈریسنگ رومز، کپڑے دھونے کی جگہ یہ سب موجود نہیں ہوتی۔

وہ تو شکر ہے کہ میں زیادہ بولی نہیں ورنہ پتا چل جاتا تھا کہ مجھے پاؤڈر واش روم کے بارے میں نہیں پتا، ہم تو ایسے پوز کر رہے تھے جیسے ہم نے پاؤڈر تو کیا لپ اسٹک اور آئی شیڈ واش رومز تک کے بارے میں پی ایچ ڈی کیا ہوا ہے۔

بیگم بھی ان کی ایسی افلاطون تھیں جیسے لگ رہا تھا کہ تمیز، طریقہ، تہذیب اور رکھ رکھاؤ صرف ان کے خاندان کا ہی زیور رہا ہو۔ ایسے، ایسے کھانے اور ان کے ایسے، ایسے نام کہ جو نہ کسی نے سنائے اور نہ سنے۔

''بھابی یہ ضرور کھائیے گا یہ باؤلی ہانڈی ہے۔'' ایک اچھی خاصی ڈش جو کہیں سے بھی باؤلی نہیں لگ رہی تھی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ کالج لائف میں جب بھی کبھی میں گھر میں کوکنگ کرتی تھی تو ابو ہمیشہ کہتے ہیں۔ کیا باؤلوں کی طرح بنایا ہے۔

اس کام میں تو میں .... کم عمری میں ہی ایکسپرٹ تھی مگر مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ میں بھی باؤلے کھانے بنا سکتی ہوں، میں نے دل میں سوچا۔

کھانے کے بعد گھر کی سجاوٹ پر بات نکلی...... میں نے ان کے گھر کی تعریف کی۔

''بھئی یہ میں نے گھر میں بنایا ہے، یہ صوفہ میں نے پرانے والے صوفے کو توڑ کر بنایا ہے، یہ صوفہ کلاتھ میری ساڑی کا ہے، گاڑی میں، میں نے موٹر سائیکل کا انجن ڈلوایا ہے وغیرہ.....'' ٹائپ کی باتیں ان خاتون کا اسٹائل تھا۔ بس صرف دیواریں اور چھتیں اپنے گھر کی انہوں نے نہیں ڈالی تھیں باقی تمام چیزوں کی مزدور وہ خود تھیں۔ اور ہمارا ٹائم ...... ہیں..... کیا واقعی..... مزہ آگیا۔ یقین نہیں آرہا..... ٹائپ کے جملے بول، بول کر گزر رہا تھا۔

''کپڑوں کی ڈیزائننگ کا شوق ہے آپ کو؟'' میں نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا کیونکہ سخت گرمی میں وہ اونی شال لپیٹے بیٹھی تھیں۔ جبکہ ڈیزائنگ میں ہم ماہر (بلکہ ایک زمانے میں تو ہم نے ایک اچھے بوتیک کی بھی نگرانی کی تھی اور بعد میں نقصان اٹھا کر بند کر دیا)

''بھئی آج کل کے اوٹ پٹانگ واہیات سے کپڑے مجھے سمجھ میں نہیں آتے، لمبی، لمبی قمیصیں کہ جس کو دیکھ کر پتا بھی نہ چلے کہ کوئی عورت ہے یا فقیرنی...... گول، گول فراکیں، جیسے آپ پہنی ہوئی ہیں، اب لڑکیوں، بچیوں پر تو اچھی لگتی ہیں مگر اب آپ اور میں اسے پہن لیں تو پاگل ہی لگیں گے ناں..... میں تو سیدھے سادے شلوار قمیص پہننے کی عادی ہوں کہ انسان جہاں بھی رہے ایزی رہے۔'' وہ نان اسٹاپ بولے جا رہی تھیں۔

اور جواب میں، میں ایسے ہنس رہی تھی جیسے رو رہی ہوں۔

چونکہ ان کا نمک کھالیا تھا تو نمک حلالی تو کرنی لازمی ہوگئی تھی۔ اگر نہ کھایا ہوتا تو پھر میں اسے بتاتی کہ باؤلی، تم خالی کھانے ہی باؤلے نہیں بناتیں بلکہ باتیں بھی باؤلے پن کی کرتی ہو یا شاید بعض لوگوں کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور ان کی بات کسی کے دل کا کیا حال کررہی ہے۔

جیسے کراچی میں ہماری ایک عزیزہ ہیں، خاندان والے ان کی امارت کی وجہ سے ان سے تھر تھر کانپتے ہیں، وہ صحیح کہیں یا غلط..... کسی مائی کے لال میں یہ ہمت نہیں کہ ان کو بتا سکے کہ آپ نے یہ بات بالکل غلط کی ہے یا آپ کی اس بات سے کسی کا دل خراب ہوا ہے... یا شاید ایسے لوگوں کو کسی کی پروا ہی نہیں ہوتی وہ یہ سوچتے ہیں کہ انہوں نے جو کہہ دیا ہے سب سراہیں گے اور وہ بھی غلط کہہ ہی نہیں۔

جیسے ایک دن وہ ہمارے گھر آئیں، گھر والے بچھے، بچھے جارہے تھے۔ چائے کا کپ بھی کئی دفعہ ان کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھنے کی کوشش کرچکی تھی، بعد میں پتا چلا کہ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، سروس کسی فائیو کیا ٹین اسٹار ہوٹل کی طرح دی جارہی تھی۔ چھینک انہوں نے ماری اور الحمد للہ ہم پڑھ رہے تھے، جاتے، جاتے بھی ہاتھ پونچھنے کے لیے ٹشو پیپر دیے گئے تھے۔ اس ٹائپ کے لوگ کھانا کم کھاتے ہیں اور ٹشو پیپر زیادہ..... اسی روپے کا ڈبا ایک جھٹکے میں اڑ گیا تھا۔ چلو خیر ہے پتا تو چلا کہ ہمارے گھر ٹشو ہوتے ہیں..... دل کو بھی الگ تسلی دی جارہی تھی۔ ورنہ بچوں کے گھر میں شیشے کے گلاسوں اور ٹشو پیپرز کا ملنا آسان کام تھوڑی ہے، ہاں یہ الگ بات ہے کہ ان کے جانے کے بعد استعمال شدہ ٹشو میں کمال مہارت سے ایسے ڈبے میں دوبارہ ایڈجسٹ کرتی ہوں کہ کیا کمپنی پیکنگ ہوگی۔ اب یہ ہنر ہر ایک میں نہیں ہوسکتا۔ گاڈ گفٹڈ چیزیں ہر ایک میں نہیں ہوتیں۔ بس بھی غرور نہیں کیا.....

''امی، امی قدسیہ آنٹی کا فون آیا ہے۔'' بچے نے ہانپتے، کانپتے فون کا ریسیور مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

''شاید کل کی دعوت کا شکریہ کررہی ہوں گی کہ ہر چیز اے ون تھی..... گلاس بھی شیشے کے تھے اور ٹشو پیپرز بھی موجود تھے۔'' میں اپنے دل ہی دل میں اندازے لگارہی تھی۔

''بھئی دیکھو برا مت ماننا لیکن اتنا گندا ہے تمہارا گھر کہ اللہ توبہ..... اور تمہارا ڈرائنگ روم جس کو... تم سب سے صاف سمجھتی ہو۔ حالت تو دیکھو اس کی، چھتوں پر اتنے لمبے، لمبے جالے ہیں کہ ان پر جھولے لٹک جائیں۔''

''وہ..... اچھا، اچھا صحیح کہہ رہی ہیں، آپ.....'' آواز بھی کہ حلق میں پھنس ہی گئی تھی۔

''کیا کبھی جاتی نہیں ہو یا بند ہی رکھتی ہو بھئی اگر ہفتے میں ایک دن بھی اچھی طرح صفائی کردی جائے تو پورے، ہفتے ڈرائنگ روم کی صفائی کی ضرورت نہیں رہتی۔ تم تو دیکھتی نہیں ہو اپنی صفائی والی کو کہو کہ وہ ہی اپنی تنخواہ حلال کرلے..... کونے، کونے میں کچرے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔''

''آپ نے کونے بھی دیکھ لیے..... اتنی سی دیر میں'' میں نے بے عزتی کو مذاق کا پاجامہ پہنایا۔

''اتنی گندگی تو کسی اندھے کو بھی نظر آجائے، اوپر سے پتا نہیں کس نے کہہ دیا کہ چپے، چپے پہ لائٹ لگادو، جب کوئی مہمان آتا ہے تو تم کونے، کونے کی لائٹ جلادیتی ہو کہ جس کو گندگی نظر بھی نہیں آرہی وہ بھی آجائے، دیکھو چندا برا نہیں ماننا۔''

ہنستے ہوئے رونا کسے کہتے ہیں مجھے اس دن پتا چل گیا تھا۔

''نہیں، نہیں برا ماننے کی کیا بات کی ہے آپ نے!'' دل تو چاہ رہا تھا کہ کہوں اللہ آپ کو سمجھے..... تم کو اس لیے تو نہیں ٹھنسایا تھا کہ ہم پر ہی اچھل کر آؤ۔

اور بھی بہت کچھ کہا..... مگر وہ ضابطہ تحریر میں لے آؤں تو قارئین کی زبان بگڑنے کی ذمے داری ہو جائے گی اور ذمے داری کسی چیز کی بھی ہو آج کی عورت لینے سے گھبراتی ہے، میری طرح..... سچی میں.....

(باقی آئندہ)

موبائل اور انٹرنیٹ کے پر پنپنے والی محبت

شائستہ زریں

جب سے محبت موبائل اور انٹرنیٹ کی مرہونِ منت ہوئی ہے۔ اہلِ محبت کے انداز ہی بدل گئے۔ محبت کی تڑپ طلب میں تبدیل ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں محبت کا دورانیہ مختصر ترین ہوگیا۔ صبح محبت کا بیج دل میں بویا گیا، دن چڑھے اس کی کونپلیں پھوٹیں، دن ڈھلے پروان چڑھی، دن رہے تناور درخت بنی، شام ڈھلے دراڑ پڑی اور رات گئے تک مرجھا گئی۔ محبت میں کے ٹوکی چوٹی سر کرنے والے یہ کہہ کر راستہ بدل گئے کہ

تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

موبائل اور انٹرنیٹ پر یومیہ محبت کرنے والے محبت کے اس آزار سے بھی آزاد ہوتے ہیں کہ ...

محبتوں میں عجب ہے دلوں کو دھڑکا سا
نہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے

کیونکہ محبت صبر طلب ہوتی ہے اور محبت کی صبر آزما جانکاہی ان بے صبر محبت کرنے والوں کے بس کی بات نہیں بقول جمال احسانی

کچھ تو مشکل ہے بہت کارِ محبت اور کچھ
یار لوگوں سے مشقت نہیں کی جاسکتی

سو موبائل اور انٹرنیٹ پر ہونے والی محبت آغاز ہی میں دم توڑ دیتی ہے۔ خالص محبت کو قلب و روح سے نسبت ہے۔

اشفاق احمد رقم طراز ہیں۔ ''محبت تو یہ ہے کہ کوئی احساس دلائے بنا آپ کے درد کو سمیٹ لے، آپ کی کمزوریوں کو ڈھانپ لے۔ اس میں کوئی وعدہ ہو نہ انتظار۔ اس میں کچھ طلب کرنے کی نوبت نہ آئے وگرنہ محض رابطے میں رہنا، گفتگو میں محبت کے بلند و بانگ دعوے کرنا زبان کا چسکا تو ہو سکتا ہے محبت ہرگز نہیں۔''

بلاشبہ محبت ایک آفاقی جذبہ ہے جو لفظی اظہار کا محتاج نہیں، جس سے دلی تعلق محسوس ہو اس کے لیے سرزد ہونے والا رویّہ اور طرزِ عمل آپ ہی اظہار بن جایا کرتا ہے۔ طلب سے ماورا یہ جذبہ روحانی مسرت کا سرچشمہ ہے اور یہ روحانی خوشی تب ہی میسر آتی ہے جب اخلاصِ نیت کے ساتھ محبت کا سفر طے کیا جائے۔ بے لوث جذبے سے عاری محبت، محبت نہیں محض مشغلۂ دل ہے اور محبت دل لگی کا نہیں دل کی لگی کا نام ہے۔

محبت نمبر کے لیے ہم نے محبت کی کہانیاں رقم کرنے والی پاکیزہ کی مصنفات سے معلوم کیا کہ آج کے دور میں موبائل اور انٹرنیٹ پر پنپنے والی محبت کے لیے آپ کیا کہیں گی؟ اور خود آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟

ناہید سلطانہ اختر

موبائل اور انٹرنیٹ پر ہونے والی محبت کے بارے میں، میں یہی کہوں گی کہ اس میں delete کا آپشن آپ کی انگلی کے اشارے پر ہوتا ہے۔ removal کے امکانات سو فیصد۔ اور کوئی بھی ایک فریق دوسرے کو جب چاہے بلاک کرسکتا ہے تو

ایسی محبت جس میں removal، delete اور بلاکنگ کے آپشنز موجود ہوں پائدار کب ہوسکتی ہے؟ موبائل اور انٹرنیٹ پر ہونے والی محبت نئے زمانے کا تحفہ، دل لگی اور سراب ہے۔ اسکرین پر نظر آنے والی جس تصویر کو اس سراب کے پیچھے دوڑنے والا اپنا محبوب جان رہا ہو۔ اس کے پس پردہ اصل چہرہ ہیبت ناک بھی ہوسکتا ہے۔ محبت کے بارے میں، میں اس خیال کی حامی ہوں کہ ''محبت قطبی تارے کے مانند ہوتی ہے جو اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہٹتا''محبت کو مستقیم، مستحکم اور دو طرفہ ہونا چاہیے۔ کوئی ہیرا پھیری نہیں، نقطہ الف سے نقطہ بے تک بغیر کسی پیچ وخم کے مستقیم و مستحکم۔

رفعت سراج

موبائل اور انٹرنیٹ پر پروان چڑھنے والی محبتیں جو ہوتی ہیں وہ سستے صابن کے جھاگ جیسی ہوتی ہیں۔ اس کو محبت نہیں کہتے اس کو ہارمونز کی جنگ یا ہارمونز ری ایکشن کہتے ہیں۔ اس لیے کہ جو ان تمام وارداتوں کو محبت کا نام دے رہے ہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ محبت کیا ہے؟ اس لیے کہ محبت تو باہمی احترام، احساسات کی پاسداری اور قربانی مانگتی ہے۔ اس میں گھر کے ماحول، خوب صورت سماجی اقدار جس کا بیڑا غرق ہو چکا ہے اور اساتذہ کی بے توجہی جس کو مجرمانہ فعل کہنا بجا ہوگا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ آج کل تعلیم کا مقصد صرف اور صرف معاشی مسائل کا حل سمجھا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج کل ڈالر، پونڈز اور نوٹوں کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ نفس پرستی اور احساس برتری کی تقویت کے لیے جو دوڑ دھوپ ہوتی ہے۔ اس میں کہیں بھی خوب صورت سی محبت کو پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ یہ نہیں کہ محبت بالکل ہی ختم ہوگئی ہے یا ناپید ہوگئی ہے۔ اس لیے کہ جب تک دنیا



رفعت سراج

ہے اللہ دنیا کو محبت سے خالی کبھی نہیں رکھ سکتا لیکن انٹرنیٹ اور موبائل کی محبت کو اللہ کی نگاہ میں بھی کوئی وقعت اور مقام حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ شاید محبت کی اس توہین پر پروردگار کا غضب بڑھ جاتا ہوگا کیونکہ اس نے یہ کائنات محبتوں کے پھیلاؤ کے لیے بنائی۔ محبتوں کو بازاری چیز بنانا یا تماشا بنا کر رکھ دینا رب العالمین کے پروگرام میں بہت بڑی دخل اندازی ہے۔ عشق مصطفیٰ ﷺ اس کائنات میں سب سے حسین احساس ہے، عشق مصطفیٰ ﷺ کا مکتب وہ مکتب ہے جس میں داخل ہو جانے کے بعد انسان سارے آداب محبت سیکھ جاتا ہے اور محبت میں ادھورے پن کا احساس ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا ہے۔ میری نظر میں محبت صرف اور صرف احساسات کی پاسداری اور باہمی احترام کے سوا کچھ بھی نہیں اس کے لیے دلیل کے طور پر ایک شعر عرض ہے

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اقبال بانو

انٹرنیٹ اور موبائل پر ہونے والی محبت ......

اول تو یہ رسکی ہے اور یہ محبت پنپتی کبھی بھی نہیں ۔ یہ محبت اس وقت تک پروان چڑھتی ہے جب تک ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ نہ لیں جب دیکھ



اقبال بانو

لیتے ہیں تو 99% ایسا ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند نہیں آتے اتفاقاً اگر پسند آجائیں تو شادی ہوسکتی ہے۔ کسی کسی کیس میں یوں بھی ہوتا ہے کہ ملاقات کے بعد لڑکے کو لڑکی پسند آجاتی ہے مگر اسے لڑکا پسند نہیں آتا یا لڑکی کو لڑکا اچھا لگتا ہے لیکن وہ اسے پسند نہیں آتی۔ اس صورت میں جس جگہ پر پہلی بار ملتے ہیں وہ محبت اسی جگہ دفن ہوجاتی ہے۔ محبت ایک نہایت لطیف اور کومل جذبہ ہے، محبت کو کھیل سمجھنا محبت کی توہین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ سے محبت کی۔ ماں جیسی محبت دنیا میں نہیں...۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ماں سے ستر گنا زیادہ محبت کرتا ہے۔ یہ ایک اعلیٰ و ارفع آسمانی جذبہ ہے اسے ہم نے کیچڑ میں لتھیڑ دیا ہے...... محبت میں سچائی ہو کھوٹ نہ ہو تو دنیا کا خوبصورت ترین جذبہ ہے۔

رضوانہ پرنس

اصل میں ہم کو موبائل اور انٹرنیٹ کی محبت کا کوئی تجربہ نہیں، اس لیے کیا کمنٹ دیں ہوسکتا ہے



رضوانہ پرنس

کہ ان کے ذریعے کسی نے اپنی منزل پالی ہو اور کسی نے ناقابلِ تلافی نقصان اٹھایا ہو یہ تو ان کی فہم و فراست پر منحصر ہے۔ بہت حسین جذبہ ہے، جو زندگی میں دھنک رنگ بھر دیتا ہے لیکن اس جذبے میں شدت اور سچائی کا ہونا لازمی ہے ورنہ تو محبت اس شعر کی تفسیر بن جائے گی۔

نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی دل سے اتر نہ جائے کہیں

قیصرہ حیات

انٹرنیٹ اور موبائل پر پنپنے والی محبت بہت زیادہ فرسٹریشن پیدا کر رہی ہے۔ لوگ جذباتی ہو کر باتیں کرتے ہوئے اپنی حدود کا بھی خیال نہیں رکھتے

اور اس محبت کی حقیقت جب کھلتی ہے تو وہ محض سراب ثابت ہوتی ہے اور اسی لیے وہ رشتے زیادہ مضبوط و دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ میرے نزدیک محبت ایک دوسرے کے جذبات کا احساس اور ان کا خیال رکھنے کا نام ہے۔ محبت صرف پُرخلوص چاہت سے پنپتی ہے۔ اگر اس میں کوئی غرض شامل ہو جائے تو وہ محبت نہیں رہتی۔

شیریں حیدر

موبائل اور انٹرنیٹ پر پنپنے والی محبت فقط دھوکا ہے، جس شخص کو آپ نے دیکھا تک نہ ہو، اسے جانتے تک نہ ہوں، اس کی تصویر اور اس کے الفاظ میں الجھ کر سمجھ بیٹھیں کہ آپ کو اس ان دیکھے شخص سے محبت ہو گئی ہے، خود کو دھوکا دینا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ تصویر بھی کسی اور کی لگائی جا سکتی ہے اور اپنے بارے میں معلومات اپ لوڈ کرنے میں بھی جا ہے جتنا جھوٹ اور غلط بیانی کریں کوئی اس کی تصدیق کرنے والا نہیں۔ ایسی محبتیں جس طرح کڑھی کے ابال کی طرح اٹھتی ہیں، حقیقت منکشف ہونے پر اسی طرح بیٹھ بھی جاتی ہیں۔ مذہبی نقطہ نظر سے بھی یہ غلط ہے اور کسی معاشرے کی اخلاقی گراوٹ کا کھلا ثبوت ہے، بدقسمتی سے ہمارا میڈیا ڈراموں اور اشتہارات کے ذریعے بے حیائی کے اس پہلو کو بڑھا رہا ہے۔



شیریں حیدر

میں تو محبت کی کہانیوں کی لکھاری ہوں، مجھے تو محبت کے سبھی رنگ پیارے لگتے ہیں، اللہ سے محبت دنیا کی ہر محبت کا آغاز ہے، اس نے محبت سے ہمیں بنایا، ہمیں مٹی میں محبت کا خمیر ملا کر تخلیق کیا، ماں کی کوکھ میں رکھا، ماں جو محبت کا دوسرا نام ہے..... باپ جو سراپا محبت ہے، ہماری آنکھ کھلتی ہے تو محبت کے یہ دو محور اور کئی اور خوب صورت رشتے جو ہم سے محبت کے تعلق سے بندھے ہوتے ہیں..... اللہ کے رسول ﷺ سے محبت، جو اللہ کے محبوب ہیں۔ اپنے وطن سے محبت جو ہمارے وجود اور پہچان کا مرکز ہے، اپنے بہن بھائیوں سے، اپنے دوستوں سے، علم کی شمع سے اور اسی طرح اپنے وجود سے منسلک ہر شے سے محبت۔ اس ساری محبت کا اولین اصول یہ ہے کہ ہم خود سے محبت کرنا سیکھیں، اگر ہم خود سے دیانت داری سے محبت کریں گے تو یہی محبت ہر چیز سے محبت کی بنیاد بنے گی۔ باقی اگر ہم نے محبت کا ایک دن منانا شروع کیا ہے تو میں اس کی سخت مخالف ہوں، محبت کسی ایک دن کے لیے ہوتی ہے نہ اس کا اظہار ایک دن کی پابندی کا محتاج۔

نایاب جیلانی

گو کہ موبائل اور انٹرنیٹ موجودہ دور کی ضرورت کے لازمی جزو ہیں۔ موبائل اور نیٹ نے ہمارے نوجوانوں کو جو سب سے بڑا دھچکا پہنچایا ہے وہ ہے وقت کی ناقدری کرنا..... موبائل اور انٹرنیٹ نے "اظہار" اتنا "ارزاں" کر دیا ہے کہ بندہ، بندہ نہ صرف محبت کر رہا ہے بلکہ اظہار کرنے میں لمحہ بھی نہیں لگاتا۔ میرے نزدیک موبائل اور

انٹرنیٹ سے شروع ہونے والی محبت قطعاً... "مایا نداز" ہوتی ہے۔ جتنی جلدی ابال آتا ہے اتنی ہی جلدی بیٹھ بھی جاتا ہے۔ محبت احساسات کی تفسیر کا نام ہے۔

رفاقت جاوید

ہر انسان ہر دور میں محبت کے لمس میں گرفتار ضرور ہوتا ہے۔ محبت کا ایک ہی نام ہے لیکن خوشبوئے محبت کی لاتعداد قسمیں ہیں کبھی تو معصوم ننھی منی کلیوں کے چٹکنے کی مسحور کن خوشبو......
...... بن کر ہوش و حواس پر چھا جائے، کبھی کھلکھلاتے پھولوں کی بے باکانہ شوخی سے مزین کر دے، سماں بدلتا ہے جیسے جھرنوں کی مدھر سی صدا اور کبھی تلاطم خیز موجوں کی شوریدگی اور بغاوت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ کبھی دل کے نہاں خانوں میں مندر بنا لے، کبھی صنم کدہ سجا کر پوجا کرنے پر آئے تو لمحوں کا حساب نہ رہے۔ حسین اَن دیکھے سپنوں اور کنواری معصوم پاکیزہ سوچوں جذبات میں بہہ جانے والی رفاقت کا نام ہے محبت۔



رفاقت جاوید

بقول پروین شاکر

یہ صوت و رنگ یہ آہنگ اجنبی ہی سہی
مجھے لگتا ہے جیسے میں جانتی ہوں انہیں
ازل سے میری سماعت ہے آشنا ان سے

محبت ایک بے اختیار اور بے لگام جذبے کا نام ہے، اس کے اظہار کی کوئی زبان ہے نہ روشنائی ہے فقط بولتی نظروں کا کمال ہے جو بھانڈا پھوڑ دیتی ہے۔ بس یہی بے لوث اور سچی محبت ہے۔ عشق اور دیوانگی ہے اگر اس میں معمولی سا بھی کھوٹ ہے تو وہ محبت نہیں ہوس ہے۔ دو جسموں کی ضرورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آج کے دور میں موبائل پر پروان چڑھنے والی محبت کا اس محبت سے دور پار کا واسطہ بھی نہیں کیونکہ اس کی بنیاد ہی گمنامی اور فریب کاری پر رکھی گئی ہے آج کی محبتیں اسٹیٹس کی محتاج ہیں اگر پہلے رانگ نمبر پر محبت کی توہین اور بے حرمتی کی شروعات ہو جاتی ہے تو اس کا انجام بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ یہی موبائل ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا المیہ بن چکا ہے جس میں محبت نہیں سراسر ذلالت ہے۔

سیما رضا ردا

جس دور میں ہم سفر کر رہے ہیں یہ سائنٹیفک دور ہے۔ اس کے اپنے تقاضے ہیں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سسی پنوں، ہیر رانجھا کو بھی اگر موبائل اور انٹرنیٹ کی سہولت ہوتی تو یقیناً ان کے درمیان کوئی نہیں آتا۔ ان کی محبتوں کے ساتھ روایتیں اور رسم و رواج تھے، جنہوں نے ان کی محبت ان سے چھین لی۔ وہ محبت مری نہیں بلکہ آج بھی زندہ ہے اماں لیلیٰ اور بابا مجنوں کے جانشین اسے پروان چڑھا رہے ہیں بس ان کا طرز محبت جدا ہے۔ ان کی محبت پنپ رہی ہے لیکن بغیر محبت کی روح کے۔ آج بھی لیلیٰ مجنوں کی روحیں آسمان سے حیرت و حسرت سے اپنے جانشینوں کو دیکھتے ہوئے کہیں خوش ہو

رہی ہیں کہ ان کی راہ کے کانٹے ان کے حبا نشینوں نے چن لیے ہیں اور کہیں تڑپ رہی ہیں کہ ان میں وہ اخلاص نہیں جو ہم میں تھا۔ مجھے اس لڑکی کا خواب یاد آرہا ہے۔ جس نے خواب میں لیلیٰ کو دیکھا تھا جس نے کہا تھا کہ...... ''سلام انٹرنیٹ میری وجہ سے آج محبت نے اپنا راستہ خود بنالیا۔''
سوشل میڈیا نے اپنے وکیل آپ پیدا کر



سیمار ضا ردا

لیے۔ محبت کا مقدمہ محبت کرنے والے خود ہی لڑتے ہیں اور مقدمہ جیت جاتے ہیں۔ میری نظر میں محبت بقول غالب

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فر پہ دم نکلے

اللہ کی قدرت کے جتنے بھی مظاہر ہیں وہ سب اللہ کی اپنے بندوں سے محبت کے استعارے ہیں زمین اور آسمان کے درمیان کا نام محبت ہے۔ اس کے بغیر آپ رہ نہیں سکتے، اس کے بغیر آپ جڑ نہیں سکتے۔ محبت شخصیت کی تعمیر کرتی ہے۔ کتنا ہی خوشنما لباس کیوں نہ پہن لیں اگر آپ کے اندر سے محبت کے سوتے نہیں پھوٹتے تو آپ کی شخصیت بھی بے رونق لگتی ہے محبت آسودگی بخشتی ہے حتیٰ کہ غربت کے دامن کو بھی وسیع کر دیتی ہے۔ بقول شاعر

گلابوں کی طرح دلِ شبنم میں رہتے ہیں
محبت کرنے والے خوب صورت لوگ ہوتے ہیں

صائمہ اکرم چودھری

آج کے دور میں موبائل اور انٹرنیٹ پر پہنچنے والی 80% محبتوں کو میں ''بناسپتی'' محبت کہوں گی۔ ہماری نئی جنریشن کی ترجیحات میں محبت دوسرے بلکہ اکثر صورتوں میں تیسرے نمبر پر چلی گئی ہے۔ آج کل تو باقاعدہ سوچ سمجھ کر اور آپشن رکھ کر محبت کی جاتی ہے۔ ہماری آج کل کی نسل بہت مادہ پرست ہے وہ سب سے پہلے اگلے بندے کا اسٹیٹس جاب اور کوالیفکیشن دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے اور بعض صورتوں میں تو ''اسٹپنی'' کے طور پر بھی ایک بندہ ریزرو میں رکھا جاتا ہے۔ ہمارے دور میں اپنے دا'' محبت کا جو رجحان تھا وہ بدل چکا ہے میں اپنے کالج میں اسٹوڈنٹس کے خیالات سن



صائمہ اکرم

کر اکثر حیران ہوتی ہوں۔ کالج میں سیل فون پر پابندی کی وجہ سے جو موبائل ہمارے ہاتھ لگتے ہیں ان کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ ایک محترمہ ایک ہی وقت میں چار، چار لوگوں سے عشق فرما رہی ہیں۔ اس لیے آج کے دور میں انٹرنیٹ اور سیل فون کی محبتوں کو میں پانی کے بلبلے سے تشبیہ دوں گی جو ایک لمحے کو بنتی ہیں پھر ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ محبت جو ہر غرض سے پاک ہو، جس میں انسان کو ظاہر کی آنکھ کے بجائے باطن کی آنکھ سے دیکھا جائے جس میں کچھ دو اور کچھ لو کے اصول نہ چلتے ہوں۔ میری نظر میں یہی محبت ہے۔

قارئین کرام!

مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں کہ

''ایک فائل دل کی بھی ہوتی ہے جس میں ایک ہی نام ہوتا ہے، اگر ایک سے زیادہ ہوتو وہ کتاب نہیں رہتی بلکہ انسائیکلوپیڈیا بن جاتی ہے۔''

بلاشبہ یہ اعزاز موبائل اور انٹرنیٹ کے حصے میں آتا ہے کہ اس نے کتاب محبت کو محبت کا انسائیکلو پیڈیا بنا دیا، بہر دو جانب کسی ایک پر قناعت کا رواج رفتہ، رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی اہم وجوہات بے صبری، انا پرستی اور خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ حقیقت سے کوسوں دور جذباتی ہو کر فیصلے کیے جاتے ہیں جو ''دل کی شرافت'' سے نہیں بلکہ ''شر اور آفت'' سے جنم لیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ محبت عنقا ہو گئی ہے۔ جو روح کی اولین ضرورت اور دل کی تسکین کا سبب بنتی ہے۔ جس میں فریقِ ثانی سے دوری کا خیال ہی سوہانِ روح ہو۔

بقول ادا جعفری

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

بانو قدسیہ صاحبہ نے کیا بھلی بات کہی کہ محبت کے خواب صرف ان ہی کے پورے ہو سکتے ہیں جو محبت میں نہ کچھ مانگتے ہیں نہ طلب کرتے ہیں۔''

اور جہاں ''طلب'' ہی محبت کی ادا ٹھہری وہاں محبت پائیدار کیسے ہو سکتی ہے؟ محبت کو دل سے نسبت ہے تو محبت کی پکار بھی یہی ہے کہ

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

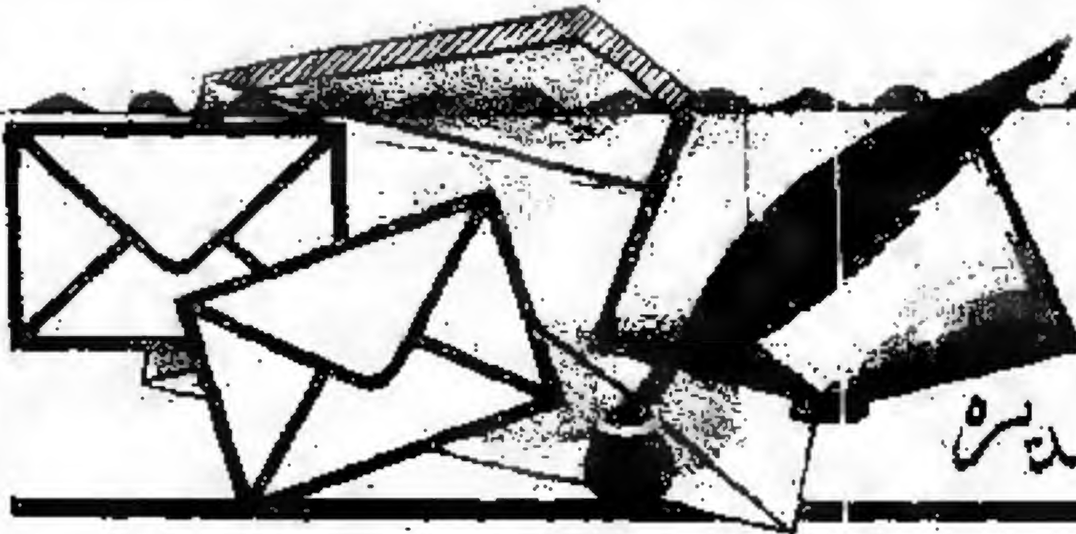
گویا محبت ''شرر'' ہے ''شر'' نہیں۔ وہ چنگاری جو تڑپ بن کر دل میں بھڑکتی ہے اور یہ لازوال جذبہ ذات سے کائنات تک پھیل کر محبت کرنے والے کو کندن بنا دیتا ہے۔

☆☆☆

سب کچھ

میرے گاؤں کے ایک پیڑ پر
اِک کوئل گیت سناتی تھی
جسے سن کر ایک لڑکی کے
پیروں میں پائل بجتی تھی
پھر اِک دن ایسا بھی آیا
اس پیڑ سے کوئل روٹھ گئی
لڑکی کی پائل ٹوٹ گئی
پائل میں اب کوئی گیت نہ تھا
کوئی سجا من کا میت نہ تھا
یہ یادیں کیسی ہوتی ہیں
جو دل میں گھٹ کے روتی ہیں
دیکھو تو سب کچھ ویسا ہی ہے
سوچو تو سب کچھ بدل گیا

شاعرہ: ردا حسین ثومی، کراچی



بہنوں کی محفل

مدیرہ

★ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ!

★ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

★ پیاری بہنو! میری سمجھ میں نہیں آ رہا..... کہ سانحۂ پشاور کا پرسہ کیسے دوں..... اور کس، کس کو دوں..... کہ اس غم میں پوری قوم ہی ڈوبی ہوئی ہے۔ مسلے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر کون سی آنکھ ہوگی جس سے لہو آنسو بن کر نہ ٹپکا ہوگا۔ جب شہید بچوں کی تصویریں ٹی وی پر آنا شروع ہوئیں تو کوئی ہیرو لگ رہا تھا تو کوئی شہزادہ..... کوئی شرارتی سا اور کوئی من موجی سا..... مگر ہر تصویر ایسی تھی کہ دل چاہ رہا تھا کہ ان سب کو اپنی بانہوں میں بھر کر اپنے سینے سے لگا لوں۔ جب میرا یہ حال تھا تو ان کے گھر والوں اور خصوصاً ماؤں کا کیا حال ہوگا۔ جو بے کل ہوئی کہہ رہی تھیں آج تو وہ ناشتا کر کے بھی نہیں گیا، آج اس کا امتحان تھا، کسی نے اپنی بہن سے کہا تھا کہ میں تمہیں کالج لینے نہیں آیا کروں گا..... اب خود آیا کرنا۔ ہر ایک کا جملہ کلیجا پھاڑے دے رہا تھا۔ ان درندوں کا ساتھ کس نے دیا۔ اس کا جواب بھی یقیناً بہت جلد مل جائے گا کہ کیسے، کیسے بھیڑیے انسان کے روپ میں ہوا کرتے ہیں۔ اس قومی سانحے میں کتنی ہماری میری بہنیں اس دکھ کے سمندر میں اتر آئی ہیں۔ اسکول کی پرنسپل جو طاہرہ قاضی کے نام سے جانی جاتی تھیں ہماری رائٹر رفاقت جاوید کی بہو کی سگی خالہ ہیں۔ پاکیزہ کی مستقل قاری شگفتہ جو ہمیں لگا ہے گا ہے فون بھی کیا کرتی ہیں انہوں نے ہمیں فون پر بتایا کہ ان کا بیٹا عبدالاعظم آفریدی سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا اور جسے گھر میں عبداللہ کہا جاتا تھا۔ آرمی میں جانے کا خواہش مند تھا اور بے حد ذہین تھا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ بے حد شاندار تھا۔ شگفتہ بہن فون پر مجھے بتا رہی تھیں اور بڑی ہمت سے بات کر رہی تھیں مگر ان کے لہجے سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے جو میرے دل پر گر رہے تھے۔ اور بھی بے شمار مائیں، سرگرداں و پریشاں باپ، بھائی، بوڑھے اور کمزور، چاچا، تایا، دادا، نانا جن سب کا دکھ ایک ہی تھا۔ جن کے بچوں کی عمریں ابھی یونیفارم پہننے کی تھیں اور وہ کفن پہن کر چلے گئے۔ الفاظ کیسے گونگے ہو جاتے ہیں اور لب کیسے سل جاتے ہیں۔ اس سانحے کے بعد یہ اندازہ مجھے شدت سے ہوا اس دن میرے کمرے میں میری بہو بھی اور میری بیٹی بھی..... اور ہم سب رو رہے تھے اور ایک دوسرے سے بیگانہ تھے۔ خوب صورت چاند سے بچوں کو ٹی وی پر دیکھتے ہوئے ہر ایک کا کلیجا غم سے پھٹا جا رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ ہر بچہ میرا اپنا ہے۔ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔ اللہ سب دیکھ رہا ہے اور وہی صبر دینے پر قادر ہے۔ میری یہی دعا ہے کہ یا اللہ ان شہید بچوں کے والدین، لواحقین کو دلی غم کا کانٹا بھی چھونے نہ پائے اور ہمارے شہید بچوں اور ان کے اساتذہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمانا اور ان کے درجات بلند کرنا، آمین۔ ان بچوں کی مائیں کوئی عام مائیں نہیں ہیں، یہ شہیدوں کی مائیں ہیں اور شہادت کا مرتبہ ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ اور یہ بچے یقیناً خاص الخاص ہی تھے تب ہی تو یہ شہادت کے لیے منتخب کیے گئے اور شہید کبھی نہیں مرتے۔ اللہ ہم سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

ہمارے پاس ڈی جی خان سے شبانہ ملک کا فون آیا، یہ ہماری رائٹر فرحانہ ناز ملک کی بہن ہیں۔ انہوں نے ادارۂ پاکیزہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ان کی فیملی میں سب کو بالخصوص ان کے والد اور بہنوئی کو پاکیزہ کا فرحانہ ناز نمبر بے حد پسند آیا۔ اور جسے سنبھال کر رکھ لیا گیا ہے۔ رائٹرز اور دیگر بہنوں کے مضامین اور خطوط میں فرحانہ کے لیے محبت، چاہت اور دعائیں گندھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شبانہ ملک نے از خود کہا..... تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ فرحانہ سے محبت کرنے والے فرحانہ کی تصویریں بھی دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ آئندہ کسی موقع پر فرحانہ کی تصویریں ہمارے قارئین کے لیے ضرور بھیجیں گی۔ اس ضمن میں، میں یہ کہنا چاہوں گی ادارہ پاکیزہ کے لیے اس کی ہر رائٹر بہت اہم ہے۔ اور ہم نے ان کی ہمیشہ دل سے عزت کی ہے۔ اور یہ رائٹر کا حق ہوتا ہے کہ اسے زندگی میں بھی اور اس کے بعد بھی خراجِ عقیدت پیش کیا جائے..... اور یہ باتیں صرف لفظی نہیں ہیں۔ ہمارے قارئین جانتے ہیں کہ پاکیزہ کے ہر

سالگرہ نمبر میں ہماری مرحوم مصنفات کو ہمیشہ دعاؤں کے پھول بھیجے جاتے ہیں۔شبانہ ہم آپ کے دل سے شکر گزار ہوں گے کہ آپ فرحانہ ناز ملک کی تصاویر ہمارے قارئین کے لیے بھیجیں گی۔ہمارے پاس ابھی تک فرحانہ ناز کے لیے محبت بھرے خطوط آ رہے ہیں ان کو ہم جمع کر کے آپ کے ایڈریس پر ارسال کر دیں گے۔

☆اور اب آ جائیں ایک اہم بات کی جانب...... جو میں اکثر لکھا کرتی ہوں مگر کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا۔میں اپنی نئی مصنفات کے ساتھ ساتھ اپنی بے پروا بہنوں سے بھی یہ کہنا چاہوں گی۔اپنے مسودے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس رکھا کریں اور ہمیں اپنی اور یجنل تحریر بھجوایا کریں کیونکہ اکثر اوقات فوٹو اسٹیٹ کاپی اتنی مدھم ہوتی ہے کہ اسے پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔

☆پینسل سے لکھی ہوئی تحریریں خاصی مدھم ہوتی ہیں، قلم استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

☆اپنے افسانے یا ناولٹ پر صفحہ نمبر ڈالا کریں۔صحیح طرح سے پن اپ کیا کریں اور خاص بات یہ کہ نا قابلِ اشاعت تحریریں تلف کر دی جاتی ہیں اس لیے ان کی واپسی کا تقاضا نہ کیا کریں۔اس سے قبل آپ سرگرمیوں سے آگاہ ہوں آئیں پہلے ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصور واروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔یہ آیت کریمہ کہلاتی ہے۔اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب اپنی بہنوں کی سرگرمیوں سے باخبر ہو جائیں اور بفضلِ تعالیٰ اس مرتبہ خوشی کی خبروں کے ساتھ شروع ہو رہی ہیں۔

☆☆☆

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆جناب معراج رسول اور عذرا رسول کے پیارے بیٹے ذیشان رسول دو جنوری کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی کہ اس میں عزیز و اقارب اور مصنفات و شاعرات نے بھرپور شرکت کی۔مہمان انڈیا، کینیڈا، دبئی اور لندن سے آئے۔مگر عذرا رسول نے شادی کے کاموں سے لے کر ہر امور میں سادگی کو ملحوظ رکھ کر ایک اچھی مثال قائم کی۔پہلے یہ طے پایا تھا کہ ذیشان کا ولیمہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوگا جہاں لاکھوں روپے صرف سجاوٹ پر خرچ کیے جا رہے تھے مگر یہ آئیڈیا عذرا رسول اور ذیشان دونوں نے ہی ریجیکٹ کر دیا کہ اتنے پیسے کے زیاں سے یہ بہتر نہیں ہے ان پیسوں سے غریبوں کی مدد کر دی جائے۔اور ہمیں دیکھ کر دیگر لوگ بھی سادگی کی جانب قدم بڑھائیں۔ بارات، سدا بہار میں گئی جو گلابوں کی خوشبو سے تمام مہمانوں کو مسحور کر رہا تھا۔دلہن اور ان کی فیملی بھی شرقی اور اسلامی اقدار کی حامل ہے۔دلہن ڈاکٹر فاطمہ نے اپنی شادی اور ولیمے کے مواقع پر بھی اپنا دوپٹا اس طرح کور کر رکھا تھا کہ نہ تو ان کے بال نظر آ رہے تھے اور نہ ہی ان کی گردن۔الحمدللہ عذرا جس طرح کی بہو چاہتی تھیں اللہ نے انہیں ویسی ہی بہو عطا کی...... دلی دعا ہے کہ وہ اپنے بیٹے اور بہو سے وابستہ ہر خوشی دیکھیں، آمین۔اس شادی کی مکمل دلچسپ کوریج، رنگین تصاویر کے ساتھ آپ انشاءاللہ پاکیزہ کی قریبی اشاعت میں پڑھیں گی۔

☆مقبول مصنفہ عنیزہ سید کا ٹی وی سیریل تم سے مل کر مقامی چینل پر سولہ فروری سے رات آٹھ بجے شروع ہو رہا ہے۔یہ ڈراما پاکیزہ میں شائع ہونے والے ناول پر مبنی ہے۔

☆ہماری بے حد پیاری تبصرہ نگار اور مقبول شاعرہ شگفتہ شفیق کی پیاری سی بیٹی ڈاکٹر کنزل شفیق کا نکاح تابش اعجاز کے ساتھ کراچی کے ایک خوب صورت بینکوئیٹ میں ہوا۔دولہا تابش لندن میں ہوتے ہیں اور ماشاءاللہ بے حد خوب صورت جوڑی ہے۔یہ ایک پُر محبت تقریب تھی جس میں شرکت کر کے دلی خوشی ہوئی۔بیٹی کی رخصتی انشاءاللہ عید کے بعد ہوگی۔(مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی نئی تبصرہ نگار بشریٰ ملک، پنجاب ان دنوں اپنی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ (پیشگی مبارک باد)
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عمرانہ شہناز اپنے والد شہناز صدیقی اپنی بہن فرحانہ بہنوئی افسر صدیقی کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کر کے کراچی آ گئی ہیں۔ (بے حد مبارک باد)
☆ ہماری شاعرہ اور مصنفہ فریدہ جاوید فری لاہور نے اپنا ساتواں ایوارڈ بھی حاصل کر لیا ہے۔ خبر کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ کھاریاں سے کاروانِ ادب کے منیر طور صاحب کی طرف سے فریدہ کے ناول پر عبدالحلیم شرر ایوارڈ (جو کہ پہلا ایوارڈ ہے) دیا گیا ہے۔ (مبارک باد)
☆ بفضلِ اللہ تعالیٰ یکم جنوری کو میرے چھوٹے بیٹے عمیر کے گھر پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ جس کا نام عنایت رکھا گیا ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ میری پوتی کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں کہ اللہ اسے نیک، تمیزدار، دین دار، فرمانبردار اور اچھے مقدر والی بنائے اور وہ صحت و تندرستی کے ساتھ والدین کے زیرِ سایہ پروان چڑھے، آمین۔
☆ گزشتہ دنوں ڈپٹی اسپیکر شہلا رضا نے معروف مصنفہ ناہید فاطمہ حسنین کو اپنے ہاں دعوتِ حلیم میں مدعو کیا اور پھر ماشاء اللہ سٹی ویلفیئر آرگنائزیشن کے خواتین کے مشاعرے میں ناہید فاطمہ نے شرکت کی اور جہاں ناہید کے کلام کو زبردست پزیرائی حاصل ہوئی۔ وہاں پریشانی کی خبر یہ ہے کہ ناہید فاطمہ کے ہاں گزشتہ دنوں ڈکیتی کی واردات ہوئی جس میں انہیں خاصا مالی نقصان ہوا۔ (ناہید اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے اہلِ خانہ کو سلامت رکھا۔ اور یہ مقام شکر ہے)
☆ عظمیٰ آفاق سعید کی پہلی کتاب بعنوان ذرا سا گھوم دوں میں عنقریب شائع ہو رہی ہے۔ جس کا انتساب ان کی بیسٹ فرینڈ کے نام ہے۔ اس کتاب میں تین ملکوں کے دلچسپ سفرنامے ایک ساتھ موجود ہیں۔ اور اس کتاب کو شائع کروانے کی دلچسپ وجوہات بھی انہوں نے بتائی ہیں۔ یہ دلچسپ کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے القریش پبلی کیشن، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر 042-37652546,042-37668959
☆ پاکیزہ کی مقبول شاعرہ اور تبصرہ نگار سعدیہ ہما شیخ سرگودھا کی ذہین ترین بیٹی حورین نے دوسری مرتبہ میتھس میں آل پاکستان آئی کے ایم سی میں گولڈ میڈل حاصل کیا ہے۔ (ماشاء اللہ)
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری صباحت پیروین کا اپنے کزن جاوید جمیل کے ساتھ لاہور میں نکاح ہو گیا ہے۔ (مبارک باد)
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار نوید تبسم، پشاور سے شادی ہو کر سعودیہ چلی گئیں اب وہاں ان کی دو پیاری، پیاری بیٹیاں، لعل و ماہ اور رزومیصا ہیں۔ (ماشاء اللہ)
☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار مسز خان، کراچی عنقریب اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ ہو رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ، اللہ آپ کو خیر و عافیت اور خوشیوں کے ساتھ اپنے نئے گھر میں رہنا نصیب کرے، آمین)
☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار صبا نور، لیہ نے علامہ اقبال یونیورسٹی سے انٹر کا امتحان دے دیا ہے۔ (ماشاء اللہ)
☆ سدرہ کلثوم، لکی مروت کی اس ماہ سالگرہ ہے۔ (مبارک باد)

☆☆☆

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ مصنفہ افسر سلطانہ کراچی کی بہن قیصر سلطانہ ان دنوں شدید علیل ہیں۔
☆ شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلانوالی کی طبیعت بے حد خراب ہے۔
☆ مصنفہ سیما مناف، کراچی کی طبیعت قدرے بہتر ہے، مگر ابھی آپ کی دعاؤں کی مزید ضرورت ہے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار فیروزہ بیگم، کراچی ان دنوں علیل ہیں۔
☆ شاعرہ، مصنفہ اور تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری، لاہور کو ان دنوں دل کی تکلیف لاحق ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں ظفر، کراچی ہنوز بستر علالت پر ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شازیہ محبوب، کراچی کی طبیعت ناساز ہے۔

٭٭٭

انتقالِ پُرملال

☆ مصنفہ بشریٰ گوندل کی ساس صاحبہ انتقال کر گئیں۔
☆ مصنفہ طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی کی ساس راہی ملک عدم ہوئیں۔
☆ مصنفہ عقیلہ حق کے پھوپی زاد بھائی انتقال کر گئے۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کی دعا کریں۔

٭٭٭

☜ سیما یاسمین مجتبیٰ، کراچی سے۔ ”خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ جنوری کا پاکیزہ ملا اور فوراً ہی دل کو چھو گیا..... سب سے پہلے عظمیٰ آفاق کا دبئی کا سفرنامہ پڑھا بڑی جستگی، شوخی و شرارت کے ساتھ کیا عمدگی سے لکھا ہے۔ بے اختیار منہ سے ماشاء اللہ نکلا۔ اس میں سو فیصد سچی باتیں ہیں یہ کام تو ہم بھی کیا کرتے ہیں کہ اپنی انچیوں پر رنگ برنگی ربن باندھ دیتے ہیں کہ وہ دور سے آتے ہوئے دکھائی دے جائیں کیونکہ ہر دوڑتا ہوا سامان ایک جیسا ہی نظر آتا ہے۔ آپ کا ناولٹ عرصے بعد پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ قسط وار ناول ہم باقاعدگی سے نہیں پڑھ پاتے ہیں۔ اختر شجاعت کا علم ،معرفتِ الٰہی بہت پسند آیا تھا۔“ (شکریہ)

☜ طاہرہ حسین، نیویارک سے۔ ”طویل عرصے بعد پاکیزہ میں تمہارا ناولٹ پڑھا اور بہت اچھا لگا۔ ناول بھی پڑھ رہی ہوں اور دیگر تحریریں بھی مگر عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ ”دبئی کے ہو گئے“ بے حد اچھا لگا۔ ملائشیا کا سفرنامہ پڑھ کر بہت انجوائے کیا تھا۔ محترمہ عذرا رسول کو ان کے بیٹے ذیشان کی شادی کی ہماری جانب سے مبارک باد پہنچا دیجیے گا۔ نیٹ پر تصویریں دیکھی تھیں۔ ماشاء اللہ دولہا، دلہن دونوں ہی بہت پیارے ہیں۔“ (عذرا رسول صاحبہ شکریہ کہہ رہی ہیں، پاکیزہ کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہوں)

☜ رضوانہ پرنس، کراچی سے۔ ”امی کے انتقال کے بعد کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے مگر پاکیزہ حسبِ عادت پڑھا۔ سرورق موسم کی مناسبت سے ہے، سب سے پہلے عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ پڑھا اور بے حد پسند آیا۔ پھر رفاقت جاوید کے ناول کی قسط پڑھی۔ آہستہ آہستہ ورق گردانی کر رہی ہوں تاکہ میری توجہ بٹی رہے۔ جب اکیلی ہوتی ہوں تو ہر طرف مجھے امی نظر آتی ہیں۔“ (پیاری رضوانہ، طاہرہ باجی تو ہر ایک سے محبت کرنے والی تھیں۔ میں جب بھی ان سے ملی، وہ ہمیشہ مجھے گلے سے لگا کر دعائیں دیتے ہوئے ملتی تھیں۔ ان کے انتقال کی خبر نے مجھے بھی افسردہ کر دیا تھا۔ تو تم تو ان کی بیٹی ہو اور لاڈلی بیٹی..... جن کی ہر بات تم سے ہی شروع ہوا کرتی تھی، اپنے آپ کو سنبھالو کہ تم نے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ہاں ان دنوں تو پورے پاکستان میں شادیوں کا موسم ہے۔ تم بھی اپنے بیٹے علی کے لیے بہو کے بارے میں سوچنا شروع کر دو۔ اچھا لگے گا)

☜ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ”بہت عرصے بعد اس محفل میں آئی ہوں۔ پیاری مصنفہ شیریں حیدر کو بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کا گاؤں اور ہمارا گاؤں ایک ہی ہے۔ اور آپ کی تحریریں مجھے بے حد پسند ہیں۔ جنوری کے پاکیزہ میں سب سے زیادہ پسند آنے والی تحریر ”ہم دبئی کے ہو گئے“ تھی پڑھ کر بے حد لطف آیا۔ عظمیٰ اب تمہارا دلچسپ ناولٹ کب آ رہا ہے۔ دیگر تحریریں بھی اچھی ہیں جنہیں میں آہستہ آہستہ پڑھ رہی ہوں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ..... شیریں حیدر بھی شکریہ کہہ رہی ہیں)

☜ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا سے۔ ”انجم باجی کافی عرصے کے بعد اس محفل میں شامل ہو رہی ہوں اور وجہ یہ ہے کہ آپ نے آخر بہت دنوں کے بعد ناولٹ لکھ ہی دیا اور جو مجھے بے حد اچھا لگا کہ مرد جو دل چاہے کرے مگر وہ عورت پر پوری نظریں رکھتا ہے۔ اور یہ واقعی حقیقت ہے۔ پاکیزہ کی ہر تحریر کوئی نہ کوئی سبق لیے ہوتی ہے اس لیے مجھے بے حد پسند ہے۔ رفاقت جاوید کا ناول بہت پسند آ رہا ہے۔ نگہت سیما بھی ٹھیک ہی لکھ رہی ہیں۔ مکمل ناول اچھا لگا۔ افسانوں میں شمیم فضل خالق اور نگہت اعظمی نمایاں رہیں۔ ڈاکٹر زاہدہ پروین کی طرح دیگر ڈاکٹرز کو بھی صحرا میں دوائیاں اور پانی لے کر ضرور جانا چاہیے۔ ہم دبئی کے ہو گئے کی جتنی تعریف کی

جائے کم ہے۔ عظمیٰ کی تحریر میں بے ساختگی ہے، ذرا برابر بناوٹ اور شو بازی نہیں ہے۔ میں اپنی عندلیب کے لیے ہمیشہ دعا کرتی ہوں۔ وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔" (ہاں، دعاؤں میں بہت طاقت ہوتی ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ انشاء اللہ)

٭ فریدہ افتخار، پشاور سے۔ "پشاور کی تاریخ میں جنگ آزادی میں قصہ خوانی بازار میں انگریزوں نے محض گولیاں برسائیں اور وہ زمین لہو میں رنگ دی گئی۔ مگر ایسا ستم تو چنگیز خان، ہلاکو خان نے بھی نہیں کیا ہوگا کہ اساتذہ اور بچوں کے گلے تک کاٹے گئے۔ جن اساتذہ نے بچوں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا ان کا قصہ ہی تمام کر دیا۔ ہماری بھانجی کی بھانجی بھی شہید ہو گئیں۔ چند معصوموں کو بچاتے بچاتے۔ ان کے شوہر ایک سرجن ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ہزاروں آپریشن کیے ہیں مگر انسانی وجودوں کے ساتھ ایسا ظلم کبھی نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں کہ اس ظلم کی آندھی میں اس خون میں کس کس کے ہاتھ ہیں؟ اللہ جانے...... پشاور والوں کے ہر گھر میں اداسی چھائی ہوئی ہے کئی، کئی روز تک چولہے نہیں جلے۔ بس اللہ سے صبر اور حوصلے کی دعا ہے۔ (اس سانحے کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے، یہ غم اور یہ دکھ نہ صرف پاکستان کے ہر گھر کا ہے بلکہ دنیا میں ہر مسلمان نے محسوس کیا ہوگا۔) عظمیٰ بٹی کا دبئی نامہ بہت خوب ہے۔ ابھی چونکہ بیٹی بچے میرے پاس آئے ہوئے ہیں اور نانی اماں ان کی فرمائشیں پوری کر کر کے نڈھال ہوئی جا رہی ہیں مگر ان کے دم سے رونقیں ہیں ماشاء اللہ...... پاکیزہ میرے ہاتھ میں ہے مگر بوجہ مصروفیت نہیں پڑھ پا رہی۔ جنوری میں انشاء اللہ عازم سفر ہو رہی ہوں۔ چند روز دبئی رہ کر پھر بیٹے کے پاس امریکا۔ پروردگار میرے وطن میں امن و سکون خوش حالی لائے اور نیا سال ہم سب کے لیے لاتعداد بے شمار خوشیوں کی نوید لائے اور اس کے رہنے والوں پر اپنی رحمتوں کی برکھا برسائے جو پردیسی ہیں اللہ ان کا بھی حامی و ناصر ہو، آمین۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔" (اللہ آپ کو خیر و عافیت کے ساتھ واپس لائے اور یہاں بھی امن و سکون رہے)

٭ نگینہ ضیا بخش، کراچی سے۔ "جنوری کا سرورق بہت اچھا لگا۔ اپنی طبیعت خرابی کے باوجود سب سے پہلے آپ کا ناولٹ پڑھا اور بہت پسند آیا۔ نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے ناول اچھے جا رہے ہیں۔ نگہت اعظمی، عتیقہ محمد، شمیم فضل خالق کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں۔ شائستہ زریں کا سروے ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے۔ عظمیٰ کا سفرنامہ پڑھ کر ہم اسی میں کھو گئے۔ ویل ڈن۔" (نوازش)

٭ عظمیٰ زہری، اوستہ محمد، بلوچستان سے۔ "پہلے بہنوں کی محفل میں جھانکا بہنوں کے تبصرے پڑھتے، پڑھتے اپنے خط پر نظر پڑی۔ ہائے آپی میں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنی خوش ہوئی بس بے ہوش ہونے کی کسر رہ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے پتا نہیں کون، کون سے پہاڑ سر کر لیے ہوں۔ سب سے پہلے تو جا کر اپنے شوہر کو اپنا لیٹر دکھایا اور کہا دیکھیں میرا خط شائع ہو گیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح ترک وفا ہٹ رہا۔ نایاب جیلانی کے ہاتھوں میں تو جادو ہے۔ جی ایک بات تو بتائیں کیا ایمل سچ میں ارتفاع کی ماں نہیں ہے؟ ویسے ارتفاع بڑی ہی ضدی لڑکی ہے۔ آپی نئے سال کی خوشی ہوئی ہوگی لیکن آپ کے ناولٹ کچی ڈوری رشتے کی نے پاکیزہ اور نئے سال کو چار نہیں آٹھ چاند لگا دیے۔ کیوں بہنوں سچ کہا نا! باقی سب کہانیاں بھی ہمیشہ کی طرح اچھی لگیں۔ عتیقہ محمد بیگ کا گھونسلا بھی زبردست لگا میرے خیال سے اس افسانے کا نام گھونسلا کے بجائے اپنی دنیا ہونا چاہیے تھا۔ جلترنگ تو ہمیشہ ہی خاص رہتا ہے۔ عظمیٰ آفاق آپ کے ساتھ، ساتھ آپ کے سفر میں ہم بھی شریک رہے۔ (شکریہ) باجی میں ایک دعا بھیج رہی ہوں اولاد نرینہ کے لیے۔ ہر لحظہ یا قہار پڑھیں اور پورے نو ماہ اس کا ورد کریں۔ اللہ کے فضل سے انشاء اللہ بیٹا ہوگا۔" (اتنی پیاری دعا بتانے کے لیے جزاک اللہ مگر نماز کی پابندی لازمی رکھنی چاہیے)

٭ تابندہ جبیں، کراچی سے۔ "باجی بہت دنوں بلکہ مہینوں کے بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ مگر پاکیزہ ضرور پڑھتی ہوں بس اب یہ فرق آ گیا ہے کہ جو رسالہ میں ایک دن میں ختم کر لیتی تھی اسپیڈ پڑھنے کی بہت تیز تھی۔ ماشاء اللہ سے۔ اب وہی پاکیزہ پندرہ دن تک وقفے، وقفے سے پڑھ کر ختم کر دیتی ہوں وجہ میرے ان دونوں شہزادوں کا اماں کی ہر چیز پر قبضہ کر لینا ہے۔ میں یہ خط خاص طور پر فرحانہ ناز ملک کے دلخراش حادثے کا پڑھ کر لکھ رہی ہوں اتنا افسوس ہوا کہ بس بالکل ایسے ہی اچانک شاک لگا جیسا کہ شازیہ چوہدری کا پڑھ کر ہوا تھا مگر دل سے تو اب تک شازیہ چوہدری بھی نہیں نکلیں فرحانہ ناز کی مزاحیہ کہانیاں بہت بار پڑھیں یہ ایک اچھی لکھاری تھیں۔ باجی لفظ تھیں لکھتے ہوئے بھی قلم رو رہا ہے۔ ترک وفا پڑھ کر تو مصنفہ کے ذہن کو داد دینی پڑ رہی ہے بہت خوب صورتی سے ناول کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ باقی کے دونوں قسط وار ناول چونکہ ابھی چند ماہ قبل شروع ہوئے ہیں سو ابھی کرداروں کو ہی سمجھ رہے ہیں۔ عظمیٰ آفاق کی عید ملن پارٹی کی روداد پڑھی بہت اچھا لکھا ہے۔ عظمیٰ تو بالکل ایسے منظر دکھاتی ہیں جیسے کہ ہم سامنے بیٹھے سب دیکھ

رہیے ہوں ماشاء اللہ سے اجیہ بھی لمبی ہوگئی ہے اور پیاری سی بھی۔ خیر پیاری تو عظمٰی بھی ہیں باجی ایک راز کی بات بتاؤں آپ شلوار قمیص میں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ساڑی بھی آپ پر بجتی ہے مگر شلوار سوٹ میں آپ الگ سی لگتی ہیں۔ عظمٰی کی پارٹی کی تصاویر دیکھ کر مجھے محترمہ عذرا رسول سب سے زیادہ اچھی لگیں۔ ماشاء اللہ سے بہت فریش لگ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو تا حیات صحت اور خوشیاں عطا فرمائے۔" (آپ کی دعاؤں کے لیے ممنون ہوں۔ مجھے بھی اب شلوار قمیص پہننا سہل لگتا ہے۔ اب تو اپنی آسانی دیکھا کرتی ہوں)

✉ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ "سب سے پہلے آپ کا اداریہ پڑھا کمال کا اداریہ تھا۔ اس مرتبہ افسانے اور ناول ایک سے ایک بڑھ کر لگے۔ شمیم فضل خالق تو اتنا اچھا لکھتی ہیں کہ دل کرتا ہے کہ ان کے ہاتھ چوم لوں۔ شمیم جی کیا خوب افسانہ لکھا ہے کہ پڑھ کر مزہ آگیا۔ نگہت اعظمی نے بھی خوب لکھا۔ آخری روزن کیا بات ہے بمیرا یونس کا مکمل ناول بے حد اچھا لگا۔ ہماری بھانجی یعنی عظمٰی آفاق کا سفر نامہ ہم وہیں کے ہو گئے پڑھا ایسا لگ رہا تھا کہ ہم بھی ساتھ ہیں۔ پڑھ کر بے حد اچھا لگا۔ وہ میرے گمان میں رہا، نزہت جبیں کی تحریر بھی متاثر کن تھی۔ گھونسلا افسانے نے تو اتنا متاثر کیا۔ واہ عتیقہ جی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ فصیحہ آصف کا نیا سال اچھی شاعری لگی۔ زمر نعیم کی غزل بھی اچھی تھی۔ (نوازش) انجم باجی ریڈیو ایف ایم بہاول نگر سے شہروز عالم نے ہمارا انٹرویو کیا پھر ہمیں اس کی ریکارڈنگ بھی سنوائی۔" (یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مبارک باد بھئی)

✉ مہرو بیر، کشمیر سے۔ "ہم نے پیپر زدیے تھے رزلٹ آگیا ہے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے ہیں۔ (کون سی جماعت میں پاس ہوئی ہو؟) سرورق اس بار ... تھا اور امانت کا اینڈ ہوگیا جو کہ بہت اچھا تھا۔ اعتبار وفا بھی اچھا جا رہا ہے آگے جا کر راز کھلے گا۔ ترک وفا کی بات کی جائے تو یہ ... سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس بار ہمیں زیادہ کی امید تھی کہ تمام راز کھل جائیں گے مگر خیر...... باقی تحریریں بھی اچھی ہیں خاص کر زندگی بدلتی ... یہ پڑھ کر لگا واقعی زندگی بدلتی ہے اور فرحین اظفر کی ع سے عورت م سے مجبور واقعی عورت معاشرے میں سب سے زیادہ مجبور ہوتی ہے۔ بہت سی مجبوریاں ہیں جو کہ اسے کیا کچھ کرواتی ہیں۔ اسے اپنا آپ مار کر معاشرے میں رہنا پڑتا ہے۔ علم، معرفتِ الٰہی کے صفحات بڑھائیں۔ باقی پاکیزہ کی تحریریں معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ محترمہ سیما سراج سے نشست بھرپور تھی۔ نزہت اصغر نے اچھی محفل سجائی۔ جلترنگ بہت مزے کا تھا۔ نہیں، نہیں ہم نے کھایا نہیں صرف چکھا ہے۔ روحانی مشورے ہمیں اچھے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے آمین۔" (دیکھیے آپ کا پرانا خط ہم نے لگا دیا ہے، آپ ہر ماہ باقاعدگی سے ہمیں تبصرے بھیجیں وہ دیر سے سہی مگر لگے گا ضرور)

✉ سلمٰی غزل، کراچی سے۔ "صبح صبح گاڑی نکال کر بھاگی۔ جلدی سے جنوری کے پاکیزہ میں اپنا خط پڑھوں تو ڈھونڈے سے نہ ملا ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی میں نے تو پہلی مرتبہ محفل میں بغیر اجازت داخل ہونے کی کوشش کی تھی مگر وائے مقدر کہ اجازت نہیں ملی اب پلیز اس مرتبہ تو میرا خط نظر انداز مت کیجیے گا کیونکہ میں بھی اب مسز ایوب اور ... کی طرح ہر ماہ انٹری دینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ (گزشتہ ماہ آپ کا خط تاخیر سے ملا تھا، اس وجہ سے شامل نہیں ہوا تھا) .... ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اور ہاں یہ پوت پیا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا..... محاورے آپ اور عظمٰی کے لیے ہی ایجاد کیے گئے ہیں کیونکہ ہم تو ... ہو گئے۔ ان محاورے کی تفسیر ہے زبردست، مزیدار اور دلنشین آپ کے جلترنگ کی طرح اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ..... پورا پاکیزہ تو پڑھ نہیں سکی۔ البتہ اعتبار وفا، زبردست، عتیقہ محمد بیگ کا گھونسلا، دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف..... طرف دار دل بھی خوب رہا اور ..... عظمٰی کا سفر نامہ ہی پڑھ سکی ہوں۔ دن چھوٹے اور مقابلہ سخت سمجھ میں نہیں آتا کہ وقت کی طنابیں کھینچ کر کیسے پابند سلاسل کر لیں۔ آپ بہت اچھی، اچھی دین کی باتیں بتاتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی ٹپ ہر وقت وضو بے وضو چلتے پھرتے ایاک نعبد وایاک نستعین..... پڑھتے رہیں پھر اللہ کا کرم دیکھیں۔" (سلمٰی یہ ٹپ ہر ماہ تمہارے تبصرے کی منتظر رہوں گی، ہاں اتنی پیاری دعا بتانے کے لیے جزاک اللہ)

✉ مسز اقصٰی عمران، لاہور سے۔ "ٹائٹل کچھ پھیکا پھیکا سا لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے امت محمدی کو بہت اچھا پیغام دیا۔ ہمارا یہ سال 12 ربیع الاول سے آغاز ہو رہا ہے اور میری دعا ہے کہ اسی کی برکت سے ہم تمام آفتوں اور مصیبتوں سے دور رہیں۔ آپ نے کہا کہ شرک سے بچنے کا عہد کریں۔ مگر مجھے بتائیں لوگوں میں یہ شعور کیسے آئے؟ اکثر مجھے ایس ایم ایس آتے ہیں کہ یہ اللہ کا نام آگے دس لوگوں کو بھیج دو۔ خوش خبری ملے گی کوئی دعا قبول ہوگی۔ تو کیا یہ شرک نہیں ہے کہ ہم بجائے اس کے کہ نماز پڑھیں۔ خدا کے آگے سجدہ ریز ہوں۔ ہم ایک ایس ایم ایس بھیجیں تو اپنی آخرت سنوار لیں گے۔ (استغفر اللہ) اللہ ہم سب کو ہدایت دے۔ (بے

شک) اور آپی سانحۂ پشاور نے حقیقتاً دل کو پریشان کر دیا اور ننھے فرشتوں کی تصویریں دیکھ کر دل خون کے آنسو رو دیا۔ نہ جانے کون درندہ صفت انسان ایسی گھٹیا حرکت میں ملوث ہیں۔ خدا ان تمام شہدا کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے، آمین۔ نگہت سیما کی اعتبارِ وفا دلچسپ ہونا شروع ہوئی ہے مگر اس پر تبصرہ اس کو مکمل ہونے کے بعد ہی کیا جائے گا۔ نایاب جیلانی نے ترکِ وفا میں لفظوں کی جادو گری سے کمال ہی کر دیا۔ آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ بلاشبہ مصنفہ نے بڑی observation اور تحقیق کے بعد یہ ناولٹ لکھا ہے۔ عظمیٰ آفاق کو پڑھ کر ایسا لگا کہ ہم بھی دبئی کی سیر کر رہے ہیں۔ بہت دلچسپ لگا سب کچھ۔ بہنوں کی محفل ہمیشہ کی طرح بہنوں کے کھٹے میٹھے خطوط سے مزین تھی۔ نئے ناموں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ آپ نئے لوگوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ جلترنگ اور پاکیزہ ڈائری مزے کے سلسلے ہیں۔ اور پلیز اس بات کا جواب دیں کہ اگر ہم نے اپنی کوئی روداد یا قصہ بھیجنا ہو تو کیا ہم بھیج سکتے ہیں؟" (ضرور بھیج سکتے ہیں مگر مختصر اور دلچسپ انداز میں.... ہاں تبصرے کے لیے ممنون ہوں)

✉ خدیجہ مومن، پشاور سے۔ "پاکیزہ میں یہ میرا پہلا خط ہے، سیکنڈ ائیر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ میں اور امی پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ آج کل پاکیزہ میں ترکِ وفا چل رہا ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ عظمیٰ آفاق کی تحریر بھی بہت پسند آئی۔ میں اکثر گنگناتی ہوں۔ پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ پتا نہیں میرا خط شائع ہوگا بھی کہ نہیں۔ دل گھبرا رہا ہے لیکن پھر بھی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔" (پیاری خدیجہ اس محفل میں خوش آمدید۔ پاکیزہ میں جو بہن بھی خط لکھتی ہیں۔ چاہے وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں ہی لکھے، ہم اسے ضرور شامل کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے پہلے خط میں ہر تحریر کے بارے میں اپنی رائے نہیں دی ہے، آئندہ تبصرہ بھرپور ہونا چاہیے)

✉ شمائلہ سہیل جاوید، کراچی سے۔ "میری تمام شادی شدہ بہنوں سے یہ دلی درخواست ہے کہ ہم لوگ اپنی گھر داری، بچوں کی تعلیمی مصروفیات، شوہروں اور سسرالی جھنجٹوں کے باعث اپنے والدین کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کو بہت کم وقت دے پاتے ہیں۔ کبھی کوئی بچہ بیمار ہے، کبھی بچوں کو ٹیسٹ جانا ہے، کبھی کسی کے پیپر چل رہے ہیں، نندیں آئی ہیں، ساس بیمار ہیں۔ میاں کے ناشتے، پانی کو بھی دیکھنا ہے۔ یہ سب مصروفیات اپنی جگہ بلکہ ترجیح انہی کو دینی ہے۔ لیکن کچھ وقت، کچھ لمحے، کچھ خدمت، کچھ دل کی کہنا اور کچھ ان کی سننا ان چیزوں کو خدارا نظر انداز مت کریں۔ ہم سے پہلے ہمارے والدین کی خدمت کی باز پرس ہوگی۔ شوہر کے والدین سر آنکھوں پر مگر پھر بھی شوہروں کی اجازت سے اپنے بوڑھے والدین کو نظر انداز مت کریں۔ میں نے اپنا بہت اچھا وقت اپنے والد کے ساتھ گزارا مگر پھر بھی دل میں ملال ہے کہ کسک ہے، جب وہ رکنے کو بلاتے، اپنی جاب کی مصروفیت، بچوں کی تعلیمی سرگرمیاں، گھر، بوڑھے داریاں، پیروں کی زنجیر بن جاتیں۔ انتقال کے بعد رکتے بھی رہے ہیں، چھٹیاں کر کے جا بھی رہے ہیں مگر فائدہ؟ والد ہی نہیں رہے۔ اور ان شوہروں کو میری طرف سے خاص سلام اور دعا جو اپنے والدین کے ساتھ بیوی کے والدین کو بھی اپنا سمجھتے ہیں، یقین کریں ان شوہروں کی ہر کوئی دل سے عزت کرتا ہے۔ نئے سال پر امیدیں ہیں، امنگیں ہیں، حوصلے ہیں، خدا اس سال سانحۂ پشاور جیسا کوئی سانحہ نہ دکھائے۔ تمام ماؤں کی ممتا کو ٹھنڈا رکھے۔ بہر حال اب آتے ہیں جنوری کے شمارے کی جانب سب سے پہلے تو عظمیٰ کو بے حد مبارک باد۔ نگہت سیما نام ہی کافی ہے، اعتبارِ وفا پر ہمیں پورا پورا اعتبار ہے کہ ناول دلوں میں گھر کر لے گا۔ ریحانہ کا افسانہ غربت معاشرے کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ بھوک بڑی ظالم شے ہے۔ نظم روٹی آنکھوں میں گھوم گئی۔ زاہدہ پروین، جنگل کے پھول کو شہر کے گملے میں لگانے کی تیاری کر رہی ہیں مگر کیا اپنی جڑوں سے الگ ہو کر کوئی پنپ سکتا ہے؟ رفاقت جاوید کا اندازِ تحریر کچھ الگ لگتا ہے۔ دیکھتے ہیں آگے چل کر یہ منفرد انداز کیا رنگ لاتا ہے۔ غزالہ عزیز ہمیشہ کی طرح نمبر ون رہیں۔" (تبصرے کا شکریہ، تمہاری اس رائے سے میں سو فی صد متفق ہوں کہ شادی شدہ بیٹیوں کو اپنے بوڑھے والدین کو بھی وقت دینا چاہیے)

✉ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ "تمام افسانے اور ناولز ہمیشہ اچھے ہوتے ہیں، ہم وہی کے ہو گئے آپ کی ہونہار بیٹی عظمیٰ نے خوب لکھا۔ ہمیں بھی ایسا لگا کہ جیسے ہم بھی دبئی کی سیر کر رہے ہیں۔ صحرا میں میڈیکل کیمپ پڑھ کر حیرانی ہوئی کہ اب بھی ایسے لوگ ہیں جو انسانیت کے درد کو سمجھتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فریدہ جاوید فری، امینہ عندلیب کو مکمل صحت دے اور صغیرہ بانو شیریں، رخسانہ پرنس کی والدہ کو جنت میں جگہ دے، آمین۔ ہم ساجدہ ظفر کو ان کے میاں محمد ظفر اللہ ضیا کے موٹر سائیکل جیتنے پر دلی مبارک باد دیتے ہیں۔" (اور ہم آپ کی جانب سے یہ پوچھتے ہیں کہ اب ان کے میاں جی ان کو بائیک پر گھماتے ہیں یا نہیں)

٭ ظل شاہین، رحیم یار خان سے۔ ''خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ پاکیزہ میرے سامنے ہے، حسب سابق دین کی باتوں سے آغاز کیا اس بار اختر شجاعت کے بجائے قیصرہ حیات تھیں یہ بھی بہت اچھا لکھتی ہیں ماشاء اللہ۔ پھر فرحانہ ناز کی یاد میں تم یاد آؤ گی بہت پڑھا تمام رائٹرز کے الفاظ پرخلوص جذبات اور سچے احساسات کی عکاسی کر رہے تھے۔ سویرا فلک کی تحریر پڑھی۔ سچ ہے کہ لفظ طلاق کو ہمارے ہاں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے مگر جو لوگ وسیع قلب و ذہن رکھتے ہیں وہ حالات و واقعات کے حقائق کو سمجھتے ہیں۔ سنہری موتیع میں رائٹر نے مختصر انداز میں اچھی بات سمجھائی۔ کبھی کسی کو خود سے کمتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ نہ جانے زندگی کب اور کیسے اسی کھوٹے سکے کے سامنے آپ کو سوالی بنا کر لا کھڑا کرے۔ مستقل سلسلے بہترین ہیں، جلترنگ میں مکالمہ تو بہت ہی بہنوں کے دل کی آواز ہوگا دیگر خاکے بھی مزیدار ہیں۔ کارزار تحاریر میں فضول خرچی پر نعمانہ گل کی رائے سے مجھے سو فیصد اتفاق ہے بلکہ یہ میرے بھی دل کی آواز ہے کاش لوگ پڑھ کر سیکھنے اور عمل کرنے کی کوشش کریں۔ کارزار پر ہی حجاب عباسی کی نظم بہت دل کو لگی۔ پاکیزہ ڈائری اور بہنوں کی محفل میں اپنی شمولیت پر شکریہ ادا کرتی ہوں۔ سروے میں امینہ عندلیب اور یاسمین طاہر کی باتیں اچھی لگیں۔ عظمیٰ ڈیر نے تو واقعی تارے ہی زمیں پر بلا ڈالے اور ہمیں ان کی پیاری، پیاری بچیوں کو بھی دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ماشاء اللہ اجیہ تو قد میں عظمیٰ تم سے بڑی ہوگئی ہے دونوں بہنیں لگ رہی ہو، ماشاء اللہ۔ عذرا آپا ہمیشہ کی طرح سوبر لگیں اور بے حد پیاری بھی۔'' (ہاں بھئی یہ تو ہے عذرا رسول کوئی رنگ بھی پہن لیں ہر رنگ ان پر ایسا جچتا ہے کہ جیسے ان کے لیے ہی بنا ہے)

٭ شہلا، پنڈی گھیب سے۔ ''پاکیزہ سے وابستگی 2011ء سے ہے۔ شوق تو بہت تھا پڑھنے کا مگر یہ کسی طریقے سے پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ بڑی بہنیں اور کزنز بھی نہیں پڑھتیں تو یہ شروعات ہم نے خود ہی کی۔ (یہ تو اچھی بات ہے) ناہید سلطانہ اختر کمال کی واہ کیا بات ہے اور ہاں اعتبار وفا تو ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ گتھیاں کھل رہی ہے اور ترک وفا تو فیورٹ ہے۔ اور رنگ خلش تو ابتدا ہے لیکن اچھا جا رہا ہے اور ہاں جنگل کا پھول بھی اپنے climax پہ ہے اور باقی تمام کہانیاں زبردست۔'' (اس محفل میں خوش آمدید آپ کو پڑھنے لکھنے کا شوق ہے۔ آپ نئی سہیلیوں اور کزنز میں بھی یہ شوق پیدا کر سکتی ہیں۔ آئندہ بھی آپ کے تبصرے اور مراسلات کی منتظر رہوں گی)

٭ انیبہ زینب، فاروق آباد سے۔ ''گزشتہ ماہ میں نے پہلی دفعہ پاکیزہ پڑھا البتہ میری امی جان باقاعدگی سے پاکیزہ پڑھتی ہیں، میرا پہلا خط ہے اور ساتھ ہی میں اپنا پہلا افسانہ آپ کو بھجوا رہی ہوں امید ہے آپ اس کو پاکیزہ کا حصہ بنائیں گی۔ چونکہ ابھی نیا نیا پاکیزہ پڑھا لہٰذا میں ابھی کوئی رائے نہیں دے سکتی تمام مصنفات کے بارے میں البتہ آہستہ، آہستہ تعارف ہوگا تو پاکیزہ سے انسیت بڑھتی رہے گی۔ آئندہ اپنی لکھی ہوئی شاعری بھی بھجواؤں گی۔'' (اس محفل میں خوش آمدید ابھی آپ کا افسانہ پڑھا نہیں ہے۔ ہاں اپنی شاعری بھی ضرور بھجوائیں)

٭ سیدہ علیشاہ، بہاول پور سے۔ ''آنٹی لائف میں پہلی بار آپ سے فون پر بات ہوئی۔ یقین جانیے بہت اچھا لگا ایسا لگا جیسے میں آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ میں تھوڑی سی کنفیوز بھی تھی مگر جس طرح آپ نے مجھ سے بات کی بے حد محبت اور پیار سے کی۔ وہ میرے لیے کسی ایوارڈ سے کم نہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھے آپ سے فون پر اتنا پیار ملے گا۔ میرا آپ سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔ آپ میرے لیے ایک رول ماڈل ہیں۔ ایک ماں کے جیسی شفیق ہیں۔ پاکیزہ ہمیشہ کی طرح شاندار رہا۔ اعتبار وفا کی یہ قسط لاجواب رہی۔ جلترنگ بہت مزے کا تھا۔ رنگ خلش کچھ خاص نہیں لگا۔ باقی سارے کا سارا پاکیزہ زبردست رہا..... لیکن اپنی نظموں کی غیر موجودگی سے تھوڑا دکھ بھی ہوا۔ اسی لیے آج میری ہی ہی بھی غائب ہے۔ آنٹی جانی آپ نے مجھے انٹرویو بھیجنے کا کہا تھا میں نے آج بھیج دیا ہے۔'' (گڑیا ہمیں تم ہنستی مسکراتی اچھی لگتی ہو، تمہاری بے حد پیاری تصویریں بھی مل گئی ہیں جو شائع ہو جائیں گی)

٭ صابرہ سلطانہ، کیماڑی، کراچی سے۔ ''پاکیزہ میں آپ کا ایک ناول شائع ہوا تھا زیور اور نگین دو کرداروں کے نام یاد ہیں مگر ناول کا نام یاد نہیں تب میں نے پاکیزہ پڑھنا شروع کیا تھا تب سے، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مہینے پاکیزہ مس کیا ہو۔ پاکیزہ محفل کی تمام بہنوں کو سلام خصوصاً امینہ عندلیب اور فاخرہ گل، اگلی میرا اصل نام شگفتہ ہے لیکن قلمی نام میں اپنی والدہ محترمہ کے نام سے لکھنا چاہتی ہوں۔ اخبارات میں اپنے والد محترم کے نام کی نسبت سے لکھتی ہوں۔'' (پیاری صابرہ تمہارا مضمون بھی ملا ہے جو کسی بھی اخبار کے حوالے سے بہترین ہے مگر پاکیزہ کے حوالے سے مناسب نہیں ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ کچھ صفحات نئی رائٹرز کے لیے رکھ دیے جائیں۔ جس میں وہ اپنی زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ لکھیں۔ آپ سب بہنیں بتا دیجیے کہ اس بارے میں کیا کہتی ہیں)

شہلا نواز، لاہور سے۔ ”سرورق اچھا تھا اداریہ فکر انگیز تھا۔ وہ میرے گماں میں رہا اور طرف دار دل بس سو سو تھے۔ آخری روزن اچھا افسانہ تھا۔ کچی ڈوری رشتے کی ناولٹ ہم تو مزاحیہ سمجھے تھے مگر سنجیدہ تھا سو کچھ خاص مزہ نہیں آیا۔ ہاں خاصے کی چیز تو عظمیٰ کا سفرنامہ، ہم دبئی کے ہو گئے تھا۔ چکن تکہ، پزا کے بارے میں پڑھ کر بہت ہنسی آئی ویسے ہمیں بھی پزا پسند نہیں ہے۔ بائیک کی سواری قتالہ عالم کا ڈانس پڑھ کر ہمارا دل بھی بہت مچلا کہ کاش ہم بھی عظمیٰ کے سنگ ہوتے۔ اری عظمیٰ اگلی مرتبہ جانا تو ہمیں بھی دبئی ساتھ لے جانا۔ چاہے ایک بڑی سی اٹیچی میں بند کر کے لے جانا کفن پہنا کے دبئی ائرپورٹ پر چیکنگ کرنے والوں کو کہہ دینا کہ میت لے کے جا رہی ہوں اسی بہانے ہم بھی دبئی یاترا کرلیں گے۔ شائستہ زرین کے سروے نئے موسموں کے نئے خواب ہمیشہ کی طرح موضوع بہت انوکھا تھا اللہ سب کے خواب پورے کرے۔ صحرا میں میڈیکل کیمپ پڑھ کر صحرا کے باسیوں کی حالتِ زار پر بہت دکھ ہوا جن کو پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں...... اور ہم لوگ کتنا پانی ضائع کرتے ہیں۔ بہنوں کی محفل کافی مختصر تھی۔ فریدہ جاوید فری آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ اللہ آپ کو صحتِ کاملہ سے نوازے۔ آپ انجم آنٹی سے میرا موبائل نمبر لے لیں۔“ (پیاری بیٹی شہلا...... اللہ تمہیں خوشیوں کے ساتھ دنیا کا چپا، چپا دکھائے اور تم شاداں و فرحاں گھومو۔ یہ میت والی بات تو مجھے مذاق میں بھی اچھی نہیں لگی۔ اللہ تمہیں لمبی زندگی عطا فرمائے اور تمہارے سارے سوئیٹ ڈریمز پورے ہوں، آمین)

سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ سے۔ ”میں پاکیزہ کی مستقل قاری ہونے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اپنی رائے کا اظہار بھی کر لیتی ہوں۔ اس طرح سے پاکیزہ سے تسلسل میں رہتا ہے...... پاکیزہ اپنے بہترین انتخاب اور سحر انگیز تحریروں کی وجہ سے باذوق بہنوں کے مطالعے میں رہتا ہے۔ نایاب جیلانی کو ناولٹ لکھنے میں ملکہ حاصل ہے اور یہ میری فیورٹ رائٹر ہیں اور ان کے ناولٹ کی نویں قسط انتہائی پُر اثر تھی ختم کر کے ان کا کلائمکس خلافِ توقع تھا (حالانکہ ترک وفا ابھی جاری ہے) حالات و واقعات اور حادثات ابھی باقی ہیں جنہیں جیلانی صاحبہ بڑی مہارت سے پینٹ کریں گی۔ ہم کون؟ میں پاکیزہ بہنیں خود کو تلاش کریں گی اور سیما یاسمین کو شاباش کہ انہوں نے کہانی کو اپنے انداز سے لکھا اور بیان تمام پڑھنے والوں کے انداز سے کیا ہے، سچ میں ایک خصوصی مضمون کا ذکر کرلوں تاکہ بھول نہ جاؤں اس مضمون کو ماضی، حال، مستقبل کو ایک کر کے لکھنے سے یہ مراد لی جائے کہ آج کے بچے، کل کے معمار ہی تو ہیں، پروفیسر سیما سراج صاحبہ کا انٹرویو روایتی رہا، ان سے ادب، شاعری اور ٹیچنگ کے بارے میں کافی سوالات کیے جا سکتے تھے، ان کا تعارفی خاکہ تو کولیں ہے پھر بھی انٹرویو پسند آیا۔ یہ میرا شہر میں ایک انتہائی خوب صورت رادی کا احوال حیا ترمذی نے مہارت سے سیلف انٹرویو کی شکل میں لکھا ہے ایسی تحریریں آج کل دنیا کے ادب میں لکھی جا رہی ہیں خاص کر کے انڈیا میں تو عام ہیں، حیا بخاری کا مکمل ناول کرچیاں محبت کی تھکا دینے والا تھا اس کا آخری پیرا نہایت خوب صورت لکھا ہے اور الفاظ کا اتنا بڑا ذخیرہ۔ روشانے کی دھجیاں، مختصر جامع کہانی تھی یہ افسانہ ہے تو بھی بہتر ہے۔ ناہید فاطمہ کی پری بھی اچھی کوشش ہے۔ سچی بات ہے کہ ع عورت م مجبور کوئی خاص نہیں تھی۔ نہ کوئی تاثر چھوڑا ہوگا پڑھنے والیوں پر...... ناہید سلطانہ اختر نے اپنے سابقہ معیار کو برقرار رکھا ہے، زندگی بدلتی ہے میں یہ ان کا تحریری گر ہے پھر نگہت سیما اعتبار وفا لکھ کر نمایاں رہی ہیں۔“ (تبصرے کا شکریہ)

رخسانہ انصاری، کراچی سے۔ ”انجم آنٹی پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ بہنوں کی محفل میں شریک کر لیں گی۔ نگہت سیما کا ناول اعتبار وفا دسمبر کی چوتھی قسط پڑھی بہت اچھا چل رہا ہے۔ شروعات ہی اتنی زبردست ہے آگے تو اور مزہ آنے والا ہے۔ رفاقت جاوید کے رنگ خلش میں سائرہ بہت صبر والی ہے، اللہ پاک ہر لڑکی میں ایسا صبر شکر دے۔ سائرہ کے شوہر کو تھوڑا تو محبت والا ہونا چاہیے تھا، اتنی نفرت اپنی ہی اولاد سے...... نایاب جیلانی کا ترک وفا آخر کار اختتام پر آ گیا۔ بہت اچھا لکھا میرا تو پسندیدہ ناولٹ رہا۔ رفعت سراج کا امانت کا اینڈ اچھا نہیں تھا پر کوئی بات نہیں اچھا برا تو چلتا رہتا ہے۔ زندگی کا یہی اصول ہے۔ اور سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے کا پہلا ورق بہت پسند ہے۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے اور ہم سب لڑکیوں کو تو سیکھ ملتی ہے بہت شکریہ انجم آنٹی اور پورے کا پورا پاکیزہ ڈائجسٹ ہی پسند ہے، کچھ برا لگتا ہی نہیں...... جلترنگ، پاکیزہ ڈائری، دین کی باتیں یہ سب بہت پسند ہے۔“ (اس محفل میں خوش آمدید، آپ تمام تحریروں کے بارے میں رائے دیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ تبصرے کے ساتھ، ساتھ آپ دیگر مستقل سلسلوں میں بھی شرکت کر سکتی ہیں)

لبنیٰ، کراچی سے۔ ”آپ یقین کریں میں سوچ ہی میں تھی کہ آپ کو میرا خط ملا یا نہیں اور میں لفظوں میں اس خوشی کو بیان نہیں کر سکتی کہ آپ نے خود مجھ سے بات کی صرف ایک دو منٹ ہی سہی مگر میں تا عمر اس خوشی کو محسوس کرتی رہوں گی یہ اور بات ہے کہ یہ خوشی میری تشنہ رہ گئی۔ گزشتہ دو روز سے مجھے شدید بخار تھا جب آپ کا فون آیا اس وقت میں نے مر پڑ کے دوا لی تھی۔ آپ نے پوچھا لبنیٰ بات کر رہی ہو کون ہو کیسے جانتی ہو تو آپ یقین کریں آپ کی پہچان پاکیزہ ہی ہے۔ اور جب، جب بھی مایوسی حد سے بڑھی آپ ہی سامنے آ گئیں۔ آپا یہ مبالغہ آرائی یا خوشامد نہیں ہے میں آپ کو کتنا پسند کرتی ہوں شاید کبھی نہ بتا سکوں۔ آپ کی آواز مجھ تک بہت سہولت سے آ رہی تھی مگر میری آواز آپ تک صحیح نہیں جا رہی تھی کیونکہ آپ مجھ سے پوچھ رہی تھیں بات کر رہی تھیں اور پھر رابطہ ٹوٹ گیا۔ میں نے آپ کو دو دن تک فون کیا مگر میری بات نہ ہو گئی اور دن میں آپ کا نمبر بند تھا۔ ٹھیک جس وقت آپ کی کال آئی تھی تقریباً سات سوا سات کچھ ایسا ہی یاد پڑتا ہے اسی ٹائم کیا تھا مگر خیر...“ (اب دوبارہ مجھے فون کر لیں)

بشریٰ ملک، پنجاب سے۔ ”پاکیزہ سے مجھے دلی لگاؤ ہے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک شمارے میں ہونی چاہئیں۔ ہر بار کی دفعہ اس بار بھی زبردست سلسلے تھے پہلے تو عظمیٰ آفاق کو مبارک باد، ان کی کاوش تارے زمین پر کے لیے۔ کہانیوں میں ٹاپ آف دی لسٹ نایاب جی کی کہانی ترکِ وفا بیسٹ ہے پر اس کہانی میں ہر دفعہ سسپنس بہت ہوتا ہے پھر اس بار مکمل ناولز میں یقین بھی بھرپور تھی۔ آخر میں میری بہن سندس یاسر کے لیے دعا کیجیے گا۔“ (جی ضرور)

شبنم کنول، پاپا نگر سے۔ ”ٹائٹل پسند آیا، دین کی باتیں کا سلسلہ زبردست ہے۔ سلسلے وار ناول زبردست ہیں۔ فرحانہ جی کا ناولٹ، یقین بہت مزے کا لگا۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ ان جیسا شاید ہی کوئی لکھتا ہے۔ اندر کی گہرائیوں میں ڈوب کر۔ افسانے سب کے سب اچھے تھے۔ عظمیٰ آفاق آپی کے تارے زمین پر، پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ بہت ہی شاندار تھا اس ماہ کا پاکیزہ...... پاکیزہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مجھے پہچان دی، آنٹی میرے گاؤں کی لڑکیاں جب پاکیزہ پر میرا نام دیکھتی ہیں تو کہتی ہیں شبنم تم لکھتی ہو۔ ہاں میں لکھتی ہوں پر یہ سب میری آنٹی کی بدولت ہے وہ بھی منظر انداز بھی کر سکتی تھیں۔“ (شبنم آپ کے گاؤں کی لڑکیاں جو پاکیزہ میں لکھنا چاہتی ہیں آپ کو ان کو گائیڈ کریں ناں)

پاکیزہ کا آئندہ شمارہ بہار نمبر اور اپریل و مئی کے شمارے سالگرہ نمبر ایک اور دو ہوں گے۔ ان خصوصی شماروں میں اپنی شرکت یقینی بنانے کے لیے آپ اپنے خوب صورت مراسلات، اپنی تصویر کے ساتھ اپنے مختصر انٹرویو اور اپنی کسی یادگار سالگرہ کا احوال جلد سے جلد ارسال فرما دیں جو بہنیں تصویر کے بغیر یہ احوال لکھ کر بھیجنا چاہیں تو وہ بھی بھیج سکتی ہیں مگر جلدی کیجیے...... کہ ڈاک کا نظام اچھا نہیں ہے۔ اور دیر سے ملنے والی تصویریں ان شاندار نمبرز میں جگہ نہیں پا سکیں گی۔ آئیے درود ابراہیمی پڑھ کر دعا مانگتے ہیں، یا اللہ یا رحمٰن، یا رحیم میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا...... اور دونوں جہاں میں مجھے خیر عطا کر، کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے، اور تیری ثنا سب سے بڑی ہے اور تیری پناہ عزت والی ہے اس لیے صرف اپنا محتاج رکھنا...... اور اپنی شان کے حساب سے اپنا رحم و کرم اور فضل کرنا...... بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیب یا مجیب یا مجیب

دعا گو آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمدِ باری تعالیٰ

خدایا اوّل و آخر بھی تو ہے
خدایا باطن و ظاہر بھی تو ہے
وہ اوّل تو کہ ہے آخر سے آخر
وہ آخر تو کہ ہے اوّل سے فاخر
نہیں اول کو آخر سے جدائی
ورائے عقل ہے تیری خدائی
زمین و آسماں کا نور ہے تو
مگر خود ناظر و منظور ہے تو
مسلّم ہے تجھی کو حکمرانی
کہ تیری سلطنت ہے جاودانی

شاعر: محمد اسمٰعیل میرٹھی

مرسلہ: ظلِ شاہین، رحیم یار خان

نعت رسول مقبول ﷺ

دل چاہتا ہے ان کے لیے نعت میں لکھوں
اس نعت میں نبیؐ کی ہر اک بات میں لکھوں
ہر شے سے پہلے نورِ نبیؐ کا ہوا ظہور
اس نور کے جمال و کمالات میں لکھوں
اس نور سے وجود میں آئی تھی کائنات
اللہ کے حضور مناجات میں لکھوں
رحمت بنا کے بھیجا تھا ربِ کریم نے
کتنے حسین ہوگئے حالات میں لکھوں
پل بھر میں طے ہوا شبِ معراج کا سفر
پیارے نبیؐ کی رب سے ملاقات میں لکھوں
ہجرت ہوئی تو لوگ سراپا خلوص تھے
تاریخ بن گئی ہے مساوات میں لکھوں
اِک معجزہ ملا تھا وہ امت کو دے گئے
وہ نور ہے شفا ہے عنایات میں لکھوں
باتیں تو ہیں ہزار قلم میں سکت کہاں
ممکن نہیں کہ اُن کی ہر اک بات میں لکھوں

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

مرسلہ: شازیہ محبوب، کراچی

دعا

یارب ہم بڑے ہی گناہ گار ہیں
تیری رحمت کے الٰہی طلب گار ہیں
اعمال سے خالی ہے دامن میرا
تیرے فضل و کرم کا ہے بس آسرا
الٰہی میرے اعمالِ سیاہ صاف کر
میرے مالک میری ہر خطا معاف کر
مجھے اللہ پناہ دے، دے جہنم کی آگ سے
روزِ محشر کی سختی، قبر کے عذاب سے
الٰہی تو میرے گناہ بخش دے
تو رحیم ہے رحم کر مصطفیٰ علیہ کے واسطے

مرسلہ: یاسمین اقبال، کراچی

اللہ کا ذکر

ایک اعرابی نے رسول اللہؐ سے عرض کیا۔ ''اسلام میں نیک اعمال بہت زیادہ ہیں، مجھے ایک بات بتا دیجیے، جسے میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا۔

''تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہے۔''

مرسلہ: نور افشاں، شکار پور

حدیث نبوی ﷺ

☆ حضرت ابو سعود بدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

''تم سے پہلے لوگوں میں سے (مرنے کے بعد) ایک شخص کا حساب کیا گیا تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی نیکی نہیں پائی گئی کہ وہ لوگوں سے لین دین کا معاملہ کرتا تھا اور خوش حال تھا اور اپنے غلاموں سے کہتا تھا کہ تنگ دست سے درگزر کیا کرو (جب وہ مرگیا تو فرشتوں سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
''ہم درگزر کرنے کے اس سے زیادہ حق دار ہیں۔ تم اس سے درگزر کرو۔ (اسے معاف کردو)''
مرسلہ: نجمہ اصغر، کراچی

سنہری باتیں

☆ جہادِ کفار اصغر ہے اور جہادِ نفس جہادِ اکبر ہے۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)
☆ مقدمات کا فیصلہ جلد از جلد کرنا چاہیے تاکہ دعویدار اپنے دعوے سے دستبردار نہ ہو جائے۔
(حضرت عمر فاروقؓ)
☆ تلوار کا زخم جسم پر ہوتا ہے اور بری گفتگو کا روح پر۔
(حضرت عثمان غنیؓ)
☆ تیرا نفس تجھ سے وہی کام کروائے گا جس سے تُو نے اسے مانوس بنایا ہے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
مرسلہ: سامعہ ملک پرویز، بھیرہ خانپور

یونہی ہنسی ہنسی میں

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں
کچھ لوگ ایسے ملتے ہیں
یونہی ہنسی ہنسی میں
نہ جانے کیوں اور کس طرح
کتنے دلوں سے ہی کھیل جاتے ہیں
ہر بار ان کو دیکھ کر، اُن سے مل کر
میں سوچتی ہی رہ جاتی ہوں
کہ یہ مختصر سی زندگی
تو نا کافی ہے محبت کے لیے بھی
پھر پاس ایسے لوگوں کے
آ کہاں سے جاتی ہے
گنجائش نفرت کی
شاعرہ: اُم ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

گولڈن پیکیج

''کائنات بنانے والے کی طرف سے یہ سنہری پیشکش ہے۔ جنت میں کشادہ پلاٹ حاصل کرنے کا شاندار موقع انتہائی آسان شرائط پر، خلوص دل سے توبہ کرنے سے ایڈوانس بکنگ کروائیں۔
بس! آپ روزانہ پابندی سے پانچ وقت کی نمازوں کی قسط جمع کراتے جائیں۔
کارنر پلاٹ کے لیے رمضان المبارک کے روزے رکھیں۔ اور بہترین تعمیرات کے لیے زکوٰۃ خیرات دیں۔ اس کے علاوہ بہترین باغ کے لیے حج کی سعادت حاصل کریں۔ مزید خوب صورتی کے لیے تہجد کا اہتمام کریں۔
جلدی کیجیے یہ پیشکش صرف آپ کی زندگی تک محدود ہے۔''
مرسلہ: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

آجاؤ

اے نئے سال کی نئی رُت
اس کی جھولی خوشیوں اور سکھ سے بھر دینا
اور اسے کہنا کہ
اس کے دم سے میری زندگی گنگناتی ہے
اب تو آجائے
کہ بھیگی فروری پھر سے لوٹ آئی ہے
از: حیا ترمذی، کاغان

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ تعلیم نے آبادی کی بہت بڑی تعداد کو پڑھنے کے قابل بنا دیا ہے لیکن یہ تمیز نہیں دی کہ کون سی چیز پڑھی جائے۔
(جی ایم ٹریویلین)

☆ غلط بات جاننے سے نہ جاننا بہتر ہے۔
(جوسٹھ بلنگ)

☆ خالص اور مکمل غم، خالص اور مکمل خوشی کی طرح ناممکنات میں سے ہے۔
(ٹالسٹائی)

☆ مجھے آج تک تنہائی سے بہتر کوئی ساتھی نہیں ملا۔
(ٹالسٹائی)

☆ تقدیر ہمیشہ دلیروں کا ساتھ دیتی ہے۔
(ٹیرینس)

مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

پریشانی

بیٹا: ''پاپا آپ کو سو اور پچاس کا نوٹ راستے میں ملے تو کون سا اٹھائیں گے۔''

سردار: ''سو کا...... بے وقوف تھوڑی ہوں۔''

بیٹا: اسی لیے تو آپ پر لطیفے بنتے ہیں۔ دونوں نوٹ اٹھاتے ہوئے آپ کو پریشانی ہوتی ہے کیا؟

تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد

خلش

دل میں اک خلش سی ہے
گئے دنوں کی بات ہے لیکن
مجھ سے ملنے آئی تھیں تم
اور کچھ کہنے آئی تھیں تم
جو تم کہنا چاہ رہی تھیں
وہ بات میرے دل پر لکھی تھی
دل پر دستک دے کر بھی
خاموش رہیں، کچھ کہہ نہ سکیں
ہولے، ہولے قدم بڑھا کر
چپکے سے تم لوٹ گئیں
کاش تمہاری باتیں سن کر
اپنی مجبوری بتلاتا
اپنا سچا پیار جتاتا
کچھ تو کہتا کچھ تو سنتا
ایک خلش جو دل میں بسی ہے
اس کو مٹاتا
جاگتے سپنوں میں کھو جاتا

کلام: عالیہ ضیا
مرسلہ: ممتاز خانم، کراچی

نئی روشنی

ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اس نے اس کی قبر پر جو کتبہ لگایا اس پر یہ جملہ کندہ تھا۔ ''میری روشنی بجھ گئی۔'' چند سال بعد اس نے دوسری شادی کرلی۔ شادی سے ایک روز قبل اس نے ایک پادری سے پوچھا کہ اسے اپنی پہلی بیوی کی قبر پر نصب کتبے کے الفاظ مٹا دینے چاہئیں۔ ''نہیں'' پادری نے جواب دیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں، بس پرانے الفاظ کے نیچے یہ الفاظ لکھ دو۔ میں نے دوسری موم بتی روشن کرلی۔''

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

میرا قلم

حق کی عظمت کا علمبردار ہے میرا قلم
فکر کی دنیا کا اک سردار ہے میرا قلم
حرف کوئی گر صداقت کا یہاں ہو منحرف
بول اٹھتا پھر سے یہ بیدار ہے میرا قلم
دشمنانِ حق کے رستوں میں کھڑا ہے بے دھڑک
آج دیکھو برسر پیکار ہے میرا قلم
جیسے فرعونِ جہاں کے واسطے موسیٰ کوئی
ظالموں کے واسطے تلوار ہے میرا قلم
یہ جلائے گا یقیناً کالے چہروں کے نقاب
یہ حقیقت ہے کہ اک انگار ہے میرا قلم
روشنی دے مولا تو خانم کے ہر اک لفظ میں
ہاں اگر سچائی کا شاہکار ہے میرا قلم

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور



ہائے ری مجبوری

کتنی تیز بارش ہو رہی تھی۔ زمین کی گرمی نکل گئی تھی۔ درختوں کا سارا گرد و غبار بہہ گیا تھا۔ لہلہاتے ہوئے درخت کتنے خوب صورت لگ رہے تھے۔

پڑوس کے فلیٹ سے بیسن کے پکوڑوں کی خوشبو ان کے فلیٹ میں بھی آ رہی تھی۔

''سنیے... بیسن لا دیں۔'' شمیم نے اپنے میاں سے کہا۔

''پاگل ہو رہی ہو، اس موسم میں پکوڑے کھاؤ گی؟''

''دنیا کھاتی ہے، برسات میں پکوڑے...''

''دنیا کی حرص کرو گی؟''

''کیا حرج ہے۔''

''لوگ کنویں تک ڈوبیں گے تو تم بھی ڈوبو گی؟''

''اللہ! کیا ہو گیا ہے آپ کو، صرف بیسن کے پکوڑے کے لیے آپ مجھے کنویں تک میں ڈبو رہے ہیں؟''

''جب تم میں عقل ہی نہیں ہے تو کیا کروں؟''

''پکوڑے کھانے کا عقل سے کیا تعلق..... اس کا تو زبان سے تعلق ہے، موسم سے تعلق ہے، ساون کی رم جھم سے تعلق ہے۔''

''جب ہی تو تمہیں پاگل کہتا ہوں کہ برسات میں زیادہ کھانے پینے سے طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ بیسن پیٹ میں بھرو گی تو ہیضہ ہو جائے گا۔''

''میں کون سا ٹرے بھر کر پکوڑے بنانے کو کہہ رہی تھی۔''

''ہونہہ میں جانتا ہوں تمہیں، جیسے دو پکوڑے کھا کر تسلی ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے! نہ لا کر دیں۔''

''میرا نہ لانا بھی تمہارے فائدے میں ہے۔'' انہوں نے احسان جتایا مگر وہ پیر پٹخ کر اپنے پڑوس میں چلی گئی جہاں سے اب پودینے کی چٹنی کی بھی خوشبو ان کے فلیٹ میں آ رہی تھی۔

تمناؤں کے رنگ

''سنیے اس برستی بارش میں سی ویو چلیں۔ لوگ جاتے ہیں، خوب مزہ آئے گا۔''

''پاگل ہو گیا، بارش میں بھی کوئی پکنک منانے جاتا ہے؟''

''ہماری امی کے ہاں تو سب جاتے ہی بارش میں جاتے ہیں۔''

''ہاں! تمہارے گھر والوں کی تو الٹی کھوپڑی ہے۔''

''پلیز! لے چلیں نا، آٹھ سال پہلے گئی تھی جب آپ کے بڑے بھائی کی شادی ہوئی تھی۔ سارے مہمان بھی ساتھ تھے۔ ان آٹھ سالوں میں آپ کے بھائی پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کر چکے ہیں اور سیکڑوں دفعہ اپنے بچوں کے ساتھ سی ویو جا چکے ہوں گے مگر ہم نے آٹھ سال پہلے کا سمندر دیکھ رکھا ہے۔''

''سنو! سمندر اب بھی ویسا ہی ہے جیسا آٹھ سال پہلے تھا۔ اس میں سے دریا اور جھیلیں نکال کر شہروں میں جال نہیں پھیلایا گیا۔''

''مجھے تو بس اس بارش میں لے چلیں، میں اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا پتا سمندر کی

لہریں سترہ منزلہ عمارتوں کو چھو کر آ رہی ہوں۔"

"راستے میں جگہ جگہ گٹر ابل رہے ہیں، سڑکوں پر گاڑیاں کشتیوں کی طرح بہہ رہی ہیں، میں پاگل ہوں، جو اس موسم میں اپنی زخم خوردہ بلیلہ نکالوں گا جو رو پیٹ کر دفتر جاتی ہے۔ کیا میں اس سے بھی محروم ہو جاؤں؟"

"اور جو میرا دل ٹوٹے گا، اس کی آپ کو کوئی فکر نہیں؟" سعدیہ نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں! میں بے وقوفی کی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔"

"اس موسم میں جو لوگ پکنک منانے جاتے ہیں وہ کون لوگ ہوتے ہیں؟"

"سو فیصد پاگل...... وہ فخر سے ہنسا۔

تھوڑی دیر توقف کے بعد اس نے میاں جی سے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"سنیے......! بھائی جان، بھابی اپنی جیپ میں ہی دیو جا رہے ہیں۔ ان کا فون آیا تھا کہ اگر چلنا ہے تو ہمارے ساتھ چلو۔ وہ ہمارے گھر ہوتے ہوئے جائیں گے۔"

"ہاں، ہاں چلو تم بھی سمندر دیکھ لوگی۔"

"مگر وہ تو گھر سے نکل گئے ہیں۔ اتنی سی دیر میں، میں کیا تیاری کروں گی۔ میں انہیں منع کر دیتی ہوں کہ آپ لوگ چلے جائیں۔ کیا ہے موبائل نمبر؟" وہ بڑبڑائی۔

"پاگل ہو تم! منع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان ہی کپڑوں میں تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ زیادہ سے زیادہ تم اپنے چہرے پر فیئر اینڈ لولی لگا لو اور لائٹ سی لپ اسٹک...... اپنی بھابی سے زیادہ خوب صورت دکھائی دوگی۔"

"ہاں! بھائی جان پوچھ رہے تھے۔ کوئی چیز راستے میں سے لینی ہو تو بتا دو۔"

"ان سے کہنا صرف آم کی پیٹی لے لیں اور کولڈ ڈرنک کا کریٹ لے لیں۔ کھانا وہ ہمیں وہیں کسی ہوٹل میں کھلا دیں۔ ساون کا مزہ دوبالا ہو جائے گا۔" وہ اپنے میاں جانی کو دیکھ کر بے اختیار ہنس دی کہ اپنی تمناؤں میں رنگ بھی وہ دوسرے کے کندھے پر رکھ کر بھرنے کے عادی تھے۔۔ ہے ناں......!

انوکھی خواہش

تم تنہا ہو، میں تنہا ہوں
چلو خواب نگر میں چلتے ہیں
جہاں پیار کی بارش ہوتی ہے
اور سکھ کے دیپ جلتے ہیں
جہاں پت جھڑ میں بھی پھول کھلیں
اور سرد ہوائیں خوشبو لائیں
خوشیاں برسیں چھم، چھم کرتی
بن بادل ہو برسات جیسے
تمہیں چھونے کا احساس جیسے
یہاں دن کے نظارے جب سوتے ہیں
پھر چاند سے باتیں ہوتی ہیں
پھر خواب میں خواب ہم ہو جائیں
الفاظ ہوا میں کھو جائیں
چپ چاپ کہیں ہم سو جائیں
تم ساتھ چلو تو چلتے ہیں
ہم خواب نگر میں چلتے ہیں

مرسلہ: ممتاز خانم، کراچی

جھوٹی کھیں کی

جوائنٹ فیملی سسٹم میں ایک فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ کہیں پر بھی آنے جانے کی آسانی ہو جاتی ہے۔

اب رفو کو کہیں جانا ہوتا، اپنی کسی بھی نند کو ساتھ بیٹھیں اور چلی جاتیں۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ نندوں کو بازار میں گھومنے کا مراق تھا۔ (شوق تھا) تیز بخار میں بھی جلتی ہوتیں اور اگر کوئی بھولے سے کہہ دیتا،

میرے ساتھ کوئی بازار چلے گا تو شاہدہ اور نجمہ دونوں کراماً کاتبین کی طرح جانے والے کے دائیں بائیں آکر کھڑی ہو جاتیں۔

وہ بازار جاتیں تو ان کی بھی چھوٹی، موٹی خریداری شروع ہو جاتی۔ ان کو دس بیس پچاس کی ضرورت پڑتی تو وہ بخوشی دے بھی دیتیں مگر جب بات ہزار پانچ سو کی ہوتی تو وہ دے کر یہ ضرور کہہ دیتیں کہ واپس کر دینا۔ جسے وہ منہ بنا کر واپس بھی کر دیتیں۔ پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ان کے پاس بازار میں پیسے کم پڑ گئے۔

"شاہدہ! تمہارے پاس پچاس روپے ہوں گے؟"

"نہیں! میرے پاس تو نہیں ہیں۔" صفا چٹ انکار کر دیا گیا۔

"نجمہ! تمہارے پاس تو ہوں گے پچاس روپے۔ ابھی سوٹ خریدنے کو کہہ رہی تھیں نا۔"

"ہاں، میرے پاس ہیں تو مگر مجھے اپنی چیزیں بھی تو خریدنی ہیں۔" وہ آنکس سے بولی۔

"اس وقت تو مجھے دے دو۔ یہ پرس مجھے اچھا لگ رہا ہے اگر اس وقت نہیں لیا تو ہاتھ سے نکل جائے گا۔ کیا پتا پھر ادھر آنا ہو یا نہیں؟" رفو نے کہا۔

"اچھا لے لیں میں بعد میں سوٹ لے لوں گی۔" نجمہ نے پچاس روپے دیتے ہوئے کہا۔ رفو نے پچاس روپے لیتے ہوئے دل میں اس وقت سوچ لیا تھا کہ وہ نجمہ کو یہ پیسے بھی نہیں لوٹائے گی کہ اس نے بارہا اس سے کہیں زیادہ پیسے ان دونوں نندوں پر لٹا دیے تھے اور انہوں نے بھولے سے بھی واپس نہیں کیے تھے۔

"پھر یوں ہوا کہ شاہدہ اور نجمہ بازار جانے کا پروگرام بناتیں اور رفو کو اپنے دیگر ضروری کام یاد آنے لگتے۔ پچاس روپے کا ادھار لیے ہوئے وہ ساتواں دن تھا کہ نجمہ جب بھی رفو کو دیکھتی، سلام بعد میں کرتی پہلے ٹھنڈی سانس بھرتی۔

ایک دن نہ جانے رفو نے کیسے پوچھ لیا کہ تمہارا فیورٹ ٹی وی پروگرام کون سا ہے؟ نجمہ جھٹ سے بولی۔ "پچاس منٹ۔" اور رفو دل ہی دل میں ہنس دی۔ شادی میں جانے میں رفو کو دیر ہوئی تو نجمہ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ "آج آپ کی وجہ سے دیر ہوئی ہے۔ ہم پورے پچاس منٹ لیٹ جا رہے ہیں۔"

یہ لوگ جب شادی میں پہنچے، اس وقت نکاح ہو رہا تھا۔ مہر دس ہزار رکھا تھا۔ نجمہ نے رفو سے کہا۔ "دس ہزار مہر تو کم ہے۔ کم از کم پچاس ہزار مہر تو ہونا چاہیے تھا۔"

رفو اب سب سمجھ رہی تھیں کہ مجھے یاد دلوانے کے اوچھے طریقے بی نجمہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مگر جب اگلے دن نجمہ نے رفو سے اس کا سونے کا ہار مانگا پہننے کے لیے.... (سہیلی کے ہاں جانا تھا) تو رفو نے کھرتل لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں میں نے اسے کہاں رکھ دیا۔ مل ہی نہیں رہا شاید بینک میں رکھ آئی لاکر میں۔"

"اوہ، آپ کو اپنا ہار یاد تک نہیں ہے کہ کہاں رکھا ہے۔"

"ہاں واقعی! گرمی بہت پڑ رہی ہے ناں! اس لیے ذہن بھی کم کام کر رہا ہے میرا۔"

"ابھی آپ پچاس برس کی تو نہیں ہوئیں۔ جو بھول بھلکڑ بھی ہو گئیں۔" نجمہ نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ جسے رفو نے دل ہی دل میں داد دی۔

وہ شاید پندرھواں دن تھا۔ جب نجمہ نے رفو کو دیکھ کر کہا۔ "ارے بھابی جان! بازار چل رہی ہیں۔ سنا ہے کہ وہاں کسی دکان پر بیگ کی سیل لگی ہوئی ہے۔ پچاس، پچاس روپے میں بڑے اچھے پرس مل رہے ہیں۔"

رفو کو اس کی اس ادا پر ہنسی آئی اور چونک کر کہا۔

"ارے یاد آیا، تمہارے پچاس روپے مجھے

دیئے تھے۔لو بھئی، اپنے پچاس روپے۔''

''ارے! میں تو بھول بھی گئی تھی۔آپ نے بتایا تو مجھے یاد آیا۔'' تب نجمہ پچاس کا نوٹ جھپٹ کر بولی۔

تب رفو نے نجمہ کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، جھوٹی کہیں کی۔ ہر وقت تو یاد دلاتی تھی۔ کیا آپ کو بھی کسی نے اس طرح کوئی بات یاد دلائی ہے؟

سزا

پیارے، میاں جانی!

سلامیاں!

کتنی حیرت بلکہ دکھ کی بات ہے کہ گھر میں آپ سے بات کرنے کو میں ترس کر رہ گئی ہوں اور آج آپ کے دفتر کے ایڈریس پر خط لکھ رہی ہوں۔ میاں جانی! آپ تو مجھے شادی کرنے کے بعد مجھے اپنے گھر میں کسی فالتو سامان کی طرح بھول گئے ہیں۔

صبح تڑکے آفس جانا اور شام کو آنا تو اپنی بہنوں میں ایسے بیٹھ جانا جیسے آپ بھی ان کی بہن ہوں۔ میں حیرت سے آپ کو دیکھتی ہوں، جب آپ ان کے بیچ ٹانگ پر ٹانگ رکھے دونوں ہاتھ گود میں رکھے بالکل ان ہی کی طرح بیٹھتے ہیں ان سے آنکھوں، آنکھوں میں باتیں کرتے ہیں۔ وہ آپ کے کانوں میں زہر گھولتی ہیں تو آپ ہنستے ہوئے ان کی کمر پر ایسا ہی دھموکا جڑتے ہیں جیسے آپ کی بڑی بہن اپنی چھوٹی بہن کے جڑتی ہے اور جب میں وہاں پہنچ جاتی ہوں تو سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے سب منہ باندھے بیٹھے ہوں جیسے کوئی بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔

ایک آدھ مرتبہ میں نے پوچھا بھی آپ سب لوگ کیا مسکوٹ، (باتیں) کر رہے تھے؟ تب آپ نے بے اعتنائی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ''ہم تو ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ کتنی اچھی باکسنگ آ رہی ہے۔'' میں نے پھر کچھ پوچھنا چاہا تو آپ کی آپا مجھے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

''پلیز نازنین! خاموش ہو جاؤ۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے مجھے کسی کی مداخلت اچھی نہیں لگتی۔'' تب میں نے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ وہاں ہڑ دنگا سا اشتہار چل رہا تھا۔

''یہ تو بریک آیا ہوا ہے، کیا آپ بریک میں بھی بات نہیں سن سکتیں؟''

''ہاں، نہیں سنتے، پوری توجہ سے ٹی وی دیکھتے ہیں۔ آخر کو کیبل والے کو مہینے کے ساڑھے چار سو روپے دیتے ہیں، وہ بھی تو حلال کرنے ہوتے ہیں۔'' تب میں نے شکایتی نظروں سے آپ کو دیکھا تو آپ اپنی چھوٹی بہن کے کانوں میں ایسی باتیں کر رہے تھے۔ جنہیں سن کر وہ ہنسے چلی جا رہی تھی۔

رات گئے جب میں آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی تو آپ کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا کہ میرے پاس فضول باتیں سننے کا ٹائم نہیں۔ صبح دفتر جانا ہے، سونے دو۔ میاں جی کوئی ایسے بھی کرتا ہے جیسے آپ کرتے ہیں اور کبھی، کبھی تو آپ رات کو بھی میرے کمرے میں نہیں آتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے گھر سے بھاگ کر آپ سے کورٹ میرج کی مگر آپ بھی تو میرے اس جرم میں برابر کے شریک تھے۔

یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں آپ کی بہنوں اور اماں کو اپنے کمرے کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی کہ وہ اس قابل ہی نہیں ہیں۔

مگر میں تو...... ''قابلہ'' ہوں آخر آپ نے مجھ سے شادی کی تو کوئی تو خاص بات مجھ میں بھی ہوگی۔ پلیز مجھے پریشان مت کریں۔ مجھے خط کا جواب دو بدو دیں کہ شادی کے بعد بیوی صرف محبوبہ ہی رہنا چاہتی ہے اور آپ کا تو نام بھی محبوب ہے تو مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟

والسلام! مسز محبوب!

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صعدیہ زیدی

☆ رابعہ عمران ...... رحیم یار خان

وہ زخم دے کے مجھے حوصلہ بھی دیتا ہے
اب اس سے بڑھ کے طبیعت شناس کیا دے گا
وہ میرے اشک بجھائے گا کس طرح محسن
سمندروں کو وہ صحرا کی پیاس کیا دے گا

☆ یاسمین رشید ...... کراچی

طواف کوئے سخن ختم ہی نہیں ہوتا
کوئی نہیں ہے تو ہم دیکھنے میں آتے ہیں
اُٹے ہوئے ہیں غبار شکستگی میں سلیم
جو آئینے پس غم دیکھنے میں آتے ہیں

☆ نفیسہ آرا ...... راس الخیمہ

جو جس کا حق ہے اسے روز سونپ دیتے ہیں
بچا کے کچھ بھی تو ہم رائگاں نہیں رکھتے
جو نیکی کرتے ہیں دریا میں ڈال دیتے ہیں
کبھی حساب غم دوستاں نہیں رکھتے

☆ عرشیہ جنید ...... کراچی

اختلاف رائے ہی سب کچھ نہیں ہوتا سلیم
بات اچھی ہو تو پھر آگے بھی چلنی چاہیے

☆ جبیں نیاز ...... ملتان

تمام عمر بھٹکتی پھری سرابوں میں
اب آرزو دلِ صد چاک سے لپٹتی ہے

☆ جمیلہ لوہی ...... بلوچستان

سرہانے میت کے کہہ رہے ہیں کہا سنا میرا معاف کر دو
وہ دل میں شاید سمجھ گئے ہیں یہ واپسی کا سفر نہیں ہے

☆ تابندہ قیصر ...... پاک پتن

اندھیری رات میں سایہ تو ہو نہیں سکتا
یہ کون ہے جو مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

☆ غزالہ طارق ...... سرگودھا

ترکِ تعلق کو صرف ایک لمحہ چاہیے
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا

☆ ممتاز خانم ...... کراچی

رہین ہجر ہیں گوشہ نشینیاں میری
یقین کیسے کریں بے یقینیاں میری
میں عشقِ پیچاں سے ٹوٹا، کہاں، کہاں نہ گیا
اُڑائے پھرتی رہیں بے زمینیاں میری

☆ کوثر خالد ...... جڑانوالہ

ویسے تو زندہ دل ہیں مگر پھر بھی اے شکیل
ہوتا ہے اک درد ہماری ہنسی کے ساتھ

☆ کاشف عبدالحلیم ...... میرپور خاص

یہ خواہش ہے کہ تجھے خود سے بھی زیادہ چاہوں
میں رہوں یا نہ رہوں میری وفا یاد رہے

☆ عنبر وسیم ...... گوجرانوالہ

آنکھوں سے بڑا کوئی ترازو نہیں ہوتا
تُلتا ہے بشر جس میں وہ میزان ہیں آنکھیں

☆ ارم کمال ...... فیصل آباد

شام سورج کو ڈھلنا سکھا دیتی ہے
شمع پروانے کو جلنا سکھا دیتی ہے
گرنے والے کو تکلیف تو ہوتی ہے مگر
ٹھوکر انسان کو پھر چلنا سکھا دیتی

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



گرلڈ فش مچھلی

اشیا: مچھلی، ایک سے ڈیڑھ کلو کی ثابت لے لیں۔ pamfret جسے عرفِ عام میں پاپلیٹ بھی کہتے ہیں وہ ہو تو اچھا ہے۔ نمک، سرخ مرچ، پسی کالی مرچ، حسبِ ذائقہ لے لیں۔ سرکہ آدھا کپ۔ پسا ہوا لہسن، دو کھانے کے چمچ۔ بیسن یا بھونا ہوا آٹا، ایک کپ۔ ہری مرچ، چار سے چھ عدد۔ پیاز، ایک گول بڑی (لچھے کاٹ لیں) آئل، حسبِ منشا۔

ترکیب: مچھلی کو دھو کر اس پر نمک اور سرکہ مل کر آدھے گھنٹے رکھ دیں۔ اب اس میں لہسن پیسٹ اور مرچ ملائیں اور بیسن یا آٹے میں الٹ پلٹ کر کے مزید آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک گرل پین کو درمیانی آنچ پر گرم کریں اس میں کوکنگ آئل کا لیپ کریں اور مچھلی کو اس پر رکھ کر باری، باری دونوں جانب سے گرل کر لیں۔

ایک ڈش میں پیاز کے لچھے اور ہری مرچ کاٹ کر اس میں گرلڈ مچھلی رکھ دیں۔ اسے سلاد، چٹنی، چاٹ مسالا، کیچپ یا چٹ پٹے رائتے کے ساتھ تناول فرمائیں۔

زرینہ خان، بارہ کہو

ہرے لہسن کا فرائی قیمہ

اشیا: قیمہ، آدھا کلو۔ (بیف، مٹن یا چکن کا) پنیر آدھا کپ۔ ہرا لہسن، باریک کاٹ لیں۔ (آدھا کپ لے لیں)۔ دہی، ایک کپ۔ نمک، سرخ کٹی مرچ، کالی مرچ، پسی ہوئی حسبِ ذائقہ۔ پیاز، ایک عدد درمیانی (چوپ کر لیں)۔ کوکنگ آئل، حسب ضرورت۔ ادرک پیسٹ، ایک چھوٹا چمچ۔

ترکیب: ایک دیگچی میں آئل گرم کر کے چوپڈ پیاز ڈال کر گولڈن ہونے تک چمچ چلائیں۔ اب اس میں نمک، مرچ، ادرک ڈال کر بھونیں پھر قیمہ ڈال کر مزید چمچ چلائیں۔ اب دہی پھینٹ کر ڈالیں اور ہلکی آنچ پر پندرہ منٹ چھوڑ دیں۔ اگر قیمہ گل گیا ہے تو پانی خشک کر لیں۔ اب ایک پھیلی ہوئی ڈش میں قیمہ نکال لیں اور ہرا لہسن جو آپ نے دھو کر باریک کاٹا ہوا ہے۔ قیمے کے گرد گولائی سے سجا دیں۔ قیمے کے وسط میں پنیر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈالیں اور اوپر سے ڈش کو کور کر لیں۔ بھاپ سے پنیر اور لہسن کچھ نرم پڑ جائیں گے اب اسے گرم، گرم چپاتی یا ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

بینا عباس، کراچی

نو اَنند سلاد

پیاری بہنو! آج آپ کو سبزیاں کھانے کی آسان سی ترکیب بتاتی ہوں۔ سردیوں میں تو اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

اشیا: مٹر کے دانے، ایک کپ۔ گاجر، شلجم، شملہ مرچ، چقندر، اروی، آلو، پھول گوبھی، یہ تمام سبزیاں حسبِ پسند ملا جلا کر آدھا کلو ہو جائیں۔ انڈے دو عدد (سخت ابال لیں) مولی اور کھیرا کچا ہی لے لیں۔ اگر پسند ہو تو ہرا دھنیا، پودینہ، مولی کے پتے، ہری مرچ اور ہری پیاز بھی باریک، باریک

کھانے پینے کی اشیا محفوظ رکھیں

1۔ اگر دالیں مہینے بھر کی ضرورت سے زیادہ آگئی ہوں تو انہیں فریج یا فریزر میں تھیلیوں میں کس کر بند کرکے رکھ دیں یا پھر خشک دیگچی میں چولھے پر اچھی طرح کلھار لیں یعنی جس طرح زیرہ یا سونف خشک بھونتے ہیں پھر ٹھنڈا کرکے ائر ٹائٹ جاروں میں رکھیں ویسے ہفتے میں دالیں ہوں مسالے ہوں یا فریج میں رکھی سبزیاں ان چیزوں کو الٹ پلٹ کر ضرور دیکھتے رہنا چاہیے۔ ورنہ کبھی کبھی ٹماٹر یا پیاز سڑ جاتے ہیں اور خاتونِ خانہ اوپر ہی اوپر سے اٹھا کر کام نمٹاتی رہتی ہیں۔ ساری بات دلچسپی کی ہے۔ اگر کام میں دلچسپی ہو اور اپنے شوہر یا باپ، بھائی کے پیسے کا درد ہو تو کبھی چیزیں ضائع نہ ہوں۔

2۔ ہرا دھنیا، پودینہ، سلاد پتا یا اور کوئی سبز پتے فریج میں محفوظ کرنا مقصود ہو تو پہلے انہیں صاف کرلیں کہ کوئی گلا سڑا پتا نہ ہو پھر ایلومینیم فوائل یا ٹن فوائل کے علیحدہ علیحدہ پیکٹ بنا کر اس میں یہ پتے محفوظ کرلیں اور فریج میں سبزی کے خانے میں رکھ لیں۔

ناہید انجم، لاہور

کاٹ کر شامل کرلیں۔ لیموں کا رس حسبِ پسند۔ اخروٹ کی گری، آدھا کپ۔ پسی کالی مرچ، بھنا اور پسا ہوا سفید زیرہ اور نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: تمام سبزیاں دھو کر چھیل کر ابال کر چوکور کاٹ لیں۔ چقندر بغیر چھیلے ابالیں الگ برتن میں اور پھر چھلکا اتار کر کاٹ لیں۔ اروی دھو کر چھیل کر کاٹ کر الگ برتن میں ذرا سے پانی میں ابال لیں کہ یہ لیس دار ہو جاتی ہے۔ ایک بڑی سرونگ ڈش میں تمام سبزیاں ڈال کر مکس کرلیں۔ (انڈے بھی کاٹ لیں) اور جو اشیا کچی ڈالنی تھیں وہ بھی شامل کرلیں اوپر سے نمک کالی مرچ اور زیرہ بھی چھڑک لیں لیموں کا رس بھی ملا لیں۔ کانٹے کی مدد سے اوپر نیچے کرلیں اور آخر میں اخروٹ کی گری بھی ڈال دیں۔ یہ ایک مکمل کھانا ہے۔ موسمی سبزیوں سے لطف اندوز ہوں اور رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے میرے حق میں بھی دعا کریں۔

عرشیہ جنید، کراچی

ثابت مونگ کی پینڈیاں (لڈو)

اشیا: ثابت مونگ .... آدھا کلو۔ چینی ڈیڑھ پاؤ۔ دیسی گھی، ایک کپ۔ دودھ، ایک کپ۔ میوہ جات (گری) بادام، پستہ، اخروٹ، منقے، ناریل، مکھانے، چار مغز، خشخاش، سفید تل۔

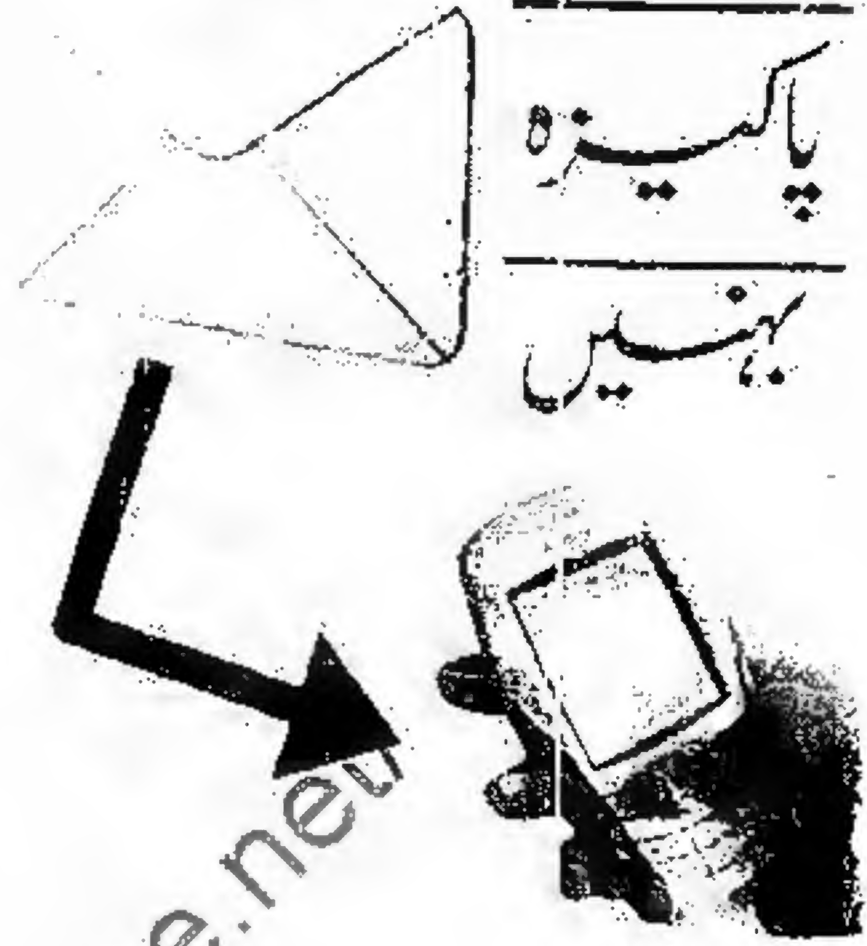
یہ تمام اجزا اپنی استطاعت اور ضرورت کے تحت دو کپ لے لیں۔ چار مغز، تل اور خشخاش دو، دو کھانے کے چمچ مکھانے الگ دو کپ لیں۔

ترکیب: دال کو اچھی طرح چن کر تھوڑا بھون کر خوب باریک پیس لیں۔ تمام میوہ جات بھی صاف کر کے چھان پھٹک کر باریک پیس لیں۔ چینی اگر باریک ہو تو اچھا ہے۔ اب پسی دال کو گھی کے ساتھ سوجی کی طرح بھونیں کہ خوشبو اٹھنے لگے اب اس میں میوہ اور چینی ڈال کر بھونیں۔ چینی نہ پگھلے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ آمیزہ بھون کر کچھ دیر ٹھنڈا ہونے رکھیں مگر بالکل ٹھنڈا نہیں کرنا ورنہ لڈو نہیں بنیں گے۔ ایک ململ کا کپڑا ہاتھ میں لے کر اس میں ایک لڈو جتنا آمیزہ رکھیں اور دودھ کی مدد سے دبا دبا کر گول، گول پینڈیاں بنالی جائیں۔ ہتھیلی سرخ تو ہو جائے گی مگر آمیزہ ٹھنڈا نہیں ہونے دینا۔ اس طرح تمام آمیزے کی بڑے یا چھوٹے جیسا بھی چاہیں گول گول لڈو بنالی جائیں۔ دودھ کی مدد سے یہ آمیزہ بندھ کر لڈو کی شکل میں ہو جائے گا۔ تھوڑی محنت لگے گی ضرور مگر مزیدار سی چیز تیار ہو جائے گی۔ سردیوں کے لیے ائر ٹائٹ جار میں محفوظ کرلیں اور اپنی اور مہمانوں کی تواضع کریں۔

فضہ بتول، بارہ کہو

سندیسے

پاکیزہ بہنیں



اعجاز کے نام

سنو!
تم عزم والے ہو، بلا کا ضبط رکھتے ہو
تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا مگر دیکھو!
جسے تم چھوڑتے جاتے ہوا سے تو ٹھیک سے
شاید
بچھڑنا بھی نہیں آتا......

از: بشریٰ ملک، ٹیکسلا

پیمائش محبت

نہ کبھی ہماری محبت کی آزمائش کر سکو گے
جان سے زیادہ کیا فرمائش کر سکو گے
چاہتے ہیں تم کو اتنا جتنا سمندر میں ہے پانی
کیا سمندر کے پانی کی پیمائش کر سکو گے

شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

اپنی بہنوں سے ایک سوال اور ایک پیغام

"کمزور کا یہی زور چلتا ہے کہ وہ پیٹھ پیچھے برائی کرے۔"
کیا آپ کمزور ہیں؟

از: عرشیہ جنید، کراچی

سوال

کوئی بھی دکھ پیارے نہیں ہوتے
سمجھوتوں پر گزارے نہیں ہوتے
میں اس سے پوچھ بھی تو سکتا تھا
ہوں پر آ کے سوال مگر سارے نہیں ہوتے

شاعرہ: صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ

روتے روتے

میں اپنی سکھی کو
دلاسا دیتے ہوئے
یہ کہہ رہی تھی
بے وفاؤں کے لیے کبھی
رویا نہیں کرتے
یہ کہہ کر میں خود
پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی

از: خدیجہ مومن، پشاور

ادھار

☆ نقد بڑے شوق سے، ادھار اگلے چوک سے۔
☆ ادھار ایسا جادو ہے جو ہم آپ پر کریں گے تو آپ غائب ہو جائیں گے۔
☆ تو نقد تیرہ ادھار۔
☆ آپ بہت ہی اچھے ہیں، ادھار اچھا نہیں ہے۔
☆ ادھار مانگ کر شرمندہ نہ کریں۔
☆ ادھار کی ماں ابھی مری نہیں، نقد کا باپ ابھی زندہ ہے۔
☆ آئے نقد ہے اور جائے ادھار سے۔
☆ ادھار محبت کی قینچی ہے اور نقد محبت کو سیتی ہے۔
☆ آج نقد کل ادھار۔
☆ نقد میں برکت ہے اور ادھار میں شر ہے۔

مرسلہ: فردوس شاہی، لاڑکانہ



روحانی مشورے

ادارہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ کے بڑے لاڈلے پیغمبر تھے، آپ کے والد کا نام عمران بن قاہث تھا اور والدہ کا نام یوحا نند تھا۔ جب آپ مصر میں پیدا ہوئے تو اس وقت فرعون کی حکومت تھی۔ فرعون کو نجومیوں نے حضرت موسیٰ کے بارے میں پیش گوئی سے آپ کی پیدائش سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ ہوگا جو تمہاری حکومت ختم کرے گا۔ لہٰذا جو بچہ پیدا ہوتا فرعون اسے قتل کروا دیتا۔ یہاں تک کہ عورتوں کے حمل بھی گرائے گئے۔ موسیٰ کو آپ کے والدین نے ایک صندوق میں بند کر کے خدا کے بھروسے پر دریا میں صندوق بہا دیا۔ آخر وہ صندوق پکڑ کر فرعون کے خادموں نے اس کے گھر پہنچا دیا۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر ہی پل کر جوان ہوئے۔ جب آپ بڑے ہوئے تو آپ کی فرعون سے ٹکر ہوئی پھر آپ حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس رہے اور ان کی لڑکی سے آپ کی شادی ہوئی۔ اس دوران آپ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا۔ اس کے بعد آپ نے پھر فرعونیوں کو دعوتِ حق دی۔ فرعون اور اس کے حواریوں کے ساتھ سخت مقابلہ رہا۔ آخر اللہ نے آپ کو مصر چھوڑنے کا حکم دیا لیکن فرعون نے چاہا کہ آپ کو قتل کر دیا جائے لہٰذا اس نے آپ کا تعاقب کیا اور دریائے نیل میں غرق ہوا۔ اس کے بعد آپ نے عرصہ دراز تک بنی اسرائیل کو رشد و ہدایت کی۔ آپ نے اپنی اس تمام زندگی میں چند خاص موقعوں پر اللہ کے حضور دعائیں مانگیں جو حضرت موسیٰ کی دعائیں کہلاتی ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

طلب رزق کی دعا

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ○

اے میرے پروردگار! تو اپنے خوانِ کرم سے اس وقت جو نعمت بھی مجھ کو بھیج دے میں اس کا سخت حاجت مند ہوں (پ۔۲۰۔قصص۔آیت ۲۴)

فرعون کے علاقے سے آپ ہجرت کر کے مدائن پہنچ گئے۔ وہاں آپ ایک درخت کے سائے کے نیچے بیٹھ گئے۔ قریب ہی ایک کنواں تھا جہاں پانی لینے والوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم سے ذرا فاصلے پر دو لڑکیاں کھڑی تھیں جو اپنے جانوروں کو پانی پلانا چاہتی تھیں۔ لہٰذا آپ نے ان کے لیے پانی نکالا اور پھر مندرجہ بالا دعا مانگی، لہٰذا جو شخص سفر میں بھوکا، پیاسا ہو اور کھانے کے لیے کچھ نہ ملے اگر اس دعا کو کثرت سے پڑھنا شروع کر دے تو جلد ہی اس کے قیام و طعام کا بندوبست ہو جائے گا اور اس آیت کے ورد سے بھوکا نہیں رہے گا۔

دعائے مغفرت

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ ○

اے میرے پروردگار (یہ) تو میں نے اپنے اوپر (بڑا ہی) ظلم کیا تو میرا گناہ معاف فرما (پ ۲۰۔قصص۔آیت ۱۶)

قرآن پاک میں حضرت موسیٰ کے بارے میں ایک واقعے کا ذکر ہوا ہے۔ جس میں بیان ہوا ہے کہ آپ نے اللہ کے حضور استغفار کیا اور وہ واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ آپ شہر میں جا رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک قبطی ایک اسرائیلی کو مار رہا ہے۔ اسرائیلی کمزور تھا آپ نے قبطی کو سمجھایا کہ

زیادتی نہ کرو اور اس کو مت مارو لیکن قبطی زیادتی سے باز نہ آیا۔ چنانچہ آپ نے قبطی کو روکنے کے لیے اسے ایک تھپڑ مارا۔ لیکن اسے ایسی چوٹ لگی کہ وہیں مر گیا تو اس پر آپ نے اللہ سے معافی مانگی اور استغفار کے لیے مندرجہ بالا آیت پڑھی۔

لہٰذا اس دعا کی خاصیت یہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس پر خود ہی ظلم کر بیٹھے اور اس دعا کو کثرت سے پڑھے تو اللہ اسے معاف کر دے گا۔

عام گناہوں سے معافی مانگنے کے لیے بھی یہ دعا بہت عمدہ ہے لہٰذا ہر نماز کے بعد اسے ایک بار پڑھ لینا چاہیے۔ اگر کوئی شخص اسے ہر جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب بعد تہجد کے وقت ۲۱ جمعراتوں تک ایک ہزار مرتبہ شب بھر میں پڑھے تو اس کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے خواہ وہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔

دشمنوں کے ہاتھ سے نجات پانے کی دعا

رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھ کو (ان) ظالم لوگوں سے نجات دے۔ (پ ۲۰۔ قصص، آیت ۲۱)

قبطی کے واقعے نے حضرت موسیٰ کو پریشان کر دیا۔ فرعون تک جب بات پہنچ گئی تو اس نے حضرت موسیٰ کو پکڑنے کا حکم دے دیا۔ کچھ لوگوں نے آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ایک شخص نے آپ کو حالات سے آگاہ کر دیا اور آپ کو شہر چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آپ شہر سے خفیہ طور پر نکل کھڑے ہوئے اور اس وقت آپ نے مندرجہ بالا دعا مانگی۔

لہٰذا آج بھی اگر کوئی ظالم قوم کے پنجے میں ہو اور اس سے نجات چاہے تو وہ اس دعا کو روزانہ ۲۱۰۰ مرتبہ پڑھے۔ انشاء اللہ بہت جلد نجات کا ذریعہ بن جائے گا۔ ایسے ہی اگر کسی ملازم کا مالک ظالم ہو اور وہ اس سے نجات حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ اس دعا کو بعد نمازِ عشا ایک سو گیارہ مرتبہ پڑھنے کا معمول بنا لے۔ انشاء اللہ بہت جلد خلاصی پا لے گا۔

فرعون پر غلبہ پانے کی دعا

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ

اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں (بڑی) شان و شوکت اور دولت دے رکھی ہے۔ (اور) اے ہمارے پروردگار (یہ ساز و سامان تو نے ان کو اسی غرض سے دے رکھا ہے) کہ (لوگوں کو) تیرے رستے سے بھٹکائیں، تو اے ہمارے پروردگار! ان کے مالوں پر جھاڑو پھیر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ یہ لوگ عذاب دردناک کے دیکھے بدون ایمان ہی نہیں لائیں گے۔ (پ ۱۱۔ یونس، آیت ۸۸)

حضرت موسیٰ جب پیغمبر مبعوث ہو گئے تو آپ نے مدائن سے واپس مصر آ کر فرعون کو اور اس کی رعایا کو دعوت حق دی لیکن فرعونیوں نے آپ پر طرح طرح کے ظلم کرنے شروع کر دیے۔ آخر جب فرعونیوں کی نافرمانیاں اور مظالم حد سے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں چنانچہ آپ بنی اسرائیل کو لے کر چل دیے لیکن جب فرعون کو آپ کے مصر چھوڑنے کا علم ہوا تو اس نے آپ کے تعاقب میں فوج لگا دی۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں نے رحمتِ خداوندی سے دریائے نیل عبور کیا۔ لیکن فرعون اور اس کی فوج دریائے نیل میں غرق ہو گئی۔ قرآن پاک میں بیان ہوا ہے کہ اس پر آپ نے مندرجہ بالا آیت پڑھی تا کہ لوگوں کو فرعون کے ظلم سے نجات ملے آخر کار آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو فرعونیوں کے ظلم سے نجات ملی۔

☆☆☆






شوابے ہومیو کلینک

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں۔ ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

دائمی نزلہ اور سائنوسائٹس

نائمہ.............. اسلام پورہ

میں پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں اور ہومیو کلینک ضرور پڑھتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ دس سال سے الرجی ہے۔ پہلے مجھے زکام ہوا اور ناک بند ہوگئی۔ ایکسرے میں ناک کی بائیں طرف کی ہڈی بڑھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے آپریشن کا مشورہ دیا مگر میں نے نہیں کروایا۔ ڈاکٹروں اور حکیموں سے بہت علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا، مجھے سال کے بارہ مہینے زکام نزلہ رہتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں جو مجھے بلغم نہ آیا ہو۔ اب جب الرجی کا دورہ ہوتا ہے تو ناک کے اندر والے سوراخ یعنی جو منہ کی طرف ہیں، ان میں جلن ہوتی ہے۔ چھینکیں آتی ہیں۔ ناک فوراً بند ہو جاتی ہے۔ جلن اتنی زیادہ ہوتی ہے جیسے آگ لگی ہو یا مرچیں لگ جائیں۔ پانی کی طرح قطرے گرتے ہیں۔ صبح سو کر اٹھتی ہوں تو سر کے سائڈ اور پیچھے کی طرف درد ہوتا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے جیسے سر میں پتھر ہوں۔ سجدے میں جاتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ ماتھا

> **ٹوکن**
>
> **برائے شوابے ہومیو کلینک**
>
> **مارچ 2015ء**
>
> اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔
>
> نام: ______________
>
> پتا: ______________
>
> ______________

کھنچ رہا ہو۔ اور چکر آتے ہیں۔ ریشہ گلے میں گرتا ہے تو کھانسی آتی ہے۔ بلغم بعض اوقات گٹھلیوں کی طرح منہ کے راستے نکلتا ہے۔ کبھی سبز اور کبھی سفید ہوتا ہے۔ روزانہ گولی کھاتی ہوں لیکن الرجی اس کے باوجود بھی ہوتی ہے۔ میں نے ہر قسم کی گولیاں، ناک بند ہونے کے اسپرے، قطرے وغیرہ سب استعمال کر لیے ہیں لیکن آرام نہیں آیا۔ وزن بہت زیادہ ہوگیا ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ مجھے ہائی بلڈ پریشر ہے جو کہ موروثی ہے۔ تقریباً 160/95 تو رہتا ہے۔ میں گولی روزانہ کھاتی ہوں۔ اکثر سر اور چہرے کی ہڈیوں میں درد رہتا ہے۔ دوائیاں بہت زیادہ استعمال کرتی ہوں۔ مجبوری ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جو میں کوئی گولی نہ کھاؤں۔ پنڈلیوں اور گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔ ٹانگوں پر زور دے کر ٹیکی پر یا اوپر نیچے نہیں اٹھ بیٹھ سکتی۔ ڈاکٹر صاحب میں نے بڑی امید سے یہ خط لکھا ہے۔ میں اب دوائیاں کھا کھا کر تھک گئی ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی ایسی دوائی دیں تا کہ میں بھی نارمل زندگی گزار سکوں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ مجھے امید ہے آپ جواب ضرور دیں گے۔ شکریہ۔

جواب: بی بی، نائمہ، آپ کو کرانک سائنو سائٹس اور Polyps ہیں اس لیے۔ دھول مٹی سے بچنے لیے ماسک کا استعمال کریں۔ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر ناک میں اوپر چڑھائیں صبح اور شام۔ ساتھ میں ڈاکٹر ولمار شوابے کی Marum Varum 30 کے 5 قطرے 3 مرتبہ اور Glonine 30 Calc carb 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ لیں۔ نزلہ کی زیادتی کی صورت میں KALOBA کے 10 قطرے دن میں 4 سے 5 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

چہل قدمی کی عادت ڈالیں۔ کھانے میں مرغی، نمک اور ٹھنڈی کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔



☆......☆......☆

بال چہرے پر

مس آر......اسلام آباد

میری عمر 24 سال ہے اور کچھ دنوں میں میری شادی ہونے والی ہے میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر بال ہیں۔ تھریڈنگ کرا کرا کے تنگ آگئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں میرا یہ مسئلہ جلد از جلد حل ہوجائے تا کہ میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہو برائے مہربانی میرے مسئلے پر فوری توجہ دیں اور کوئی اچھا نسخہ تجویز کریں۔

جواب: بی بی، ہارمونز کی خرابی کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے۔ اپنے ماہانہ نظام کے متعلق بھی لکھیں۔ آپ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ کا وزن کتنا ہے؟ آپ Oleumjec 30 ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی 5،5 قطرے اور Pulsatilla 30 کے بھی 5، 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد تفصیلی خط لکھ کر اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔

☆......☆......☆

ابارشن کے بعد ماہواری کی زیادتی

حیات بی بی......نارووال

میرا تین ماہ کا حمل ضائع ہوگیا تھا یعنی کہ (ابارشن) اس بات کو تقریباً 6 سال ہوگئے ہیں۔ اس وقت میرا خون بہت زیادہ ضائع ہوا۔

پہلے میں نے خیال نہیں کیا اپنی صحت کا۔ اب اتنے سال ہوگئے ہیں۔ صبح کو جب سو کر اٹھتی ہوں



تو طاقت نہیں ہوتی۔ آدھا گھنٹا پڑی رہتی ہوں پھر اٹھتی ہوں۔ بلیڈنگ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اگر فوراً اٹھوں تو دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے لیکوریا کی تکلیف جب ہوتی ہے تو پیشاب بھی زیادہ آتا ہے۔ میرے ہاتھوں کے ناخن سفید اور کھردرے ہوگئے ہیں۔ خون کی کمی بھی ہے۔

جواب: صحیح علاج کے لیے صحیح تشخیص ضروری ہے اور صحیح تشخیص کے لیے مرض کی علامات و کیفیات، معائنہ، متعلقہ رپورٹس کا ہونا ضروری ہے۔ الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹس کا ذکر تو آپ نے کیا ہے لیکن وہ بھیجنا بھول گئیں۔ بہرحال ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شواب، جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کر کے تازہ الٹرا ساؤنڈ اور کیفیات لکھ کر بھیجیں۔ Sabina6 5,Bovista30 قطرے دن میں 3 مرتبہ ایک گھونٹ پانی میں لیں۔ Thlaspi BursaQ, AlfalfaQ دن میں 3 بار 5 قطرے ایک گھونٹ پانی کے ساتھ لیں۔

☆......☆......☆

بے روزگاری اور ڈپریشن

پروین اختر .... پنڈی گھیب

عرض ہے کہ میری عمر 26 سال ہے۔ غیر شادی شدہ ہوں۔ انٹر پاس ہوں اور کوئی روزگار نہیں۔ آج سے ایک سال پہلے بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ روزگار نہ ہونے کی وجہ سے ٹینشن کا شکار ہوں۔ اور اب چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن لیتا ہوں اس وجہ سے کافی ڈپریشن کا شکار ہوں۔ کبھی روتا ہوں اور کبھی ہنستا ہوں، کبھی اول فول بکنے لگتا ہوں۔ سر میں سخت درد بھی ہوتا ہے، نیند بہت کم آتی ہے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے کافی کمزور ہوں، یادداشت بھی بری طرح سے متاثر ہوئی ہے۔ بچپن سے شدید قبض رہتا ہے۔ نفسیاتی ڈاکٹر سے علاج ہو رہا ہے۔

جواب: بیٹا ماشاءاللہ آپ جوان اور سمجھدار ہو۔ ہم اللہ کو کیوں یاد نہیں کرتے۔ دو رکعت صلوٰۃ الحاجات پڑھ کر دعا کریں۔ صبح فجر کے بعد سورۃ یٰسین اور مغرب کے بعد سورۃ الواقعہ کی تلاوت کریں۔ نماز کی سختی سے پابندی کریں۔ ہر چیز کا مالک اللہ ہے اور ہر کام اس کی رضا کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی بڑا کام کرنے کے بجائے کوئی چھوٹا موٹا کام کریں۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے جب کھاؤ پیو گے تو قبض تو ہو گا، بلڈ پریشر چیک کرائیں، ناک کا معائنہ کرائیں۔ کیا نزلہ ہوتا ہے؟ ڈاکٹر ولمار شواب جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات حسب ہدایات استعمال کریں۔ 15 دن کے بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

Stramonium30 اور Carbo Veg 30 کے 5,5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ اور LAIKAN کی ایک گولی دن میں 2 مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔

☆......☆......☆

یادداشت کی کمی

سازہ .... کراچی

میں میٹرک کی طالبہ ہوں۔ مجھے پڑھا ہوا یاد نہیں رہتا۔ پیپر والے دن تو گھبراہٹ میں سب بھول جاتی ہوں۔ ماہنامہ پاکیزہ میں کریٹکس (cratex) کے بارے میں پڑھا۔ برائے مہربانی میری راہنمائی فرمائیں کہ اس دوا کے کوئی بد اثرات تو نہیں؟ ماہانہ ایام کے وقت استعمال کر سکتی ہوں؟ کوئی منفی اثر تو نہیں ہوگا؟

کریٹکس کب سے شروع کروں اور کب تک کھاؤں؟

جواب: سارہ دماغی صلاحیت بڑھانے کے لیے کریٹلکس ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ایک بے مثال دوا ہے۔ اس کے اب تک کوئی منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ خاص دنوں میں بھی اس کو لیا جا سکتا ہے اس سے کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ قوت اور توانائی برقرار رہتی ہے۔ اس کو کم از کم 3 ماہ تک استعمال کریں۔ صبح اور شام ایک ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ نگلیں۔ اس کے علاوہ Anacardium 30 شوابے جرمنی کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆......☆......☆......☆

ایام جلدی ہونا

رعنا............ٹنڈو غلام علی

میں کافی عرصے سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں۔ ہومیو کلینک سے بھی کافی استفادہ حاصل کیا ہے۔ میں آپ کے پاس ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ پچھلے سال گرمی شدید تھی۔ جیسے ہی میں بازار سے گھر آئی تو مجھے ایام شروع ہوگئے۔ حالانکہ 10 دن پہلے ہی ..... بند ہوئے تھے۔ وہ دن اور آج کا دن ہے۔ ہر ماہ 10 دن پہلے ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی 20 دن کے بعد آجاتے ہیں جس کی وجہ سے بہت کمزوری ہوگئی ہے اور خون کی بھی کمی ہوگئی ہے۔ میری عمر 34 سال ہے۔ میرے 3 بچے ہیں، چھوٹی بیٹی سوا سال کی ہے۔ اس کو فیڈ بھی کرواتی ہوں۔ براہ مہربانی آپ کوئی ایسی دوا بتائیں جس سے ٹائمنگ درست ہو جائے اور کمزوری بھی دور ہو جائے۔

جواب: محترمہ آپ اپنا الٹراساؤنڈ کرا کر اپنی رپورٹ ضرور بھیجیں نیز ڈاکٹر ولمار شوابے کی Ptk60 کی ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ اور



Ptk 45 کی دو گولیاں تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ ..... لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

☆......☆......☆

نظر کی کمزوری

محمود............لاہور

عرض ہے کہ میری بیٹی کی عمر ساڑھے چھ سال ہے، عرصہ ڈھائی سال سے عینک لگی ہے۔ اس کے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور تھکی کی کیفیت ہوتی تھی۔ بائیں آنکھ کو ٹیڑھا کر کے دیکھتی تھی۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ ہر چھ ماہ بعد نظر چیک کروانے پر پہلے سے کمزور ہی نکلتی ہے ..... چھوٹی، چھوٹی باتوں کو خود پہ سوار کر لیتی ہے۔ حد سے زیادہ حساس ہے۔ براہ کرم ایسی اچھی دوا تجویز کریں جو نہ صرف نظر ٹھہرانے میں مدد دے بلکہ اس کو بہتر بھی کرے۔ شکریہ

جواب: محمود صاحب آپ نے تفصیل بالکل نہیں لکھی کہ اب سر درد کیسا ہوتا ہے یا بالکل ختم ہوگیا ہے، اس کے لیے کیا علاج کیا؟ آنکھ کی پوزیشن کیا ہے؟ نمبر کتنا تھا اور اب کتنا ہے، آپ کے گھر میں ایک دوسرے سے تعلقات کیسے ہیں؟ وزن اور خوراک کیسی ہے؟ مکمل تفصیلات لکھیے گا۔

☆......☆

ہاتھوں میں کرنٹ کا دوڑنا

مسز ریحان............کراچی

میری عمر 55 سال ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ہاتھوں میں اکثر کرنٹ دوڑ جاتا ہے۔ بازو موڑ کر سونے سے زیادہ ہوتا ہے۔ بازو سیدھا رکھوں تو

بہتر رہتا ہے اسی وجہ سے رات کو بار بار آنکھ کھل جاتی ہے۔ کافی علاج کرایا ،لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ برائے مہربانی ہومیوپیتھی میں اگر کوئی اس کا علاج ہے تو مجھے ضرور بتائیں اور دوا تجویز کریں۔ بہت مشکور ہوں گی۔

جواب: محترمہ آپ کو اپنی رپورٹس بھی بھیجنی چاہیے تھیں۔تاکہ ہم اپنے طور پر اس کو جانچ سکیں۔لہذا پہلی فرصت میں رپورٹس بھیج دیں۔ساتھ خون کا ٹیسٹ HbA1C بھی کرائیں۔ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calcarb30 اور Rhustox30 کے 10،10 قطرے 1/4 کپ پانی میں دن میں 4مرتبہ استعمال کریں۔

☆.....☆.....☆.....☆

قبل از وقت سفید بال

اقبال.............فیصل آباد

ڈاکٹر صاحب میری عمر 18 سال ہے اور ابھی سے بالوں میں سفیدی آگئی ہے۔مجھے نزلہ بھی رہتا ہے اور ناک بند ہوجاتی ہے۔آپ کو دو بار خط بھی لکھ چکے ہیں لیکن جواب نہیں آیا۔ایسی دوا تجویز کریں کہ نزلے کا علاج بھی ہوجائے اور بالوں کی سفیدی بھی ختم ہوجائے۔میں بہت پریشان ہوں۔شکریہ!

جواب: بالوں کو دھونے کے لیے میٹھا پانی استعمال کریں اور کوئی اچھا شیمپو بھی۔شوابے جرمنی کی Acid Phos 30 اور Lyco30 کے 5،5 قطرے دن میں 3مرتبہ ایک گھونٹ پانی میں لیں جبکہ Bacilinum200 ہر 15دن بعد لیا کریں۔6ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

☆.....☆.....☆

سورائسس

مسز فاکہہ ارسلان.....آزاد جموں کشمیر

میں ایک تکلیف دہ مسئلے کی طرف آپ کی توجہ دلا رہی ہوں۔میں پانچ چھ سال سے دونوں پاؤں میں ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوں جس کا بار،بار علاج کرانے کے باوجود وقتی فائدے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوسکا۔پہلے کئی بار ایلوپیتھک علاج کرایا۔ان لوگوں نے سورائسس تجویز کیا۔بعد میں ہومیوپیتھک علاج بھی کروایا۔علاج سے وقتی فائدہ تو ہوجاتا ہے لیکن مکمل افاقہ نہیں ہوتا۔مرض پھر بڑھ جاتا ہے۔میں Housewife ہوں۔عمر تقریباً60سال ہے۔

مہربانی کرکے اس لاعلاج بیماری کا مناسب حل تجویز کریں جس سے مستقل افاقہ ہو اور مجھے صحتِ کاملہ نصیب ہو۔

جواب: آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Bacilinum 200 کی ایک خوراک ہفتے میں ایک دفعہ لیں۔تین دن کے وقفے کے بعد Ars.iod 30 اور Hydrocotyle 30 کے بھی 5 قطرے دن میں 3مرتبہ لیں۔ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔شوگر بھی ٹیسٹ کروائیں اور میٹھی چیزوں کا استعمال بھی کم سے کم کریں۔

☆☆☆